

کتاب ۳۲۸

کاروان ابرار

جلد دوم

تاریخ

آزادگی بر سر

جانبا از مرزا



# کاروانِ احرار

جلد دوم

تاریخِ آزادی برصغیر

||

گزشتہ نصف صدی کی تاریخِ حریت

مجلسِ احرارِ مسلم لیگ، کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند کی

جدوجہدِ آزادی کے پس منظر میں

||

(یکم جولائی ۱۹۳۲ء تا یکم اپریل ۱۹۳۳ء)

جانباز مرزا

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

5887

مکتبہ تبصرہ، لاہور	ناشر
چٹان پریس لاہور	طبع
ایک ہزار	اشاعت اول
مقصود احمد - لاہور	کتابت
جون - ۱۹۶۶ء	تاریخ اشاعت
پانچ سو بارہ	صفحات

قیمت ..... ۳۰ روپے



ہم نے تاریخ پر احسان کیا ہے لوگو  
ہم نے اس بارے میں نوا پنا ہے لوگو

اور ہم نے انسانی زندگی کے کچھ  
مختصر دور پر مایہ سیا ہے لوگو

زندگی نام ہے اس دور کا بیٹا  
ہم نے یہ زہر بو طور پر ہے لوگو

اس کے دوران جو مرتے ہیں توہ چاہتے ہیں  
ایک دن اپنا سجت مر مر کے جیسا ہے لوگو

ویر میں نام خدا ہے تو خدا میں ہیں۔  
ہاں مگر جو نے یہی نام سیا ہے لوگو

ہم سے زبردست رہو سم انا الحق کی صدا  
بنا جاؤ اور سنی ہم نے دیا ہے لوگو

آج شہزادہ ہو کر ناما کے ہم پر  
ہم نے نکت کے لیے گا گیا ہے لوگو

جس کی نوہیں تمہیں منوں کے کھنڈے ملتے ہیں  
خون جاتا ہے اس کے پیشوں اورا سنا ہے لوگو

جاننا زمر

# فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	پٹلر پر قاتلانہ حملہ	۲۳	۲۶	ایک خبر	۷۶
۲	کانگریس کو اجراء کا جواب	۲۴	۲۷	ہندو مسلم اتحاد کا جدید نعرہ	۷۶
۳	گاندھی جی کے نام خط	۲۵	۲۸	تحریک شائقہ رسول کی بازگشت	۷۸
۴	وزیر اعظم کی علیحدگی کا مطالبہ	۲۶	۲۹	سز ظفر اللہ کا تقریر	۷۹
۵	یوم کیپور تھلہ	۲۸	۳۰	گاندھی کا کانگریس سے استعفیٰ	۸۰
۶	گاندھی جی کا اعتراف	۲۸	۳۱	لیگ اور مسلم کانگریس کے امیدوار	۸۰
۷	جیل وارڈز کی علیحدگی	۲۹	۳۲	قادیان اجراء کانگریس	۸۱
۸	سر آغا خاں کا مطالبہ	۲۹	۳۳	کانگریس ہائی کمان میں تبدیلی	۹۰
۹	ہمارا جہ کا جواب	۵۱	۳۴	تحریک کیپور تھلہ	۹۲
۱۰	آل انڈیا اجراء ورکنگ کمیٹی کا اجلاس	۵۱	۳۵	کانگریس اور ریاستیں	۹۲
۱۱	قراردادیں	۵۲	۳۶	اجراء پر انبار کا آغاز	۹۳
۱۲	شعبہ تبلیغ کا قیام	۵۵	۳۷	خالد لطیف گابا کی کامیابی	۹۵
۱۳	تیسرا محاذ	۵۸	۳۸	وزیر اعظم کیپور تھلہ کی علیحدگی	۹۵
۱۴	وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل	۶۱	۳۹	دوسرا اعلان	۹۶
۱۵	سندھ اور پاکستان	۶۲	۴۰	جنرل انتخاب کے نتائج	۹۶
۱۶	کیونسٹ پارٹی	۶۳	۴۱	جائینٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ	۹۷
۱۷	الپھریٹ لیگ	۶۵	۴۲	لندن میں خود مراسم	۹۸
۱۸	اجراء سے سمجھوتہ	۶۵	۴۳	دنیا جھکتی ہے مگر قوت کے سامنے	۱۰۰
۱۹	وائسرائے ہند کا اعلان	۶۵	۴۴	پسند اپنی اپنی	۱۰۱
۲۰	۱۷- اگست کا اجلاس	۶۵	۴۵	سیماشن چندر بوس کونونس	۱۰۲
۲۱	پٹلر جوڑ من کا صدر منتخب ہو گیا	۶۶	۴۶	شاہ جی کی گرفتاری	۱۰۳
۲۲	نئی آفر تقرری	۶۸	۴۷	ریاستہائے ہند کا اجلاس	۱۰۴
۲۳	ہمارا جہ جیتنے کے نام	۷۱	۴۸	قادیان کانگریس کا ذکر	۱۰۵
۲۴	پنجاب کا مسلم پرس	۷۲	۴۹	کیپور تھلہ کا نیا وزیر اعظم	۱۰۶
۲۵	مولانا ظفر علیاں خاکساروں سے بچا لے	۷۴	۵۰	وائسرائے ہند کا تقریر	۱۰۶

صفحہ	مضامین	نمبر شمار	صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۱۴۷	مشر جناب کی تقریر	۸۶	۱۰۷	معاہدہ دارسانی کو خطرہ	۵۱
۱۴۸	نمائندہ احرار کا بیان	۸۷	۱۰۸	قائد اعظم کی واپسی	۵۲
۱۴۹	بنگالی مسلمان	۸۸	۱۰۹	۱۹۳۵ء	۵۳
۱۵۰	وایان ریاست	۸۹	۱۱۰	چودھری عبدالعزیز کی اپیل	۵۴
۱۵۱	نئے رفیق سفر	۹۰	۱۱۱	فرانس اور اٹلی کا معاہدہ	۵۵
۱۵۲	جناب راجندر گنگو کا خاتمہ	۹۱	۱۱۳	جلد کا پیغام	۵۶
۱۵۲	سکھوں کا اعلان	۹۲	۱۱۶	سجاش بابو کی یورپ روانگی	۵۷
۱۵۳	غازی عبدالقیوم کو پھانسی	۹۳	۱۱۶	شیخ عبدالحمید سندھی کو احرار کی دعوت	۵۸
۱۵۳	معاہدہ دارسانی سے جلد کا انکار	۹۴	۱۲۰	تجویز اور فوائز	۵۹
۱۵۶	یونینسٹ پارٹی	۹۵	۱۲۱	ایڈیٹنگنٹ پارٹی کا قیام	۶۰
۱۶۰	کیمپوٹل ایوارڈ کا نقرس	۹۶	۱۲۲	اسمبلی کا اجلاس	۶۱
۱۶۰	حادثہ کراچی پر احتجاج	۹۷	۱۲۲	کیور تھلہ میں یک روزہ ہڑتال	۶۲
۱۶۱	احرار وفد کراچی کو	۹۸	۱۲۲	احرار کو ملاقات کی دعوت	۶۳
۱۶۱	پریس نوٹ	۹۹	۱۲۳	دفتر احرار پر پولیس کے چھاپے	۶۴
۱۶۲	ایک اہم الزام کی تردید	۱۰۰	۱۲۴	نیشنل لیگ کا قیام (قادیانی جماعت)	۶۵
۱۶۲	روس اور برطانیہ میں اتحاد	۱۰۱	۱۲۶	اسمبلی کی صدارت	۶۶
۱۶۲	تحقیقات سے انکار	۱۰۲	۱۲۶	وائسرائے کی تقریر	۶۷
۱۶۳	شیخ عبدالحمید سندھی کا استعفیٰ	۱۰۳	۱۲۷	وایان ریاست کا اجلاس	۶۸
۱۶۳	احرار کے خلاف ملک گیر مہم	۱۰۴	۱۲۸	ریاستوں کی قرارداد	۶۹
۱۶۶	حمایت اسلام کی قرارداد	۱۰۵	۱۲۹	سجاش بابو کی کتاب پر پابندی	۷۰
۱۶۶	کراچی کے حادثہ پر احتجاج	۱۰۶	۱۳۰	یوم احتجاج	۷۱
۱۶۸	مرکزی احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس	۱۰۷	۱۳۰	حکومت کو خوش فہمی	۷۲
۱۶۲	قادیانیوں کا سالانہ محبت	۱۰۸	۱۳۰	مسلم لیگ کا اجلاس	۷۳
۱۶۲	جناب راجندر فارمولہ کی اشاعت	۱۰۹	۱۳۱	کیور تھلہ فرائیوٹس کمیٹی کی سفارشات	۷۴
۱۶۶	شاہ جی کو سزا	۱۱۰	۱۳۲	فدائے توڑیلے کا محشر میں جنون میرا	۷۵
۱۶۶	ڈاکٹر اقبال کا استعفیٰ	۱۱۱	۱۳۳	چودھری عبدالعزیز کی رہائی	۷۶
۱۶۶	سکھوں میں جنگ آزادی	۱۱۲	۱۳۵	چودھری عبدالعزیز	۷۷
۱۶۶	یکم مئی	۱۱۳	۱۳۷	اسمبلی کا اکھاڑا	۷۸
۱۶۸	مملکت پر برطانیہ کا قبضہ	۱۱۴	۱۴۰	مشر محمد علی جناب کی تقریر	۷۹
۱۶۹	دوسری جنگ عظیم کے آثار	۱۱۵	۱۴۳	تحریک کیور تھلہ کا خاتمہ	۸۰
۱۸۰	خالد لطیف گاہا کی لندن روانگی	۱۱۶	۱۴۵	ایڈیٹریل پر بحث	۸۱
۱۸۰	کنٹرول لائسنس کا انتقال	۱۱۷	۱۴۶	مشر جناب کی صدر کانگریس کو دعوت	۸۲
۱۸۱	دفتر احرار پر چرائیاں	۱۱۸	۱۴۶	سرکاری ممبران کی رائے	۸۳
۱۸۱	کنٹرول لائسنس	۱۱۹	۱۴۶	جناب راجندر گنگو	۸۴
۱۸۶	شریف حسین کا مطالبہ	۱۲۰	۱۴۷	مسلم لیگ کا اجلاس	۸۵
۱۸۶	برطانیہ کا جواب	۱۲۱			

صفحہ	مضامین	نمبر شمار	صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۲۵۲	نام میں تبدیلی	۱۵۶	۱۸۶	آخر	۱۲۲
۲۵۲	کون کیا تھا	۱۵۸	۱۸۸	لارنس	۱۲۳
۲۵۲	حکومت سعودیہ کا برطانوی مکنی معاہدہ	۱۵۹	۱۸۹	جرمن اور برطانیہ	۱۲۴
۲۵۵	معاہدہ	۱۶۰	۱۹۲	کوئٹہ میں زلزلہ	۱۲۵
۲۵۴	انڈیا بل کی منظوری	۱۶۱	۲۰۰	احرار کا کوئٹہ ریڈیف کمیٹی	۱۲۶
۲۵۶	ہندوستان کا نیا واسلے	۱۶۲	۲۰۱	احرار وفد پر پابندی	۱۲۷
۲۵۸	تحریک کا نیا موڑ	۱۶۲	۲۰۲	صدر مرکز پر حکم	۱۲۸
۲۵۸	روزنامہ مجاہد کا اجرا	۱۶۲	۲۰۳	احرار کمیٹی کا معاہدہ	۱۲۹
۲۵۹	تحریک التوا	۱۶۵	۲۰۳	برائی، نیکی سے خائف	۱۳۰
۲۶۱	ایک اور مسجد کا انہدام	۱۶۶	۲۰۴	لاوارث بچے	۱۳۱
۲۶۲	ڈاکٹر محمد عالم اور مسجد کی تحریک	۱۶۷	۲۰۵	کوئٹہ اور مجلس احرار	۱۳۲
۲۶۲	سکھوں کی آٹھی تحریک	۱۶۸	۲۰۶	میوہ ہسپتال کا چارج	۱۳۳
۲۶۲	حکومت ہند کا اعلان	۱۶۹	۲۰۶	احرار بلٹین	۱۳۴
۲۶۳	بساط شہید گنج کا نیا فرہ	۱۷۰	۲۰۶	واٹس رائے کا اعتراف	۱۳۵
۲۶۳	یہ مفاد عامہ کے خلاف ہے	۱۷۱	۲۰۷	یوم کراچی	۱۳۶
۲۶۳	پنجاب میں مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی مکمل اجازت ملنی چاہیے	۱۷۱	۲۰۸	فوتروں کی فہرست	۱۳۷
۲۶۵	یوم شہید گنج	۱۷۲	۲۰۸	جرمن، برطانوی معاہدہ	۱۳۸
۲۶۵	تلوار رکھنے کی اجازت	۱۷۲	۲۱۰	مسجد شہید گنج، تحریک شہید گنج اور اس کے اسباب	۱۳۹
۲۶۶	مولانا احمد علی لاہوری کا بیان	۱۷۵	۲۱۳	ایک اخباری خبر	۱۴۰
۲۶۷	احرار کو دعوت مباہلہ	۱۷۶	۲۱۳	حادثہ مسجد شہید گنج	۱۴۱
۲۷۱	امیر ملت کا خطاب	۱۷۷	۲۲۲	احرار کا موقف	۱۴۲
۲۷۱	امیر شریعت اور امیر ملت	۱۷۸	۲۲۳	سکیم لیڈروں سے ملاقات	۱۴۳
۲۷۲	مرکزی مجلس احرار کی خاطر کا اجلاس	۱۷۹	۲۲۶	مصالحیت کی تجویز	۱۴۴
۲۷۳	سکھوں کے خلاف دعویٰ	۱۸۰	۲۲۶	سید عبید "روزنامہ سیاست لاہور"	۱۴۵
۲۷۳	یوم شہید گنج	۱۸۱	۲۲۷	بات بنتے بنتے رہ گئی	۱۴۶
۲۷۳	حبشہ کی جنگ	۱۸۲	۲۳۳	مسجد شاہ چراغ	۱۴۷
۲۷۴	احرار کی تاریخ کا مختصر اجتماع	۱۸۳	۲۳۶	مرزائی اور تحریک شہید گنج	۱۴۸
۲۷۵	تلوار کے متعلق حکومت پنجاب کا اعلان	۱۸۴	۲۳۷	جعلی خطوط	۱۴۹
۲۷۷	امیر ملت کا منصب	۱۸۵	۲۳۹	جعلی خطبہ کا محرک	۱۵۰
۲۷۸	روزنامہ انقلاب اور مرزائی	۱۸۶	۲۳۲	احرار کا ورلی جتھہ	۱۵۱
۲۷۹	ڈاکٹر امیتکے کا بیان	۱۸۷	۲۳۷	فتویٰ	۱۵۲
۲۷۹	مجلس احرار اور اچھوت	۱۸۸	۲۳۹	صدر بلدیہ لاہور کا بیان	۱۵۳
۲۸۱	مولانا داؤد غزنوی کا استحقاق	۱۸۹	۲۵۰	مشترک اجلاس	۱۵۴
۲۸۱	امر مکن اور امر نکر کی کمیوں کو ٹھیکہ دیا گیا	۱۹۰	۲۵۱	کانفرنس کی مشترک قرارداد	۱۵۵
۲۸۲	آل انڈیا پوٹیشنل احرار کانفرنس ساکھوٹ	۱۹۱	۲۵۱	اراکین کمیٹی	۱۵۶

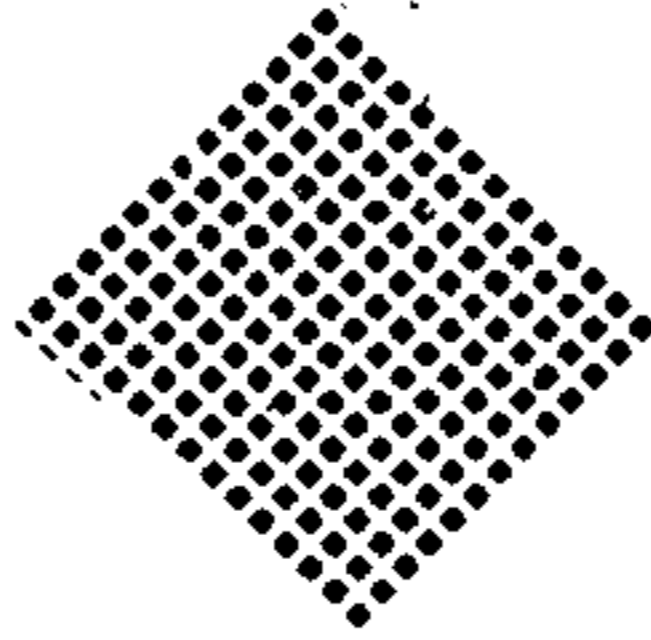


صفحہ	مضامین	نمبر شمار	صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۲۲۳	نئی صورت حال	۲۲۶	۲۸۸	جلسہ اجلاس کا اجلاس	۱۹۷
۲۲۷	اجلاس کا چیلنج	۲۲۷	۲۹۰	مدعی نبوت کو سزا	۱۹۳
۲۲۸	جلسہ اور اٹلی کی جنگ	۲۲۸	۲۹۰	یورپ، جنگ کا اکھاڑہ	۱۹۴
۲۲۸	مجلس اجلاس کا مطالبہ	۲۲۹	۲۹۲	یوسولینی	۱۹۵
۲۲۹	سکھ تحریک ختم ہو گئی	۲۳۰	۲۹۳	شہنشاہ ہیل سلاسی	۱۹۶
۲۲۹	چارج پنجم کا انتقال	۲۳۱	۲۹۴	پنجاب کونسل میں شہید گنج پر بحث	۱۹۷
۲۲۹	ایرلیٹ کی حج کو روانگی	۲۳۲	۲۹۵	مرزا نیوں کی درخواست	۱۹۸
۲۳۰	المجلیس پنجاب کی قرارداد	۲۳۲	۲۹۶	پنجاب کونسل میں بحث کا دوسرا روز	۱۹۹
۲۳۱	جمعیتہ علمائے ہند کی قرارداد	۲۳۲	۲۹۷	صوبہ سرحد میں تلوار کی اجازت	۲۰۰
۲۳۲	شاہ حجاز کا اعلان	۲۳۵	۲۹۸	پھر مبادلہ کا چیلنج	۲۰۱
۲۳۲	اورونڈ کی حجاز کو روانگی	۲۳۶	۲۹۸	آل انڈیا اجلاس کانفرنس کی صدارت	۲۰۲
۲۳۵	کراچی سے روانگی	۲۳۷	۲۹۹	تمغہ خدمت	۲۰۳
۲۳۶	ایک اور وفد	۲۳۸	۳۰۰	نظر بندوں کی رہائی	۲۰۴
۲۳۷	سر آفاخان کی آمد	۲۳۹	۳۰۰	ایک اور نوٹس	۲۰۵
۲۳۸	مسٹر خاج لاہور منہج گئے	۲۴۰	۳۰۱	دفتر ۱۹۸ اور ۱۲۲	۲۰۶
۲۳۹	قائد اعظم کا بیان	۲۴۱	۳۰۱	مدیر سیاست کی معذرت	۲۰۷
۲۳۹	ایک اہم سوال	۲۴۲	۳۰۱	شہنشاہ جلسہ نے مصالحتی فارمولا مسترد کر دیا	۲۰۸
۲۳۹	ڈیفنس کمیٹی کا فیصلہ	۲۴۳	۳۰۲	اجلاس قادیان میں سول نافرمانی	۲۰۹
۲۴۰	سر آفاخان کا مشورہ	۲۴۳	۳۰۲	یوم حجاز	۲۱۰
۲۴۰	مسٹر خاج کی دہلی روانگی	۲۴۵	۳۰۲	کرنیو ہٹ لیا گیا	۲۱۱
۲۴۰	عالمی حالات اور ہٹلر	۲۴۶	۳۰۲	خاکسار لٹلر کا اعلان	۲۱۲
۲۴۲	جمعیتہ اقوام کو جرمن کا جواب	۲۴۷	۳۰۳	اجلاس کانگریس کی گولڈن جوبلی میں	۲۱۳
۲۴۲	چارج پنجم کا سوگ	۲۴۸		شامل نہ ہوں	
۲۴۳	سرفضل خلیفہ کی کامیابی	۲۴۹	۳۰۴	اقبال کا استعفیٰ	۲۱۴
۲۴۵	مدینہ منورہ میں مرزا نیوں کو شکست	۲۵۰	۳۰۶	دوسری اور تیسری گرفتاری	۲۱۵
۲۴۷	سلطان حجاز سے اجلاس وفد کی طاقان	۲۵۱	۳۰۷	صاحبزادہ فیض الحسن کا تقریر سالانہ پنجاب	۲۱۶
۲۴۸	مضی کفایت اللہ کا بیان	۲۵۲	۳۰۸	چوتھی گرفتاری	۲۱۷
۲۴۸	کانگریس نے بحث ختم کر دی	۲۵۳	۳۰۹	اجلاس کی انوکھی جہازت	۲۱۸
۲۴۸	ہندوستان میں ہٹلر کے خلاف پروپیگنڈہ	۲۵۳	۳۱۱	دوسری جہازت	۲۱۹
۲۴۹	انتخابات کی سرگرمیاں	۲۵۵	۳۱۳	پانچویں گرفتاری	۲۲۰
۲۵۲	کانگریس کی قرارداد	۲۵۶	۳۱۴	۱۹۳۶ء	۲۲۱
۲۵۲	نئے وائسرائے کی آمد	۲۵۷		حکومت کو شکست	۲۲۲
۲۵۲	قائد اعظم کی تقریر	۲۵۸	۳۱۶	سر آفاخان کا بیان	۲۲۳
۲۵۲	علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر	۲۵۹	۳۱۸	قادیان میں نماز جمعہ	۲۲۴
۲۵۲	نیا ایرلیٹ	۲۶۰	۳۱۹	کشمیری بھائیوں کے نام	۲۲۵
۲۵۲	انسانیت پر سب سے بڑا ظلم	۲۶۱	۳۲۱		

صفحہ	مضامین	نمبر شمار	صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۳۹۶	یونی	۲۹۸	۳۵۵	مسلم لیگ کا اجلاس	۲۹۲
۳۹۸	آپ ڈھونڈی کیوں گئے تھے	۲۹۹	۳۵۶	یونینسٹ پارٹی	۲۹۳
۴۰۰	خارج کی لاہور سے روانگی	۳۰۰	۳۵۶	مشترک اپیل	۲۹۴
۴۰۱	بنگالی پارٹی لیگ بورڈ سے الگ ہو گئی	۳۰۱	۳۵۷	کانگریس کا اجلاس	۲۹۵
۴۰۱	لال ڈھنڈورا	۳۰۲	۳۵۷	سرفضل حسین کی تقریر	۲۹۶
۴۰۱	سندھ بھی گیا	۳۰۳	۳۵۸	اگر اور دیگر رہنماؤں میں بات چیت	۲۹۷
۴۰۲	سید گیلانی کا استعفیٰ	۳۰۴	۳۵۹	اگر اور دیگر رہنماؤں میں بات چیت	۲۹۸
۴۰۲	حکومت پنجاب کا اعلان	۳۰۵	۳۶۵	کانگریس کی بے بسی	۲۹۹
۴۰۲	ایکٹ ۱۹۲۵ کی منظوری	۳۰۶	۳۶۷	اگر اور دیگر رہنماؤں میں بات چیت	۳۰۰
۴۰۲	سکھ لیڈر کا اعلان	۳۰۷	۳۶۷	کانگریس کی بے بسی	۳۰۱
۴۰۲	سرفضل حسین کا انتقال	۳۰۸	۳۶۷	اگر اور دیگر رہنماؤں میں بات چیت	۳۰۲
۴۰۴	یونینسٹ پارٹی کا نیا لیڈر	۳۰۹	۳۶۷	کانگریس کی بے بسی	۳۰۳
۴۰۵	مسلمانوں کا قبرستان	۳۱۰	۳۶۷	اگر اور دیگر رہنماؤں میں بات چیت	۳۰۴
۴۰۵	سودیشی بی کی تلاش	۳۱۱	۳۶۸	یونی مجلس احرار کا اجلاس	۳۰۵
۴۰۵	مسجد شاہ چراغ کی واپسی	۳۱۲	۳۶۸	اگر اور دیگر رہنماؤں میں بات چیت	۳۰۶
۴۰۵	عبد اللہ ارون کا استعفیٰ	۳۱۳	۳۶۹	روزنامہ مجاہد کی ضمانت	۳۰۷
۴۰۶	اگر اور دیگر رہنماؤں کی واپسی	۳۱۴	۳۶۹	نوابزادہ بیانت علیخان کی علیحدگی	۳۰۸
۴۰۶	تحریک مدح صحابہ	۳۱۵	۳۶۹	مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا اجلاس	۳۰۹
۴۱۰	بنائے فساد	۳۱۶	۳۸۰	تحریک شہید گنج کا نتیجہ	۳۸۰
۴۱۲	اگر اور کی سول نافرمانی	۳۱۷	۳۸۱	۲۶ مئی کے روزنامہ انقلاب کا ادارہ	۳۸۱
۴۱۳	سکندر حیات کی آمد	۳۱۸	۳۸۲	مقدمہ کا فیصلہ	۳۸۲
۴۱۴	مستندہ محاذ	۳۱۹	۳۸۲	حکایت کا اعلان	۳۸۳
۴۱۴	کانگریس اور ہندو سماج	۳۲۰	۳۸۲	سرفضل حسین کا بیان	۳۸۴
۴۱۴	مولانا ظفر علیخان کی تقریر	۳۲۱	۳۸۳	بہ خاموشی کیوں؟	۳۸۵
۴۱۴	یونائیٹڈ پریس کی اطلاع	۳۲۲	۳۸۳	ایک اخباری افواہ	۳۸۶
۴۱۵	اسمبلی میں تحریک التوا	۳۲۳	۳۸۴	پنڈت جواہر لال نہرو لاہور میں	۳۸۷
۴۱۵	اگر اور رہنماؤں کی گرفتاری	۳۲۴	۳۸۴	ہاتما گاندھی کا بیان	۳۸۸
۴۱۵	قبل از مرگ واویلا	۳۲۵	۳۸۴	ہاتما گاندھی کا بیان	۳۸۹
۴۱۵	تحریک رداں	۳۲۶	۳۸۷	مشرخہ کی گفتگو سے واپسی	۳۹۰
۴۱۶	یونی پارلیمانی بورڈ کا اجلاس	۳۲۷	۳۹۰	سید حبیب کا استعفیٰ	۳۹۱
۴۱۶	بنگال قسے ہندوؤں کو جواب	۳۲۸	۳۹۰	روزنامہ انقلاب کی رائے	۳۹۲
۴۱۷	مدھاس کا مسلمان	۳۲۹	۳۹۰	اگر اور دیگر رہنماؤں میں بات چیت	۳۹۳
۴۱۷	نوابزادہ بیانت علیخان کا استعفیٰ	۳۳۰	۳۹۱	ایک خبر	۳۹۴
۴۱۷	بے بنیاد افواہیں	۳۳۱	۳۹۱	مولانا مظہر علی کا بیان	۳۹۵
۴۱۹	حکومت حجاز کو تشویش	۳۳۲	۳۹۳	سر سکرندھ اور سرفضل حسین کے درمیان گفتگو	۳۹۶
۴۱۹	پنجاب پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس	۳۳۳	۳۹۶	پنجاب	۳۹۷

صفحہ	مضامین	نمبر شمار	صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۲۶۰	سوالات	۲۶۰	۲۲۰	مولانا ابوالکلام آزاد کا جواب	۲۲۴
۲۶۳	ہوم ممبر کے جواب	۲۶۱	۲۲۱	حلف نامہ	۲۲۵
۲۶۵	تشدد کی نئی تحریک	۲۶۲	۲۲۳	پارلیمنٹری بورڈ کی نئی شرائط	۲۲۶
۲۶۶	ہندو مسلم فساد	۲۶۳	۲۲۴	اچرائی پارلیمنٹری بورڈ سے علیحدگی	۲۲۷
۲۶۷	آل انڈیا شہید گنج کانفرنس	۲۶۴	۲۲۷	اچرائی پارلیمنٹری بورڈ	۲۲۸
۲۶۷	پہنچی وہیں پر خاک جہاں کا خمیر تھا	۲۶۵	۲۲۹	پولی کا ڈاکٹر قتل کر دیا گیا۔	۲۲۹
۲۶۸	تحریک مدح صحابہ ملتوی کر دی گئی	۲۶۶	۲۲۹	منشی احمد دین کی گرفتاری	۲۳۰
۲۶۹	کار سوز کی گرفتاری	۲۶۷	۲۲۹	لکھنؤ میں گرفتاریاں	۲۳۱
۲۷۰	انتخاب کی تیاریاں	۲۶۸	۲۳۰	اتحاد ملت کا پارلیمنٹری بورڈ	۲۳۲
۲۷۰	پنجاب شیعوں پوٹیکل کانفرنس کی قراردادیں	۲۶۹	۲۳۰	مسجد شاہ چراغ کا قبضہ دے دیا گیا	۲۳۳
۲۷۰	برطانیہ کے شاہی خاندان میں انقلاب	۲۷۰	۲۳۰	مجلس اچرائی کا مرکزی اجلاس	۲۳۴
۲۷۲	آل انڈیا کانفرنس کی قرارداد	۲۷۱	۲۳۰	جمعیت علماء ہند کا اجلاس	۲۳۵
۲۷۳	مجلس اچرائی نے اپنے امیدواروں کا اعلان کر دیا	۲۷۲	۲۳۳	پنجاب تقسیم ہو گیا	۲۳۶
۲۷۳	جدید دستور کو مسترد کر دیا	۲۷۳	۲۳۲	تیزاب ڈالنے کی تحریک کا خاتمہ	۲۳۷
۲۷۳	پنجاب اہل حدیث کا فیصلہ	۲۷۴	۲۳۳	رواں تحریک	۲۳۸
۲۷۳	ہندو مسلم اتحاد	۲۷۵	۲۳۳	اچرائی پراونشل کانفرنس	۲۳۹
۲۷۳	تحریک مدح صحابہ شیعوں کی خلاف ورزی ہے	۲۷۶	۲۳۴	مالیر کوٹھک کے مہاجرین	۲۴۰
۲۷۳	صدر مجلس اچرائی کا جواب	۲۷۷	۲۳۵	سر سکندر حیات کی واپسی	۲۴۱
۲۷۵	۱۹۳۷ء	۲۷۸	۲۳۵	انتخاب کا آغاز	۲۴۲
۲۷۸	صدر کانگریس کا خط	۲۷۹	۲۳۶	روز نامہ انقلاب لاہور کے ادارے	۲۴۳
۲۷۸	جواب	۲۸۰	۲۳۶	نواب آف میر کوٹھک کا اعلان	۲۴۴
۲۸۲	اچرائی امیدواروں کے اعلان	۲۸۱	۲۳۷	نئے ریونیو ممبر	۲۴۵
۲۸۲	تیسری پارٹی بھی ہے	۲۸۲	۲۳۷	آل انڈیا پوٹیکل کانفرنس لاہور	۲۴۶
۲۸۳	جو اہل لال	۲۸۳	۲۴۰	رسم پرچم کشائی	۲۴۷
۲۸۳	شکال کا مسئلہ طے ہو گیا	۲۸۴	۲۴۰	قراردادیں	۲۴۸
۲۸۵	منشی احمد دین کو سزا	۲۸۵	۲۴۲	سیکرٹری استقبالیہ	۲۴۹
۲۸۵	سر سکندر حیات کی تقریر	۲۸۶	۲۴۳	اچھوت تبلیغ کانفرنس	۲۵۰
۲۸۶	مولانا شوکت علی کی ناراضگی	۲۸۷	۲۴۴	مجلس اچرائی کا انتخابی منشور	۲۵۱
۲۸۶	مرزائی اور سکندر حیات	۲۸۸	۲۵۴	عبداللہ گاندھی کی مخالفت	۲۵۲
۲۸۶	ججلی چیمپیوں کی اشاعت	۲۸۹	۲۵۵	مظفر فضل الحق کا جواب	۲۵۳
۲۸۹	ملک برکت علی پر ازار	۲۹۰	۲۵۵	قائد اعظم اور روز نامہ انقلاب	۲۵۴
۲۸۹	پندرہت مالوی پنجاب میں	۲۹۱	۲۵۸	ایک خبر اور اس کے عنوان	۲۵۵
۲۹۰	حلف نامہ آزادی خلافت قانون قرار دیا گیا	۲۹۲	۲۵۸	سندھ میں نئی پارٹی	۲۵۶
۲۹۰	مجلس اچرائی کا اعلان	۲۹۳	۲۵۸	جرمن دور جاپان میں سمجھوتہ	۲۵۷
۲۹۰	مولانا عبید اللہ سندھی کی صدارتے بارگشت	۲۹۴	۲۵۹	مسجد شاہ چراغ	۲۵۸
			۲۵۹	یورپی کونسل میں تحریک مدح صحابہ	۲۵۹

صفحہ	مضامین	نمبر شمار	صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۴۹۹	کانگریس کی قراردادوں	۴۲۲	۴۹۱	انتخابات شروع ہو گئے	۴۰۵
۵۰۱	علامہ اقبال کا خط مہر خواجہ کے نام	۴۲۳	۴۹۲	برطانیہ کی جنگی تیاریاں	۴۰۶
۵۰۲	یونی میں لیڈر شپ کا جھگڑا	۴۲۴	۴۹۳	راجہ شمس الدین علی کا بیان	۴۰۷
۵۰۵	وزارت میں ختم ہو گئے	۴۲۵	۴۹۳	پٹنہ کا اعلان	۴۰۸
۵۰۵	کانگریس کے رویے پر صدر مجلس احرار	۴۲۶	۴۹۴	انتخاب کے نتائج	۴۰۹
۵۰۶	کانگریس ارکان کے لیے حلف نامہ	۴۲۷	۴۹۵	مجلس احرار	۴۱۰
۵۰۶	مہر محمد علی خواجہ کا اعلان	۴۲۸	۴۹۵	یونیورسٹی پارٹی	۴۱۱
۵۰۷	ایک نظم کی ضبطی	۴۲۹	۴۹۶	پنجاب میں ناکامی پر مہر خواجہ کا بیان	۴۱۲
۵۰۷	پندرہت نورو کا اعتراف شکست	۴۳۰	۴۹۷	سیکرٹری انجمن اسلامیہ	۴۱۳
۵۰۸	یکم اپریل کو برطانوی	۴۳۱	۴۹۷	سیاسی قیدیوں کی رہائی	۴۱۴
۵۰۸	مدح صحابہ کبریٰ	۴۳۲	۴۹۸	حکومت پنجاب کا اعلان	۴۱۵
۵۰۹	مسلم ماس کنٹریکٹ	۴۳۳	۴۹۸	وزیر اعظم پنجاب کا اعلان	۴۱۶
۵۰۹	ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ	۴۳۴	۴۹۸	روزنامہ پر تاپ کی ایک خبر	۴۱۷
۵۱۰	براعلیٰ ہندہ کر دی گئی	۴۳۵	۴۹۸	مہر خواجہ کا ایک اور بیان	۴۱۸
۵۱۰	وزیر اعظم بنگال کا اعلان	۴۳۶	۴۹۹	مرکزی مجلس احرار کا اجلاس	۴۱۹
۵۱۱	جدید دستور	۴۳۷	۴۹۹	سرحد میں وزارت	۴۲۰
				سیجاش بابو کی رہائی	۴۲۱



جلد دوم کے ترتیب دینے اور اخبارات کے فائل دیکھنے میں جن اداروں نے تعاون کیا ان میں ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان اور عجائب گھر لائبریری کے منتظمین صاحبان کا شکر یہ کہ مستحق ہیں۔ نیز ڈاکٹر محمد جہانگیر ڈائریکٹر ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان اور ان کے عملہ کا بھی ممنون ہوں کہ ان کے مفید مشورے اکثر مہرے رہنمائی کرتے رہے۔ ان کے علاوہ حسب ذیل کتب تاریخ رواں میں میرے لیے کارآمد ثابت ہوئیں۔

مصنف پودھری خلیق الزمان

۱۔ شاہراہ پاکستان

سر محمد یامین خاں

۲۔ نامہ اعمال حصہ اول

مولانا منظر علی انظر

۳۔ ایک خوفناک سازش

مولانا منظر علی انظر

۴۔ تاریخ مدح صحابہ

مولانا عزیز الرحمن جامی

۵۔ رئیس الاحرار

محمد شفیع پودھری

۶۔ تحریک پاکستان - دستور اسلامی جمہوریہ

عاشق حسین بھالوی

۷۔ ڈاکٹر اقبال کے آخری دو سال

سید نور احمد

۸۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک

اور دیگر

## کچھ حکایتیں کچھ شکائتیں

الحمد للہ کہ کاروانِ احرار کی جلد دوم مکمل ہو کر قارئین تک پہنچ چکی۔ زمانہ جس تیزی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ ماضی کے واقعات اسی قدر وقت کی گردوغبار میں لپیٹے جا رہے ہیں۔ کھنڈرات کی دیواروں نے انہیں اور گہرے گڑھے میں دبا دیا ہے نہ تو حالات مہلت دے رہے ہیں اور نہ قلم اس بوجھ کا تحمل ہے۔ اس پر بھی گمشدہ اوراق کی تلاش میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھی۔

غیر ملکی حکمرانوں نے جن ہاتھوں میں قلم دیا ان کی حرکت پر نظر رہی اور اس کے نتیجے میں حقیقت افسانے میں ڈھل کر رہ گئی۔ ہزاروں میل جتس کے باوجود تنگ میل دکھائی نہیں دیتا کہ منزل کی راہ سبھائی دے۔ آخر اس راہ کا مسافر جی ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن ایک میں ہوں کہ بے سرو سامانی کے باوجود آرزوؤں کی گدال لیے کھنڈرات کی ایک ایک اینٹ الٹ پٹ کر تاریخ کمنہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ کہیں ناکرہ گناہ انسانوں کا خون بکھرا پڑا ہے کہیں لاشوں کے ڈھیر ہیں۔ کہیں تمنائیں تڑپ رہی ہیں اور کہیں حسرتیں ماتم کناں۔ ان سب کو جوڑ کر تاریخ ماضی کا ایک ہیوٹی تعمیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کتاب بڑا کا نقش اول آپ کی اوزانِ خواہشات پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ آئندہ مؤرخ کو اپنا اثاثہ نجات جھج کرنے پر وقت نہیں ہوگی۔ ۱۹۷۵ء کے اکتوبر میں پہلی جلد مارکیٹ میں آئی تو عوام کے ساتھ ملکی صحافت نے بھی اس کا غیر مقدم کیا اور اسے تاریخ کا اہم جزو قرار دے کر اس کی مزید ضرورت کا احساس دلایا چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ادارے جو عوام تک ایسا لٹریچر پہنچانے کے مدعی ہیں اور اس ضرورت کے لیے حکومت سے لاکھوں روپے وصول کرتے ہیں، کاروانِ احرار (جلد اول) کی پذیرائی کرتے۔ مگر انہوں نے اس سے بے اعتنائی کا پورا مظاہرہ کیا۔ محض اس لیے کہ اس کام میں

وہ بری طرح ننگے تھے۔ اس آئینے میں ان کے خدو خال واضح تھے۔ انہیں یہ ڈر رہا کہ آئینہ  
 نسلیں ان کی راکھ تک جلا دیں گے۔ اس خوف و ہراس کی وجہ سے انہوں نے کاروانِ احرار  
 کو اپنی دہلیز سے باہر رکھا۔ لیکن تاکے؟

عام طور پر پاکستان نیشنل سنٹر اور نیشنل بک سنٹر لاہور نئی کتب کی افتتاحی تقریب  
 کے لیے مقرر ہیں۔ ان اداروں کے منتظمین سے جب کاروانِ احرار (جلد اول) کی افتتاحی تقریب  
 کے لیے کہا گیا تو انہوں نے کتاب کا مطالعہ کیے بغیر تقریب کی اجازت دینے سے انکار  
 کر دیا۔ حالانکہ تاریخ کسی کی طرفدار نہیں ہوتی لیکن محض لفظ احرار پر ان کا خون خشک ہو گیا اور  
 ان عوامی اداروں نے یہ کہہ کر تقریب کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ یہ سرکاری ادارے  
 ہیں۔ ان میں سیاسی کتب کی تقریب کی گنجائش نہیں۔

خیر..... ناخدا جن کا نہ ہو ان کا خدا ہوتا ہے۔

میں عوام اور ملک کے جوائنڈ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کاروانِ احرار جلد اول  
 کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔

امید ہے کہ کتاب ہذا جلد دوم بھی اپنے معیار پر پوری اترے گی۔

آپ کا جانباہر مرزا

۴ جون ۱۹۷۷ء

کتاب سے پہلے صاحب کتاب کا سمجھنا ضروری ہے۔

کہانی میری روئدادِ جہاں معلوم ہوتی ہے  
جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے

(۲)

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہم ڈیرہ اسماعیل سے لاہور پہنچے۔

کاروانِ زندگی ۱۹۳۹ء تک انہیں راہوں سے گذر رہا تھا کہ میری ازدواجی زندگی کے منصوبے از سر نو باندھے جانے لگے۔ انسانی فطرت کا تقاضہ بھی تھا کہ شادی کر لی جائے۔ بچپنا، جوانی کی سرحدوں پر چھوڑ کر رخصت ہو چکا تھا۔ گو مجھے اس دور کی آمد کا احساس نہیں تھا تاہم بہار کے دنوں نافہ فطرت سے خوشبو اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ یہ خیال بھی تھا کہ جس خازنِ روادی سے میں گذر رہا ہوں، نو آموز رفیق سفر اس کا متحمل ہوگا؟۔ نیز زندگی جس کھیل تماشے میں مصروف ہے۔ اس میں ذاتی کردار کی سختی نشتِ اول سے ازدواجی بندھنوں کے بغیر اس میں پائیداری کا آنا مشکل ہے۔ جبکہ ہر موڑ پر ہزاروں فتنے راستہ رو کے کھڑے ہوں۔ ایسے میں دل و نظر کا سفید سنبھالنا دشوار ہے اور سائل تک پہنچنے کے لیے ہزاروں طوفانوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ پھر مسلمان قوم کی رہنمائی جس کی انگلیاں خواہ مخواہ اٹھنے کی عادی ہوں۔ اس دنیاوی رسم و راہ سے گذرے بغیر گزارہ نہیں۔

اس پر میں نے نہیں غور کیا۔ آخر ضلع ہوشیار پور کے ایک غیر مسلم نے اپنی لڑکی کا رشتہ دینا منظور کر لیا۔ یہ لڑکی اس کی مسلمان بیوی کے بطن سے تھی جس نے اپنا مذہب تبدیل کر کے غیر مسلم سے شادی کر لی تھی۔ لیکن مذکورہ لڑکی ہنوز اپنے ایمان پر قائم تھی۔ اس کے سوتیلے باپ کی خواہش پر یہ رشتہ منظور کر لیا گیا۔ ابتدائی رسم قریباً ختم ہو چکی تھی کہ اس کی اطلاع برادرِ اکبر سمیت برادری تک پہنچ گئی۔ وہ سب بگڑ گئے۔ آخر یہ رشتہ پروان چڑھے بغیر ٹوٹ گیا۔



اس موقعہ پر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے ایسا آزاد منش جو برطانوی سلطنت کی غلامی سے وطن کو آزاد کرانے کا عزم کیا ہوتے ہے۔ وہ برادری کے بندھنوں کو توڑ سکا۔

رسم درواج: قوموں کے عروج و زوال کی داستان تاریخ کے اوراق پر بکھری پڑی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو غارتگری کے اسباب میں قوموں کے مصنوعی رسم و رواج بھی ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ امرتسر کے مسلمان رؤسا کی کہانی اس باب کی عظیم المیہ کہانی ہے۔ یہ لوگ کبھی مارے شہر کے مالک تھے لیکن دنیاوی رسم و رواج میں ایسے الجھے کہ آخر کو انہیں شہری آبادی سے دور اپنے ٹھکانے تلاش کرنے پڑے۔ ان کی جائیدادوں کی وارث ہمسایہ قوم بن گئی اور یہ یوسف بے کارواں ہو کر اپنی کھوئی ہوئی عظمت پھر کبھی حاصل نہ کر سکے۔

پیدائش سے موت تک انسانی زندگی میں جس قدر غمی اور خوشی کے موڑ آتے ہیں

کی کشمیری برادری خصوصاً ان مواقع پر آپے سے باہر ہو کر خراج کرتی۔ اس کے لیے مکان ہندو کے ہاں رہن رکھنے پڑتے۔ جو سودر سود کی رقم سے آخرا نہیں کے ہو جائے۔ لیکن سبائی چارے میں ناک اونچی رہتی۔

میرے ایسا آدمی جس نے ہمیشہ ان برائیوں سے منع کیا تھا اور راستے کی روک

بنارہا۔ اپنے لیے عمل کا وقت آیا تو ساری حقیقت کرکری ہو گئی۔ میرا فعل میرے قول

کے خلاف نکلا

فروری ۱۹۳۹ء کو میری شادی اوسط درجے کے ایک راجپوت گھرانے میں ہونا قرار پائی۔ سسرال والوں کی خواہش تھی کہ برات کے ساتھ باجا اور دو لہا گھوڑے پر سوار ہو۔ میرا موقف اس کے برعکس تھا۔ گھر میں برادر اکبر میرے ہم آہنگ تھے۔ مگر مجھ اور سسرال والوں کی ہم نوا تھیں۔ یہ جھگڑا چار دن گھر میں وجہ نزاع بنا رہا۔ آخر سسرال والوں کی بات رہ گئی۔ مجھے اپنے ارادوں میں شکست ہو گئی۔ جاہتی دوست برات میں شرکت کے لیے آئے مگر اس فیصلہ کی وجہ سے ناراض ہو کر چلے گئے۔ اس کے باعث برات کی رونق ضائع ہو گئی۔ نتیجہ میں میں نے پھر کبھی حوام کو ان کے رسم و رواج پر ٹوکنے کی گفتگو نہیں کی۔

گھر کا ماحول سکون بخش ہو تو اس جیسی جنت کوئی نہیں۔ مگر اس کا انحصار بیوی کی محبت پر ہے۔ اگر اس میں خاوند کی اطاعت کے ساتھ صبر و تحمل کا وہ ہے تو سمجھو زندگی نفع بخش رہی۔ ورنہ مختلف طبیعتوں کا ملاپ جہنم سے کم نہیں ہوتا۔ میری نئی رفیقہ حیات سیرت کے لحاظ سے فرشتہ صفت ثابت ہوئی۔ میرے ایسے آوارہ مزاج آدمی کے لیے ایسی بیوی کا ملنا میرے خالق کا مجھ پر انجام تھا۔ اس کے آتے ہی کتاب زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ خانگی نشیب و فراز گھر نو دریاں اور عزیز واقارب کی قرابت داری حاصل ہوئی۔

یہ تمام میری پیشتر کی زندگی میں اجنبی چیزیں تھیں۔ میری طبیعت نے یہاں سے نئی کرٹ لی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے میں یکاکی کسی نئی راہ پر اٹلا ہوں۔ نئے سفر نے نئی نئی راہیں سمجھائیں۔ اضطرابی زندگی میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ شب و روز میں تغیر آیا۔ گھر سے باہر کے کام مختصر کرنے کی عادت پڑ گئی۔ البتہ نئے سفر میں زار راہ کی کمی بری طرح کھٹکنے لگی۔ تمہی دامن نے نئی شادی کے رکھ رکھاؤ اور اس خوشی کی عمر بہت مختصر کر دی۔

بھائی سے علیحدگی۔ دامن کا لباس ہنوز اجلا تھا کہ اس کا چہرہ میلا ہونے لگا۔ مانگ کا سینہ پھیلا پڑ گیا۔ جوانی کی ابھرتی ہوئی تمناؤں پر اس پڑنے لگی۔ آرزوؤں کی ابتدائی عمارت کے آثار گرنے لگے۔ یہ سارا کچھ بھائی اور بھابھ کی بے رخی کے سبب تھا۔

عورت ہو ہو کہ ساس، نند ہو کہ بھابھ۔ ایک جنس ہونے پر بھی ایک جگہ امن سے نہیں رہ سکتی۔ بلاشبہ عورت فطرت کے نگار خانے کا ایک حسین شاہکار ہے۔ اس میں ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے مختلف روپ شامل ہیں۔ مگر جب یہ تصویر اپنا رخ بدلتی ہے تو اس کے تمام روپ ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس وقت یہ صرف عورت رہ جاتی ہے اور بس۔ اور اس روپ میں جب وہ انتقام پر اترتی ہے تو الامان الحفیظ۔

نہ جانے بھابھ نے اندر خانے بھائی کو کیا سکھایا پڑھایا کہ وہ بھی مجھے پرانی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ حالانکہ مجھے شادی سے زیادہ اگر کوئی مسرت تھی تو یہ کہ دونوں بھائی مدت کے بعد ایک جگہ بیٹھ کر دکھ دکھ کے سانجھی ہوں گے۔ دونوں ماں جاتے نون کی سانجھ سے بیگانگی کے مارے راستے مسدود کر دیتے۔ مگر اس خوشی میں ایسا زہر گھول دیا گیا کہ اس کا ہر گھونٹ حلق

سے اترتے ہی جسم میں آگ لگتا چلا گیا۔

بھائی کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے، جس میں ماں کے دودھ اور باپ کے خون کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ ان دونوں چیزوں نے اس رشتے میں ایسی گرہ دے رکھی ہے کہ اگر اس میں ذرا سی دراڑ آجائے تو ایسا لگتا ہے جیسے ایک بازو میں زخم آگیا ہو۔ اور کہیں اگر نصیب بٹمناس بھائی بھائی کے باہن لکیر آجائے تو جیسے دونوں بازو جسم سے ٹوٹ کر گر گئے ہوں۔ بھائی، بھائی کی پشت پناہ ہوتا ہے ان کی علیحدگی سے وہ دیوار گر جاتی ہے، جو ایک دوسرے کو سہارا دینے ہوتے ہوتی ہے۔ دشمن یہیں سے حملہ آور ہوتا ہے اور اپنے ارادوں کی تکمیل میں دور تک چلا جاتا ہے۔

مگر آہ! میری سوچ کے برسانے بہت جلد ڈھل گئے

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور کالے بھی گئے

میری بہار کی عمر مختصر نکلی۔ نزاں نے تمام پھول پتیاں بکھیر دیں اور بادِ سموم نے ایسا جھاڑ پھیرا کہ چمن میں ویرانی کے سوا باقی کچھ نہ رہا۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

تنگ دستی ہو تو جھکڑے کے ہزار بہانے مل جاتے ہیں۔ پریشان حالی کے باعث پہلے تو عورتوں میں باہم تکرار ہوتی۔ آخر گھر میں مستقل فساد رہنے لگا۔ بھادوہ کی طبیعت شروع سے تیز تھی۔ نئی دامن بھی ان عورت مٹھری۔ سمجھانے کے باوجود کسی بات کا جواب دینا ہی پڑ جاتا۔ اسی بات کا نتیجہ بنتا۔ آخر نوبت یاس جا رسید کر ہم دونوں بھائی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اگرچہ اس سانحہ پر سے برس برس گزر چکے ہیں۔ لیکن زخم کی سسک ہنوز باقی ہے۔ آٹھویں گرفتاری۔ ایک مخلص مسلمان قومی کارکن کی زندگی کس طرح آگے بڑھتی ہے۔ وہ کیونکر گزر بسر کرتا ہے۔ یہ سوال واقعی جواب طلب ہے۔ مگر جواب کون دے؟ زندہ قوموں کے ورکر جب میدانِ کارزار سے گذرتے ہیں تو ان پر دل سچا اور ہوتے ہیں۔ ان کی بلائیں لی جاتی ہیں۔ ان کے قدم جب تاج شاہی کو روندھنے ہوئے بڑھتے ہیں تو وقارِ سلطنت خاک ہو کر ان کے پاؤں سے چمٹ جاتا ہے۔ لیکن مردہ قومیں اور بے ضمیر افراد ایسی دولت کی توقیر نہیں

سمجھتے۔ ان کی نا سمجھی سے یہ گنجانے گراں مایہ مٹی کے تول تل جاتا ہے۔ اور اگر کوئی اس سودے سے رہ جائے تو اس کی ساری زندگی اپنے آنسوؤں میں سیکھ کے رہ جاتی ہے۔ بھائی کے روٹھ جانے سے شب و روز اتر ہوتے چلے گئے۔ جس آشیانے کی بنیاد تنکوں پر رکھی تھی اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ حادثات روزگار کے باعث ہر گھڑی دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ پیٹ کا مسئلہ تو تھا ہی گھر بلیو ضروریات کی خرید بھی درد سر بن گئی۔ جیسے کیسے ہو سکا حالات سے لڑ جھگڑ کر تعمیر آشیانہ کے لیے بہر طور مزید تنکے فراہم کیے۔ ایسے میں شب عروسی کے خوبصورت لمحات بے مزہ ہو کر رہ گئے۔

مجلس اہل غریبوں کی جماعت تھی۔ یہاں خلوص، قربانی کے سوا کوئی شے نہیں تھی۔ ویسے بھی میرے مسدک کے خلاف تھا کہ میں کسی کے سامنے دست سوال بڑھاؤں۔ اگر کہیں کبھی ایسا ارادہ کیا بھی تو حیار مانع رہی۔

دلہن جو کھاتے پیتے گھرانے سے آئی تھی، میرے گھر سے اسے ایک وقت کی روٹی بھی دشوار ہو گئی۔ ان دنوں امرتسر میں چودھری افضل حق کانگریس کے مقابل انتخاب لڑ رہے تھے۔ یہ ضمنی الیکشن تھا۔ ڈاکٹر کچلو کے خلاف یونینسٹ پارٹی کے شیخ عمر صادق نے عذر داری جیت لی تھی۔ اب کی دفعہ جماعت نے اس سٹیٹ پر شیخ حسام الدین کی بجائے چودھری صاحب کو اپنا نمائندہ نامزد کیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو پنجاب کانگریس نے ٹھکڑ دے دیا۔ یونینسٹ پارٹی کے امیدوار سے مقابلہ تھا۔ (ایک ہی سیاسی عقیدے کے دو مسلمان باہم کیوں ٹکرائے اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں دیکھیے) یہ دن امرتسر میں ہی نہیں پنجاب بھر کیلئے کشمکش کے دن تھے۔ جماعتی مصروفیت کی وجہ سے ہر صبح دفتر ہزار میں چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ بیوی میرے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ میرے آنے پر روکھی سوکھی کھا کر ہم میاں بیوی سو رہتے۔ دن یوں ہی بیتتے رہتے۔

۲۶۔ نومبر ۱۹۳۹ء الیکشن کا آخری دن تھا کہ مجھے امرتسر کو توالی کے سامنے گرفتار کر لیا گیا۔

رفیقہ، حیات کو عمر میں پہلی بار اس صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اس پر ستم یہ کہ وہ عنقریب بچہ کی ماں بننے والی تھی۔ یہ خوف مجھے ہر گھڑی ستانے لگا کہ کہیں اس صدمے سے بچے یا اس کی اپنی جان کو نقصان نہ پہنچے۔ اس خیال میں ایک رات اور دو دن گذرے تھے کہ بیوی اپنی والدہ کے ساتھ

ٹرسٹرکٹ جیل میں ملاقات کے لیے آئی۔ اس کا چہرہ میری گرفتاری کے تاثر سے خالی نہیں تھا۔ اڑھی اڑھی سی رنگت پریشان حالی کی غماز تھی۔ بظاہر اسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ مگر اندر سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ بہت دیر تک ہم دونوں میں گفتگو رہی۔ اس دوران نہ تو اس نے اپنے فاقوں کا شکوہ کیا اور نہ مجھے بہت ہوئی کہ اس سے پوچھوں کہ تم نے یہ دن کیسے گزارے۔ گو اس کی نظر میں بار بار سوال کرتی رہیں مگر میرا دل اس کے سوال کے جواب پر شرمندہ تھا۔ ہنرمیری خوشدامن سے نہ رہا گیا اور یہ بات اس کے منہ سے نکل ہی گئی کہ گھر میں اللہ کے سوا کوئی شے نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس پر فیقہ حیات والدہ پر ناراض ہوئیں، کہ آپ نے ایسا کیوں کہہ دیا۔ میرے پاس خدا کا اور ان کا دیا بہت کچھ ہے۔ مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔

خدا والی بات تو درست تھی اور جہاں تک میرے دینے کا سوال تھا، اس حقیقت کا خود مجھے علم تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنے خالق سے گڑ گڑا کر دعا مانگی۔ اسے جہانوں کے پالنہ بار! میں نے اپنے کو صرف تیری خوشنودی کے لیے مشکلات میں ڈال دیا ہے۔ میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے۔ میری حفاظت کرنا۔ دوسرے دن خواجہ عبدالرحیم عاجز ملاقات کے لیے آئے تو ان سے عرض کیا کہ خدا کے بعد میں گھر کی نگہداشت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

انہوں نے ایک روز جیل میں آکر کہا۔ کل میں نے امرتسر چھوڑ منڈی میں تیرے گھر کے لیے ایک دوست سے تعاون کی درخواست کی۔ اس نے کہا، جاننا زکے پاس تو کافی دولت ہے۔ اس کا حساب تو بینک میں ہے۔ میں نے جب اپنے متعلق یہ سنا تو عاجز صاحب سے کہا کہ اب کسی کے پاس مت جائیے، تاکہ یہ بھرم بھاؤ نہ رہے۔

ایک ہفتہ کے بعد مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ میری فریاد جرم میں ایک جلوس کی رہنمائی کا الزام تھا۔ جس میں فوجی بھرتی کے خلاف نعرے لگانے گئے تھے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ انتخاب کے دنوں نہ تو کوئی جلوس نکلا اور نہ میں نے کسی جلوس کی رہنمائی کی۔ حکومت کا یہ افسانہ چارہ تک بحث کا موضوع رہا۔ آخر مارچ ۱۹۴۰ء کے تیسرے ہفتے سرکاری وکیل کے کہنے پر عدالت نے مقدمہ واپس لے لیا۔

طاہرہ کی پیدائش۔ سو اس کے کہ بیوی کی حالت میں فریق آیا ہو۔ جیل سے واپسی پر گھر کے

ماحول میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ تبدیلی آتی بھی کیا۔ گھر میں رکھا ہی کیا تھا جو تبدیل ہو جاتا۔ البتہ بیوی کی صحت بریاد ہو گئی اور یہ اثرات تازہ سیت رہے۔

رہائی کے کچھ دنوں بعد گوجرہ ضلع لائپور جا حتی حکم کے تحت مقامی میونسپل انتخابات کے لیے جانا پڑا۔ تیسرے دن گھر سے اطلاع آئی کہ میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ یہ مارچ کا آخری دن تھا۔ یہ خبر سن کر مجھ پر اس سی ٹرگنی اور آنکھوں نے ساون بھاووں کا سماں باندھ دیا۔ میں دل برداشتہ ہو گیا۔ میرے آنسو لڑکی کی پیدائش پر نہیں، بلکہ لڑکی کی جو ذمہ داری مجھ پر آن پڑی تھی اس سے میرا دل کانپ اٹھا۔ میں خدا کے خوف سے رویا تھا۔ سفر سے واپسی پر بچی کو گود میں لیا اور خدا سے دعا مانگی کہ

”اے میرے پالنہ دار! اس بچی کی صحت، آبرو سب تیرے سپرد ہیں۔“

اور اس کا نام طاہرہ رکھا۔

ایام مفروضی۔ دوسری جنگ عظیم کے بڑھتے ہوئے شعلے یورپ سمیت ایشیا اور مشرق وسطیٰ کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ جرمن کے بمبار طیارے لندن پر آگ برسا رہے تھے۔ برطانوی حکومت اتحادی طاقتوں کی معیت میں اس طوائی میں شامل تھی۔ اپنی غلامی رکھایا کو بھی اس نے اس آگ میں جھونکنا چاہا۔ ان کے انکار پر تمام ایسے ہندوستانی عناصر کو ۱۹۳۹ء کے آخری دنوں جیل خانوں میں بند کر دیا گیا۔

مجلس احوار نے اپنی قرارداد میں برطانیہ سے ترک تعاون کا اعلان کیا۔ جس پر اس کے تمام رہنما اور کارکن جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ مجلس احوار کے نزدیک ہندوستان کی نجات کے لیے اس سے بہتر کوئی موقعہ نہیں تھا۔ نازی ازم کے سیلاب نے یورپ میں انگریزی قہار کا استقبال محذوف کر دیا تھا۔ ان حالات میں جب صیاد کا دامن اس کے اپنے گل بوٹوں کے خارزاروں سے الجھا ہوا ہوا گلچیں کا قفس کی تیلیاں توڑ کر گھمت باد بھاری کی راہ لینا کوئی دشوار نہیں تھا۔

میرے تمام ہمسفر وقت کا تقاضا پورا کرتے ہوئے مجھ سے کوسوں دور جا چکے تھے۔

ایران آفرنگ کی صدائیں بار بار مجھے میری ذمہ داریوں کا احساس دلا رہی تھیں۔

دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔

خود تاریخ مجھے پکارتی کہ لوہا گرم ہے۔ اٹھو تم بھی ایک ضرب لگاؤ۔ شاید تمہاری قربانی سے اس اندھیرے میں نکھارا جائے۔ لیکن خانگی حالات نے میرے پاؤں بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ میں کسی کروٹ سنبھلنے کے قابل نہیں تھا۔ میں جن راہوں پر سفر کر چکا تھا اس کی تھکان ہنوز باقی تھی۔ پاؤں کے تلوے لہولہان ہو رہے تھے۔ اس پر بھی دل مضطر کی صدا تھی کہ جانبازا وطن عزیز اس جنگ کے بعد آزاد ہو جائے گا۔ تیرے ہمراہی ناسخا نہ لٹھے الاپتے جب گھروں کو لوٹیں گے، تو تیرا ماضی تجھے شرمندہ کرے گا۔

ان دنوں مولانا عبدالکریم مبارک نے امرتسر سے ایک ماہنامہ جاری کر رکھا تھا۔ یہ شعبہ تبلیغ مجلس اہوار کا آرگن تھا۔ میں نے تین سو روپے ماہوار پر اس ادارہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ جنگ کے دنوں ہر چیز گراں تھی۔ یہ قلیل تنخواہ میرے لیے ناکافی تھی۔ تاہم بادل سخاوت سے قبول کر لیا۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں دن بھر رسالہ مذکور کے لیے خریدار فراہم کرتا اور رات کو جنگ کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر ابھارتا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ جنگ کے دنوں فوجی بھرتی کے خلاف عوام کو اکسانا سلطنتِ وقت کا مجرم ہونا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوشاب (ضلع سرگودھا) اور کوڈر (ضلع جالندھر) سے گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ اس پر پنجاب پولیس نے میری تلاش شروع کر دی۔ مجھے اس کی اطلاع جالندھر اور امرتسر کے درمیان سفر کرتے ہوئے ملی۔ چنانچہ احباب کے مشورہ پر پنجاب کو چھوڑنا پڑا اور میں یوپی چلا گیا۔ جماعتی پالیسی کے مطابق سہارنپور سے دہلی، آگرہ، بنارس، بریلی، علی گڑھ، مراد آباد اس طرح سارے صوبے میں قریباً پچاس اجلاسوں میں شمولیت کی اور عوام سے نظم و نثر میں خطاب کیا۔

ایک دلچسپ واقعہ۔ یوپی میں دورہ کے دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

حضرت غالب سے کسی نے پوچھا، آپ کا آموں کے متعلق کیا خیال ہے جو اب میں کہنے لگے۔ بہت زیادہ ہوں اور بہت میٹھے ہوں۔ اپنا بھی یہی ایمان ہے۔ ویسے بھی ام جنت کے بیوہ جات میں شامل ہے۔ جب یہ موسم آتا ہے تو کونل کی میٹھی آواز اس میں مزید رس بھرتی ہے۔ ساون کے برستے بادل جوان تمناؤں میں عجیب کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

مغرب سے اٹھتی ہوئی گھٹائیں زلف یار کی طرح بل کھاتی ہوئی باغوں میں پڑے ہوئے  
جھولنوں کو ہوا دیتی ہیں تو برسات کا یہ موسم دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

یوپی کی مسلسل دھوڑ دھوپ سے تھک ہار کر کچھ دیر ستانے کو جی چاہا تو میں دیوبند  
چلا آیا۔ علمی مرکز بھی ہے اور آموں کی فصل بھی یہاں وافر ہوتی ہے۔ میلوں کے بعد  
ضلع سہارنپور اس فصل کا مرکز ہے۔ شہر کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کی تیاری ہو رہی تھی  
کہ میں مسجد میں پہنچا۔ وضو سے فارغ ہو کر نیت رہا تھا کہ ایک آواز نے چونکا دیا۔  
”حضرات! آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ ہندوستان کے انقلابی شاعر جاتیار مرزا  
مسجد میں موجود ہیں۔ وہ نماز کے بعد اپنا کلام سنائیں گے“

یہ تھے مولانا ضیاء الدین (مولانا مفتی نعیم لدھیانوی کے فرزند اکبر) میران سے زندگی  
میں پہلی بار آنا سامنا ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر اعلان کر دیا۔ اڑتے اڑتے یہ خبر  
شہر اور پھر مدرسہ میں جا پہنچی۔ نا آشناؤں سے بھی تعارف ہوا۔ مدرسہ بڈا کے اساتذہ کی خدمت  
میں حاضری دی۔ مدرسہ کی عمارت اور دوسری تاریخی یادگاریں بھی دیکھیں۔ طلباء سے ملاقات  
ہوئی۔ ہر روز دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آموں کی محفلیں بھی لگیں۔ اسی طرح دو ہفتے گزر  
گئے۔ اب چلنے کا ارادہ تھا کہ طلباء نے دارالحدیث میں آخری مرتبہ مجھ سے میرا کلام سننے کی  
خواہش کی اس لیے خاصہ اہتمام کیا گیا۔ نماز عشاء کے بعد نشست تھی۔

یوپی میں عام طور پر مشاعرہ بیٹھ کر پڑھنے کا رواج ہے۔ اس رسم کے مطابق میں نے بھی  
مصرعہ اٹھایا یہی تھا کہ دارالحدیث کی تمام بنیاں گل کر دی گئیں۔ اس قدر شور ہوا کہ کوئی بات  
سمجھ میں نہ آئی۔ ایک کونے سے ہم نہیں آئیں گے، دوسری طرف سے ہم ضرور سنیں گے۔  
ان آوازوں کے باہم تصادم کے پس منظر میں مدرسہ کی دیرینہ سیاسی کشمکش کا فرما تھی جس  
سے میں ناواقف تھا۔ بنگالی اور یوپی کے طلباء کا ایک گروہ تھا۔ پنجابی اور پٹھان دوسری  
طرف تھے۔ آخر ہاتھ پائی کی نوبت آنے سے پیشتر یہ محفل میرے اعلان پر برخاست  
ہو گئی کہ میں اپنا کلام نہیں سناؤں گا۔

رات پریشانی میں کٹی۔ دیوبند میں میرے قیام کے دوران میرے لیے اپنی نوعیت کا



یہ پہلا واقعہ تھا۔

میرے سیاسی افکار ڈھکی چھپی بات نہیں تھے جس پر طلباء مشتعل ہوتے اور پھر جیب کے گذشتہ نپدھوڑہ میں اس قسم کی کئی محفلوں میں شریک ہو چکا تھا۔ پھر کئی طلباء کی طبیعتوں میں انقلاب کیسا، صبح کی نماز کے بعد ناشتہ کا دسترخوان آراستہ ہو رہا تھا کہ حضرت مولانا اعجاز علی تشریف لائے اور مجھے بے لخت گالیاں دینے لگے۔

مولانا اعجاز علی مدرسہ ہذا کے اساتذہ میں جلالی طبیعت رکھتے ہیں۔ اس پر احباب کا تقاضہ ہوا کہ میں خاموش رہوں۔ چنانچہ وہ غصہ نکال کر چلے گئے۔ پتہ چلا کہ انہیں رپورٹ دی گئی تھی کہ

”ایک داڑھی مونڈے نے رات حضرت شیخ کی مسند پر بیٹھ کر سگریٹ پیے

اور قوالی کی“

ظاہر ہے کہ اس پر غصہ آنا چاہیے تھا۔ مگر حقیقت یہ نہیں تھی۔ نہ تو میں سگریٹ کا عادی ہوں اور نہ ہی مجھے علم تھا کہ یہ شیخ کی مسند ہے۔ جہاں بیٹھ کر حضرت شیخ المسند مولانا حسین احمد مدنی طلباء کو حدیث پڑھاتے ہیں۔ اس پرستم یہ کہ مولانا اعجاز علی سے میرا تعارف نہیں کرایا گیا تھا۔

اس حادثہ کے بعد احباب نے رائے دی کہ مجھے مولانا قاری محمد طیب ناظم دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد عثمانی سے ملاقات کرنی چاہیے، کہیں یہ انساں حقیقت نہ بن جائے۔ اس تجویز پر میں قاری طیب صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی قاری صاحب ازراہ شفقت اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مصافحہ اور محالفر کے بعد فرمایا۔

”مجھے رات اور صبح کی ساری رپورٹ مل گئی ہے۔ اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ ورنہ

یہ بات آگے بڑھ جاتی“

اتنے میں چائے آگئی۔ جیب میں چلنے لگا تو کہا: ”جانے سے پہلے حضرت عثمانی صاحب سے ملتے جانا۔ نیز مناسب ہو تو رات حضرت مدنی دورے سے واپس تشریف لارہے ہیں

ان سے ملنا نہایت اہم ہوگا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی سے ملا تو آپ اس وقت مطالعہ میں مصروف تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو جلدی سے مجھے گلے لگالیا اور پیشانی کا بوسہ لیا۔ "رات ایک اطلاع ملی تھی، کہیں وہ تمہارے متعلق تو نہیں؟ مگر تم نے سگرٹوں کا سلسلہ کب سے شروع کیا ہے۔ مراد آباد کی ملاقات میں تو تم نے کہا تھا کہ مجھے یہ عادت نہیں۔"

حضرت یہ سارا کچھ آپ سے غلط کہا گیا۔ میں اب بھی منشیات سے نفرت کرتا ہوں، اچھا تو اب ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟ "نہیں! حضرت میں آج جانا چاہتا تھا، میری بات کاٹ کر حضرت عثمانی نے فرمایا: "رات شیخ واپس پہنچ رہے ہیں اگر ان سے مل جاؤ تو بہتر ہے۔" بڑے لوگوں کی باتیں بڑھی ہوتی ہیں۔

مجلس احرار بھکواڑہ (ریاست کپور تھلہ) کے کارکن مولوی برکت اللہ (ابجکل رحم یار خان) میں قیام کرتے ہیں، ان دنوں مدرسہ دیوبند کے محاسب تھے۔ ان کے سپرد کیا گیا کہ وہ رات اٹیشن پر پہنچ جائیں اور جیسے ہی حضرت گاڑی سے اتریں، تمام واقعہ ان کی خدمت میں عرض کر دیا جائے۔ پناہ چاہیے ہی ہوا۔ میں خدمت میں حاضر ہوا تو اپنے اخلاق عالیہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف کیا اور فرمایا: "تم احرار والے جہاں جاؤ گے فساد ہی کراؤ گے۔"۔۔۔ خیر صبح چائے میرے ساتھ پی لینا۔ مگر یہ چائے لیڈروں کی سی نہیں ہوگی۔" حضرت میں جیسی پاہوں گا مجھے ملے گی۔"

نماز فجر کے بعد حضرت کے در دولت پر حاضری دی تو شہر کے معززین کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ اس میں مقامی کانگریس کے صدر، مدرسہ کے اساتذہ اور قومی کارکن شامل تھے۔ بعض مجلس احرار کے ایک کارکن کی عزت افزائی تھی یا اس دافع کو دھونا تھا، جو بعض نا عاقبت اندیش طلباء نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مہمان کے دامن پر لگایا تھا۔ نیز دارالعلوم کے استاد سے جو غلطی ہوئی تھی۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ میں اسے حضرت شیخ الہند کی عالی ظرفی کے سوا کچھ نہیں سمجھتا۔

جن کے مرتبے ہیں سوا

نانتے میں یوپی کا انداز تکلف پوری طرح شامل تھا۔ اس سے فارغ ہوتے تو میں

نے حملے کی اجازت چاہی۔ فرمایا: ”ابھی نہیں تمہیں میرے ساتھ مدرسے چلنا ہے“ چنانچہ وہاںوں کو رخصت کرنے کے بعد میں حضرت کی معیت میں مدرسے پہنچا اور حضرت شیخ نے مجھے اپنے ساتھ مسند پر بیٹھنے کا حکم کیا اور خود طلباء کو پڑھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد فرمایا۔ طلباء بار بار اشارے کر رہے ہیں۔ غالباً یہ تم سے کچھ سننا چاہتے ہوں گے۔ لہذا کچھ سنا دو۔ میں نے تعمیل ارشاد پر گزشتہ رات کی ادھوری نظم سنائی۔ حضرت اور طلباء بہت محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد فرمایا: ”اب تمہیں اجازت ہے“ خود دروازے تک چھوڑنے آئے مصافحہ اور معالقبہ کے بعد کان میں فرمایا: ”دل میں کوئی میل لے کر نہ جانا“

اس واقعہ سے مقصود میری پذیرائی نہیں۔ بلکہ مجلس احرار کے موقف کا احترام تھا۔ یا اسے ان لوگوں کے ذاتی کردار کی بلند حوصلگی کہیے۔

یہ دور میرے پختہ شعور سے ماوروی تھا۔ لیکن حضرت شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی مولانا شبیر احمد عثمانی اور قاری طیب نے مجھے جو اعزاز بخشا وہ تمنغہ افتخار ہے جو ہمیشہ میرے دل کی گرامیوں میں آویزاں رہا۔

سرحد کا دورہ۔ یوپی کے بعد میں شمال مغربی صوبہ سرحد چلا گیا۔ پہلا مقام ایبٹ آباد تھا۔ سرحد کا یہ پہاڑی علاقہ موسم گراما کے لیے بہترین فضائی مقام ہے۔ دو ایک روز دستوں سے ملاقات رہی۔ مقامی جماعت نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ عوامی اجتماع کے لیے جامع مسجد کے بعد پنی بارگ موزوں ترین جگہ ہے۔ عام سبک جلسے میں ہوتے ہیں۔ جلسے کی صدارت حکیم عبدالسلام نے کی۔ آپ سرحد کے ممتاز رہنما تھے۔ مزائیت کے خلاف میری نظموں نے جھوٹی نبوت کی عارت ریزہ ریزہ کر دی۔ اس وقت عوام کے جذبات میں طوفان تھا اگر ان کا بس چلتا تو جہنم کی آہٹ سے آہٹ بجا دیتے۔ صحیح اطلاع ملی کہ مقامی حکام کی نیت میرے متعلق درست نہیں۔ چنانچہ یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ نیرواپسی کے لیے لاری کا سفر بھی مخدوش سمجھا گیا۔ بہتر ہے کہ ہویاں ریلوے اسٹیشن تک پہاڑی راستہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ عزلی ملازم کے دو طالب علم میرے ساتھ کر دیے گئے۔ حکیم صاحب دو میل تک راستے کی نشاندہی کے لیے خود ساتھ آئے۔ یہ سفر پچیس میل کا تھا۔ پہاڑی راستے

کے باعث منزل پر پہنچنا تکلیف دہ تھا۔ ہم اسی خود اس سفر کے عادی نہیں تھے۔ صبح ستاروں کی لومیں ہم سفر پر روانہ ہوئے۔ دن کے گیارہ بجے ایک گاؤں پہنچے۔ بھوک اور پیاس سے جان پر بن رہی تھی۔ ایک راہ گیر سے عرض کیا، جو اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے گھر لے گیا۔ باجر سے کی روٹی، شلجم کا اچارسی کے ساتھ پیش کیا۔ گو میں اس خوراک کا عادی نہیں تھا لیکن بھوک کی شدت اور میربان کے خلوص نے ایسا مزہ دیا کہ آج تک اس لذت کی حلاوت محسوس ہو رہی ہے۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ خشک پہاڑوں کے پہروں پر آہستہ آہستہ رات کی سیاہی کے نشان ابھرنے لگے۔ یہ سنگلاخ زمین جسے میں صبح سے روندنا چلا آ رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے کبھی کبھار ایسے لگنے لگا، جیسے اس کا دامن میرے لیے سکرٹنے لگا ہو۔ کہیں ندی نالے راستے کی روک بنتے۔ لیکن میرا عزم دیکھتے ہی اپنی راہ لیتے۔ اب آسمان پر ستارے چمکنے لگے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے فرنگی آئین کے محافظ بہت سے چراغ لے کر میرے تعاقب میں آنکے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندیاں میرا محاصرہ کر رہی ہیں۔ انجانی راہوں پر چلتے ہوئے مجھے سورا گھنٹے بیت چکے تھے۔ جواں بہت اور صحت کی موجودگی نے اس سفر کی تھکان کا احساس نہ ہونے دیا۔ سامنے جو بلیاں کاریلوے سٹیشن دکھائی دیا تو جان میں جان آئی۔ یہاں میری ملاقات ملک خدا بخش سے ہوئی۔ یہ سرحد اسمبلی کے سپیکر تھے۔ میری ان سے یہ دوسری ملاقات تھی۔ پیشتر ازیں ہم کو ہاٹک کے ایک مشاعرہ میں مل چکے تھے۔ ملک صاحب گو آئینی وضع کے آدمی تھے مگر آزادی پسند عناصر سے انہیں محبت تھی۔ اس صوبہ میں ان کا وجود بڑا ہی غنیمت تھا۔ میری اچانک ملاقات پر بہت خوش ہوئے۔ کھانا کھایا اور اپنے صوبے کی سیاسیات پر بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات ہمیں ریلوے سٹیشن میں گزارنی اور دوسری صبح میں پشاور چلا گیا۔

اسی رات چوک یادگار میں جلسہ ہوا۔ ان دنوں متحدہ ہندوستان میں فوجی بھرتی کے خلاف مجلس احرار کی تحریک زوروں پر تھی۔ مفتی سرحد مولانا عبدالقیوم پوپلانی اس جلسہ کے صدر تھے۔ میری سیاسی نظمیوں دوسرے کارکنوں کو زیر تھیں۔ اس وجہ سے عوام میں میرا تعارف تھا۔ لیکن صدر جلسہ نے میرا تعارف پر تکلف انداز میں کرایا۔ نظمیوں پر ہمیں تو مجمع میں ایک قسم کی بناوت

کے آثار ابھرنے لگے۔

دوسرے روز صوبے کے دیگر شہروں کے لیے روانہ ہوا۔ کوہاٹ میری دوسری منزل تھی۔ یہاں کے دوستوں نے سنا تو والہانہ دوڑے آئے۔ شیخ ابراہیم پراچہ، سید مخدوم شاہ بنوری اور میر لالی معروف کارکن آکر ملے۔ ایک رات اور دو دن یہاں قیام رہا۔ پھر بنوں چلا گیا۔ ان دنوں مشہور تھا کہ آزاد قبائل مسافروں کا مال و اسباب لوٹ لیتے ہیں۔ اس بناء پر شام سے پہلے پہلے روانہ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ دن کے دوسرے پہر دوستوں سے اجازت چاہی اور لاری کے ذریعے بنوں پہنچ گیا۔ شہر میں نو وارد کی حیثیت سے کسی سے آشنا نہیں تھا۔ رات کو چونکہ یہاں ٹھہرنا تھا۔ لہذا کھوج شروع کی کہ کوئی ٹھکانا ملے کہ شہر کے ایک بڑے چوک میں جلسہ کا ہتھام ہو رہا تھا۔ لوگ جمع تھے۔ میں بند دکان کے ایک تختے پر بیٹھ گیا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ مقررین نے جی بھر کر حکومت کے خلاف آگ برسائی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے صدر جلسہ کو رقعہ لکھا کہ میں بھی کچھ کہتا چاہتا ہوں اور نیچے اپنا نام لکھ دیا۔ نام پڑھتے ہی صدر صاحب خود مجھے تلاش کرنے لگے۔ لوگ حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ انہیں اپنی تلاش میں آنے دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے اسٹیج پر لے گئے۔ میرے تعارف میں وہ بڑی دیر عوام سے گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں میں نے فوجی بھرتی کے خلاف جماعتی متوقف پیش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں اگلے روز صبح بنوں کی فوجی چھاؤنی میں ایک غیر مسلم دوست سے جو ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ملازم تھا، ملنے گیا تو گیت پر روک لیا گیا اور اسی وقت ایریا کمانڈر کے پیش کیا گیا۔

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

”میرا ایک دوست پنڈت ہری ناتھ یہاں ہے۔ اسے ملنا چاہتا ہوں۔“

چنانچہ مجھے بٹھا دیا گیا اور اسی وقت پنڈت جی کو بلوایا۔ ایریا کمانڈر نے ان سے چند

سوال کیے۔ ہم تھوڑی دیر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور میں واپس چلا آیا۔

کئی دنوں بعد مجھے جالندھر جیل میں اطلاع ملی کہ پنڈت جی کو میری دوستی کے جرم میں

ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

نوں سے اسی روز ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچ گیا۔ یہاں کے عوام سے خاصی جان چچان تھی میری آمد پر جماعتی اجباب نے فوراً جلسے کا اہتمام کر لیا۔ شہر کی مسجد میں نمازِ عشاء کے بعد خاصے لوگ جمع ہو گئے۔ مجلس احوار کی موجودہ پالیسی پر تقریباً ایک گھنٹہ عوام سے گفتگو کی۔ دوسرے روز براستہ دریا خان پنجاب پہنچ گیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ انگریزی قانون کے محافظ شکاری کتوں کی طرح میری تلاش میں ہیں۔ اس کے باوجود میں بچوں کی خیریت دریافت کرنے امر ترس گیا۔ مختصر وقت گھر ٹھہر کر لاہور واپس آ گیا۔ اجباب سے دیگر باتوں کے علاوہ میری گرفتاری پر بھی بحث ہوئی۔ مفردی کے دوران اکثر مقام پر پولیس سے ڈبھٹہ ہوئی۔ مگر کسی نہ کسی طرح میں بچتا رہا۔ ایک دفعہ امر ترس میں ایک مشاعرے میں شامل ہوا کہ پولیس آن پہنچی۔ اب گرفتاری یقینی تھی۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر جو ان دنوں امر ترس میں آئے۔ اوکالج کے پرنسپل تھے، مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ جیسے ہی پولیس میری گرفتاری کے لیے آگے بڑھی۔ تاثیر صاحب نے اسے ایسی ڈانٹ پلائی کہ وہ اپنا سامنے لے کے رہ گئی۔ اس موقع پر محفل میں جو بھگڑ مچی میں اس میں غائب ہو گیا۔ پولیس دروازے پر کھڑی میرا انتظار کرتی رہی۔ مگر میں ہال کے برابر گندے نالے سے ہوتا ہوا اسپیشن پر ادرواں سے گاڑی پر لاہور پہنچ گیا۔

ان دنوں زانا جہان داد خاں امر ترس پولیس کے سٹی انسپکٹر تھے۔ میرے اور ان کے مابین شیخ حسام الدین کی وساطت سے ایک معاہدہ طے پایا کہ میں مفردی کے دوران اگر کبھی گھر آنا چاہوں تو رات کی سیاہ چادر میں چھپ کر اور صبح کے سفید دامن پر میرا سایہ ابھرنے نہ پاتے اس معاہدے پر کافی دیر عمل ہوتا رہا۔

چودھری افضل حق کی وفات۔ پنجاب کی یونیورسٹی گورنمنٹ نے چودھری افضل حق کو ان کی بیماری کے باعث میعادِ امیری سے قبل رہا کر دیا تھا۔ یہ سزا کا موسم تھا۔ ان دنوں دماغ کا مرض اپنے مریض پر شدید حملہ آور ہوتا ہے۔ چودھری صاحب اس مرض میں مدت سے مبتلا تھے۔ جاڑے کے دن اپنے شباب پر تھے کہ ۲۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو نصف رات گئے چودھری صاحب دفتر مجلس احوار لاہور کی بالائی منزل پر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا شد وانا الیہ راجعون۔ اس وقت چودھری صاحب کی فیملی کے علاوہ ڈاکٹر عبد القوی نعمان اور راقم موجود تھے۔

ہم دونوں نے مرحوم کے جسم کو ان کے آخری سفر کے لیے تیار کیا۔ یہ سعادت تھی جو مجھے اس مردِ مومن کے قریب رہ کر حاصل ہوئی۔

مرحوم اپنے وقت کے صاحبِ فکر لوگوں میں سے تھے۔ سیاسیات کے جوار بھاٹان ان کے ہمیشہ مرہونِ منت رہے۔ اپنے سیاسی حریف کی رائے کا چودھری صاحب وزن کرتے اور اسے اپنے سے کبھی کمزور نہ خیال کرتے۔ میاں رفیع حسین سے چودھری صاحب کو زندگی بھر سیاسی اختلاف رہا۔ لیکن جب ان کی موت کی خبر ایک رضا کار نے سکرلتے ہوئے سنائی تو چودھری صاحب نے رضا کار کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ اور خود تیزی سے ٹھہرنے لگے۔ میں قریباً گیارہ برس چودھری صاحب کے قریب رہا ہوں لیکن اس قدر غصے اور افسوس میں اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا، جتنا نہیں اس روز دیکھا۔

دوسری جنگِ عظیم کی خبر سنتے ہی مرحوم چودھری صاحب بچوں کی طرح ناچنے لگ گئے۔ ارد گرد کے لوگ حیران تھے کہ اچھی بھلی باتیں کرتے ہوئے انہیں یکایک کیا ہوا۔ جب اس پر سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اس لڑائی کا انجام خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اب ہندوستان غلام نہیں رہ سکتا۔ آپ کی رہنمائی میں مجلسِ اوزار نے جو فیصلے کیے وہ ماضی کی تاریخ میں مستقبل کیلئے سنگِ میل کی طرح آج بھی راستہ دکھا رہے ہیں۔ کاش سالارِ قافلہ کی وفات کے بعد قافلے کے لوگ تھک ہار کر بیٹھ نہ جاتے۔

چودھری صاحب میرے ایسے کارکنوں کے روحانی باپ تھے۔ وہ ہر ساعت کارکنوں کی نگہداشت کرتے۔ جلسہ میں ان سے تقریریں سن کر خوش ہوتے۔ مگر دفتر پہنچ کر ان کا محاسبہ کرتے کہ یہ تم نے کیا کہا۔ اس کا اثر یہ ہوگا۔ فلاں بات جو تم نے کہی۔ اہل ذمہ اسے یوں مت کہنا۔ بلکہ یوں کہنا۔ حالانکہ مقرر جلسہ میں حوام سے بڑی داد لے کر آتا تھا۔ لیکن چودھری صاحب کے نزدیک سیاسی اعتبار سے اس میں کمزوری تھی۔ اس محاسبہ سے کارکنوں کا حوصلہ بڑھتا۔ افسوس کہ ان کی موت کے بعد جماعت میں اس کا فقدان رہا۔

ادب کی دنیا میں ان کی شخصیت اپنا جواب آپ تھی۔ ان کی تصانیف نے نوجوانوں کو زندگی کی نئی راہیں دکھائیں۔ آپ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو کچھ نہ کچھ کھتے رہنے کی تلقین فرمایا کرتے۔

۱۹۳۹ء میں مجھے امرتسر جیل میں کچھ وقت ان کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا۔ فقط یہ  
اسی کا اثر ہے کہ میں کبھی کبھار چنداٹے بیدھے حروف لکھ لیتا ہوں۔

میری ایک تصنیف پر بحث کرتے ہوئے روزنامہ "امروز" نے لکھا تھا۔

"جانناز مرزا کی تحریر پر چودھری افضل حق کی چھاپ نظر آتی ہے"

یہ حقیقت ہے کہ میں چودھری صاحب مرحوم کی تحریر سے متاثر ہوں میرے ہر موضوع  
کی اٹھان انہی کے طرز نگارش پر ہے۔ حالانکہ مجھے امرتسر جیل میں ان کی رفاقت کے صرف  
چند ماہ میسر آئے۔

میری ایک کتاب تھی (اور میں سنتا چلا گیا) یہ میں نے ۱۹۴۱ء کو راولپنڈی جیل میں لکھی  
تھی۔ رہائی کے بعد جب اس کا مسودہ چودھری صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو بڑے  
خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں اس پر دیباچہ لکھوں گا۔ مگر افسوس کہ زندگی نے انہیں مہلت نہ دی  
تویں گرفتاری۔ ڈیڑھ برس کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد آخر مجھے لاہور جمعیت علماء ہند  
کے سالانہ اجلاس کے موقع پر گرفتار کر لیا گیا۔ تاریخ یاد نہیں۔ شاید یہ وہی دن تھے جب  
جرمن اور جاپان کی فوجیں یورپ اور ایشیا کو اپنے فاتحانہ اقدام سے روکتی ہوئیں آگے

بڑھ رہی تھیں۔ غالباً مارچ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ پولیس کے زیر حراست مجھے جالندھر جیل  
بھیجا گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مقدمہ کی بنا زکوٰۃ و صلح جالندھر کی کوئی پرانی تقریر ہے۔  
جالندھر جیل۔ جالندھر مرزا آبائی وطن ہے۔ دادا مرحوم کے چار بیٹے تھے۔ میرے والد سب  
سے چھوٹے اور لاڈلے تھے۔ قیمتی کاوانغ ان کے دامن پر بھی بچپن میں ہی لگ گیا تھا یہیں  
سے چاروں بھائی الگ الگ ہو گئے۔ ایک کو پہلوانی کا شوق تھا۔ وہ ریاست بروہا میں  
ہمارا جہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ ان کا نام بوٹا پہلوان تھا اور وہیں فوت ہوئے۔ ان سے  
چھوٹے فتح دین تھے جو احمد آباد میں کپڑے کا کاروبار کرتے رہے اور بعد میں حلوانی کا کام  
بھی کرنے لگے۔ انہوں نے وہاں کافی روپیہ پیدا کیا اور اپنی زندگی کے آخری دن جالندھر  
آ کر گداہ سے۔ تا آنکہ۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔



ان سے چھوٹے حاجی کریم بخش تھے، جو والد صاحب کے ساتھ امرتسر آگئے۔ اور یہیں ایک رنگریز کے ہاں ملازمت کر لی۔ محلہ چوہڑ بھیری میں ان کا ذاتی مکان بھی تھا جو ان کی وفات کے بعد ہم دونوں بھائیوں کے حصے میں آیا۔ ان سے چھوٹے میرے والد صاحب تھے، جن کے ہاں چھ بیٹے پیدا ہوئے۔ چار راقم کی پیدائش سے پہلے فوت ہو گئے۔ اور برادر بزرگ دمرزا محمد عبداللہ ۱۹۲۷ء کے انقلاب کے بعد کراچی میں فوت ہوئے۔ اس طرح سے میرا رشتہ جالندھر سے وابستہ ہے۔ آج بھی آباؤ اجداد کی ہڈیاں جالندھر کی خاک سے پیوست ہیں۔ پولیس مجھے جالندھر کی کچھری میں لے کر پہنچی تو بہت سے قریبی عزیز سربراہ مل گئے۔ لیکن میرے جرم کی نوعیت جان کر اپنے مستقبل کے پیش نظر ان سرکاری ملازم رشتے داروں نے میرے ایسے باغی کومنزگانا نامناسب سمجھا۔ ایسے دوست بھی تھے جو اب وکیل بن چکے تھے۔ ان کی تلاش بھی کی۔ مگر کون سنتا ہے۔ عدالت کی ابتدائی کارروائی کے بعد مجھے مقامی جیل میں بھیج دیا گیا۔ اس جیل میں میں آج پہلی مرتبہ لایا گیا تھا۔ جیسے ہی بڑے دروازے میں داخل ہوا۔ سامنے دیوار پر لکھا تھا،

جب تک سانس تبتاں آس!

قیدی کے لیے یہ س قدر مایوس کن الفاظ تھے۔ نہ جانے میری نظر میں بار بار اس موڑ سے کیوں ٹھکراتی رہیں۔ جیسے مجھے کوئی کہہ رہا ہو کہ ساری زندگی کے تار ڈھیلے نہ ہونے پائیں۔ زندگی کا دوسرا نام آس ہے۔ تمام عمارت اسی ایک لفظ پر تعمیر ہے۔ ذرا سی لغزش سے ساری عمارت متزلزل ہو جائے گی۔

اس جیل میں چند کمیونسٹ قیدی بھی تھے، جن سے اکثر مذہبی چھیڑ چھاڑ رہتی۔ یہ سب کے سب بظاہر سکھ مذہب کے پیرو تھے۔ لیکن یہ فریب تھا۔

انہی دنوں لندن سے سرسٹیفورڈ کرسپ برطانوی حکومت کی طرف سے چند شرائط پر بندوستان سے آزادی کا سودا کرنے آئے تھے۔

ایران افرنک کو یقین تھا کہ ان کی بیڑیاں اب ٹوٹ جائیں گی۔ اس لیے وہ جوں تک ہاتھ کھینٹے وقت نہ لڑ گیا۔ آخر یہ وہی عدالتی کارروائی کے بعد مجھے چوداہ قید با مشقت کی زندگی میں لایا گیا۔

دیا گیا۔

جانڈھر سے روانگی۔ مجھ سے سیاسی اختلاف رکھنے والے کیونسٹ قیدی خوش تھے کہ یہ کاٹھیا بھی نکل گیا۔ کیونکہ جب تک میں یہاں رہا یہ دوسرے لوگوں پر اپنا جادو نہ چلا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ میری ان کی اکثر ٹڈ بھڑکتی رہتی۔ سزا کے بعد مقامی حکام نے مجھے لائپور جیل تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چند سپاہیوں کی معیت میں ہتھکڑی اور پٹریاں پہن کر جب میں جیل سے باہر نکلا تو میری نظریں اس مصرعہ سے انہری بار ٹکرائیں۔

جب تک سانس تب تک اس

سوہے کی بو جھل پٹریاں اور کمزور پاؤں۔ اس پر ستم یہ کہ ریلوے اسٹیشن تک پیدل چلنا ہو گا سواہ چلتی نگاہوں نے نہ جانے کن خیالات سے دیکھا۔ پابجواں، موٹا گاڑھے کا کتر پولیس کے زرخے میں جب میں جانڈھر کے بازاروں سے گذرا تو کسی نے کہا چور ہو گا، کسی نے کہا مسالوں کی اولاد ایسی بد معاشیوں میں پکڑی جاتی ہے، کسی نے گرہ کٹ سمجھا۔ بچے تماشہ سمجھ کر ساتھ ہو لیے۔ آشناؤں نے دانستہ منہ پھیر لیا۔ عزیزوں نے راستہ کاٹ کر دوسری طرف رخ کر لیا۔ پیرنگوں نے آواز سے کہے۔ البتہ چند دوست جو واقعہ حال تھے۔ گاڑھی چھوٹنے سے پہلے اسٹیشن پہلے۔ ان میں منور خوری بھی تھے۔

داگر یہ جوان مرگ نہ ہو جاتے تو شاید دوسرے افضل حق ہوتے، بڑے سمجھدار اور مخلص نوجوان تھے۔ کاش موت انہیں کچھ دن زندگی کی فہمت دیتی۔ گاڑھی میں سوار ہوتے وقت احساس ہوا کہ پاؤں میں پٹریوں کے باعث زخم اچکے ہیں۔ اور ان سے خون بہ رہا ہے۔ آج اس واقعہ پر سے کئی برس بیت چکے۔ لیکن زخموں کے نشان پر جب نظر پڑتی ہے تو یوں محسوس ہوتا، جیسے یہ پھر تازہ ہوا ہے۔ گاڑھی لاہور پہنچی یہاں سے لائپور کے لیے دوسری گاڑھی تبدیل کرنا تھی۔ اس دوران فرصت کے چند لمحات مل گئے۔ مرکزی دفتر حرا میں خواجہ عبدالرحیم حاجز کو پیغام بھیجا تو وہ آتی دفعہ اپنے ساتھ کچھ آم لیتے آئے۔ یہ پھل مجھے بڑا مرغوب ہے۔

کچھ اور لوگ بھی ملنے آئے۔ اتنے میں گاڑھی کی روانگی کا وقت ہو چکا تھا۔ اوٹلنے والے ایک لمبے عرصہ کے لیے جدا ہو گئے۔

لائپور جیل۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ شہر کے لوگ کاروبار سے فارغ ہو کر گھروں کو جا چکے تھے، جب ہم لائپور گھنٹہ گھر تک پہنچے۔

بھوانہ بازار سے گذرتے وقت عید باغ میں کچھ بھیڑ دیکھی تو معلوم ہوا، اسٹریٹ لائٹس بج چکی ہیں۔ آج مقامی جیل سے رہا ہوئے ہیں۔ یہ ان کے اعزاز میں جلسہ ہو رہا ہے۔ چند لمحے ٹھہر کر آدمی بھیجا کہ انہیں بلا لائے۔ یہ خبر سارے جلسے میں پھیل گئی اور تمام ہجوم میری طرف اٹھ آیا۔ اسٹریٹ لائٹس نے بتایا کہ مقامی جیل کا انتظام بہت گندہ ہے۔ افسران جیل بڑی بے اعتنائی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ خیر۔۔۔۔۔!

تاروں بھری رات پورے شباب پر تھی۔ جب میں لائپور جیل میں داخل ہوا۔ یہ ایسا وقت تھا، جب قیدی اپنی محدود دنیا کو چھوڑ کر خواب کے سہانے نرے سے رہا ہوتا ہے۔ اس وقت کسی حکومت کا آئین اڑے نہیں آسکتا۔

”آپ کو بستر تو نہیں چاہیے؟“ یہ سوال سارے چھ فرٹ لمبے ایک سیاہ نام وارڈر نے کیا۔ جب وہ میری کوٹھڑی کا دروازہ بند کر چکا۔ مگر میرے پاس اس سوال کا جواب کیا تھا۔ اچھا ہوا کہ اس نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ ع

یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

اس احساس نے میری تنہائی کی ساری عمارت کو توڑ پھوڑ دیا۔ ہم شہر قیدیوں نے میلہ استقبال تو ملی نعروں سے کیا۔ رات کے سناٹے میں یہ نعرے واقعی آرام طلب قیدیوں کی برہمی کا باعث ہوئے ہوں گے۔ لیکن خیر۔ یہ گناہ بھی میرے ہی دامن میں باندھ دیکھئے۔

جس کمرے میں ہم مقفل تھے۔ اس کا رقبہ چھ مربع فٹ تھا۔ اندھیرے اندھیرے میں بہت سے سوال و جواب ہوئے۔ جن کا تعلق جیل حکام کی بے اعتنائی سے تھا۔ اس مختصر کمرے میں اٹھارہ پوٹیکل قیدی تھے۔ اس پر جون کی گرمی۔ کمرے کی کھڑکیاں اس ڈھب سے بنائی گئی تھیں کہ اگر کہیں ہوا کا کڈرہ نہ بھی تو غریب قیدی اسے فائدہ نہ کر سکیں۔ اس رات گرمی کا یہ عالم تھا کہ حشرات الارش اپنی بلوں سے باہر نکل آتے تھے۔ ان کی

تشریف آوری مزید تکلیف کا باعث بنی۔ آخر خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ صورتوں کی جان پہچان اور تعارف کے بعد باہر آئے۔ احاطہ دیکھا جہاں ہماری کوٹھڑی تھی۔ یہاں ایک بھی تو درخت نہیں تھا۔ حالانکہ عام طور پر جیلوں میں درخت ہوتے ہیں، تاکہ مشقت سے فارغ ہو کر قیدی کچھ دیر سستا سکیں۔ لیکن لائپور کی جیل شاید ہمارے ہی دم قدم سے آباد کرنے کی تجویز تھی۔ پانی کانل اس قدر ناقص کہ گھنٹوں انتظار کے بعد کہیں چلو بھر پانی مبتہر آتا۔ ان مشکلات کے پیش نظر جیل حکام کو توجہ دلائی اور مسلسل درخواستیں کیں کہ خدا را، ایک دفعہ معاثرہ کر لیجئے کہ اتنے آدمیوں کے رہنے کی گنجائش اس کمرے میں ہے؛ لیکن کون سنا ہے "طوطی کی صدا نقار خانے میں"۔

برابر ایک ہفتے کی صدائے بے ہنگام کے باعث ہم نے جیل انتظامیہ کے خلاف ایک ایسا فیصلہ کیا جس کے لیے ہم تیار نہیں تھے۔ کیونکہ ہمارا یہ قدم موت کی طرف لے جانے والا تھا۔ یعنی ہم نے بھوک ہڑتال سے اپنے کو ختم کرنے کا عزم کر لیا۔ جب ہمارے اس فیصلے کی اطلاع جیل حکام کو پہنچی تو وہ اس قدر برہم ہوئے کہ ہمارے احاطے کا دروازہ جو کبھی کبھار کھلتا تھا، اس کی آس بھی جاتی رہی۔ آخر چار دن کے بعد پانی کے گھڑے بھی چھین لیے گئے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ موسم گرما اور پھر لائپور۔ ہم مردوں کی طرح ایک دوسرے پر پڑے رہتے تھے۔ ہفتہ بھر کی بھوک ہڑتال کے بعد ہم میں سے اکثر جو میرے ایسے نحیف جسم کے مالک تھے۔ قریباً ختم ہو چکے تھے۔ نبض کی رفتار مدہم پڑ چکی تھی۔ قوت گویا بھی سلب ہو چکی تھی۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو حکام کو بھی اپنی جان کے لالے پڑے۔ انہوں نے اپنے فیصلے پر غور کیا۔ اگلی ہفتی گزرتی گزرتی، ہمارے عزم کے دروازے پر جھک گئیں۔ ہم چاہتے تھے کہ اس سارے واقعہ کو ایک مقدمہ کی شکل میں عدالت تک لے جائیں کہ جیل حکام انسانیت کے کس قدر مجرم ہیں۔ جنہوں نے اٹھارہ آدمیوں کو چھ قسط مرحلہ کوٹھڑی میں جانوروں سے بدتر جان کر بند کیا ہوا ہے۔ مگر ہماری یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی۔ البتہ بارہ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد ہمیں ایک بہت بڑی بیرک دے دی گئی۔ یہ ایسے لوگوں کے لیے مخصوص تھی، جن کے دربار جیل پرنٹنڈنٹ سے بالابالا فیصلہ کر لیا کرتے۔ اس

طرح کا سلسلہ پنجاب کی اکثر جیلوں میں رائج ہے۔

ہماری نئی برک پکر کے بالکل ملحق تھی، جس سے ریڈیو کی آواز اکثر سنائی دیا کرتی۔ یہ ریڈیو جیل سہارا  
گھنٹی کی طرف سے قیدیوں کی تفریح طبع کے لیے لگایا گیا تھا۔  
ہماری اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب قیدی ایک ماہ کے بعد پنجاب کی مختلف جیلوں  
میں تبدیل کر دیے گئے۔

شاہ پور جیل۔ ابھی میری سابقہ سزا کے کچھ دن باقی تھے اور یقین تھا کہ اس دوران دوسرے مقدمہ  
کے لیے مجھے بلا لیا جائے گا، تاکہ سزا ایک ساتھ شروع ہو۔ حالانکہ اسی غرض سے لاہور سے  
شاہ پور جیل میں تبدیل کیا گیا تھا۔ مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حکام جیل کے پاس اس قسم کی  
کوئی اطلاع نہیں۔

شاہ پور جیل کے متعلق مشہور ہے کہ یہاں گذشتہ صدی اللہ کے کسی نیک بندے کی  
بیٹھک رہی ہے۔ گاؤں داؤں نے عقیدت کے طور پر ایک کنواں کھدوا دیا۔ چونکہ اس کنواں  
کی زمین نمکین واقع ہوئی ہے، لہذا پانی نمکین نکلا۔ جب اس کا پتہ مذکورہ درویش کو ہوا تو اس  
نے اللہ سے دعا مانگی اور کنویں کا پانی میٹھا ہو گیا۔ نہ جانے یہ کیسی بات ہے۔ لیکن پانی  
اچھا اور میٹھا دیکھ کر پنجاب گورنمنٹ نے بیمار قیدیوں کے لیے بطور ہسپتال یہ جگہ جیل کے  
لیے منتخب کر لی۔

واقعی اس جیل کا پانی میٹھا اور زود منعم ہے۔ جب مجھے یہاں لایا گیا تو مجھے ایسے دکھ  
کہ میں کسی بڑے باغیچے میں آ گیا ہوں۔ جیل ہی آپ یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں  
جیل پنجاب میں کوئی نہیں۔ یہاں پہنچ کر میری صحت چند دنوں میں اچھی ہو گئی۔ ان دنوں کانگریس کی  
تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کا آغاز ہو چکا تھا۔ پنجاب کے تمام سیاسی رہنما اسی جیل میں نظر بند  
تھے۔ رات گیارہ بجے مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ صبح ہوتے ہی تمام قیدیوں سے انکاب مجھے  
کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ دو دن کی بحث کے بعد باقی سیاسی قیدیوں میں مجھے شامل کر دیا گیا۔  
لالہ بھیم سین سچر، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور میں ایک کیمپ میں تھے۔ مولانا داؤد غزنوی  
ہمارے جرحشن مالک روزنامہ "پرتاب" لاہور اور ان کے دو دنوں کے اجازت سے برابر کے کیمپ میں تھے۔

اس طرح پانچ صد کے قریب سیاسی رہنما یہاں نظر بند تھے۔ حکام جیل سے ہر روز کسی نہ کسی بات پر نوک جھونک رہتی تھیں۔ ڈاکٹر مظہر حسین پرنٹنگ ٹرنٹ جیل بہت حد تک شریف آدمی تھے لیکن سیاسی قیدیوں کی مسلسل آمد اور ان کی بعض ناجائز ضروریات نے ان کے دماغ کو چڑچڑا کر دیا تھا۔ گذشتہ جیلوں میں مجھے سرکاری طور پر (writing) لکھنے پڑھنے کی اجازت تھی۔ مگر ان دنوں سیاسی قیدیوں پر پابندی کے باعث مجھ سے یہ مراعات چھین لی گئیں۔ اب میں صرف پڑھ سکتا تھا، لکھ نہیں سکتا تھا۔ جیل قانون کے مطابق کسی قیدی کو خواہ وہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی جیل حکام کی اجازت کے بغیر کسی قسم کی تحریر کا حق حاصل نہیں۔

گوگھر کے حالات پر لیٹان کن تھے تاہم برادر اکبر کے ایک خط نے ڈھارس بندھائی کہ گھر کے حالات کی کوئی فکر نہ کریں۔ بہر حال بڑے لوگوں کی سنگت میں ایام اسیری گذرتے محسوس نہ ہوتے اتنے ہیں دوسرے مقدمے کی اطلاع بھی ان پہنچی اور اس کی کارروائی بھی شروع ہو گئی۔ خوشاب۔ اس شہر کی تاریخ تو معلوم نہیں لیکن سرگودھا سے دور دریا تے راوی کے کنارے واقع ہے۔ جیسے کرنام سے ظاہر ہے (خوش آب) یہاں کا پانی اچھا ہے اور خاص طور پر مٹی کے برتن مثلاً صراحی اور گھرے تو امرار عموماً موسم گرما میں یہیں سے منگواتے ہیں۔ شہر صاف ستھرا اور ریلوے اسٹیشن سے تھوڑی دور چل کر آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ دریا کے کنارے تک ایک ہی بازار چلا جاتا ہے۔ مکانوں کی ساخت پرانی وضع کی ہے۔

۱۹۴۰ء فروری کے دنوں یہاں ایک تقریر کر گیا تھا۔ یہ مقدمہ اس زمانے کی صدائے بازگشت تھی۔ جب روز اول بطور مجرم یہاں لایا گیا تو تمام احوار دوست ملنے آئے۔ اور مقدمے میں مجھے اعانت کا یقین دلایا۔ اگرچہ یہ علاقہ انگریزی سلطنت کی کھاد سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے میرے ایسے کے لیے ان کے دل میں کیا عزت ہو سکتی تھی۔ تاہم غریب دوستوں کے ساتھ دیا۔ ایک وکیل سے بھی بات لے ہو گئی، محنتانہ بھی ادا کر دیا۔ تاہم اس نے مقدمے، پیروی میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ آخری فیصلے کی تاریخ سرگودھا کی عدالت میں تھی۔ وکیل نے نہ مانا مانا آیا۔ اس کی انتظاریں وقت ضائع کرنا مناسب نہ جان کر میں نے خود اپنے مقدمے پر بحث کی۔ تقریباً گھنٹہ بھر مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتا رہا۔

سیاسی مقتدے کی نوعیت چاہے کچھ ہو۔ قانون اسے مجرم قرار دیتا ہو یا نہ، حکومت کی پالیسی بہر طور سیاسی ورکر کو جیل بھجینے کی ہوتی ہے۔ اور عدالت اس ضابطے کی پابند ہوتے ہوئے قانونی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے ملزم کو مجرم قرار دے دیتی ہے۔ مجھے اس پیشی پر اڑھائی سال قید سخت کا حکم ہوا۔ میں نے عدالت کا شکریہ ادا کیا اور اسی وقت شاہ پور جیل واپس آ گیا۔ یہاں سے چند دنوں کے بعد دیگر قیدیوں کے ساتھ اولڈ سنٹرل جیل متان تبدیل کر دیا گیا۔

لاہور اور ساہیوال کے بعد پنجاب میں اولڈ سنٹرل جیل متان عادی مجرموں کے لیے معروف اور سخت جیل سمجھی جاتی تھی۔ اس جیل کے افسانے عام لوگوں کی زبانی اکثر سننے میں آیا کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کے شروع میں تو یہاں کافی تعداد میں سیاسی قیدی موجود تھے۔ جیل لار کے مطابق مجھے اس روز نمائی کو ٹھہری میں بند کر دیا گیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ تمام دن کو ٹھہری میں تنہا رہتے گذر جاتا۔ بد قسمتی سے اس جیل کے حکام دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ سیاسی قیدی بھی ان کے جال میں الجھے ہوئے تھے۔ - ۲۰ - جنوری کا یوم آزادی اس جگہ سے کا عملی آغاز تھا۔ ایک فریق پرنٹنگ جیل سر دارام سنگھ کی طرف داری میں تھا، جبکہ دوسرا داروغہ جیل سٹریٹ لال کالیہ کے ساتھ تھا۔ یوم آزادی پر جھنڈا لہرانے کی رسم کے وقت کچھ کمیونسٹ نظریے کے لوگ پرنٹنگ جیل کے محاون تھے۔ صبح آٹھ بجے احاطہ نمبر ۳ میں مہاشا خوشحال چند فورسنگ مالک روزنامہ "ملاپ" لاہور کے فرزند سٹریٹس پال نے پرچم کشائی کی رسم ادا کرنا چاہی کہ جیل کے قیدی نمبر دار اور وارڈن مجاہد افسروں کے لاکھیاں لے کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ تمام جیل میں ہا ہا کا رنج گئی۔ ہر بیرک کے سیاسی قیدی خواہ ان کا تعلق اس رسم سے تھا یا نہیں سب کو بلا امتیاز تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس مار پیٹ سے راقم کو بھی چوٹیں آئیں میرے علاوہ سینکڑوں سیاسی قیدی زخمی ہوئے۔ نیز طبی امداد کے بغیر انہیں بیرکوں میں بند کر دیا گیا۔ سردی کے موسم میں اس قدر چوٹیں کھانے کے بعد ہم سب کو دھوپ تاپنے سے محروم کر دیا گیا۔ یہ عمل ایک ماہ تک رہا۔ اس دوران کپڑوں میں جوٹیں پڑ گئیں۔ زخموں سے بو آنے لگ پڑی۔ معمولی چوٹیں بھی خاصے زخم بن گئے۔ ان حالات میں تمام قیدیوں نے فیصلہ کیا کہ اس ظلم کے خلاف بطور احتجاج آج سے ایک وقت کا کھانا ترک کر دیا جائے۔ چنانچہ اس تحریک کا بھی میری نصرت پر

برا اثر پڑا۔

جیل افسران اور قیدیوں کے مابین کھینچا تانی کا یہ سلسلہ مسلسل تین ماہ تک رہا۔ پنجاب کے اخبارات میں جب اس ظلم و جور کی کہانی شائع ہوئی تو بالآخر پنجاب گورنمنٹ نے تمام متعلقہ افسران کو اس جیل سے تبدیل کر دیا۔ ان کی جگہ نئے افسران نے سنبھال لی۔ ان میں بطور سپرنٹنڈنٹ کے ڈاکٹر منظر حسین شاہ بوروا سے بھی تھے جہاں ان کا برتاؤ پولیٹیکل قیدیوں کے ساتھ نہایت اچھا رہا۔

خلخال اور جھٹکا۔ اس سال پنجاب کی یونیورسٹی گورنمنٹ نے سکھوں کا یہ مطالبہ منظور کر لیا کہ سکھ پولیٹیکل قیدیوں کو جیل خانوں میں جھٹکے کا گوشت دیا جائے۔ چنانچہ کانگریس کی ہندوستان چھوڑ دو۔ تحریک کے پولیٹیکل قیدیوں کو عثمان سنٹرل جیل میں اکٹھا کر دیا گیا۔ ان کی کل تعداد غالباً پندرہ کے قریب تھی۔ اس کے مقابل مسلمان پولیٹیکل قیدیوں کی تعداد جو کانگریس کے تحت آئے تھے قریباً تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ ان میں شہزاد آزاد سمبٹر یا لومی سوشلسٹ لیڈر منشی احمد دین کے بھائی، کامرپڈ غلام احمد اور اسی طرح کے دوسرے معروف لوگ تھے۔ راقم مجلس احرار کا واحد قیدی تھا۔ اب یہاں سوال پیدا ہوا کہ واقعی جیل میں جھٹکے کا گوشت دیا جائے یا نہ۔ یہی سوال سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے کیا۔ کیوں بھی جاننا ہوا اس سکھوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں جھٹکے کا گوشت دیا جائے۔ حکومت پنجاب نے بھی اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ آپ لوگوں (مسلمانوں) کو اس پر اعتراض تو نہیں؟

گورنمنٹ کے فیصلے کے باوجود سپرنٹنڈنٹ جیل کا یہ سوال انتظامی نوعیت کا تھا۔ اس پر میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا: ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اپنے منہ سے چاہتے کوئی گندگی کھائے۔ اس جواب پر سکھوں نے میرے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ لیکن اس کی نوعیت اہم نہ ہوئی۔

بیف (BEAF)۔ یوں تو ملتان جیل کے واقعات اس قدر اہم ہیں کہ انہیں زمانہ گزشتہ کی سیاسیات کا آئینہ دار بھی کہا جاسکتا ہے۔ جیل خانہ ایک ایسا مقام ہے کہ یہاں انسان فطرتاً ننگا ہو کر چوراہے میں اکھڑا ہوتا ہے جس سے اس کے اندرونی خدوخال صاف اور واضح نظر آنے لگتے ہیں۔



جھٹکے کے سوال پر کچھ ہندوؤں نے بھی سکھوں کا ساتھ دیا۔ مجھے حیرت ہوئی لیکن ہم مسلمان قیدی وقت کے انتظار میں خاموش رہے۔ نتیجتاً جیل حکام ہمارے رویے سے متاثر ہوئے تاخیر میں بھی انتقام کی سوجھی۔ روہتک کے چودھری محمد حسین میرے ہم نوا تھے۔ باہم مشورے سے ہم نے پرنٹنڈنٹ جیل سے درخواست کی کہ آپ بحیثیت مسلمان جانتے ہیں کہ مسلمان سال میں ایک بار اپنا ایمان تازہ کرنے کے لیے گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ لہذا ہماری مذہبی ضرورت کے پیش نظر ہمیں باہر سے گائے کا گوشت منگوانے کی اجازت دی جائے۔

ہماری اس درخواست پر حکام جیل نے جس طرح جھٹکے کے معاملے میں ہم سے مشورہ کرنا بہتر سمجھا تھا۔ اسی طرح ہماری درخواست کے جواب میں غیر مسلموں سے بھی سوال ہوا۔ لیکن بجائے جواب دینے کے سب کے سب میرے دشمن بن گئے۔ "یہاں فرقہ وارانہ فساد ہو جائے گا اور اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہوگی۔ یہ جواب بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ کچھ ہندو اور تمام سکھ نوجوانوں نے دیا۔ میں نے کہا کہ اس میں فرقہ وارانہ فساد کا کیا سوال ہے۔ یہ تو ہمارے ایمان کی بات ہے اور مذہبی ضرورت کا تقاضہ بھی ہے۔"

ایمان کی تازگی کا یہ سوال ایک ہفتہ بحث کا موضوع بنا رہا۔ اس پر بہت لمبے دے ہوئی۔ آخر بات یہاں ٹھہری کہ اگر سکھ جھٹکا بند کر دیں تو مسلمان اپنا مطالبہ چھوڑ دیں گے؟ ہم نے کہا کہ ہمارا مطالبہ ضد کی بنا پر نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے، جس کی ادائیگی میں ہم کوتاہی نہیں کر سکتے۔"

ہمیں معلوم تھا کہ یہ ایک سازش ہے، جس کی بنا پر ہم سے ایسا کہا جا رہا ہے۔ اگر ہم ذرا سی ٹھوکر کھا جاتے تو سارا معاملہ ہی چوہٹ ہو جاتا۔ مگر ہم اپنے مطالبے پر اڑے رہے جھٹکے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آخر لالہ کیدار ناتھ سہگل اور پرنٹنڈنٹ جیل ڈاکٹر منظر حسین نے فیصلہ کیا کہ جیل میں آئندہ کوئی ایسی چیز نہیں آسکے گی، جس سے کسی فرقے کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔

بہت اچھا صاحب۔ اگر آپ حضرات کی یہی مرضی ہے تو ہم اس سال ایمان تازہ نہیں کرتے۔ آئندہ سال ہی۔ لیکن آپ کے فیصلے پر پھول ضرور چڑھائیں گے۔ اس طر

ہم نے یہ مود پر فتح کر لیا۔

غازی علم الدین اور شردھانند۔ جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہو چکا کہ ان دنوں تان جیل میں ایک ہزار کے قریب پوٹیکل قیدی تھے۔ ان میں کانگریسی سوشلسٹ، کمیونسٹ اور کالی۔ مجلس احوار کی طرف سے صرف میں ہی ایک قیدی تھا۔ میرے متعلق ان سب میں مشہور تھا کہ میں فرقر پرست ہوں۔ حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ میں عمر بھر فرقر پرستی کے خلاف جنگ آزار رہا ہوں۔ لیکن جیل میں میرے دامن پر یہ دافع بھی لگ گیا۔

تان سنٹرل جیل میں عام رواج تھا کہ دوپہر کے بعد تمام سیاسی قیدی اور نظر بند ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے ایک دوسرے احاطوں میں آجا سکتے تھے۔ چنانچہ ایک دن کا ذکر ہے کہ حسب معمول میں احاطہ نمبر چار کے دوسرے کمرے میں پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ سامنے میاہ تختی پر یہ اعلان لکھا ہے کہ آج شام کو سوامی شردھانند ڈسے منایا جائے گا۔

سوامی شردھانند کو دہلی میں غازی عبدالرشید نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

کی توہین کرنے پر قتل کر دیا۔

یہ اعلان اگرچہ کوئی برا نہیں تھا۔ ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی یاد منائے

لیکن یہ مقام اس کے لیے موزوں نہیں تھا۔ کیونکہ یہاں سب کے سب آزادی وطن کے لیے قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے۔ غیر..... میں نے واپس آکر اپنی بیرک کے

سیاہ بورڈ پر غازی علم الدین ڈسے منانے کا اعلان لکھ دیا۔ بس پھر کیا تھا، تمام جیل میں ہڑ

مچ گیا۔ ہندو اور سکھ بار بار میری بیرک میں آتے۔ آخر یہ بات سپرنٹنڈنٹ جیل تک جا پہنچی۔ وہ

بھی ادھمکے دیکھ کر بھی جانبازا! آج یہ نئی شرارت کیا سوچی؟ میں نے سپرنٹنڈنٹ کا ہاتھ پکڑا اور

انہیں بیرک نمبر چار میں لے گیا۔ جیل کے ہندو، سکھ بھی اس بیرک میں جمع ہو گئے۔ سپرنٹنڈنٹ نے

بیرک والوں سے سوال کیا کہ سوامی شردھانند ڈسے کا اعلان کس نے لکھا ہے۔ اس کی ذمہ داری

کسی نے قبول نہ کی۔ جب اس تحریر کا کوئی وارث نہ بنا تو وہ تحریر مٹا دی گئی۔ میں نے اپنی بیرک

میں پہنچ کر اپنا تحریر کردہ اعلان مٹا دیا۔ اس واقعہ کے بعد جیل میں گو میرے خلاف ہندوؤں

سکھوں میں اچھی خاصی نفرت پھیل گئی۔ تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس سے انتقام کا

خزیر پیدا ہوتا۔

کرشن کا جہنم دن۔ جیل میں ہر فرقہ کے لوگ اپنے مذہبی بزرگوں کا تہوار مناتے۔ گورو نانک کے جہنم دن پر مسلمان اور ہندو اپنا تمام راشن سکھوں کے حوالے کر دیتے۔ اسی طرح مسلمانوں کے کسی مہوار پر اپنا راشن مسلمانوں کو دے دیتے۔ دن بھر جلسے اور کھانے پینے کی ہنگامہ رانی میں گذر جاتا۔ اس طرح قیدی ایک میدا مناتے۔ چنانچہ کرشن جی کا جہنم دن بھی آیا۔ اس موقع پر باہر سے مٹھائی اور پھلوں کا انتظام بھی کیا گیا۔ اس جلسہ میں راقم کو بھی دعوت تھی۔ میں نے بہت کہا کہ مجھے نہ بلائیں۔ اور کئی مسلمان قیدی بھی تو یہاں ہیں۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہیں۔ لیکن وہ بضد رہے۔

ان دنوں میں قرآن کریم اور فارسی پڑھ رہا تھا۔ ابوالفضل فیضی کی گیتا میرے فارسی سبق میں تھی۔ جیسے جیسے میں نے گیتا کا مطالعہ کیا۔ مہاراج کرشن کی زندگی میرے سامنے آتی گئی۔ اس سے پیشتر میں نے کرشن کو ایسی تصویروں میں دیکھا تھا جو پنواٹھی کی دکان پر آویزاں ہوئیں۔ لیکن گیتا کے کرشن اور تصویروں میں نمایاں فرق تھا۔

میں نے ہندو قوم کے سمجھدار طبقے کو خطاب کرتے ہوئے کہا: آپ ہی بتلائیں کہ کسی اوتار کی زندگی ایسی ہو سکتی ہے کہ تالاب میں عورتیں نہا رہی ہوں اور ان کے کپڑے اٹھا کر کرشن جی مہاراج درخت پر بیٹھ کر بالنسری سجائیں۔ کوئی سطحی درجے کا آدمی بھی ایسی غیر شرمناک حرکت نہیں کر سکتا۔ لہذا ایسی تصویریں بنانے والے مہاراج کرشن کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں نے ہندو نوجوانوں سے اپیل کی کہ آپ رہا ہو کر جہاں کہیں ایسی تصویریں دکھیں انہیں ضائع کر دیں۔

اس تقریر کا فوری اثر یہ ہوا کہ سناتن دھرمی اور آریہ سماجیوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ کیونکہ آریہ مورتی کھنڈن (توڑنا) کے حامی ہیں۔ اور سناتنی مورتی پوجا کے قائل۔ ان دونوں میں خوب جھگڑا رہنے لگا۔ اگر ایک گروہ میری تعریف کرتا تو دوسرے کے خیال میں میں مجرم تھا۔

مختصراً یہ قضیہ دیر تک چلتا رہا۔ اور دونوں گروہ ایک دوسرے کے دشمن رہے۔

اس طرح کے اکثر واقعات ان دنوں رونما ہوئے کہ میں دل برداشتہ ہو کر جیل سے نکلا۔ مجھے سیاسیات سے کچھ نفرت سی ہونے لگی تھی۔ یہاں جو باتیں سننے اور دیکھنے میں آئیں وہ جیل سے باہر نہیں تھیں۔

(جاری)



## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

میرا اور آپ کا تاریخ ماضی سے متعلق سلسلہ کلام جون ۱۹۳۲ء کے اختتام پر منقطع ہوا تھا۔ آئیے اس نشست میں گفتگو کو آگے بڑھائیں۔

ہندوستان کی متحارب اور ہم آہنگ سیاسی جماعتیں ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے پیشتر اپنی جگہ بطور رہنمائی امسال انتخاب میں مصروف تھیں۔ گو اس اکھاڑے میں کوئی جماعت براہ راست اپنے لیبل سے شامل نہیں تھی تاہم ان کا وجود اس بات کا غماز تھا کہ وہ گزشتہ دور سے متحک ہار کر لچھویر کے لیے سستا نا چاہتی ہیں۔ یہاں تک کہ جس اصرار نے بھی سنٹرل اسمبلی کی ایک سیٹ کے لیے اپنا میدوار (مسٹر خالد لطیف گایا) نامزد کر دیا۔ مگر اس پر بھی وہ ریاست کپور تھلہ کی تحریک آزادی میں برابر شریک رہی۔ چنانچہ ۳ جولائی ۱۹۳۲ء کو امرتسر میں مرکزی اصرار و گنگ کیمٹی کا اجلاس ہوا جس میں ۱۲ جولائی کو یوم کپور تھلہ منانے کا فیصلہ کیا۔ نیز اس اجلاس میں چودھری عبدالعزیز چوگڈ گزشتہ ہفتہ سے بھوک ہڑتال پر تھے، اعلیٰ دکان اظہار کیا گیا اور راجہ کپور تھلہ پریس میں برقی پیغام کے ذریعے زور دیا گیا کہ وہ فوراً وطن پہنچ کر ریاست کے حالات پر قابو پائیں۔

ہٹلر پر تو اعلانِ حملہ  
پڑا شایبوں میں انصاف کر دیا۔ بروز کا آفتاب برطانیہ میں کسی نئے  
انقلاب کی اطلاع دینا۔ تو اسم یورپ نازی سیلاب سے بے خبر یا نامل نہیں تھیں۔ جیسے  
۶ جولائی ۱۹۳۲ء لندن کے اخبارات نے جن میں لندن ٹائمز بھی شامل ہے یہ خبر علی عنوان  
سے شائع کی:

ہٹلر کے خلاف بغاوت اور اسے قتل کرنے کی سازش زور پکڑ رہی ہے۔

جرمن کی کمیونسٹ پارٹی کو اس سازش کا سرغنہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سے پیشتر  
۲۔ جولائی کی ایک اطلاع میں کہا گیا تھا کہ برلن کی سیاہ پوش فوج کے طوفانی  
دستوں نے شہر کے مختلف مقامات پر اچانک چھاپے مار کر نازی پارٹی کے  
بعض ذمہ دار افراد کو گرفتار کر کے انہیں سرعام گولی مار دی گئی۔ ان پر  
پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کا الزام تھا۔

لندن میں ہٹلر کے خلاف یہ پراپیگنڈہ عام کیا جا رہا تھا کہ وہ ولیم قیصر کو  
دوبارہ جرمن کا بادشاہ بنا رہا ہے۔

حالانکہ ہٹلر متعدد بار اس کی تردید کر چکا ہے، مگر جرمن عوام کو ہٹلر کے خلاف بغاوت  
پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔

اس پر ۱۸ جولائی کو ہٹلر نے اپنے ایک بیان میں کہا:  
"میری طوفانی فوج نے جن افراد کو قتل کیا ہے ان میں کچھ یہودی و بالشیویک  
حالات کو خراب کر رہے تھے۔ انہیں عین موقع پر جیکہ وہ بغاوت اور انقلاب  
کا علم بلند کرنے والے تھے، بجلی کی سی تیزی سے جالیا اور ان کے تمام سرغنہ کو  
موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔"

کانگریس کو احرار کا جواب | سیاست یورپ کی ہو کر ایشیا کی اپنے طریق کار  
میں کوئی اختلاف نہیں رکھتی۔ اس کے اصولوں  
میں ہے کہ اپنے حریف کے خلاف جھوٹ کی نیوایسے اٹھاؤ کہ عمارت کے مکمل ہونے تک  
اس کی سچائی پر شبہ نہ ہو سکے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسی سیاست کو ماضی میں بڑا دخل رہا  
ہے۔ خصوصاً ہندو اس فن سیاست میں ماہر تھا۔

۱۲۔ جولائی کے اخبار روز نامہ "ملاپ" نے اپنے ادارتی کالموں میں قارئین کو یہ تاثر دیا کہ:  
"پنجاب کے کانگریسوں کی ایک جماعت مجلس احرار کے ساتھ درپردہ سازش  
کر رہی ہے کہ احرار کو سیشن کالاج دے کر اس پر آمادہ کیا جائے کہ اگر وہ کانگریس  
کے ساتھ مل جائیں تو انہیں پنجاب میں سیشن اور دوسرے عملدوئے جائینگے"

اس سلسلہ میں اور بھی نئی باتیں بیان کی گئیں۔ جس کے جواب میں احرار نے جنرل سیکرٹری مولانا مظہر علی اظہر نے ایک واضح پریس بیان دیا:

”میں عوام کی اطلاع کے لیے صاف صاف اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ مجلس احرار اپنا کوئی نمائندہ موجودہ انتخاب اسمبلی یا آئندہ انتخاب کونسل میں کانگریس کے ٹکٹ پر مہینے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ اس بات کو اپنی توہین سمجھتی ہے کہ کوئی کانگریسی اسے کسی قسم کا کوئی لالچ دے کر خرید سکے۔“

اخبار ”ملاپ“ کے نامہ نگار کو معلوم ہونا چاہیے کہ احرار کا رکن نہ تو کسی عہدے کے لیے بھوکے ہیں اور نہ انہیں کسی دوسرے لالچ سے مرعوب کیا جاسکتا ہے۔ انہیں صرف اپنے خدایا پر بھروسہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ مجلس احرار ایسی باوقار جماعت کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا ذلیل ترین حرکت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک طرف تو کانگریس پر مہاسہ جانی چھاپ گئی ہوئی ہے۔ اس لیے مہاسہ جاکے اصولوں سے ہمدردی رکھنے والے نام نہاد کانگریسیوں سے کانگریسی امیدوار کا منتخب ہونا پسند نہیں کرتے جو مہاسہ جاسے تھوڑا بہت بھی اختلاف رکھتے ہوں۔ دوسری طرف وہ مسلمان ہیں جو محض ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے اپنی قوم پرستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ انہیں خوف ہے کہ کہیں لبرل کثیر تعداد میں آکر ان کی پوزیشن کو کمزور نہ کر دیں۔“

مہاسہ جانی کانگریسی اور ہندو نواز مسلمانوں کو یقین رہنا چاہیے کہ مجلس احرار کانگریس کی سیاست میں الجھنا پسند نہیں کرتی۔ لہذا انہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ احرار کا رکن کو فقط مجلس احرار کا کارکن ہونا ہی اس کی بڑی عزت ہے وہ کانگریس کا فارم پرکے کوئی اعزاز حاصل کرنا پسند نہیں کرتے۔ نہ ہی اس کی کوئی ضرورت سمجھتے ہیں۔“

ان دنوں کانگریسی رہنما مہاتما گاندھی لاہور میں تھے۔ مجلس احرار کی طرف سے آئندہ الیکشن میں سنٹرل اسمبلی کے امیدوار

گاندھی جی کے نام خط

مشر خالد لطیف گابا نے انہیں ۱۵ جولائی کو ایک خط لکھا۔

پیارے ماتما جی!

آداب عرض۔ میں اس سے پیشتر ۶ مئی ۱۹۳۳ء کو بھی ایک گزارش کر چکا ہوں کہ اگر آپ اچھوتوں کا احترام چاہتے ہیں تو اس کے لیے اسلام کے بغیر دوسری کوئی جگہ نہیں۔  
آپ کا

خالد لطیف گابا۔ ایڈووکیٹ لاہور

گاندھی جی نے گزشتہ سال سے اچھوتوں کو ہندو جاتی کے برابر سیاسی مقام کے لیے تحریک شروع کر رکھی تھی۔ لیکن ہندوؤں کا ایک طبقہ (سناٹن دھرمی) اس کے سخت خلاف تھا۔ وہ گاندھی جی کی تمام مساعی کے باوجود اچھوتوں کو نہ تو اپنے کتوؤں سے پانی بھرنے دیتا اور نہ ان پر مہگوان کے درشنوں کے لیے مندروں کے دروازے کھولتا۔

چھوڑ کر کے قریب ہندوستان میں اچھوتوں کی آبادی گاندھی کی تحریک اچھوت اڈھار اور اس پر ہندوؤں کے طرز عمل سے پریشان تھی۔ درپردہ یہ سیاسی تحریک تھی جس سے ہندوؤں کی تعداد میں اضافہ مقصود تھا۔ اس دور میں ہندوؤں کو تو انہیں گنا جاتا ہے۔ مجلس احرار نے ان دنوں گاندھی کی اس تحریک کے مقابل تبلیغ اسلام کی ملک گیر کانفرنس شروع کر رکھی تھیں۔ خالد لطیف گابا کا گاندھی کے نام خط اس سلسلے کی اہم کڑی تھی۔ گاندھی جی نے گو اس خط کا جواب نفی میں دیا۔ مگر ان دنوں کے اخبارات نے مجلس احرار اور گابا کے خط کو بڑی اہمیت دی۔

ہندوستانی ریاستوں میں شخصی وقار کے مسئلے نے راج اور وزیر اعظم کی علیحدگی کا مطالبہ راجا کے ابین ایسے قضیے کو جنم دیا کہ اس آگ میں راج سنگھاسن اور فقیر کی جھونپڑی ایک ساتھ جلنے لگی۔ نشاط انگیز زندگی گزارنے والے راجپوتوں کے رئیس منوک الحال راجا کے معاشی حالات سے اس قدر غافل تھے جس قدر انہیں اپنی ماؤ کا نہ زندگی کا علم تھا۔

کشمیر اور راولپور کے بعد ریاست کپور تھلہ کے عوام بھی اپنے پیدائشی حقوق کے حصول میں



گزشتہ دو سال سے مصائب بھیل رہے تھے۔ فرما زوائے ریاست سال کا تین چوتھائی پیرس میں گذارتا اور ریاست کا نظم و نسق ان کے وزیر اعظم دیوان سر عہد الحمید کے حوالے رہتا۔ برطانوی خطاب یافتہ کی حیثیت سے سر عہد الحمید ریاستی پالیسی کو انگریزی کی خواہش اور نیت پر چلاتے۔ انہیں نہ تو ریاست کے امن کا پاس تھا اور نہ رعایا کی تکلیف کا احساس۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے ہمارے اگر کبھی رعایا کو مطمئن کرنا چاہا، تو وزیر اعظم نے محض اپنے وقار کا مسئلہ بنا کر سارے نعتیہ پر سیاہی پھیر دی۔

چودھری عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کا بار بار جیل خانوں میں ڈالے جانا اس کے سوا کوئی بنیادی بات نہیں تھی کہ چودھری عبدالعزیز ایسے لوگ جیل میں بالآخر بھوک ہڑتال پر مجبور ہوتے ان واقعات کی موجودگی میں صدر آل انڈیا مجلس احرار مولانا جلیب الرحمن نے ۱۳۔ جولائی ۱۹۳۲ء کو برقی پیغام کے ذریعے ہمارے ہمارے کو پیرس میں مطلع کیا کہ۔

”چودھری عبدالعزیز کے ساتھ جیل میں جو سلوک کیا جا رہا ہے اس کے پیش نظر انہیں تمام دن دھوپ میں کھڑا رکھا جاتا ہے۔ کھڑی ہتھکڑی، پاؤں میں ہڈیاں ڈال دی گئی ہیں۔ پھر جبکہ وہ کئی دنوں سے بھوک ہڑتال کیسے ہوئے ہیں۔ یہ سارا کچھ وزیر اعظم کی پورے تھلے اپنے ذاتی انتقام کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔“

اگر چودھری عبدالعزیز کی موت جیل میں واقع ہو گئی تو اس کی تمام ذمہ داری ہمارے سر ہوگی۔ نیز ریاست کے حالات میں مزید ہرجان پھیل جانے کا خطرہ ہے۔ بلائے نوازش اس پر فوراً توجہ دیں۔ نیز وزیر اعظم کی پورے تھلے کو ان کی موجود ریاستی ذمہ داریوں سے فوراً الگ کر دیا جائے اور چودھری عبدالعزیز کو فوراً رہا کیا جائے۔“

اس کی ایک نقل تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ وزیر اعظم کی پورے تھلے کو بھیجی گئی۔ جو منسب ذیل ہے۔

”چودھری صاحب کے ساتھ جیل میں سخت انسانیت سوز سلوک اور مسلمانان ہند اضطراب انگیز مٹکا ہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ سلوک مسلمانان ہند کے لیے سخت ناقابل برداشت ہے۔“

عام طور پر اس سلوک کی وجہ یہ بیان کی جا رہی ہے جو آپ کو چودھری صاحب کے  
 کے خاندان سے ذاتی طور پر ہے۔ آپ اسی دشمنی کی بنا پر ان سے انتقام لے رہے  
 ہیں۔ ایسے حالات میں انہیں دھوپ میں کھڑی ہتھکڑی لگا کر تمام دن کھڑا رکھا  
 جا رہا ہے۔ نیران کے عزیز واقارب کو ان سے ملاقات کی اجازت بھی نہیں دے  
 رہے۔ اس طرح تھرکیس کے دوسرے قیدیوں سے بھی جیل خانوں میں بہت برا  
 سلوک کیا جا رہا ہے۔ ان کو اٹھارہ سیر گندم پینے کو دی جاتی ہے اور انہیں تنہائی  
 کوٹھڑی میں رکھا جا رہا ہے۔ ان حالات و واقعات میں اگر کوئی جان منائح ہوئی  
 تو آپ اور آپ کی کونسل کی ذمہ داری ہوگی۔“

**یوم کپور تھلہ** | ۱۲۔ جولائی کو ملک بھر میں مجالس احوار نے یوم کپور تھلہ منایا۔ اسی دن لاہور  
 کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے چودھری افضل حق نے کہا:

”مجلس احوار کانگریس کی طرح کوئی امیر جماعت نہیں۔ پریس والوں کی حالت یہ  
 ہے کہ ہمارے اشتہار تک شائع کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں  
 مجلس احوار کی مجبوریوں کا آپ خود ہی اندازہ کریں۔ حالانکہ سلطان پور کا واقعہ  
 جلیانوالہ باغ کے بعد دوسرا عظیم حادثہ ہے۔ لیکن ایک آدھ مسلم پریس کے  
 علاوہ کسی کو توفیق نہیں ہو سکی کہ اس پر احتجاج کرے۔ ایسے حالات میں غریب  
 جماعتیں کیا کریں۔ اس کے باوجود ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ انتہائی مجبوریوں سے  
 بھی کپور تھلہ کی مظلوم رعایا کو انصاف دلانے کے لیے سلسلہ جدوجہد کی جائیگی۔  
 مجلس احوار کے نمائندے ۲۱-۲۲ جولائی کو امرتسر میں اکٹھے ہوں گے۔“

امید ہے وہاں مستقل پروگرام وضع کیا جائے گا۔“

**گاندھی جی کا اعتراف** | ایک ہفتہ لاہور میں قیام کے بعد گاندھی جی نے ۱۵۔ جولائی  
 ۱۹۳۲ء کو روانگی کے وقت اخباری نمائندوں سے گفتگو کے

دوران اس بات کا واضح اقرار کیا کہ:

”کمیشنل ایوارڈ کی تیغ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر مشکل ہے۔ اس سے پہلے

قطا بس ابیض کو مسترد کرنا ممکن نہیں۔“

**جیل وارڈز کی علیحدگی** | تحریک کے دنوں کپور تھلہ سنٹرل جیل کے ارد گرد سرکاری طور پر سخت انتظامات تھے۔ ایک فرلانگ تک خاردار تاروں کا جھنڈا

اور فوج متعین تھی تاکہ جیل میں سیاسی قیدیوں پر سختی کی کوئی خبر باہر نہ جاسکے اور نہ ہی باہر کی کوئی اطلاع جیل میں پہنچے۔ عزیز واقارب سے ملاقات کے تمام حقوق چھین لیے گئے تھے ایسے سخت مہول میں سنٹرل جیل کے ہیڈ وارڈر محمد علی نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا وہ چودھری عبدعزیز کا ایک خط قرآن کریم میں چھپا کر باہر لے آیا۔ جس میں وہ تمام واقعات درج تھے جس کی بنیاد پر صدر ایوان نے حجاز کو پیرس میں اطلاع دی اور وزیر اعظم کی علیحدگی کا مطالبہ کیا۔

یہ راز کسی طرح فاش ہو گیا اور ۱۶ جولائی کو ہیڈ وارڈر محمد علی کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔

**سزاخانوں کا مطالبہ** | انسان پر یہ الزام روز آفرینش سے عائد رہا ہے کہ اقتدار کی ہوس نے اسے اکثر بندیوں سے گرا دیا ہے۔ بادشاہوں کو اگر سلطنت ملی

ہوس رہی ہے تو ان کے خواجہ تاش بھی اپنے پاؤں چادر سے باہر تک پھیلانے میں کمی نہیں کرتے رہے۔

غیر ملکی اقتدار نے اپنی ہوس کے جھولنے میں ایسے افراد کی ہمیشہ پاناکھی جنہوں نے ہندوستان کے علاوہ قدرتِ اسلامیہ کے مفاد اور ضرورت کو اپنی اغراض کے تابع رکھنا چاہا۔ غیر ملکی غلامی کے دو صد سال ایسے عناصر کی نشاندہی میں جیل نہیں ہیں جن کے سخت فرنگی کے پائے بنے رہے۔

سزاخانوں مرحوم گزشتہ صدی کی مسلم سیاست میں نمایاں حیثیت کے مالک رہے۔ لیکن ان کی رائے کبھی بھی غیر ملکی حکمرانوں سے جدا نہیں ہوئی۔ خصوصاً مسلم لیگ کی سیاسی سیاست (محمد علی جناح قائد اعظم کی آمد سے پیشتر تک) انہی کی آباؤ بڑھائی سے وابستہ رہی۔

دنیاوی جاہ و جمال کے سورج نے زندگی سے موت تک ان کا گھر ہمہ قسم آرائش سے مزین رکھا۔ اس پر بھی بحیثیت انسان انہیں اقتدار کی ہوس باقی رہی۔

۱۸۔ جولائی ۱۹۳۴ء کی شملہ سے آمد اس خبر کو ۲۰۔ جولائی کے روزنامہ ”القلاب“ لاہور

نے اس طرح شائع کیا۔

۱۰ شملہ اسمبلی میں ایک سوال کے دوران سٹر گیا پر شاد نے فارن سیکرٹری سے دریافت کیا۔ آیا اس بات میں کوئی حقیقت ہے کہ سر آغا خان نے حکومت برطانیہ سے درخواست کی ہے کہ مجھے (سر آغا خان) ہندوستان کا کچھ علاقہ مرحمت فرمایا جائے۔ کہ میں اپنی (برطانوی) خدمات کے صدقے میں اس پر حکومت کروں۔“

اس کے جواب میں سٹر ٹڈ کاف فارن سیکرٹری نے کہا:-

”ہنر ہائی ٹیس سر آغا خان کی طرف سے ایک خفیہ مکتوب برآمد ہوا تھا لیکن

حکومت اس کی تفصیل بتانے سے معذور ہے۔“

اس ضمن میں سر محمد یامین کی کتاب ”نامہ اعمال“ کے حصہ اول کے ص ۵۷ کی یہ عبارت

بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

”۲۶ جولائی (۱۹۳۲ء) اسمبلی میں یہ دن بڑا مزیدار دن تھا (یعنی غیر سرکاری

ریزولیشن کا دن تھا) بحث کرتے ہوئے لال چند نول رائے ممبر سندھ نے

سوال اٹھایا کہ سندھ کو صوبہ مہجی سے جدا نہ کیا جائے۔ اور کیا یہ افواہ گرم ہے

کہ سر آغا خان کو سندھ کا بادشاہ بنایا جا رہا ہے۔ اس سے سندھ میں بے چینی پھیل

گئی ہے۔ اس لیے کسی حصہ صوبہ کو اس سے جدا نہ کیا جائے۔

اس کا جواب سر محمد یعقوب نے دیا۔ کہ آغا خان کا نام کیوں لیا اور اس

کو بدتمیزی بتایا۔“

مندرجہ بالا خبروں سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ رازداران افرنگ نے اسی سن

میں ہواؤں کے سڈخ بھانپ لیے تھے کہ آج نہیں تو کل غیر ملکی آقا متحدہ ہندوستان سے

اپنا پستانہ اٹھا کر رخصت ہونے والے ہیں کیوں نہ اپنی محنت کا پھل مانگ لیا جائے۔

پھر خدا جانے انہیں دھیان رہے یا نہ رہے

مسلم لیگ اور ملت اسلامیہ کے عنوان پر سر آغا خان نے گزشتہ ربع صدی تک

مسلمانوں کے لیے بظاہر جو کام انجام دیا اگر اس میں حقیقت ہوتی تو سر آغا خان بظاہر سے

اپنی خدمات سمجھ کر اس کا صلہ نہ مانگتے یا پھر بجائے اپنے اقتدار کے انگریزوں سے متحدہ ہندوستان

کا کوئی خطہ زمین مسلمانوں کے لیے حاصل کرتے یا کم از کم محمد علی جناح کی ماں میں ماں ملاتے مگر ذاتی اقتدار کی خواہش نے انہیں اجتماعی نیکی سے محروم رکھا۔

**ہمارا جہ کا جواب** | صدر مجلس احرار نے ۱۳۔ جولائی ہمارا جہ کی پورے تھلہ کو ریاستی تحریک اور پودھری عبدالعزیز سے متعلق جو تارپرس میں دیا تھا اس کا جواب ۱۹۔ جولائی کے مسلم اخبارات نے شائع کیا۔

”ہمارا جہ نے اپنے حکام کو ہدایت کی ہے کہ پودھری عبدالعزیز کو جیل میں عام قیدیوں کی طرح رکھا جائے اور ان پر سختی کی جائے کیونکہ انہوں نے گزشتہ دو سال سے ریاست میں جو انقلابی تحریک شروع کی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے ریاست کے وقار کو سخت نقصان پہنچا ہے“

**آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس** | ہمارا جہ کا جواب کسی فرمانبردار کا جواب معلوم نہیں دیتا۔ ان الفاظ میں غصہ اور انتقام

کی بڑھتی۔ حکمران رعایا سے ذات کے لیے نہیں اصول پر ٹھکرتے ہیں۔ احرار کو اس پر شبہ تھا کہ یہ جواب پریس سے نہیں بلکہ خود سامنتہ ہے اور اس خبر کا مرکز پور تھلہ ہے۔ پناچہ احرار ورکنگ کمیٹی کے سامنے سب سے اہم ہی مشتبہ خط تھا جس کی اشاعت گزشتہ روز کے اخبارات میں کی گئی تھی۔

امرتسر منقہہ اجلاس کی صدارت ولانا حبیب الرحمن نے کی۔ اس اجلاس میں پہلے آئندہ سال کے لیے عمیدیوں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔

صدر۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی۔ نائب صدر۔ پودھری افضل حق اور پودھری عبدالعزیز۔ سیکرٹریز۔ مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا منظر علی اظہر۔ خازن۔ ڈاکٹر عبدالقوی (لاہور)۔ سالانہ جیوش احرار۔ شیخ حاتم الدین منتخب ہوتے۔

اس اجلاس میں احرار کی آل انڈیا حیثیت کو مزید وسعت دی گئی۔

پنجاب : ماسٹر محمد شفیع (لاہور)۔ میاں محمد عمر چھپرہ سوداگر چرم (امرتسر) رانا فیروز الدین ایڈووکیٹ (ہوشیار پور) مولانا عبدالغفار غزنوی (امرتسر) خاں منظر نواز خاں رئیس (ملتان)

ماہراج الدین انصاری میونسپل کمشنر (لدھیانہ) حکیم نور الدین، میر عبد القیوم ایڈووکیٹ (لاہور) حکیم احمد علی (فیروز پور) مولانا عبد الکریم اور حاجی عبدالغنی رئیس بٹالہ (ضلع گورداسپور) حضرت مولانا احمد علی (لاہور) چودھری عبدالغنی (ردہ تک ضلع حصار) نوابزادہ نصر اللہ خاں بی (ضلع مظفر گڑھ) خواجہ احمد الدین، مولانا بشیر احمد، صاحبزادہ فیض الحسن (ضلع سیالکوٹ) سردار محمد شفیع، چودھری محمد عاشق (تصور ضلع لاہور)

صوبہ یوپی :- محمود علی خاں رئیس کیلاش پور (سہارنپور) محمد کابل اکمل ایڈیٹر طہنفت رند افضل (سہارنپور) غازی منے خاں (لکھنؤ) ایم ایم بشیر (علی گڑھ) حکیم آفتاب احمد خان جامی (امروہا) مولانا محمد اسماعیل فریح، مولانا عبد القیوم، جناب عبد الحفیظ اور مولانا عبداللہ فاروقی (کانپور) سید محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ (الہ آباد) نیکوڑی (چودھری عبدالستار) مولانا عبدالجبار (دہلی) میر احمد حسن (شملا)

ممبئی :- حافظ علی بہادر ایڈیٹر روزنامہ السلال (ممبئی) کلکتہ :- خاں عبدالعزیز رئیس، سید بدر الدجی (میر کلکتہ کارپوریشن) مسٹر ہمایوں کبیر ایم اے۔

شمال مشرقی سرحدی صوبہ :- مفتی سرحد مولانا عبد القیوم پوپلنی (پشاور) سید احمد شاہ پیرسٹر (چارسدہ) حکیم عبدالسلام (ضلع بہارہ) سندھ :- ڈاکٹر محمد عمر (سکھر) حافظ عزیز الرحمن (کراچی)

موجودہ اجلاس میں سابقہ اجلاسوں سے زیادہ نمائندگی تھی۔ ہندوستان بھر کے دانشور اور سیاستدان اس میں شامل تھے۔ دونوں اجلاسوں کی مسلسل بیٹھاگ قرینا اظہارہ گھنٹے رہی۔ بند کمرے کے اجلاس میں پریس تک کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔

تحریک کپورتھلا، آئندہ ملکی انتخاب، مزاریت کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور مذہبی سرگرمیاں اجلاس کے زیر غور تھیں۔ بائیس جولائی شام کو حسب ذیل قراردادیں پریس کے حوالے کی گئیں۔  
قرارداد اول :- مجلس احرار کا یہ جنرل اجلاس واقعہ سلطان پور کے متعلق اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ سانحہ سلطان پور، جیلیا نواز باغ کے قتل عام سے کسی طرح کم نہیں

لہذا یہ اجلاس ملک کی اسلامی مجالس سے امید رکھتا ہے کہ کپور تھلہ کی مظلوم رعایا کو انصاف دلانے میں ہر اسلامی انجمن کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گی۔ نیز ہر اسلامی انجمن جلسے جلوس اور ہمدردی کی قراردادیں منظور کرے۔

قراردادیں: مجلس احرار کا یہ جنرل اجلاس واقعہ سلطان پور کے متعلق ماتحت مجالس کے ذمہ دار عہدے داروں کو ہدایت کرتا ہے کہ مظالم کپور تھلہ اور لوگوں کے مطالبات کے متعلق ایک ہفتہ کے اندر اندر ایک مفصل بیان تمام اخبارات کو بھیجیں نیز ماتحت اور دوسری اسلامی مجالس کو آئندہ پروگرام کے متعلق مطلع کریں۔

یہ اجلاس تمام ماتحت مجالس کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ رضا کاروں کی بھرتی کو فوراً تیز کر دیں اور فنڈ جمع کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جماعت کے دوسرے حکم کے منتظر رہیں۔

قراردادیں: یہ اجلاس کپور تھلہ کے مطالبات یعنی ریاست میں ذمہ دار اسمبلی کا قیام اور ایسکی کمی کی پوری تائید کرتا ہے۔ واقعہ حالیہ سلطان پور اور اس کے بعد ہتھاؤ سے منتقمہ زکار و ایوں بجائیدادوں کی ضبطی، محصوم ہتھے انسانوں پر لاطھی چارج وغیرہ خلاف انسانیت واقعات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مذکورہ صدر مطالبات حصول کے لیے جو پرامن تحریک چودھری عبدالعزیز نے ریاست میں شروع کر رکھی ہے جس سے ریاستی حوام میں بیداری کی زندگی پیدا ہو رہی ہے۔ حکام کپور تھلہ نے دراصل اس زندگی کو کچلنے کے لیے ایسے مظالم پر عمل کیا ہے دریں حالات مجلس مرکزیہ اس پالیسی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اعلان کر دینا چاہتی ہے کہ مظلوم رعایا کے جائز مطالبات بھرو تعدی سے ختم نہیں کیے جاسکتے۔ بالآخر ریاستی نظام کو بدنا پڑے گا۔ لہذا ریاست کا امن اس بات کا مقتضی ہے کہ رعایا کے فطرتی اور جائز مطالبات کو جلد تسلیم کر لیا جائے اور تمام ایسے کوفی الفور راکیا جائے۔

قراردادیں: یہ اجلاس اپنی اس رائے اور مطالبے کا صاف طور پر اعلان کرتا ہے کہ





شعبہ تبلیغ کا قیام | ۱۹۵۷ء کے بعد غیر ملکی اقتدار نے مسلمان کو تعلیم اور ملازمت سے آگے سوچنے کی ہمت ہی نہیں دی۔ سکول کالج اور دفتر گزشتہ

صدی تک مسلمان کا محور رہا ہے۔ غیر مرنی طور پر اگر کہیں ملکی سیاست کی بات ذہن سے گزری تو فرنگی ضابطہ نے سیدہ پلائی ہوئی دیوار بن کر اسے روک دیا تاکہ یہ آزار دلوں میں نہ اتر جائے۔ مال کار مسلمان من حیث القوم وفتروں کے کلرک یا بابو بن کر رہ گئے۔ جذبات میں اگر کبھی پہچان پیدا ہوا تو یہ لڑائی محض کرسی کی حفاظت تک رہی اور اس سے ہمسایہ قوم سے تلخی پیدا ہوئی۔ کلرکوں اور بابوؤں کی یہ جنگ دفاتر سے نکل کر سیاسی طاقت آزمائوں کے لیے ان کے اپنے مستقبل کے کام آئی اور بس۔ مگر عملی سیاست میں جہاں انگریزوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس وضع کا مسلمان متعدی امراض کی طرح اس سے کوسوں دور رہا۔

مجلس احرار نے ملازم پیشہ مسلمان کی اس بنیادی کمزوری کو بھانپ کر سیاست سے الگ رہ کر شعبہ تبلیغ کی بنیاد ڈالی۔ تاکہ غیر سیاسی کام کرنے والے لوگ مجلس احرار کے اس شعبہ میں کام کریں۔ ان کی سرکاری ذمہ داریاں بھی زخمی نہ ہوں اور دین کا کام بھی ہوتا رہے چنانچہ ۲۱-۲۲ جولائی کے اجلاس میں شعبہ تبلیغ کی باقاعدہ بنیاد رکھی گئی۔ اس کے اغراض و مقاصد اس طرح طے پائے۔

۱۔ شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام خالص مذہبی شعبہ ہے۔ سیاسیات ملکی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

۲۔ ارتداد و دہریت کی روک تھام کے پیش نظر منہ حتم نبوت کی ہر ممکن حفاظت کرنا۔

۳۔ مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کا شوق پیدا کرنا اور اس کے یہ مسئلوں کی ایک سرگرم جماعت تیار کرنا۔

۴۔ ہندوستان اور بیرون ہند میں اسلام کی اشاعت کرنا۔

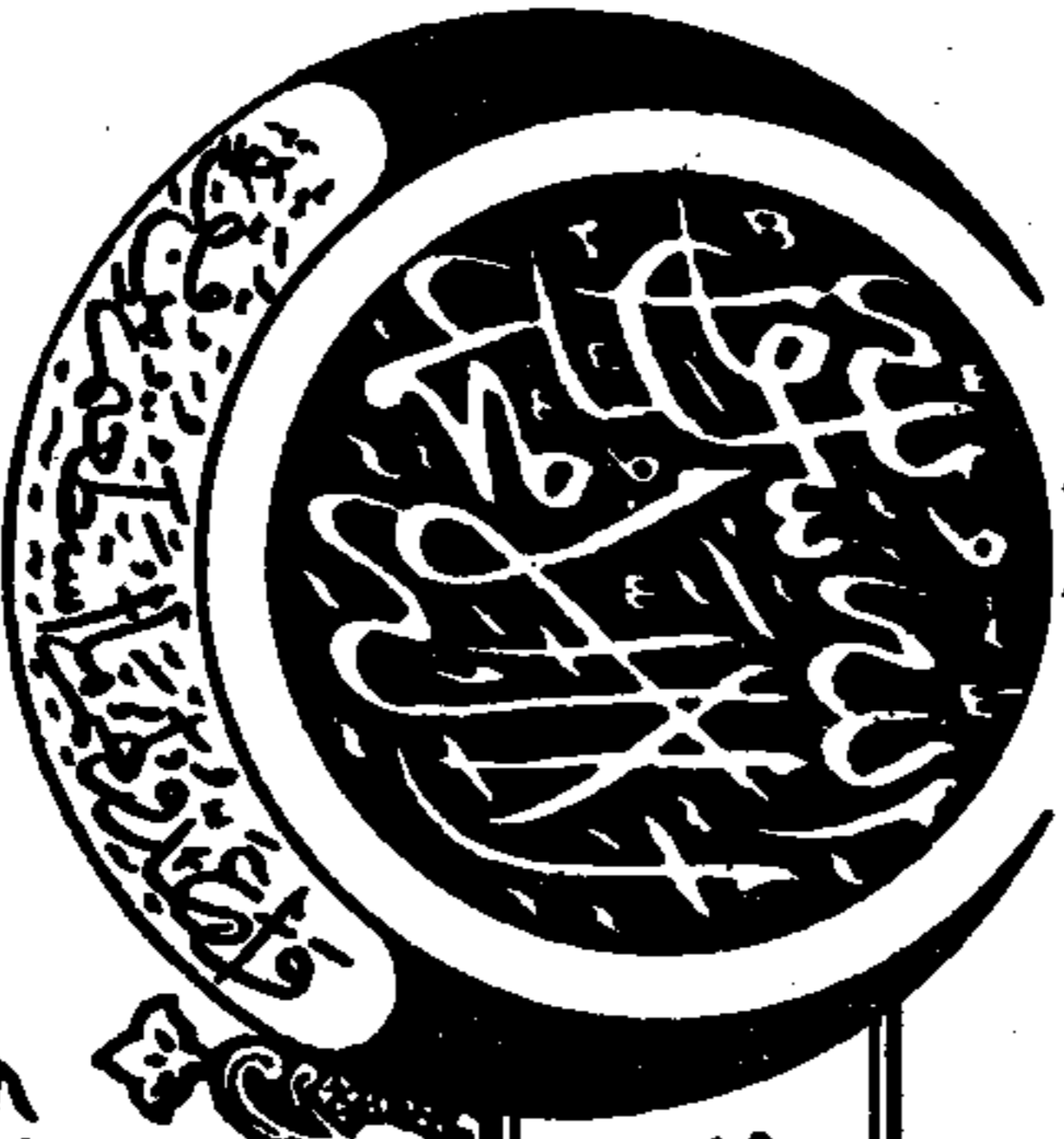
۵۔ خدمت خلق اور اسلامی اخلاق کی عملی کیفیت پیدا کرنا۔

شعبہ تبلیغ کے حسب ذیل عمدیدار منتخب ہوئے۔

صدر: میاں قمر الدین رئیس اچھرہ (لاہور)

بزرگواران  
نمبر 16915

مجموعہ تہذیب و تمدن اسلامیہ



تاریخ ۱۹۳۵ء  
از جناب مولانا عبدالحق صاحب مدرسہ اسلامیہ کراچی  
جس کو مولانا مولانا صاحب نے بطور مددگار  
مستطاباً نظر مالیات و مستطاباً نظر مالیات  
مستطاباً نظر مالیات



**SHOBA-I-TABLIQH,  
MAJLIS-I-AHRAR-I-ISLAM HIND,**

صدر دفتر تبلیغ احرار اسلام (انڈیا)

No. 1218

AMRITSAR 21, 4/19

(مرکزی ہیڈ کوارٹرز)

نائب صدر: چودھری افضل حق ایم۔ ایل۔ سی۔ ڈمبر پنجاب کونسل،

جنرل سیکرٹری: مولانا عبدالکریم۔ ایڈیٹر سہفت روزہ تمباہلہ لاہور

اس کا صدر دفتر اچھو میں قائم کیا گیا۔

گو قادیان میں احوار کا دفتر فروری ۱۹۳۲ء میں قائم کیا جا چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی مدرسہ جامعہ محمدیہ کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ لیکن شعبہ تبلیغ کے قیام نے مرزائیوں میں ہیجان اور مسلمانوں میں تبلیغ دین کی ایک نئی روح پھونک دی۔

انگریزوں کے مقابل مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور جذبہ ہریت کو فروغ دینے کا نام مجلس احوار ہے۔ احوار اور انگریزوں کے درمیان لڑائی وقتی اور

جذبائی نہیں بلکہ فطرتی جنگ تھی۔ احوار بحیثیت مسلمان انگریزوں کے خلاف بغاوت کو اپنا پیدا کنی حق سمجھتے اور اس کے لیے بہانے تلاش کرتے۔ دوسری طرف انگریز احوار کو اپنے اقتدار کی

بحالی کے لیے ہر موڑ پر تشدد کا نشانہ بناتا۔ یہ آنکھ مچولی جاری تھی کہ ہندوستانی ریاستوں میں مسلمان رعایا سے خصوصاً نا انصافی کو بھانپ کر احوار نے انسانی احیاء و بقا کے لیے اپنے

خلاف دوسرا محاذ قائم کر لیا۔ راج گڈیوں کے وارث اپنے خصوصی معاون برطانوی سامراج کے سہارے دانہ و دام سے لیس ہو کر سازشوں کے پس منظر میں احوار کے خلاف نکل کھڑے

ہوئے تھے۔ کہ قادیان میں احوار کا تیسرا محاذ قائم ہو گیا۔ جس میں احوار مسئلہ ختم نبوت کی حفاظت اور کفر و ارتداد کی بیخ کنی کے لیے اپنی بے سرو سامانی کے باوجود ایمانی عزم کے ساتھ

آموجود ہوئے۔

قادیانی مذہب دیکھنے کو مختصر اور سمجھنے کو حقیر سی ٹولی تھی۔ مگر دریائے بیاس کے

اس پار اس غیر آئینی ریاست کا وجود انگریزوں کا حفاظتی دستہ اور اسلام کے خلاف مضبوط حصار تھا۔

مرزائیت کے مذہبی اصولوں میں انگریزوں کو اولی الامر قرار دے کر اس کی اطاعت مسلمان پر

مذہباً واجب قرار دی گئی تھی۔ اسی بنا پر پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی انگریزوں کے ہاتھوں

شکست اور برطانیہ کی فتح پر قادیان میں گھی کے پرائع جلائے گئے اور اس خوشی میں مرزائیوں

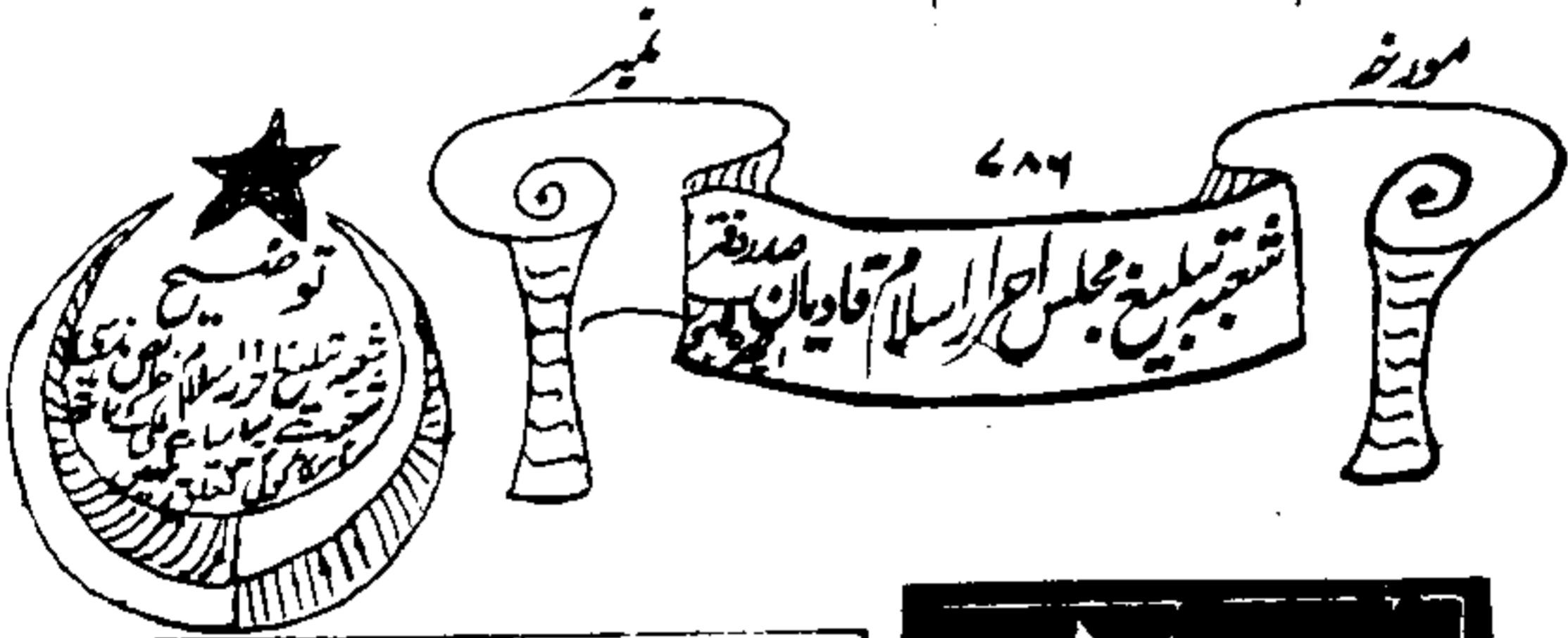
نے پنجاب کے انگریز گورنر مائیکل ایڈواڈز کو جس کے حکم پر ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر جلیا نوار باغ

میں گولی چلی تھی) لاہور میں سپاس نامہ پیش کیا۔ احرار کے نزدیک انگریز کے اس اطاعت گزار گروہ کو جس نے بظاہر مسلمانوں کی سی شکل و صورت بنا رکھی تھی، اٹھانا ضروری تھا۔ جبکہ تمام کا تمام ہندوستان فرنگی حکمرانوں سے آزادی وطن کے لیے لڑائی لڑ رہا تھا۔ ایسے منافق ٹولے سے جنگ نہایت ہی اہم اور ضروری تھی۔ گواہر کے لیے اپنے خلافت یہ تیسرا محاذ کھولنا دشوار تر تھا۔ مگر آج

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے!

گو شعبہ تبلیغ کے مقاصد میں ملکی سیاست کو دخل نہیں تھا اتنا اہم اس تنظیم پر احرار کی پوری گرفت تھی۔ اس شعبہ کا ہر فیصلہ احرار زعماء کے مشورے سے طے پاتا۔ شعبہ کے اکثر کارکن تنخواہ دار تھے۔ اور ایسے ورکرز کو اس تنظیم میں داخلے کی اجازت تھی جسے اسلام سے پوری واقفیت ہو۔ نیز وہ مرزائی اور عیسائیوں سے گفتگو کرنے پر قادر ہو۔

شعبہ تبلیغ اسلام کی رکنیت کا فارم



مقاصد شعبہ تبلیغ

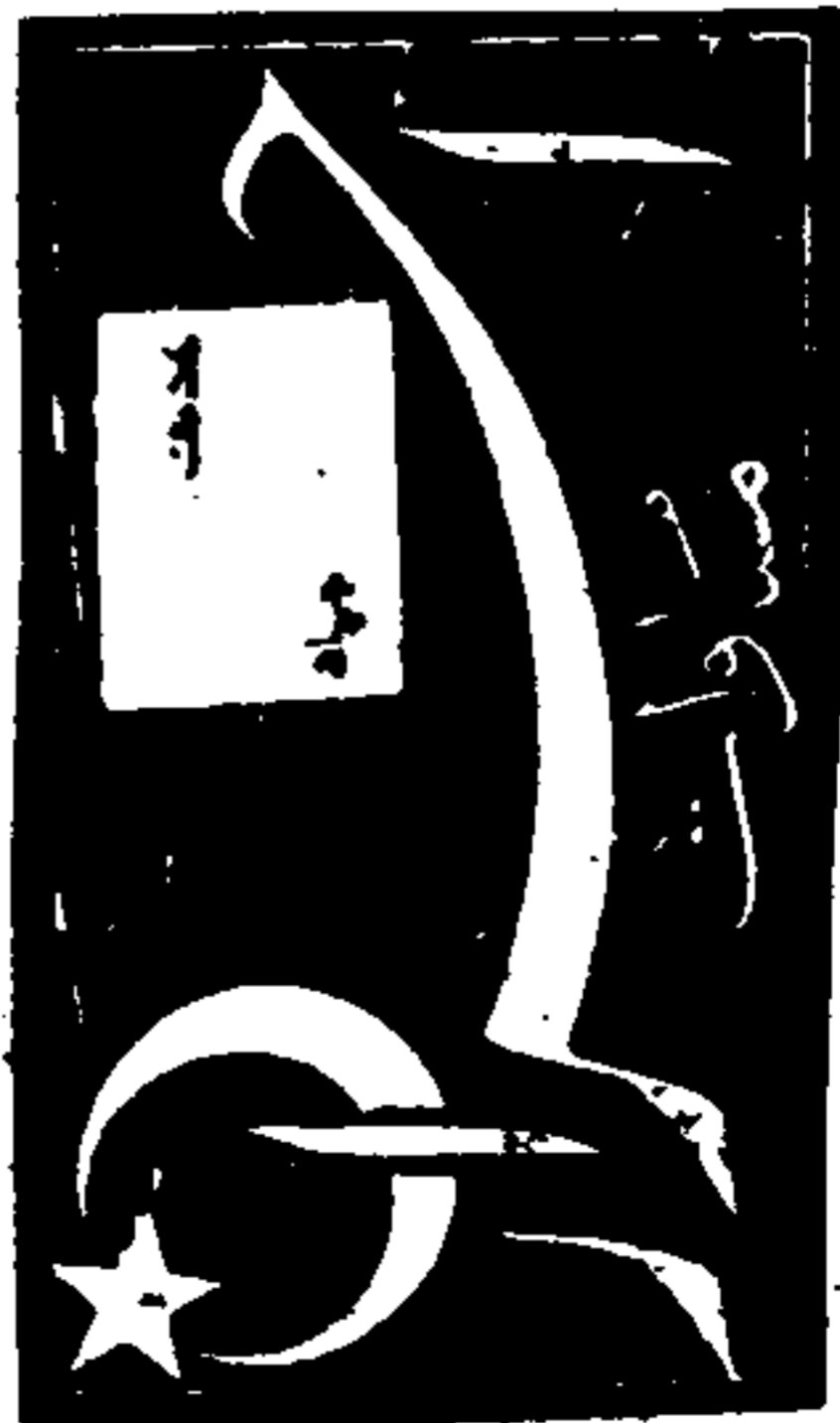
- ۱۔ ارتداد و ہریت کی روک تھام کے پیش نظر وقف ختم نبوت کی یاد دہانی
- ۲۔ مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کا شوق پیدا کرنا اور مسلمانوں کی ایک کرم کا کن جگہ تیار کرنا۔
- ۳۔ ہندوستان و بیرون ہند اسلام کی اشاعت کرنا۔
- ۴۔ خدمت خلق اور اسلامی اخلاق کی عملی کیفیت پیدا کرنا۔

۱۔ شعبہ کے زیر قیام اس وقت ایک مدرسہ دینیات قادیان میں جاری ہے جس میں اردو، حساب، تاریخ کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔

۲۔ سبھی شیخان میں مدد مندس آرن شریف و خطبہ جمعہ کا سلسلہ نہایت کامیابی سے جاری ہے۔

۳۔ گرد و نواح قادیان اور دیگر شہروں و قصبوں میں بہترین سطح تبلیغ اسلام میں معروف ہیں۔

۴۔ عریب و نادار طلبہ کی مفت تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔



شیخ رضا کالین اجسار

مسٹر خالد لطیف گابا کو سنٹرل اسمبلی کے لیے منتخب کرنا بھی سیاست سے زیادہ احوار کے تبلیغی مشن کا اہم جزو تھا۔ کیونکہ ان دنوں ہندو مہاسیجا کی طرف سے شہمی کی تحریک زوروں پر تھی اور دوسری طرف مہاتما گاندھی اچھوتوں کو ہندوؤں کے برابر سیاسی حقوق دلانے میں مصروف تھے۔ مقابل میں مسلمانوں کی تمام مذہبی اور سیاسی جماعتیں آئندہ انتخاب میں الجھی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ انبارہ کے ڈاکٹر غلام بھیک نیرنگ جن کی جماعت تبلیغ اسلام کے لیے معروف تھی اپنے حلقے سے الیکشن کے لیے ڈنٹر پیل رہے تھے۔ البتہ احوار اس مشن سے غافل نہیں تھے۔ چنانچہ ایک نو مسلم (خالد لطیف گابا) کی حمایت کا فیصلہ کر کے احوار نے مسلم اکثریت کی توجہ اپنی طرف کر لی۔ اور ساتھ ہی شعبہ تبلیغ کے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ تمام پروگرام ملتوی کر کے مسٹر گابا کے حلقے میں پہنچ جائیں۔ اس ضمن میں چودھری افضل حق نائب صدر شعبہ تبلیغ کا ایک خط درج ذیل ہے۔

برادر م کرم سیکرٹری شعبہ تبلیغ دسومہ (ضلع ہشیار پور)  
 اسلام علیکم۔ معلوم نہیں آپ کے مبلغ مسٹر گابا کے لیے بھی کچھ کوشش کر رہے ہیں یا نہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان تین مہینوں کے لیے پتے تمام مہلوں کو ضلع امرتسر، لاہور، گورداسپور اور فیروز پور بھیج دیں۔ خصوصاً وہاں میں کہ وہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر مسٹر گابا کی حمایت پر آمادہ کریں۔  
 یاد رکھنا چاہیے کہ اس انتخاب کا تبلیغی پہلو ایسا نمایاں ہے جسے شعبہ تبلیغ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس خط کا جواب دے کر مشکور فرمائیں گے۔

مک فیروز خان نون ان دنوں امرتسر آ رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید وہ عوام کو بلا کر ہمارے امیدوار (مسٹر گابا) کے خلاف اکسائیں۔ میری گزارش ہے کہ اس کا خاص خیال رکھا جائے۔ مخالفین کی نقل و حرکت کی پوری اطلاع رکھنا ضروری ہے۔ والسلام

افضل حق - ۲۵/۳/۴۲

وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل | جیسے جیسے موجودہ اسمبلی کی میعاد اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ سیاسی  
دل و دماغ نئے نئے زاویوں سے انتخاب کے میدان سوچ

رہے تھے۔ ان دنوں پنجاب کے میاں سرفضل حسین وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے  
کچھ دنوں کے لیے وہ رخصت پر گئے اور بعد میں اس ذمہ داری سے مستعفی ہو کر پنجاب کی سیاست  
میں دخیل ہو گئے۔ اب ان کی جگہ وائسرائے کی کونسل میں ان کا جانشین کون ہو، یہ سوال پنجاب  
سے نکل کر دوسرے صوبوں تک بھی پہنچا۔ لیکن نواب چھتاری، سر سکندر حیات اور چودھری  
سرفظ اللہ (مرزائی) کے نام خصوصیت سے سننے میں آ رہے تھے۔

احرار اول الذکر دونوں مسلمانوں کے لیے معترض نہیں تھی۔ اُسے سرفظ اللہ پر اعتراض تھا  
کیونکہ یہ سیٹ مسلمان کی تھی، اس پر غیر مسلم کی تقرری احرار کے نزدیک سیاسی اور مذہبی گناہ  
تھا۔ چنانچہ ۲۹- اگست ۱۹۳۴ء کو اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمن  
لدھیانوی صدر مجلس احرار نے حسب ذیل بیان پریس کو دیا۔

”عام افواہ ہے کہ چودھری ظفر اللہ قادیانی کو جو کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا مرید  
ہے اور مرزائی مذہب رکھتا ہے، سرفضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو  
کونسل کا ممبر بنایا جا رہا ہے۔“

مرزائی اپنے مذہبی عقیدے کی بنا پر نہ کسی مسلمان کا جنازہ پڑھتے ہیں نہ  
کسی مسلمان امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی وہ خود کو مسلمانوں میں شامل  
سمجھتے ہیں۔ بدیں و جو تمام دنیا کے علماء ان کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں اس  
لیے چودھری سرفظ اللہ کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بنانا مسلمانوں کے  
حقوق پر صریحاً ظلم ہے۔“

اسی بیان میں مولانا نے مسلمانان ہند کو مشورہ دیا کہ وہ وائسرائے کو اپنے دستخطوں  
سے مطلع کریں کہ کسی مرزائی کو مسلمانوں کے نام پر کوئی عہدہ اور ملازمت نہ دیں۔

”کیونکہ کوئی قادیانی بطلانیہ کے سوا کسی دوسرے ملک یا مذہب کا وفادار نہیں  
ہو سکتا۔ میرا یہ چالیس سالہ تجربہ ہے اور بقول علامہ سراقبا، مرزا کو جو اس بات

کی ضمانت ہے کہ وہ انگریزوں کا سچا و فادار ہے۔

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر سر محمد قبال نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے دوران متحدہ ہندوستان کے مسلم

## سندھ اور پاکستان

اکثریتی صوبوں کو باقی ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس کے موقر پر چودھری رحمت علی نامی شخص نے انگریزی میں ایک پمفلٹ تقسیم کیا۔ جس میں ہندوستان سے مسلم اکثریت کے صوبوں کو علیحدگی کے بعد پاکستان کا نام دیا گیا تھا۔

۱۹۳۲ء کے آخر تک مزید کہیں پاکستان کا ذکر نہیں۔ لیکن سندھ کے سرکاری وڈیوں نے نہ جانے اچانک اس انجانی حقیقت کے جنم لینے سے پیشتر کیوں اور کیسے جان لیا کہ ایسا ہوگا اور قبل از وقت مرگ داویلا شروع کر دیا۔

۳۱۔ جولائی ۱۹۳۲ء کے روزنامہ انقلاب لاہور میں یہ خبر شائع ہوئی۔

”۲۸۔ جولائی (کراچی) سندھ آزاد کانفرنس کا دوسرا اجلاس سر غلام حسین ہدایت اللہ

کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں سر موصوف نے کہا کہ

مسلمانان سندھ پنجاب، سرحد، بلوچستان کو ملا کر ایک بڑا اسلامی صوبہ پاکستان ہرگز بنانا نہیں چاہتے۔

مسلمانان سندھ پنجاب میں جہاں (پنجابی) مسلمانوں کی اکثریت ہے مدغم ہونا نہیں چاہتے۔

سندھ کی علیحدگی سے ہمارا صرف یہ منشا ہے کہ ہم اپنے گھر (سندھ) کے

خود مالک ہوں۔ اس کے سوا ہمارا کوئی مخالف مقصد نہیں۔“

متذکرہ بالا خبر سے شبہ گزرتا ہے کہ اس تجویز کا محرک چونکہ برطانیہ کا بااقتدار اور قریب

ترین آدمی تھا لہذا اسے سرکاری ذرائع سے اس سن میں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آگے چل کر ایسا ہوگا۔ یہاں تک تو درست ہے کہ ۱۹۳۵ء ایکٹ کے تحت سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر

کے ایک صوبہ قرار دیا جا رہا تھا۔ لیکن جہاں ”پاکستان بنے گا“ ہنوز کوئی ذکر نہیں تھا۔ مگر

سر غلام حسین ہدایت اللہ کو یہ اندر کی بات کیسے معلوم ہوئی؟ دوسرا شبہ یہ گذرتا ہے کہ سندھ کے



غیر مسلموں کی شہ پر آزاد کانفرنس کی اس تجویز نے جنم لیا تھا۔ بہر حال آئندہ چل کر اس حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا۔

**کمیونسٹ پارٹی** اسی جب مذہب کے مردوبہ اصولوں سے انحراف کرتا ہے، تو اس کے لیے کئی حیلے تراشتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ان ذمہ داریوں سے جی چراتا ہے جو مذہب نے اس پر عائد کی ہیں۔

ہو سکتا ہے روس میں کمیونسٹ پارٹی کے کوئی اصول ہوں لیکن برصغیر میں زیادہ تر اس پارٹی (کمیونسٹ) کا وجود مذہب سے بغاوت کے اصولوں پر قائم ہوا۔ ورنہ جس ملک کے ہر گھر کا طاقتوروں سے بھرا ہو۔ وہاں کے عوام ایسی کوئی تحریک کیوں کر قبول کرنے لگے جس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو۔

۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب آیا اور زار شاہی کی جگہ وہاں کے عوام نے سنجالی تو اس کی صدائے بازگشت برصغیر میں بھی سنی جانے لگی۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ، خلافت و ترک موالات کی تحریکات پر برطانوی حکومت کا اپنی غلام رعایا پر بے پناہ تشدد یہاں کے عوام کو اس موڑ پر لے آیا کہ غیر ملکی غلامی سے نجات کے لیے وہ طریق کار بے معنی ہے جسے کانگریس یا دوسری سیاسی جماعتوں نے اپنایا ہے۔ برطانوی سامراج سے نجات کے لیے عدم تشدد کی پالیسی بے کار ہے اور اس کے ذریعہ ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں برابر کی فوجی قوت نہ ہو۔ لیکن اس سے پیشتر کے متعدد ایسے تجربات سے ہندوستانی رہنما یوں سوچنے لگے تھے۔ خصوصاً ۱۹۰۵ء کی جنگ آزادی۔ "گاما گاٹھارو" جہاز کی سازش اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریک پر مولانا عبید اللہ سندھی کا افغانستان پہنچ کر روس اور ترکی سے سازش کر کے

۱۹۰۵ء۔ ایک جہاز کا نام تھا جسے ہندوستان سے باہر کے محب وطن ہندوستانیوں نے جاپان سے خرید کر اس وقت کے انقلابی رہنما سر فارگووڈ سنگھ کے سپرد کیا تھا۔ اس جہاز میں سوار انقلابی سکھ لوجوانوں کی اکثریت تھی غیر ملکی اسلحہ بھی اس میں تھا۔ اس سازش کا علم برطانوی حکومت کو جہاز کے ہندوستان پہنچنے سے پیشتر ہو چکا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی یہ جہاز بچکے کے گھاٹ پر پہنچا۔ گورنر نے ساحل سے فائرنگ شروع کر دی۔ مقابل میں جہاز سے بھی فائرنگ ہوئی۔ جہاز پر سوار انقلابی مارے گئے۔ جو بچے انہیں گرفتار کر لیا گیا اور یہ لوگ بیس بیس سال کے لیے جیل خانوں میں بند کر دیے گئے۔ اس طرح یہ سازش نام ہو گئی۔

ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا نیز تحریک ریشمی رومال کی ناکامی نے ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستان میں تشدد کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تاہم کانگریس کی برہمنی ہوئی تحریک میں کچھ عناصر ایسا شامل ہو جو روسی انقلاب سے بالواسطہ متاثر تھا۔ آہستہ آہستہ اور اندریہ اندریہ لوگ نوجوانوں کو اکٹھے رہنے کے مذہب ایک ایفون ہے جو انسانی جذبات کو مضمحل کر دیتا ہے۔ اس سے دوری حاصل کرنا انسانیت کی مزاج ہے اور یہ آزادی وطن کے راستے میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

جیسے جیسے یہ زہر نوجوان خون میں سرایت کرتا گیا متحدہ ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کو تقویت حاصل ہوتی رہی۔

روس کے بعد ہندوستان میں ۱۹۲۱ء میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ بمبئی، پونا اور احمد آباد میں سب سے پہلے اس کے دفاتر قائم ہوئے۔ کامریڈ منظر احمد اور کامریڈ گھاٹ (مریٹر) اس کے رہنما تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کے خلاف قانون (UNLAW FULL) قرار دیے جانے کے بعد بظاہر یہ لوگ کانگریس سے وابستہ رہے۔ مگر (UNDER GROUND) (دور پردہ) کام کرتے رہے۔ اس تحریک کو زیادہ تر بنگالی نوجوانوں نے قبول کیا۔ متحدہ ہندوستان میں دہشت پسند تحریکیں زیادہ تر اسی صوبے میں پروان چڑھیں۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء کو کانپور میں پہلی کسان مزدور کانفرنس ہوئی جس میں یہ لوگ کمیونسٹ، کھل کر سامنے آئے۔ اس کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت مولانا حسرت موہانی نے کی۔

اس طرح کانگریس کے اندر نئے خیالات نے جنم لیا اور یہ گروہ اندر خانے اپنا کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۲ء میں اس گروہ کے متعدد افراد میرٹھ سازش کیس میں گرفتار ہوئے۔ پنجاب میں اس سے پیشتر نوجوان بھارت سبھا قائم ہو چکی تھی۔ جس کے رہنما درگھت سنگھ تھے۔ جنہیں ۲۳۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو لاہور سنٹرل جیل (موجودہ شادمان کالونی) میں پھانسی دیا گیا تھا۔ میرٹھ کیس ختم ہوتے ہی یہ لوگ پھر اندر گراؤنڈ چلے گئے۔ آخر ۲۶ جولائی ۱۹۳۲ء کو ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کو باضابطہ خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود

یہ لوگ اندر ہی اندر کام کرتے رہے۔ ان دنوں کامریڈ پورن چندرا س پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ ہندوستان کی سیاسی سرگرمیاں ہنوز آئندہ انکیشن تک محدود تھیں۔ ہر پارٹی اور گروہ اس تک و دو میں تھا کہ اپنی اپنی قوم اور فرقہ میں اپنی پوزیشن واضح کرے۔ انہی دنوں بنارس المحدثیٹ کے جنرل سیکرٹری ایم ماسے سعید نے بنارس سے ۲۰ اگست کے اخبارات میں ۲۰ جون کی اس خبر کی تردید کی کہ مشترکہ انتخاب کی تجویز بنارس المحدثیٹ بیگ نے پیش کی ہے، بلکہ یہ تجویز آل انڈیا المحدثیٹ کی تجویز ہے۔

**اخبارات میں احوار سے متعلق یہ خبر شائع ہوئی کہ انبالہ ڈویژن سے مولانا غلام بھیک نیرنگ کے مقابل احوار رائی و زالدین (ہوشیار پور) ایڈووکیٹ کو اپنا نامزدہ منتخب کر رہی ہے۔** مگر چند دنوں کی باہمی گفتگو کے بعد یہ طے پایا ہے کہ کہ احوار اس حلقہ سے مولانا غلام بھیک نیرنگ کے مقابل اپنا نامزدہ واپس لے لے۔ اب احوار صرف خالد لطیف گابا کی حمایت کرے گی۔ یہ اعلان ۲۰ اگست ۱۹۳۲ء کے اخبارات میں کیا گیا۔

**وائسرائے ہند کا اعلان** ۲۰ اگست ۱۹۳۲ء کو وائسرائے ہند لارڈ وننگٹن نے اعلان کیا۔

”۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو موجودہ اسمبلی ختم کر دی جائے گی“

اس اعلان سے انتخابی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ کانگریس نے سنٹرل پارلیمنٹ بورڈ قائم کر لیا۔ ہندو مہاسجا بھائی پرمانند کی قیادت میں پر تو لٹے لگی۔ پنڈت مدن موہن مالوی اپنی نیشنلسٹ پارٹی کو مضبوط کرنے لگے۔ ۱۲ اگست کو شملہ میں مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ سکھوں نے اپنی موجودہ جاتی یونین قائم کر لی۔ اس طرح حالات نے نئے سرے سے لڑھکی اور اندھڑی ہوئی انتخابی تحریک میں جان آنے لگی۔

**۱۲ اگست کا اجلاس** شملہ میں مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے مشترکہ اجلاس میں پارلیمانی بورڈ کے قیام کے علاوہ، برطانیہ کے فرقہ وارانہ

اعلان کو کلیتہً قبول کر لیا گیا۔

چونکہ مسٹر محمد علی جناح ان دنوں لندن میں تھے۔ لہذا ان کی جگہ اجلاس کی صدارت آنریبل سر رضا علی نے کی۔ اس پر اعتراض اٹھایا گیا کہ مسلم لیگ کا یہ اجلاس غیر آئینی ہے۔ چونکہ صدر یہاں نہیں ہیں لہذا ہم اس کو نمائندہ اجلاس تسلیم نہ کرتے ہوئے واک آؤٹ کرتے ہیں۔ ان میں عبدالمتین چودھری اور مسٹر اظہر علی قابل ذکر ہیں۔

شملہ ان دنوں مسلم سیاست کا سرگرم مرکز تھا۔ ۱۲۔ اگست کے بعد ۱۴۔ اگست کو نواب چھتاری، خان بہادر حافظ برایت حسین، انور شید علی خاں اور اسی طرح کے دوسرے رہنما جمع ہوئے۔ جنہوں نے آل انڈیا کونسل مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کا اجلاس منعقد کیا۔ اور اپنا الگ پارلیمانی بورڈ بنالیا۔ نیز اسی اجلاس میں آئندہ انتخاب میں جداگانہ طریق انتخاب کی تائید کی گئی۔ اس اجلاس کے خاتمے پر لندن سے سر آغا خان نے نواب چھتاری کو مبارک باد کا تار دیا۔ دیر اجلاس مقابل کی مسلم لیگ نے مسٹر جناح کی غیر حاضری میں کیا تھا، اسی اجلاس میں لہور کے نامزد امیدوار مسٹر خالد لطیف کا باکے مقابل خان بہادر حاجی رحیم بخش کو مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کا مشترک نمائندہ ٹکٹ دیا گیا۔ سر آغا خان نے لندن سے اس کی تائید کی۔ اس کے ساتھ ہی نواب چھتاری، بیگم شاہنواز، میر مقبول نے بھی خان بہادر حاجی رحیم بخش کی حمایت میں بیان دیا۔

۱۹۔ اگست کو کلکتہ سے نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر پیٹریٹ بلوی نے ایک بیان

کے ذریعے اعلان کیا:

”نیشنلسٹ پارٹی کا ممبر وہی ہو سکتا ہے، جو کانگریس کا ممبر ہوگا۔ کیونکہ یہ پارٹی کانگریس سے علیحدہ نہیں۔ اس جماعت کے مقاصد میں اول یہ بات ہے کہ کونسلوں سے باہر قزطاس امیض اور فرقہ وارانہ نیابت کو مسترد کرنے کی کوشش کرے گی۔“

ہٹلر جرمن کا صدر منتخب ہو گیا | دنیائے پالیٹکس سے ہندوستان کے سیاسی حالات کو مختلف تھے لیکن یورپ کے پالیٹکس میں

اس کا برابر ذکر تھا۔ برطانوی غلام ہونے کے باوجود متحدہ ہندوستان کے اندر ذرا حالات

انگریزوں کے لیے سازگار نہیں تھے۔ برصغیر اویان برطانیہ کے لیے سروردی کا باعث تھا اور خصوصاً  
 جرمن کے بدلتے ہوئے حالات اور آئے دن کے واقعات نے فرنگی سیاستدانوں کو ہندوستان  
 کی طرف سے متفکر کر رکھا تھا۔ ہر شام آسمان پر شفق کے بدلتے ہوئے رنگ برطانوی دانشوروں  
 کے چہروں کی غمازی کرتے اور ڈھلتے ہوئے ستاروں کے ساتھ نہ جانے کتنی بھینس ڈوب رہا تھا۔  
 ۱۹۔ اگست ۱۹۳۴ء کو جب اڈولف ہٹلر جرمن کا مستقل صدر عوام کے دوٹوں سے منتخب  
 ہوا تو برطانوی سامراج کے رہے سے حواس جاتے رہے۔ اس سے ایک ہفتہ قبل ۹ اگست  
 کے ”ٹریبی میل“ لندن میں ہٹلر کا ایک بیان شائع ہوا۔

”جو اس وقت تک انگلستان سے نبرد آزما نہیں ہوں گے جب تک  
 کہ وہ ہم پر حملہ نہیں کرے گا۔ اسی بیان میں آگے چل کر ہٹلر نے کہا جب وہ یہ  
 کہتے ہیں کہ انگلستان کی مدافعت سرحدوں پر یا رے رائٹن کا کنارہ ہے تو ہمارا حق ہے  
 کہ ہم اپنے ملک کی سرحد کے اندر اپنی حفاظت کا انتظام کریں۔ ہم انگلستان  
 سے کوئی نوآبادی بھی نہیں چاہتے۔ میں ایک جرمن نوجوان کی جان بھی اس کام  
 کے لیے قربان کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی ہم آسٹریلیا پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔  
 البتہ آسٹریلیا ہم سے دسی تعلقات قائم کرے جو پٹے تھے۔“

اگر جرمن کو مجبور کیا گیا تو وہ تمام دنیا کی خام اجناس سے بے نیاز اور  
 خود مختار ہو جائے گا۔ دو تین سال کے اندر دنیا دیکھے گی کہ جرمن کس طرح اپنا  
 لوہا منواتا ہے۔“

صدارتی انتخاب میں نوے فیصد جرمن عوام نے ہٹلر کو ووٹ دیے لیکن اس پر بھی  
 ہٹلر کو یقین تھا اور اسی یقین کی بنا پر اس نے کہا:

”وقت آئے گا کہ دس فیصد جرمن مجبور ہو جائیں گے کہ میرا ساتھ دیں۔  
 جرمن کا ہر آدمی نازی پارٹی کا حامی بن جائے گا اور آئندہ بھی میرا اسی طرح  
 ساتھ دیں گے جس طرح گزشتہ واقعات میں میرا ساتھ دے کر انہوں نے  
 وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔“

صدارتی انتخاب کے ایک ہفتہ بعد ۲۷۔ اگست ۱۹۴۴ء کو پھلرے کہا:  
 وہ اگر کوئی غیر قوم ہم پر حملہ آور ہوتی تو اس کی وجہ محض یہ ہوگی کہ ہم اپنے  
 وطن کے مفاد کا تحفظ نہیں کر سکتے یا پھر بین الاقوامی جماعت کے مخصوص لوگ  
 ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔ لیکن میں ان لوگوں کو لعین دلاتا ہوں کہ ہم کسی  
 طاقت کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہیں۔

یہودی اور کمیونسٹوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر انہوں نے  
 مذہب کی آڑ لے کر جرمن قوم یا نازی پارٹی کی مخالفت کی تو ہم ہر ممکن ذرائع سے  
 ان کا مقابلہ کریں گے۔“

جرمن کا اقتدار سنبھالنے کے بعد پھلرے نے مسلسل تقریروں میں ہولچہ اختیار کیا اس نے  
 یونین جیک کی اڑانوں کے ساتھ برطانوی دانشوروں کی پیشانیاں بھی شکن آلود کر دیں ایسے  
 میں برٹش ایمپائر دوہری مشکلات میں الجھ گئی۔ ہندوستانی ایک طرف اپنی آزادی کی آگ کو  
 بوار سے رہے تھے تو جرمن دوسری طرف پہلی جنگ عظیم کی شکست کا انتقام لینے کی  
 تدبیروں میں تھے۔ انہی دنوں وائسرائے ہند نے ۳۱ دسمبر کی بجائے ۲۹ اگست کو  
 آئندہ انتخاب تک کے لیے اسمبلی برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس عجلت کے ساتھ اسمبلی برخواست کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ جبکہ اگست  
 کو وائسرائے خود اعلان کر چکے تھے کہ وہ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۴۴ء کو موجودہ اسمبلی برخواست کریں گے۔  
 پھر ۲۹۔ اگست کو یکایکی یہ قدم کیوں اٹھایا گیا؟ ہندوستان میں برطانوی نمائندے کا اپنے  
 وعدے سے یہ انحراف بساط سیاست پر ایک نئے سرے کی چال تھی۔

پھلرے کی مسلسل حالیہ تقریروں نے برطانوی سیاستدانوں کو بے زل کر دیا تھا اور اس موقع پر  
 وہ ہندوستانی سیاستدانوں کا باہم ایک جدید تماشہ دیکھنا چاہتے تھے تاکہ برطانیہ کمیونی کے  
 ساتھ جرمن کے بدلتے ہوئے حالات پر غور کر سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۳۱۔ اگست (۱۹۴۴ء) مسلم یونیورسٹی بورڈ لکھنؤ کے اجلاس میں آخری روز  
 نئی آواز قمری | جمعیتہ علمائے ہند کے نمائندوں نے واک آؤٹ کیا۔ ان کا موقف یہ تھا۔

”چونکہ مسلم یونیورسٹی بورڈ سے ہمارا اشتراک صرف ان شرائط پر تھا کہ آئندہ انتخاب میں ہم ایسے نمائندوں کی امداد کریں گے جو اسمبلی میں مذہبی امور کے سلسلے میں جمعیت کے فیصلوں کے مطابق کام کریں۔ لیکن یونیورسٹی بورڈ نے ہماری شرائط پوری نہیں کیں۔ لہذا ان حالات میں ہم آئندہ انتخاب میں مسلم یونیورسٹی بورڈ کی حمایت نہیں کریں گے۔ تاہم جمعیت علمائے ہند ان حالات میں بھی بورڈ کا ایک نمایاں گروپ بنا رہے گا۔“

مولانا احمد سعید اعظم علی جمعیت علمائے ہند کا یہ بیان ۲۲- اگست کے اخبارات میں

شائع ہوا۔

۲- ۲۴ اگست کو موہا اگاندھی نے پنڈت مالویہ کے بیان کی تردید میں کہا: ”ویر بات غلط ہے کہ کوئی کانگریسی نیشنلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ سکتا ہے۔“

گاندھی جی نے کہا کہ

”صرف کانگریسی پارٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ انتخاب لڑے۔ صرف اپنے پارلیمانی بورڈ پر اور کانگریسی صرف اسی نام سے الیکشن میں حصہ لے سکتا ہے۔“

۳- عین انہی دنوں موضع پول تحصیل ریواڑی کے ہسپتال کے ایک غیر مسلم ڈاکٹر نے اپنے گدھے کا نام احمد رکھا جس پر سارے ہندوستان میں رنج و غم پھیل گیا۔

۱۹۲۶ء سے ہندو ماہ سبھا اور آزادی سماج نے تحریک شاتمہ رسول شروع کر رکھی تھی کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے سرور کائنات صلعم کی ہر ممکن طریق سے ایانت کریں گے۔ چنانچہ لاہور میں راجپاں کا قتل، دہلی میں شہزادہ نند کا قتل، قصور میں پارامہ کا قتل، کراچی میں نھورامہ کا قتل، جہلم میں ایک سکھ کا قتل اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

حقیقت ہے کہ احرار ہند ہما خصوصاً ایسا عطاء اللہ شاہ بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) اور اس موقع پر سید پانچویں دیوار نہ بن جاتے تو شاید باطل کی زبانی ہند نہ ہوتیں جو مسلمانوں کو

بھی قابلِ داد ہیں، جنہوں نے جان کا نذرانہ دے کر خاتمِ الانبیاء علیہ السلام کی عزت کو محفوظ کیا۔  
 پول کے حادثے کو بھی یہی عنوان دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں بھی شاتمِ رسول کا پہلو درخشاں تھا۔  
 انتخاب کے دن تھے۔ تمام ملک اسی میں مصروف تھا۔ غیر مسلم تو غیر مسلم ٹھہرے۔ مسلمان  
 بھی اس واقعہ پر چپ سا دھ کر رہ گئے۔ گواہی بھی فارغ نہیں تھے۔ تاہم اخبارات نے پول کا گدھا  
 کے عنوان سے سارے مسلم جذبات کو آگ دے رکھی تھی! ایسے میں صرف مجلس احرار نے قدم اٹھایا  
 کہ ۲۵ اگست کو چودھری افضل حق نے وزیرِ زراعت پنجاب کو ایک خط کے ذریعے اس طرف

متوجہ کیا۔

ڈاکٹر شفاخانہ حیوانات پول کے خلاف اس بنیاد پر کہ اس نے ایک گدھے کا  
 نام پیغمبرِ اسلام صلعم کے نام پر اصرار رکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر کی اس حرکت پر سارے ملک  
 میں احتجاج ہو رہا ہے اگر متعلقہ محکمہ اس پر خاموش ہے۔ آخر کیوں۔ بہ مہربانی  
 کر کے اس کی فوری تحقیقات کر کے جواب دیں۔

آپ کا افضل حق۔ ایم۔ ایل۔ اے  
 نائب صدر مجلس احرار اسلام ہند

اس خط کے جواب میں ۲۸ اگست کو وزیرِ زراعت نے چودھری افضل حق کو تحریر کیا۔

شملہ ریسٹ ہاؤس

۲۸۔ اگست ۱۹۳۲ء

مکرمی چودھری صاحب!

مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ گدھے کے نام کے متعلق بڑی  
 غلط فہمی تھی۔ دراصل گدھے کا نام احمق تھا۔ تاہم اس پر بھی اس کا یہ نام تبدیل  
 کر کے بہادر رکھ دیا گیا ہے۔  
 آپ کا۔

جوگندر سنگھ۔ وزیرِ زراعت پنجاب

اسی روز ڈاکٹر حیوانات پول کا ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا۔  
 ”میری ذرا سی غلطی سے مسلمان بھائیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے میں  
 اس پر معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہیں ہوگی۔“



## مہاراجہ جیند کے نام

۱۹۲۱ء سے ہندوستان کی غیر مسلم ریاستوں میں مسلمان رعایا کے ساتھ ظلم و ستم کا ایک دور چل رہا ہے۔ اس پر ہندو اخبارات نے جو جانبدارانہ

رویہ اپنایا تھا۔ ماضی قریب کے واقعات سے آشنا لوگ اس سے خائل نہیں کہے جاسکتے۔

کانگریس اور مسلم لیگ سمیت ریاستی مسلمانوں کے ساتھ مسلمان جماعتوں نے جس بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا، تاریخ اس سے بیگانہ نہیں۔ یہ کریڈٹ صرف مجلس احرار کے لیے وقف رہنا چاہیے کہ اس کے رہنماؤں نے کشمیر، الورا، کپور تھلہ اور جیند جیسی ریاستوں کے حاکموں سے ٹکرا کر وہاں کے مسلمانوں کو ان کے پیدا کنشی اور جائز حقوق دلانے۔ اور اس ضمن میں اپنے کو مصائب میں ڈالا۔

۳۱ اگست ۱۹۳۴ء کا صدر مرکز یہ احرار کا یہ بیان اس ضمن میں آتا ہے۔ اس میں انہوں نے

مہاراجہ جیند کو ان کی مسلم رعایا کے متعلق چند مطالبات کا ذکر کیا ہے۔

”ملکی حالات پارلیمانی انداز سے گذر رہے ہیں اور تمام مسلمان جماعتیں آئندہ الیکشن کے لیے سوچ رہی ہیں۔ مجلس احرار ان دنوں اس فکر میں ہے کہ ریاست جیند کے مسلمانوں پر مہاراجہ جیند کے ظلم و ستم بڑھتے جا رہے ہیں، لہذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مہاراجہ کو ان پر توجہ دلاؤں۔“

تقریباً ڈیڑھ سال سے ریاست جیند کے ہندو حکام نے مسلمانان جیند پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ شاہی مسجد ریاستی حکام نے اپنے قبضے میں کر رکھی ہے۔ باقی مساجد میں سوڑ کا گوشت پھینکا گیا۔ اس سے ریاست کے مسلمانوں نے بطور احتجاج عید کی نماز ترک کر دی۔ عید الاضحیٰ کے دن ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مسلمانوں کو بکرے اور دنبے کی قربانی سے بھی باز رکھا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے قاتلوں کو ہندو عدالتیں صاف بری کر دیتی ہیں۔

ان حالات میں وہاں کے مسلمانوں نے گزشتہ ایک ماہ سے جمعہ کے دن

پرامن جلوس نکالے، جن پر مولانا عبدالعزیز فاضل دیوبند خطیب، جامعہ مسجد جیند نے امن پر قائم رہتے ہوئے ریاستی حکام کے سامنے چند مطالبات پیش کیے۔

حکام نے بجائے بات سننے اور سمجھنے کے مولانا عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کا زور قتل

کر لیا اور انہیں بیٹریاں ڈال کر جیل میں بند کر دیا گیا۔

ہندو ریاستوں میں عموماً مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور شہری حقوق متعصب ہندو حکام فنا کر رہے ہیں۔ پنجاب کا ہندو پولیس اور مہا سبھائی لیڈر ان کی پشت پر ہیں۔ جب مسلمان تنگ آکر اپنی مذہبی آزادی، شہری حقوق کے لیے پرامن جدوجہد کرتا ہے تو انہیں جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں ان پر بے پناہ مظالم ہوتے ہیں۔ ہندو پولیس اور ہندو لیڈران بے گناہ مسلمانوں کو باغی، بدعاش یا فنگے کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ نیز حکام کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان باغی مسلمانوں کو ایسی سزا دی جائے کہ عمر بھر یاد کریں۔ ان حالات سے ریاستی مسلمان کے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ باعزت زندگی کے لیے حاکم وقت سے برسر پیکار ہو جائے۔ لیکن اس طرح راعی اور رعایا کے درمیان نفرت بڑھتی رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مہاراجہ جیند ایک اچھے آدمی ہیں۔ ان کی نیت اپنی رعایا کے حق میں بری نہیں۔ اس کے برعکس ریاست میں جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا اس کی تمام ذمہ داری اس ہندو پر ہے جس کے سپرد مہاراجہ نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ کیا ہوا ہے۔

وزیر اعظم ریاست میں فساد کرنا خود چھٹی لے کر لندن کی سیر کے لیے روانہ ہو چکا ہے اور اپنے قائم مقاموں کو مسلمانوں پر تشدد کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔

ایسے میں مہاراجہ جیند اور ان کے ولی عہد کا فرض ہے کہ اپنی ریاست کو تباہی سے بچائیں۔ ورنہ بیرونی حکام ہمیشہ کے لیے آپ کی ریاست کو فنا کر دیں گے۔ آپ کی مسلمان رعایا کے صرف اس قدر مطالبات ہیں کہ:

۱۔ عید کے دن ان کو بکرے اور دنبے کی قربانی سے نہ روکا جائے۔

۲۔ شاہی مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی جائے۔

۳۔ جن مساجد میں سور کا گوشت پھینک کر انہیں ناپاک کیا گیا ہے، ریاست کے ان حکام کو اس بوم کی سزا دی جائے۔

۴: مسلمانوں کے جن قاتلوں کو بری کر دیا گیا ہے انہیں قتل کا مجرم قرار دے کر نرا دی جائے۔

کیا ہمارا بھروسہ اور وہی عہد کے نزدیک مسلمانوں کے یہ مطالبات قابل توجہ نہیں؟ اگر ہیں تو ریاست کے امن کا تقاضہ ہے کہ ان پر غور کیا جائے اور تمام گرفتار شدگان کو فوراً رہا کر دیا جائے۔“

اس کے ساتھ ہی صدر مرکز نے روہتاک مجلس احرار کو خصوصی توجہ دلائی کہ وہ ریاست جیند کے مسلمانوں کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کرے۔ نیز آئینی طریق پر ان کی ہر طرح امداد کرے۔  
غلاموں کے باہم الجھاؤ اور مندرجہ بالا واقعات نے غیر ملکی آقاؤں کو وقتی سہارا دیا اور وہ ہٹلر کے ارادوں کا دلچسپی سے جائزہ لینے لگے۔

**پنجاب کا مسلم پریس** | سیاسیات میں کوئی بات صرف آخر نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے فیصلوں میں کسی قسم کی سختی کا امکان ہوتا ہے۔ اس کے وعدے بھی مہی کے کھلونوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ نہ تو دوستوں کو دشمن بننے میں ہت لگتی ہے اور نہ ہی دشمنی دوستی میں ڈھلتے کوئی وقت لیتی ہے۔ اس پگڈنڈی پر رواں دواں لوگ ہر گھڑی راستہ بدلتے رہتے ہیں۔

پنجاب کا مسلم پریس جو گذرے ہوئے کل مجلس احرار کی تعریف سے اپنے اخبارات کو رونق دے رہا تھا، اپنے کاموں میں اس جماعت کے گیت کا تار با۔ یکایکی الیکشن کے دنوں وہ احرار میں کیڑے نکالنے لگا اور نو مسلم خالد لطیف کا باجے مجلس احرار کی حمایت حاصل تھی کے مخالف خاں بہادر حاجی ریہ بخش کی حمایت میں آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی تعریف پراتر آیا۔

یکم ستمبر ۱۹۴۲ء کے علم برائے کی پالیسی حیران کن تھی کہ سب نے اسی پر اداری نوٹ لکھے۔ خصوصاً روزنامہ آفتاب نے اپنی پالیسی اسی عنوان پر قائم کی۔ یہ اخبار الیکشن کے بعد پھر دیکھنے میں نہیں آیا، حالانکہ اسلامی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ انڈیہ کے خطاب یافتہ کی بجائے نو مسلم کی حمایت کی جاتی تاکہ آئندہ غیر مسلموں پر اس کا اثر رہتا۔ لیکن براہو دنیاوی ضرورت کا کہ صراط مستقیم

سے بڑے انسان کو دیر نہیں لگتی۔

مجلس اطرک کا اس سے زیادہ کوئی قصور نہیں تھا کہ اس نے ایک نو مسلم کو آئندہ انتخاب میں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا۔ اس پر بھی سیاسی طالع آزما ممبروں اور خان بہادروں کا ٹولہ احرار کے خلاف ہم آہنگ ہو کر اکھاڑے میں اتر آیا۔ دراصل اس کے پس منظر میں بھی انگریز دشمنی اور دوستی کا فرما تھی۔ فرنگی حکمرانوں کا وفادار گروہ ذاتی جاہ و عظمت کے لیے اسلام سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی

مولانا ظفر علی خاں خاکساروں سے جا ملے

کائناتِ عالم میں بعض انسانی وجود اس انداز سے داخل ہوتے ہیں کہ

ان کا کوئی نقشِ پاکسی منزل کی نشاندہی نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ سنگِ میل بننے کی بجائے گم کردہ راہ مسافرنِ کرہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی تقدیر کے پوراخوں کو تدریج سے روشن کرتے ہیں۔ لیکن یہ روشنی دیر پا نہیں ہوتی۔ وقت اور حالات کا دامن انہیں ایک ہی ہوا کے جھوٹکے سے گل کر دیتا ہے۔

برصغیر کی متحدہ سیاست میں مولانا ظفر علی خاں کا وجود ان کے کسی محور کی نشاندہی نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ انفرادیت میں وہ بڑی شخصیت تھے۔ لیکن نہ تو وہ سالارِ کاررواں بن سکے اور نہ خباہتِ کاررواں کہ پھیل کر اندھیرے اور اجالوں کو سمیٹ لیتے۔ وہ اپنی ذات میں ایک مستقل انجمن تھے جس کے صدر، خازن اور درکنگ کمیٹی بھی خود ہی تھے۔

روزنامہ "زمیندار" ان کے قلم کا مہربون منت تھا۔ وہ جیت تک صحافت کے آسمان پر رہا، ان کی انفرادیت ہی اور جیسے ہی مولانا ظفر علی خاں ابدی نیند سوئے یہ ادارہ اسی طرح دم توڑ گیا جیسے اس کا وجود تھا ہی نہیں۔ یہ کیوں؟ ربحِ صدی تک ہندوستان سے باہر تک جو اخبار صدائے برس رہا۔ کفر کے دل دہل جاتے رہے لیکن آج تلاش پر بھی اس کا ایک ورق دستیاب نہیں۔ کیوں؟ یہ اس سیمبالی طبیعت کا نتیجہ ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور بہ راہ رو کے ساتھ  
 پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بہر کو میں  
 مولانا موصوف ہر صبح ایک جماعت کی تشکیس کرتے اور غروب آفتاب کے ساتھ  
 اسے اپنے ہاتھوں دفن کر دیتے۔ ہاں! فرنگی حکمرانوں کے خلاف اور مرزائیت سے ان کی  
 جنگ خلوص پر مبنی تھی۔ اس میں انہوں نے کبھی ہار قبول نہیں کی۔ اس راہ میں مصائب آئے  
 تو انہیں قبول کیا۔ مگر اس میدان میں بھی یک و تہا رہے۔ ان کے مجموعہ کلام (گلستان اور  
 بہارستان) ان کی تلون مزاج طبیعت کے زندہ گواہ ہیں۔ ایک صفحہ پر اگر کسی کی تعریف ہے  
 تو دوسرے پر اس کی بھجڑ موبود ہے۔ یہاں وہ ہے کہ ناشران آج بھی ان کی اشاعت سے جی  
 چراتے ہیں۔ اور اگر کسی لے یہ جرأت کی بھی تو اس کے سرمائے کو ویک نے چاٹ لیا۔

۲۔ ستمبر ۱۹۳۲ء کے زمیندار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حضرت مولانا ظفر علیخان خاکسار  
 تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس کی تفصیل میں روزنامہ زمیندار لکھتا ہے کہ:

”پچیس خاکساروں کا ایک قافلہ میکلوڈ روڈ پر مولانا ظفر علیخان کی خدمت  
 میں سلامی کے لیے حاضر ہوا۔ تو مولانا دفتر زمیندار سے نکل کر سر و قد سڑک پر  
 کھڑے ہو گئے۔ گیارہ گولوں کی سلامی دی گئی۔ سالانہ قافلہ نے آگے بڑھ کر مولانا  
 کی خدمت میں بیچہ پیش کیا۔ اس کے دوسرے سالانہ نے تحریک خاکسار کے  
 دستور العمل کی ایک کاپی پیش کی۔ اس کے بعد علامہ مشرقی نے مولانا کے بازو  
 پر انوث کا نشان لگایا۔ اس کے بعد مولانا نے قلعہ گوہر سنگھ تک خاکساروں کے  
 ساتھ پریڈ کی۔“

اس واقعہ پر سے کئی سال گذر گئے۔ یہ سوال محترم بنارہا کہ مولانا ظفر علیخان کی حالی حال کیا  
 میں کیسے شریک ہو گئے؟

۲۲۔ دسمبر ۱۹۴۰ء کو مصنف کی ملاقات خاکسار تحریک کے سرگرم رکن مسٹر مفدر سلیمی سے  
 ان کے دفتر واقع شاہ عالم مارکیٹ لاہور میں ہوئی۔ گفتگو کے دوران مفدر سلیمی نے  
 کہا کہ مولانا ظفر علیخان خاکسار تحریک میں اس لیے شامل ہوئے تھے کہ مولانا ظفر علیخان اپنی ذہن

کے منفرد آدمی تھے۔ کانگریس اور اہوار سے جب ان کا بھانہ ہو سکا تو انہوں نے مسلم لیگ کی طرف توجہ دی اور ان دنوں مسلم عوام میں نئی تنظیم کے تحت ابھر رہی تھی۔ لیکن قائد اعظم محمد علی جناح نے جو مولانا ظفر علی خاں کی تلون مزاج طبیعت سے واقف تھے اس پر آمادہ نہ ہوئے تب انہوں نے خاکسار رہنما علامہ مشرقی سے رابطہ قائم کیا اور اس طرح وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ نوٹ: تحریک خاکسار کیا ہے؟ اس کے متعلق آئندہ اوراق میں پڑھیں۔

**ایک تجربہ** متحدہ ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی شخصیت بھی بڑی دلچسپ رہی۔ کانگریس کے ابتدائی ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس جماعت کے لیے مہاتما بڑی روح تھے۔ سیاسیات کے سفر میں جہاں کہیں انہیں اپنی ذات کے لیے خوف پیدا ہوا یا خطرے کا کوئی موڑ آتا۔ فوراً مرن برت رکھنے کا اعلان کر دیتے۔ اس سے ہندو جاتی کا دل اس مہاپرش کے لیے ہل جاتا اور وہ ان کی کسی غلط روش کو بھول کر ان کے پیرن چھونے لگتی۔

کانگریس اور سوریج پارٹی کے مابین کشمکش ہوتے ہوئے پنڈت مالوی کے ساتھ بھی گاندھی کا اختلاف کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ دوسری طرف پنڈت مالوی نے اپنی نیشنلسٹ پارٹی کا الحاق و پروردہ ہندو مہا سبھا سے کر لیا تھا۔ اس سرخ رطانی میں گاندھی جی کو اپنی پوزیشن کو قدرے نقصان کا احتمال نظر آنے لگا۔ ایسے خطرے کو بھانپ کر پہلے تو انہوں نے مرن برت رکھنے کا اعلان کیا اور پھر ۵۔ ستمبر (۱۹۳۲ء) کو اخبارات میں ایک بیان کے ذریعے کہا کہ وہ کانگریس سے علیحدگی پر غور کر رہے ہیں۔

۱۱۔ ستمبر کو حکومت پنجاب نے نوجوان بھارت سبھا، کرتی کسان پارٹی، کسان لیگ اور ڈسٹرکٹ کسان سبھا کو خلافت قانون قرار دے دیا ان سب کے دفاتر سمز بھر کر دیے گئے اور ان کے رہنما سزدار گوردت سنگھ اور فیروز دین منصور کے مکانوں کی تلاشیاں لی گئیں۔ اس واقعہ کے بعد خلافت قانون جماعتوں کے درکار بظاہر کانگریس سے مل کر کام کرنے لگے اور انہی لوگوں نے آگے بڑھ کر گاندھی جی کو ان کے ارادوں سے باز رکھا۔

**ہندو مسلم اتحاد کا جدید نعرہ** احرار اور دیگر نیشنلسٹ مسلمانوں کو محض اس جرم میں مسلم عوام نے مجرم ٹھہرایا کہ یہ ہندوؤں سے مل کر

مسلم مفاو کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ حالانکہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد محض انگریزوں کو ہندوستان سے نکلانے کے لیے ہم اور ضروری طریق کار تھا کیونکہ اس کے بغیر ایشیا اور اٹل ایسٹ کا مسلمان برطانیہ سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن فرنگی کے خطاب یافتہ خصوصی مسلمان گروہ نے ان لوگوں کی رسوائی میں کوئی کسر اٹھانے رکھی لیکن اپنی سیاسی اور ذاتی اغراض کے تحت خود بھی اسی بزم کے ترکیب ہوئے۔

نواب سر اکبر حیدری وزیر مالیات حکومت حیدرآباد دکن نے ممبئی میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس میں اپنے خطبہ عداوت میں ہندو مسلم اتحاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

”یہ فسادات کہلانے کو تو مذہبی کہاوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب سے ان کو بعید سے بعید تعلق بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کے فسادات مسلمان بادشاہوں، ہندو راجاؤں، برہمن پیشواؤں اور غرض کہ کسی عہد میں بھی نہیں ہوئے۔ کیونکہ خود پیشواؤں کی حکومت میں مساجد کا احترام کیا جاتا تھا ان کے سامنے باجا نہیں بجایا جاتا تھا اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہرگز نہیں کی جاتی تھی۔ داسکے چل کر آپ نے ان شرانگیز کتب تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے کہا، جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔“

ان شرانگیز کتب کے باعث نہ صرف ہم اپنی تاریخ سے بے خبر رہتے ہیں، بلکہ مختلف قوموں کے درمیان فساد اور منافرت کی تخم ریزی بھی ہوتی ہے اس کے لیے ایسی کتابوں کو جلد سے جلد تعلیمی اداروں سے خارج کر کے ان کی جگہ ایسی کتب کو ذریعہ تعلیم قرار دینا چاہیے جن کے مطالعہ سے ہندو اور مسلمانوں میں حسین تعلقات پیدا ہوں۔ اور وہ اپنی تاریخ صحیح سے بھی واقف ہوں۔

— خطبہ کے آخری حصہ میں انہوں نے کہا،

جو قومیں دوسری قوموں کو قربان کر کے خود طاقت حاصل کرنا چاہتی ہیں وہ خودکشی کی ترکیب ہوتی ہیں۔ کیونکہ قوموں کا وجود اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے باہم ایک دوسرے سے وابستہ ہوتا ہے۔“

(روزنامہ انقلاب ۱۵ ستمبر ۱۹۹۲ء)

اگر یہ اجلاس مشترک طلباء کا ہوتا تو یہ بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ سر اکر حیدری نے مصدقہ  
ہندو مسلم اتحاد کی بات کہی ہوگی۔ لیکن یہ تعلیمی کانفرنس صرف اور صرف مسلم طلباء کی تھی۔ اس میں  
ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ کیا معنی رکھتا ہے؟

ہندوستان کی متحدہ پارلیمانی سیاست  
اور وہاں میں ایک ایسے موڑ پر

## تحریک شاتم رسول کی صدائے بازگشت

آئی کہ حالات کا تانا بانا از سر نو بکھر گیا۔ ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج کے بغیر ہر سیاسی جماعت نئے  
انتخاب کی تیاریوں میں تھی۔ ان دنوں ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو قصور ضلع لاہور کے مسلمان نوجوان  
محمد صدیق نے پالارام نامی ہندو کو اجب کہ وہ عدالت میں اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے  
حاضر تھا، قتل کر دیا۔ مقتول پر اسلام اور داعی اسلام صلعم کی توہین کا الزام تھا۔ قاتل گرفتار کر  
لیا گیا۔ اس سے پیشتر ۲ ستمبر کو کراچی میں ہمارے نعتورام کو عبدالقیوم نے سیشن جج کے روپر موت  
کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دعتورام نے بھی حضور کی توہین کی تھی اور اس جرم میں نعتورام کو صرف  
آٹھ ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ جس پر مجرم نے سیشن جج کی عدالت میں اس سزا کے خلاف اپیل دائر  
کر رکھی تھی۔ عبدالقیوم کو گرفتار کر لیا گیا اور اس نے اپنا جرم مان لیا۔

ان واقعات نے تحریک شاتم رسول کی بھولی لبری یاد از سر نو تازہ کر دی۔ شدھی اور  
سنگٹن کی تحریک کے دوران ۱۹۲۴ء میں آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا نے خاتم النبیین کی توہین  
کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس پر لاہور کے غازی علم الدین نے راجپال کو قتل کیا تھا جس نے نگلیلا  
رسول (نعوذ باللہ) نامی کتاب شائع کی تھی۔

ہندوؤں کی ان تازہ اشتعال انگیز حرکات نے نیشنلسٹ مسلمانوں پر بھی اثر کیا چنانچہ  
دہلی جمعیتہ علمائے ہند، اور کانپور جمعیتہ علمائے ہند نے اپنے بڑی اختلاف ختم کر کے ان  
فتنہ انگیزوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

۳۱ ستمبر کو مراد آباد کے اجلاس میں مسلم یونیٹی بورڈ نے جمعیتہ علمائے ہند (دہلی) کا یہ  
مطالبہ تسلیم کر لیا کہ بورڈ شریعت کے معاملات میں جمعیتہ کا مشورہ قبول کرے گا۔ اس پر جمعیتہ نے  
۳ ستمبر کا ریزولوشن واپس لے لیا۔ مگر کانپور جمعیتہ علمائے ہند کے سیکرٹری مولانا منظر الدین نے اس کی



تردید کر دی۔ اور ساتھ ہی اپنی جمعیت کا اجلاس طلب کر لیا۔ جس میں مولانا عنایت اللہ فرنگی محل، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا شاہ محمد سلیمان، ڈاکٹر سر محمد اقبال، خان بہادر حافظ ہدایت حسین، سابق صدر مسلم لیگ، ڈاکٹر شفاعت احمد الہ آبادی، مولانا شفیع داؤدی (مدیر اس مولانا غلام رسول قہر) ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور، مولانا سید حبیب (ایڈیٹر روزنامہ سیاست لاہور) کو شرکت کی دعوت دی گئی۔

اس اجلاس میں مسلم یونیٹی بورڈ کی حمایت کا فیصلہ ہوا۔ مگر جمعیت علمائے ہند (دہلی) سے

علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

اگر علماء کے یہ دونوں دریلوی اور دیوبندی گروہ ایک ساتھ رہ کر اس وقت کی فرقہ وارانہ سیاست میں دشمنان ملت کا سامنا کرتے تو ان شہداء کی ارواح مسرور ہوتیں جنہوں نے شاتم رسول کو قتل کر کے شہادت پائی تھی۔ نیز کفر انگ پریشان رہتا۔ لیکن تن آسان اور رحمت پسند و ڈیڑوں نے غیر ملکی حکومت کے اشارہ پر اس عمارت کا انہدام ضروری سمجھا جانا کہ اس اتحاد کی بنیاد انگریز دشمنی پر نہیں، ہندوؤں سے تیرد آزما ہونے پر تھی۔ مگر برطانیہ کے لیے یہ اتحاد بھی گراں گذرا اور اس نے اپنے دلالوں کے ذریعے بنا بنایا سووا بگاڑ دیا اور یہی بگاڑ آئندہ کی سیاست پر بھی اثر انداز ہوا۔

میاں سرفضل حسین پنجاب کے زیرک سیاستدان تھے۔ وہ جب تک سرکاری طور پر سیاسی میدان میں رہے، ہندو آئیڈیوں سے ان کی

سرفطر اللہ کا تقرر

ٹھنی رہی۔ بلاشبہ وہ مسلمانوں کے بہادر دتھے لیکن انگریزوں کے مفاد تک۔ اس سے آگے اپنی ذات کے مفاد رکھتے۔ مذہب سے زیادہ سیاسی بساط کے کسار ہی تھے۔ ہر مہرہ سوچ اور فکر سے اٹھاتے۔ ایک دفعہ کی چال کے بعد اس پر غور کرنا ان کی توہین تھی۔ والٹر نے کی ایگزیکٹو کونسل سے علیحدگی کے بعد انہوں نے سرفطر اللہ کو اپنا جانشین منتخب کرنا چاہا۔ برطانوی مفاد کے نگہدار کی حیثیت سے سرفضل حسین پنجاب میں سرفہرست تھے۔ مسلمانوں کی تجویز پر والٹر نے لے سرفطر اللہ کو اپنی کونسل میں لینا منظور کر لیا۔

پیشتر ایں جب یہ نجر مجلس اجلاس تک پہنچی کہ سرفطر اللہ کو مسلمان نمائندہ کی حیثیت سے والٹر نے کی ایگزیکٹو کونسل میں نمائندگی دی جا۔ بی ہے لو اس پر بڑی سے سے ہوئی

ملک بھر میں قراردادیں پاس ہوئیں، جلوس نکالے گئے کہ یہ سٹیٹ مسلمان کی ہے! اسے مسلمان کے سپرد کیا جائے۔ مگر نہ تو سر فضل حسین نے اس تجویز پر نظر ثانی کی اور نہ انگریز حاکم نے اس پر توجہ مناسب سمجھی۔ اس ضمن میں احوار کا ایک وفد وائسرائے سے ملا، جس میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، میر احمد حسین شملہ اور الہ آباد ہائیکورٹ کے وکیل مسٹر مہراجہ کاظمی شامل تھے۔ وائسرائے نے وفد کے جواب میں کہا کہ:

”آپ ظفر اللہ کو مسلمان قرار نہیں دیتے لیکن وہ مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہو کر آیا ہے“

سر ظفر اللہ کو دوسری حمایت حاصل تھی۔ ایک طرف سر فضل حسین تھے تو دوسری طرف ان کی ٹائیڈز پر قادیانیوں کی برطانوی وفاداری کا رفا تھی۔ آخر ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۴ء کے اخبارات میں سرکاری اعلان کے ذریعہ چودھری سر ظفر اللہ کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن نامزد کر دیا گیا۔

گاندھی کا کانگریس سے استعفیٰ | آخر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ ساتھ گاندھی نے ۱۰ اکتوبر کو اپنے بیان میں کہا:

”چونکہ کانگریس میرے پروگرام کے مطابق کھدر پہننے، سوت کاتنے اور پر امن جدوجہد پر یقین نہیں رکھتی۔ لہذا میں آل انڈیا کانگریس کے اجلاس سے فارغ ہو کر کانگریس سے مستعفی ہو جاؤں گا۔“

گاندھی جی کی یہ سیاسی دھمکی وقتی طور پر کارگر رہی اور آخر کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کے چرن چھو لیے۔

لیگ اور مسلم کانفرنس کے امیدوار | سال رواں کی رونما د کو اہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں نے اس سال کوئی غیر آئینی برائی

نہیں کی۔ یہ سال صرف پارلیمانی بحث میں بیت گیا۔ ہر جرحیت خواہ اس کا دائرہ کار محدود تھا یا وسیع، اپنی اپنی حدود میں آئندہ الیکشن کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ جیسے جیسے انتخاب کے دن قریب آتے گئے جماعتیں بکھر کر سامنے آتی گئیں۔ پچاس سو سب سے پہلے ۱۰ اکتوبر کے اخبارات

میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مسٹر محمد علی جناح بمبئی کے شہری حلقہ سے انتخاب لڑیں گے۔ (یاد رہے کہ ہنوز قائد اعظم لندن میں قیام رکھتے تھے۔)

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو علیگڑھ سے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے مشترک پارلیمنٹری بورڈ نے حسب ذیل حضرات کو الیکشن میں اسمبلی کے امیدوار منتخب کیا۔

- |                            |                       |                         |
|----------------------------|-----------------------|-------------------------|
| ۱۔ ایم۔ اے۔ جناح           | ۲۔ سیٹھ عبداللہ دارون | ۳۔ نواب سر سید مر شاہ   |
| ۴۔ ڈاکٹر غلام بھیک نینگ    | ۵۔ مخدوم سید ابن بخش  | ۶۔ میجر طالب مہدی خاں   |
| ۷۔ خاں بہادر حاجی رحیم بخش | ۸۔ سر محمد یعقوب      | ۹۔ خاں بہادر وجیہ الدین |
| ۱۰۔ اے۔ ایچ۔ غزنوی وغیرہ   |                       |                         |

اسی روز ۱۷ اکتوبر کو لاہوری مرزائیوں نے اپنے اجلاس میں مندرجہ بالا امیدواروں کی

حمایت میں مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی ہمنوائی کا اعلان کر دیا۔

قادیان میں مرزائیوں نے اپنی اکثریت کے زعم میں انسانییت پر جو ظلم روا رکھا اور اس قصبہ کی غیر مرزائی آبادی کو جس طرح پریشان

## قادیان احرار کانفرنس

کیا تاریخ اس کا جواب مہیا نہیں کرتی۔ رائج الوقت قانون کی موجودگی میں خلیفہ قادیان کے گھر پر آئین اہل کی روشنی میں اپنے مخالفوں کا قتل عام مسلمان اور غیر مسلموں سے اقتصادی مفاہات اور محصوم عصمتوں کی ہلاکت، اقصیٰ خلافت میں باخلاق سوز حرکات کا ارتکاب۔

برطانوی حکومت مرزائیوں کے ان جرائم سے تنگ آچکی تھی۔ بین الاقوامی طور پر اس

کی اپنی شہرت کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ لیکن قادیانیوں کی تاریخی وفاداریوں کے باعث ان کے

خلافت قانون کو حرکت میں لانا مشکل تھا۔ لیکن جیسے ہی مجلس احرار نے ۲۱-۲۲-۲۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء

کو قادیان میں اہل کانفرنس کرنے کا اعلان کیا۔ حکومت کو موقع مل گیا کہ وہ اس والدین کی طرح

جو کبھی کبھار اپنے لڑے بیٹے کو سزا کے طور پر غیر دل سے پھرتے ہیں، احرار کو قادیان میں

کانفرنس کرنے کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی ۱۸ اکتوبر کو پولیس نے قادیانیوں کی خانہ

تلاشی لی تو ان کے قبضے سے کافی مقدار میں برچھے، کلہاڑیاں اور اسی قسم کا دوسرا اسلحہ برآمد ہوا۔

۱۹ اکتوبر کے اخبار سول اینڈ میگزین لاہور کے نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق حکومت پنجاب

تے قادیان میں احرار کانفرنس کی تیاریوں کے پیش نظر قادیان کے گرد و نواح میں وقوعہ ۱۴۴ کے تحت مندرجہ ذیل احکام نافذ کیے۔

۱۔ کانفرنس میں شامل ہونے والے حضرات لاٹھیاں یا تیز دھار کی کوئی ایسی چیز لے کر شہر میں نہ پھریں۔

۲۔ کانفرنس کے دوران قادیانی اپنا کوئی اجتماع منعقد نہ کریں۔ جس سے فساد کا خطو ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ خلاف قانون تصور ہوگا۔

۳۔ اسی طرح احرار کو بھی احتیاط کر دیا گیا کہ وہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار یا لاٹھی وغیرہ نہ لائیں۔

۴۔ کانفرنس کے منتخب صدر کے جلوس کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔

۵۔ مرزا بشیر الدین محمود کو نوٹس کے ذریعے کہا گیا کہ وہ باہر سے قادیانی نہ منگوائے۔

احرار کانفرنس شہر سے ایک میل باہر ڈھی۔ اے۔ وی ہائی سکول کے ساحطہ اور گراؤنڈ میں ہوگی

چار سو سے زائد پولیس کی نفری قادیان میں پہنچ چکی ہے۔ مزید ایک دو دنوں میں پہنچا دی جائیگی۔

اپنے طور پر انتظام کے لیے انسپکٹر جنرل پولیس اپنے دیگر عملے کے ساتھ قادیان پہنچا اور

اس نے حالات کا معائنہ کیا۔

۲۰۔ اکتوبر کی اطلاع ہے کہ اس وقت تک سینکڑوں کی تعداد میں احرار رضا کار کانفرنس میں

شمولیت کے لیے قادیان پہنچ چکے ہیں۔ ان کی سرخ وردیاں عجیب بہار دکھا رہی ہیں۔ پولیس

کے عمائد، مجسٹریٹ اور دوسرے اعلیٰ افسروں نے کانفرنس کے پرنڈال کے قریب ڈیرہ جمایا ہے۔

کانفرنس کے لیے بازار لگ رہا ہے اور دکانیں بنائی جا رہی ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر ریوے حکام نے اعلان کیا کہ لدھیانہ اور لاہور سے خاص گاڑیاں

قادیان کانفرنس میں شامل ہونے والے عوام کی سہولت کے لیے چلائی جائیں گی۔ یہ گاڑیاں

امرتسر ریوے اسٹیشن تک کے لیے ہوں گی۔ یہاں سے ۲۱ اکتوبر صبح گیارہ بجے سپیشل ٹرین

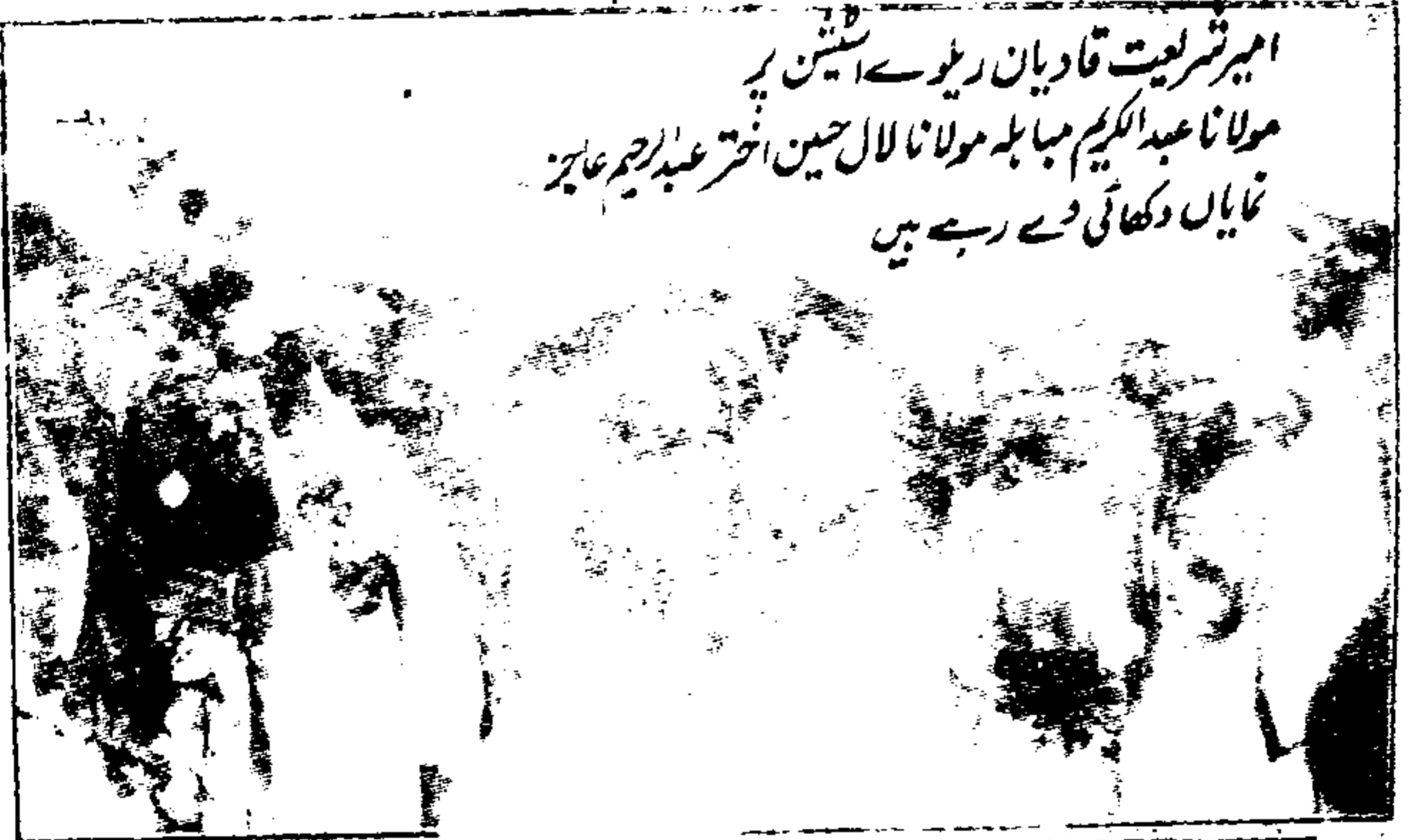
چلے گی جو تمام مسافروں کو لے کر راستہ بٹالہ قادیان ریوے اسٹیشن پر پہنچے گی۔

چنانچہ پشاور سے گوجرانوالہ تک کے لوگ لاہور سے سوار ہوئے۔ دہلی کے لوگ لدھیانہ

ریوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ جہاں سے وہ امرتسر پہنچے۔ اس طرح قریباً چالیس ڈبوں پر مشتمل

اگر اسپیشل ٹرین ۲۱۔ اکتوبر صبح گیارہ بجے امرتسر اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ اس میں کانفرنس کے منتخب صدر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ہزاروں سرخپوش افراد رضا کار سوار تھے۔ ٹرین کے دونوں جانب انجن تک اگر کے سرخ پرچم لہرا رہے تھے۔ اگر پرچم کی اڑانوں نے قادیانیوں کے چہروں کی نیگت اڑادی تھی۔ قصرِ خلافت کے مینار اڑیوں کے بل اچھل اچھل کر اگر اسپیشل ٹرین کا نظارہ کر رہے تھے۔ قادیان کا سونناں اگر غزنوی کے قدموں میں ڈھیر ہو رہا تھا۔ قادیان کے مسلمان اسکھ اور بندو اس دن کو یومِ نجات کہہ کر خوشی منا رہے تھے۔

کفر اپنی تمام حشر سامانیوں کے باوجود رزہ براندام تھا کہ ٹھیک ڈیڑھ بجے اگر اسپیشل ٹرین



امیر شریعت قادیان ریلوے اسٹیشن پر  
مولانا عبدالکیم مہتابہ مولانا لال حسین اختر عبدالرحیم عابز  
نمایاں دکھائی دے رہے ہیں

امیر شریعت رضا کاروں کے جلاؤ میں  
پنڈال کی طرت جا رہے ہیں۔



عبدالاحرار فادیان کا فرس



احرار رضا کار



ریلوے ٹرین کا ایک ڈیرہ فادیان ریلوے سٹیشن پر

قادیان ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ رضا کاروں کے علاوہ سینکڑوں انسانوں کا سمندر امیر شریعت کے استقبال کے لیے اُٹ آیا۔ دیہاتی اور شہری علوم نے صدر کانفرنس کو اپنے جلو میں لے لیا۔ مولانا عبدالکلام صاحب جن کے مکان ۱۹۳۰ء میں بلا دیے گئے تھے اور وہ خاندان سمیت قادیان سے ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے، جب امیر شریعت کی رہنمائی میں قادیان کی طرف روانہ ہوئے تو یوں گنگنا جیسے کوئی فاتح، مفتوح کے ملک میں داخل ہو رہا ہے! ایشیا سے کانفرنس کے پنڈال تک دو سہل کا راستہ حواہ رضا کاروں کے چاق و چوبند دستوں میں عجیب رونق دے رہا تھا۔

۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ جب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور بشیر الدین محمود کا امرتسر میں آنا سامنا ہوا تھا، تو کفر اس دن بھی شکست کھا گیا تھا۔ اور آج نوسال کے بعد حق و باطل میں پھر معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔

قافلہ سالار، افواج ایمان کے ساتھ قادیان کے لات و سہل پر حملہ آور ہے۔ نماز ظہر پنڈال میں ادا کی گئی۔

دیگر مہمانوں کے علاوہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی دیوبند مفتی نقیہ اللہ مدنی مولانا ثناء اللہ امرتسر، مولانا ظفر علیخان (لاہور) حکیم نور الدین (لاہور) مولانا ابوالوناس صاحب مولانا عبدالرحیم پوپلزئی (مفتی سرحد) مولانا احمد علی لاہوری قابل ذکر ہیں۔ پنڈال سے باہر مٹھانی کی دکانیں، کھانے کے بوتلے اور موسم کی زبردستی اشیاء بوجھ کر کانفرنس کا پہلا اجلاس نماز عشا کے بعد شروع ہوا۔ صدارت کی تحریر اس وقت جاری تھی۔ ان کی تائید میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ ان کے بعد حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کرسی صدارت سنبھالی۔ قرآن کریم کی تلاوت کے بعد راقم (جانباز مرزا، اورنگ آباد) عبدالرحیم عابتر نے اپنے کلام سے موسم سرما میں گرمی کی سہی حدت پیدا کر دی۔ آسمانوں سے ستارے زہرہ اور مشتری کو ساتھ لیے رات کے اندھیرے میں منہ چھپائے منتظر تھے۔ بھینگی ہوئی رات کا دامن کانفرنس کے مہمانوں کو اپنی پناہ میں لیے سگھرا ہوا تھا۔ پنڈال میں روشنی چراغ اپنی نودورت تک دیکھ رہے تھے کہ قصر باطل کی ایسا ایک اینٹ میں سینکڑوں راہ آچکے ہیں۔ صدر کانفرنس نے اپنا خطبہ شروع کیا۔ انسانوں کے دل گوش برآواز ہو گئے۔ نکالیں

جاگ اٹھیں۔ انسان سوچ و فکر میں ڈوب گئے۔ فضا ساکت ہو گئی کہ بخاری بول رہا ہے۔  
 رات یوں ہی بیت گئی۔ صبح صادق نمودار ہوئی۔ تارے جمائیاں لینے لگے۔ کہ دور  
 سے موذن نے پکارا۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔



(عبدالکریم سیال کا وہ مکان جسے ۱۹۳۰ء میں مرزا بیوں نے جلادیا تھا)

رات گیارہ بجے سے صبح چار بجے تک اس پنڈال میں شاہ جی نے کیا کیا۔ ریہ پوری تقریر  
 مصنف کی دوسری کتاب حیات امیر شریعت میں شائع ہو چکی ہے۔  
 کانفرنس کے آخری اجلاس ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں حسب ذیل قراردادیں منظور ہوئیں۔  
 قرارداد نمبر ۱۔ چونکہ مرزا غلام احمد قادیانی نے صاف الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ جو شخص  
 مجھے نبی تسلیم نہ کرے وہ اسلام سے خارج ہے اور تمام دنیا کے اسلام کے  
 علماء مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کے دعویٰ نبوت اور دیگر دعاوی و عقاید کفریہ  
 کی بنا پر اسلام سے خارج اور مرتد سمجھتے ہیں۔ اس لیے یہ کانفرنس حکومت سے



مطالبہ کرتی ہے کہ تمام مرزائیوں کو مردم شماری میں مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے۔  
(محرک) مولانا ظفر علی خاں

(موبید) مولانا ابوالوفا شاہ جہانپوری، مولانا محمد مسعود ایڑوی، مولانا محمد مسلم فاضل دیوبند۔  
قرارداد نمبر ۲۔ ”چوہدری ظفر اللہ خاں کے تقریر کے خلاف احتجاج“

تبلیغ کانفرنس کا یہ نمائندہ اجلاس آٹھ کروڑ مسلمانان ہند کے مسلسل احتجاج کے باوجود ظفر اللہ خاں قادیانی کو جو اپنے عقیدے کی رو سے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتا ہے سارا جس کو تمام مسلمان قادیانی عقائد کی وجہ سے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ دائرے کی مجلس منتظمہ میں اسلام کے نام پر رکن مقرر کیے جانے کو انتہائی رنج اور نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

اس کانفرنس کی رائے میں حکومت نے متفقہ صدارتے انتباہ کو جو مسلسل دواہ سے بلند ہو رہی ہے، ٹھکرا کر ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات و احساسات سے بے اعتنائی حکومت کا شیوہ ہو گیا ہے اور وہ مسلمانوں کو مجبور کر رہی ہے کہ نہ یہ اعلان کر دیں کہ حکومت اپنے سیاسی مسلک کی تکمیل کے لیے قادیانیت کو نذر دے رہی ہے اور قادیانی عقاید کو اپنی قوت سے مسلمانوں کا سرکاری مذہب بنانا چاہتی ہے۔ جس کو مسلمانوں کی تمام مذہبی جماعتیں اسلام کے لیے ایک ہونناک خطو تصور کرتی ہیں۔

مسلمانان ہند کا یہ اجتماع اپنے اس عزم بالجزم کا اعلان کرتا ہے کہ جب تک حکومت چوہدری ظفر اللہ خاں کے تقریر کو منسوخ کر کے اپنی قادیانیت نواز پالیسی میں تبدیلی نہیں کرتی، مسلمانان ہند اپنے احتجاج کے سلسلہ کو برابر جاری رکھیں گے۔

اس کانفرنس کی رائے میں حکومت کے اس فیصلہ میں کہ دائرے کی ”مجلس منتظمہ“ میں مسلمانان ہند کے شدید احتجاج کے باوجود چوہدری ظفر اللہ خاں کو مقرر کیا جائے، سرفضل حسین کے مشورہ اور مساجی کو بہت بڑا دخل ہے، بولسلا

کے ساتھ کھلی ہوئی غداری ہے۔ یہ کانفرنس بفضل حسین کے اس فعل کو نہایت نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس کیخلاف اپنے عدم اعتماد کا اظہار کرتی ہے۔“

(محرک) مولانا حسین احمد مدنی مدرس دارالعلوم دیوبند۔

(موتیدین) مولانا میر محمد منظر قیوم سجاوہ نشین۔ مکان شریف۔ ضلع گورداسپور۔

مولانا ظہور الحق شاہ۔ کرنال۔ گورداسپور۔ مولانا حکیم نور الدین لائپوری۔ مولانا

ظہور احمد بگوتی۔ مولانا محمد بخش خطیب جامع مسجد راولپنڈی۔ چوہدری عبدالرحمن

ایم۔ ایل۔ سی۔ رامپور۔

(روزنامہ زمیندار لاہور۔ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء)



(مولانا عبدالکریم مہا بلہ ایڈیٹر ہفت روزہ ”مہا بلہ“)



(دکنہ مرزائیت کی سر زمین قادیان میں مجلس احرار کا روح پرور پٹنہ)

کفر ویسے بھی بڑا دل ہوتا ہے، تاہم قانونی پابندیوں کے باعث کانفرنس کے دنوں کسی قادیانی کو گھر سے باہر نکلنے کی جرات نہ ہوئی اور نہ اجازت تھی۔ ان دنوں تمام قادیان ویرن ڈھکی دیتا تھا۔ مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے حکومت خود پریشان تھی۔ بنا بریں قادیان میں کانفرنس کی اجازت دینے میں حکومت نے کوئی خاص پابندی نہیں لگائی اور اس موقعہ کو غنیمت جان کر کفر پر چڑھ دوڑے۔

اس کانفرنس کے بعد قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک لمبی کھینچ لکھی اور اس طرح احرار کا قادیانیوں پر یہ پہلا بھرا پور حملہ تھا۔

سانپ اگر ایک دفعہ زخم کھا جائے تو پھر چیونٹیاں بھی اسے چدیں نہیں لینے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا اپنا زہر ہی اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔

مجلس احرار سے چوٹ کھا کر مرزا بشیر الدین محمود نے زخمی سانپ کی طرح اپنے زخم

چاٹتے ہوئے کہا:

”وہیں جب تک ان افسران کو جنہوں نے ہم پر ظلم کیے ہیں انہیں سزا نہیں

دی جاتی یا وہ معافی نہیں مانگ لیتے۔ ہماری حکومت سے صلح نہیں ہو سکتی۔  
 میں نے کانگریس کی تحریک کو خوب غور سے دیکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ  
 کانگریس ایک ایسی سکیم تیار کر رہی ہے جس سے گورنمنٹ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ میدان  
 سے ہٹ گئی ہے۔ مگر عنقریب وہ گورنمنٹ (برطانیہ) کو ایسی مشکلات میں  
 ڈال دے گی جس سے پھر اسے وفاداروں کی ضرورت محسوس ہوگی اور ہم پھر اپنے  
 جھگڑے کو ایک طرف رکھ کر اس کی مدد کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ مگر حکومت نے  
 قادیان میں اوزار کانفرنس کی اجازت دے کر ہمیں سبق دیا ہے کہ اس سے صودا کیے  
 بغیر تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ ہم خود بھی آئندہ حکومت سے صودا کریں گے اور دوسروں  
 کو بھی صودا کا سبق پڑھائیں گے۔

سوائے اس صورت کے کہ حکومت کی طرف سے ہم پر جو ظلم ہوا ہے۔  
 اسے دور کر دے، تب ہمارے تعلقات پہلے کی طرح ہو جائیں گے۔ لیکن اگر  
 ایسا نہ ہوا تو ہماری مدد صودا کرنے کے بعد ہوگی۔ اور ہم اپنی خدمات کا معاوضہ طلب  
 کریں گے اور اس جھگڑے کے خاتمے پر پھر اپنی ہمتک کا سوال گورنمنٹ کے سامنے  
 رکھیں گے اور اس سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ہمارے ہمتک کا ازالہ کرے اور یہ جھگڑا  
 اس وقت تک جاری رہے گا جب تک گورنمنٹ سے اپنا حق نہ لے لیں گے۔

(مرزا محمود۔ اخبار "الفضل" ۲۱۔ نومبر ۱۹۳۳ء)

مرزائی لیڈر کو یہ باتیں کہنے کا حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء سے تا آن اس گروہ نے اسلام  
 اور ہندوستان سے غداری کرتے ہوئے انگریزوں کی جو خدمات انجام دیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ قادیان میں ان  
 کی بادشاہت قائم کر دی جاتی۔ اٹا اوزار کے ہاتھوں اس گروہ کی گوشمالی کر دی۔ لیکن وہ بھی فرنگی تھا۔  
 خوب جانتا تھا کہ خدا بہر حال خدا ہے۔ اگر اپنے ملک اور مذہب کے نہیں بنے تو ہمارے کب ہو سکتے ہیں  
 کانگریس ہائی کمان میں تبدیلی | اوزار رہنما قادیان کانفرنس سے فارغ ہوتے تو اخبارات  
 میں دوئی خبریں دیکھنے میں آئیں! اول یہ کہ مگر محمد علی جناح  
 بمبئی کی شہ می سیٹ سے بلا مقابلہ سنٹرل اسمبلی کیلئے کامیاب ہو گئے (خود ہنوز لندن میں تھے)

دوسری خبر یہ تھی کہ گاندھی جی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے روبرو بیان دیتے ہوئے ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو کہا:

”ہندوستان کے لیے کامل سوراخ کے حصول اور سول نافرمانی کے لیے میرے نزدیک جن دو شرائط کی ضرورت ہے وہ آپ کے نزدیک ضروری نہیں۔ مثلاً آپ اس بات کو اچھی طرح باور نہیں کرتے کہ پرتھو کاتنے سے اس طاقت میں کس طرح اضافہ ہو گا جو حصول سوراخ کے لیے ضروری ہے۔“

میں ان مسائل پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لہذا کانگریس سے علیحدہ ہوتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میں تنہا گیا ہوں یا یوں ہو چکا ہوں۔ بلکہ اس لیے علیحدہ ہوا ہوں تاکہ میں دیکھ سکوں کہ میری علیحدگی کے بعد میری اور آپ کی پوزیشن کیا ہے؟ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ میں کوئی نئی پارٹی بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جیسا سٹھ سال کی عمر میں اب میں یہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

کانگریس میں غیر سیاسی عناصر کی آمد نے، مہاتما گاندھی کے سیاسی اور عدم تشددی پالیسی کو سخت متاثر کیا تھا۔ مہاسبھائی ذہن نے بھی کانگریس کو نقصان پہنچایا۔ سوشلسٹ پارٹی نے کانگریس میں شامل ہو کر اسے اپنی ڈگر پر چلانا چاہا۔ کمیونسٹ الگ کیمپ کا ہوں سے اس پر وار کر رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے ہر کانگریسی پر یہ شروع عائد کی کہ وہ روزانہ ایک ہزار گز سوت کات کر اپنے صحیح کانگریسی ہونے کا ثبوت دے۔ آخر انڈیا گروہ گاندھی جی کی عدم تشددی پالیسی سے پہلے ہی بیزار تھا۔ اس پر ہزار گز سوت کاتنے کی پابندی مزید گراں گزری جس سے کانگریس ہائی کمان میں گاندھی جی کے خلاف بغاوت کے آثار ابھرنے لگے۔ لہذا انہوں نے ہوا کا رخ دیکھ کر کانگریس سے علیحدگی بہتر سمجھی

آئندہ چل کر ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ملک میں نئے انتخاب بھی ہو رہے تھے۔ لیکن گاندھی جی اس پر بھی آمادہ نہیں تھے۔ اگر تھے تو بادلِ نخواستہ۔

آخر ۲۶ سے ۲۸ اکتوبر (۱۹۳۲ء) تک بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سالانہ اجلاس ہوا۔ لیکن اس اکھاڑے میں گاندھی جی کی غیر موجودگی سے یہ اجلاس نہایت بے رونق سمجھا گیا۔

تاہم اس اجلاس میں ورکنگ کمیٹی نے چند اہم تبدیلیاں کیں۔  
 ”ماتما گاندھی کی جگہ راجہ راجکوپال اچاریہ کو لیا گیا۔ پنجاب سے ڈاکٹر محمد عالم کی  
 جگہ خاں جبر الخفاریہ کو منتخب کیا گیا۔  
 بنگال کے ڈاکٹر جے ایم۔ سین گپتا کی بجائے ڈاکٹر بیدھان چندر رائے کو  
 چنا گیا۔“

اسی اجلاس میں کانگریس کے آئندہ صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد مقرر ہوئے۔  
**تحریک کیپور تھلہ** | ہمارا چہ کیپور تھلہ ہنوز پیرس میں تھے اور تحریک کے رہنما چودھری  
 عبدالعزیز کیپور تھلہ سنٹرل جیل میں۔ انہی دنوں ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو  
 سکھ لیڈر بابا گھڑک سنگھ نے ہندو سکھ کانفرنس میں تقریر کے دوران کہا:  
 ”ریاست میں مخلوط انتخاب سے یہاں کی اقلیتوں کو سخت نقصان پہنچے گا  
 کیونکہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔“

اس کانفرنس میں قرارداد کے ذریعے سلطان پور کے حادثہ کی تحقیقات کو غیر جانبدارانہ  
 قرار دے کر

”میجر کوٹھے والا اور کپتان روپ سنگھ کی حمایت کی گئی۔ نیران کی تمام کارروائی  
 کو جو انہوں نے سلطان پور میں مسلمانوں پر گولی چلا کر کی تھی جائز قرار دیا گیا۔“  
 حالانکہ ریاست کی اپنی مقرر کردہ سرکاری تحقیقاتی کمیٹی میجر کوٹھے والا اور سر روپ سنگھ  
 کو مجرم قرار دے چکی تھی۔

اس تاریخ کو اخبارات میں فرمانروائے کیپور تھلہ کی پیرس سے واپسی کی اطلاع شائع  
 ہوئی۔ اس پر مولانا حبیب الرحمن صدر آل انڈیا مجلس احرار نے ۴ نومبر کو بمبئی میں ہمارا جہ کے  
 سیکرٹری کو برقی پیغام بھیجا کہ،

”ہمارا جہ دہلی پہنچنے پر مجھے ملاقات کی اجازت اور وقت دے کر تار کے ذریعہ  
 مطلع کریں۔“

ہمارا جہ کے وزیر خارجہ کے سیکرٹری نے مولانا حبیب الرحمن کو اطلاع دی کہ:

” ہمارا بھ صاحب ۵۔ نومبر کو پیرس سے بمبئی پہنچیں گے اور ۹۔ نومبر کو دہلی پہنچ جائیں گے۔ چونکہ دہلی میں ان کا قیام مختصر ہوگا لہذا وہ کپور تھلہ پہنچ کر آپ کو ملاقات کی اطلاع دیں گے۔“

**کانگریس اور ریاستیں** | احرار اور ہمارا بھ کپور تھلہ کے درمیان ملاقات کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ۷۔ نومبر ۱۹۲۲ء کو آل انڈیا کانگریس کے منتخب صدر

بابو راجندر پرشاد نے ہندوستانی ریاستوں سے متعلق کانگریس کی پالیسی کا واضح اعلان کرتے ہوئے کہا ”ہندوستانی ریاستوں کے سلسلے میں کانگریس کی پالیسی کے متعلق سوال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں گزارش ہے کہ کانگریس ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کے اجلاس میں یہ واضح کر چکی ہے یعنی:

کانگریس والیان ریاستہائے ہند سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ریاستوں میں نمائندہ ادارت کے ذریعہ ذمہ دار حکومت قائم کریں اور فوری اس کے متعلق اعلان کریں۔ نیز ریاست میں ایسے قوانین نافذ کریں جو شہریت کے ابتدائی حقوق، مثلاً اجتماعی آزادی، تحریر و تقریر کی آزادی اور حفاظتِ مال و جان ہونی چاہیے۔

کانگریس! ریاستوں کے باشندوں کو یقین دلاتی ہے کہ کامل آزادی اور ذمہ دار حکومت کے حصول میں ان سے پرامن اور جائز جدوجہد میں پوری ہمدردی رکھتی ہے اور انہیں حالت کا یقین دلاتی ہے۔

**احرار پر ابتلاء کا آغاز** | سیاسی زندگی میں سانس لینا کانٹوں پر سفر کرنے کے برابر ہے۔ یہ سنگلاخ راستہ مصائب و آلام کی کئی پلٹنڈیوں سے ہو کر

گزرتا ہے۔ آبلہ پانی کے ساتھ دل و دماغ بھی لہولہاں ہو جاتے ہیں۔ وقت اور سبقت ہنوا ہوں تو دوسری بات ہے ورنہ پت جھڑکے موسم کی طرح اپنے بھی پرانی نظروں سے دیکھنے میں تساہل نہیں کرتے۔ سیاسی جماعتوں کا مزاج بھی اسی مٹی سے پر دان چڑھتا ہے۔ دلوں کا یہ کھیل تماشہ اگر معصوم بچے کی طرح پسندیدہ نہ ہو تو اس کی عمر بھی مختصر ہوتی ہے۔

مجلس احرار جن طور واطوار سے گذرتی چلی آ رہی ہے، مستقبل اس کی پذیرائی کے راستے سنوار رہا ہے۔ حالات پھولوں کے گجرے لیے واقعات کی قطاریں آگے بڑھ رہے ہیں لیکن ذریدہ نگاہیں بھی غافل نہیں کہ بوریہ نشینوں کا یہ قافلہ صحراؤں سے اٹھ کر صحن گلستان پر قبضہ جانے کی دوڑ میں مصروف ہے۔ ہو سکتا ہے، آنے والے کل کی بہاریں ان کے قدم لیں لہذا بادِ سموم سے کہو، ان کا راستہ روک لے۔ پہاڑان کے راہوں کی دیواریں بن جائیں۔ سمندروں کے پانی اُچھل کر طوفان بپا کر دیں تاکہ ہدی خوانوں کا یہ قافلہ بے راہرو ہو جائے۔ راستہ کھوجانا اور بات ہے۔ مگر راستے کا چھوڑ دینا الگ چیز ہے۔ جن مسافروں نے بادِ سموم کی آندھیوں سے خوف کھا کر اپنا راستہ بدل لیا وہ نہ منزل پر پہنچ سکے اور نہ منزل ان کے قریب آئی۔ البتہ وہ لوگ مگر بھی کامیاب و کامران نکلے جتنوں نے خزاں میں کانٹوں سے پیار کیا اور بہار کے ان پھولوں سے نفرت کی جن کی پتیوں میں وفا کی بو نہیں تھی۔

یکم نومبر ۱۹۴۲ء کو ہندوستان کے جنرل الیکشن شروع ہوئے۔ اسی روز مجلس احرار کے امیدوار مسٹر خالد لطیف گابا کے لاہور میں ووٹ پڑنے تھے۔ باغیا پورہ کے پولنگ اسٹیشن پر بیگم شاہنواز، خان بہادر رحیم بخش کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کرنے آئیں تو انہوں نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس پر احرار کارکنوں نے اعتراض اٹھایا کہ یہ بیگم صاحبہ نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ بے پردہ رہی ہیں۔ لہذا ہمیں شبہ ہے کہ کوئی دوسری عورت ان کی جگہ ووٹ ڈالنے آئی ہے۔ اس پر فریقین میں ہتکامہ ہو گیا۔

حقیقت یہی ہے کہ بیگم شاہنواز شاہی دربار سے عوامی اجتماعات تک ہمیشہ سادھی باندھے یا کبھی کبھار دوپٹہ اوڑھے شریک ہونے کی عادی تھیں۔ بڑے گھرانے کی عورت تھیں۔ یہ لباس ان کی روزمرہ زندگی میں شامل تھا جبکہ ان کے والد محترم سرمیاں محمد شفیع نے اصلاحات کے ضمن میں کسی حد تک انتہا پسند ہو گئے تھے اور انہوں نے گھر کی خواتین کا رائج الوقت پردہ کی روایات سے آزاد ہونا پسند کیا تھا۔ (نوائے وقت ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء) لیکن انتخاب کے موقع پر ایسی کون سی وجہ تھی کہ وہ برقعہ اوڑھ کر آئیں۔ بنا بریں باغیا پورہ کے احرار کارکنوں کا اعتراض غلط نہیں تھا۔ لیکن یار لوگوں نے اس حقیقت کو ایسا فسانہ بنایا کہ ۱۵ نومبر



کے روزنامہ انقلاب لاہور نے حسب ذیل ادارتی نوٹ کے ساتھ ایک تجویز پیش کر دی:

• کیا احرار کے لیے یہ چیز باعثِ فخر ہے، کہ ان کے حلقے میں ایسے ایسے لوگ

موجود ہوں، جن کی زبان درازی شرفاء کے لیے باعثِ شرم ہو؟

ہم جو کچھ عرض کر رہے ہیں اس لیے نہیں کہ احرار کی مخالفت کے لیے کوئی نیا میدان آراستہ کیا جائے بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ ہم احرار کے اس فعل کو ملت کے نقطہ نظر کے تحت افسوس ناک سمجھتے ہیں۔

نوٹ: تاریخی اندر لائن عبارت کو ذہن میں رکھیں۔

۱۵۔ نومبر کو حکومت نے اعلان کیا کہ اسمبلی کے انتخاب

**خالد لطیف گاباکی کامیابی** | میں خان بہادر حاجی رحیم بخش کے مقابل خالد لطیف گابا

نوسو ستانوے ووٹ زیادہ لے کر کامیاب ہو گئے ہیں۔

خالد لطیف گاباکی کامیابی کے بعد مجلس احرار کی پارلیمانی حیثیت حسب ذیل ہے۔

• سنٹرل اسمبلی میں مولانا محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ الہ آباد، انیکورٹ، یوپی۔

• مسٹر خالد لطیف گابا بیرسٹر ہائیکورٹ لاہور۔ پنجاب۔

پنجاب کونسل میں۔

• چودھری افضل حق (ہوشیار پور)۔

• چودھری عبدالرحمن رامپور واسے ضلع ہوشیار پور۔

• مولانا منظر علی اظہر۔ لاہور۔

وزیر اعظم کیپور تھلہ کی علیحدگی

مساراجہ کپور تھلہ نے پیرس سے واپسی پر ۲ نومبر ۱۹۳۶ء کو حسب ذیل اعلان جاری کیا۔

”میرے یورپ جانے سے قبل میرے وزیر اعظم سر عبد الحمید نے خواہش کی

تھی کہ وہ ریاستی ذمہ داریوں سے علیحدہ ہو جائیں۔ لیکن میرے کہنے پر انہوں نے میری

غیر حاضری میں بہر طور کام کو نبھایا۔ اب پھر انہوں نے اپنی درخواست کا اعارہ کیا اور

نہایت مختصراً طور پر التجا کی کہ میں ان کی اس درخواست کو قبول کر لوں۔ میں

نہایت رنج اور افسوس سے ان کی یہ درخواست قبول کرتا ہوں۔  
 سر موصوف نے بیس سال تک میری اور میری ریاست کی نہایت اخلاص سے  
 خدمت کی اور وفادار رہے۔ اس کے لیے ان کا بے حد مشکور ہوں۔ ان کی علیحدگی میرے  
 لیے رنج کا باعث ہے۔

اصولی طور پر یہ آئینی تبدیلی جنوری ۱۹۳۵ء کے آغاز میں عمل میں آجائے گی۔  
 ریاست میں نظم و نسق اور بجائی امن و قانون کی خاطر میں سیاسی  
 نوعیت کے تمام جلسوں اور جلسوں کی مخالفت کا اعلان کرتا ہوں  
 صرف انہیں جلسوں اور جلسوں کی اجازت دی جائے گی جو سرسرنڈ ہی حیثیت  
 رکھتے ہوں۔ ان احکام کی خلاف ورزی کی صورت میں انسپکٹر جنرل پولیس خلاف ورزی  
 کرنے والے لوگوں سے مناسب اور ضروری کارروائی کرے گا۔

۲۸۔ نومبر ۱۹۳۴ء کے حالیہ انتخابات کے نتائج مختلف انداز  
 میں پیش کیے۔

۱۔ جمعیتہ علمائے ہند دہلی

۲۔ مجلس احوار

۳۔ بہار کی امارۃ شریعہ

۴۔ یو پی یونیٹی بورڈ

۵۔ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس مشترک پارلیمانی بورڈ نے اسی فیصد کامیابی حاصل کی۔ کل تیس مسلم  
 نشستیں اور بیس کامیاب ہوئے۔

۶۔ کانگریس کو غیر مسلموں میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ کل تعداد ایک سو پینتالیس حاصل شدہ کامیابیوں میں

۷۔ پنڈت مالویہ کی نیشنلسٹ پارٹی نے بارہ نشستیں حاصل کیں۔

۸۔ سیکرٹری مسلم لیگ نوابزادہ نور شید علی کا تفصیلی بیان

کے لیے مسلم نمائندوں کو ٹکٹ دیے گئے تھے، جس میں بیس کامیاب ہوئے۔

۱۔ مسٹر محمد علی جناح - ۲۔ سیٹھ عبداللہ ہارون - ۳۔ مسٹر شاہنواز مجتوبہ - ۴۔ مسٹر غلام حسین بدایونی

- ۵۔ غلام نجیبک نیرنگ۔ ۶۔ سید راجن شاہ۔ ۷۔ سر مر شاہ۔ ۸۔ حافظ محمد عبداللہ۔ ۹۔ شیخ فضل حق پریہ  
۱۰۔ مولوی سر محمد یعقوب۔ ۱۱۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد۔ ۱۲۔ مسٹر اسے۔ ایچ غزنوی۔ ۱۳۔ مسٹر اسے کے فضل حق  
۱۴۔ سر عبداللہ سروردی۔ ۱۵۔ مولوی شفیع داؤدی۔ ۱۶۔ سر عبدالقیوم وغیرہ۔

## جائٹ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ

اسمبلی کے ان نتائج سے پیشتر ۲۳۔ نومبر کے اخبارات میں جائٹ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا۔ لیکن ہنوز اس پر لندن برطانوی پارلیمنٹ میں وزیر اعظم مسٹر رنز لے میکڈانلڈ اور ٹوڈی پارٹی کے لیڈر مسٹر چرچل کے درمیان کافی بحث چل رہی تھی۔ اپوزیشن کا دعویٰ تھا کہ موجودہ سکیم کے تحت ہندوستان کو بہت زیادہ حقوق دے دیے گئے ہیں۔ مگر کانگریس اس پر بھی مطمئن نہیں اور حالیہ الیکشن میں اس کی کامیابی اس کی مخالفت کی بنا پر ہے۔ اس بحث کے دوران جائٹ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر آگئی۔

- ۱۔ مرکز اور صوبہ جات میں اختیار کی تقسیم وائٹ سپر کی سفارشات کے مطابق رہیں گی۔
- ۲۔ باقی اختیارات گورنر جنرل کے پاس ہوں گے۔
- ۳۔ سندھ اور اٹریس علیحدہ صوبے بنائے جائیں گے۔
- ۴۔ صوبوں میں دو عملی کمیٹیاں۔
- ۵۔ غیر مشروط اکثریت گورنر کے راستے میں حاصل نہیں ہوگی۔
- ۶۔ مالیات اور قانون سازی میں گورنر کے خاص اختیارات ہوں گے۔
- ۷۔ قانون دان و ذراعی تحویل میں رہیں گے، لیکن پولیس اور خفیہ پولیس کے متعلق گورنر کو خاص اختیارات ہوں گے۔

۸۔ ووٹروں کی تعداد ستر لاکھ سے بڑھا کر ساڑھے تین کروڑ کر دی گئی۔

۹۔ فرقہ وارانہ فیصلے اور پونا پیکٹ میں تبدیلی نہیں ہوگی۔

۱۰۔ قیادت کے قیام کے لیے ریاستوں کی کل آبادی سے کم از کم نصف حصے کا مشمول ضروری ہے،

۱۱۔ گورنر جنرل زیادہ سے زیادہ تین مشیروں کی ارااد سے شعبہ جات فوج، معاملات خارجہ اندہی

معاملات اور برطانوی بلوچستان کا انتظام کریں گے (خاص زمینداران ان کے علاوہ ہیں)

۱۲۔ فیڈرل مجلس قانون سازی میں بالواسطہ انتخاب۔

۱۳۔ فیڈرل کورٹ کا قیام۔

۱۴۔ برما کے متعلق وائٹ پیپر کی تجاویز سے متعلق اتفاق اور دستور کی ترتیب۔

۱۵۔ لیبرارکان کا اختلافی نوٹ جو نہایت ضروری ہے۔

لندن پارلیمنٹ کے علاوہ مندرجہ بالا رپورٹ عالمی بحث کا موضوع بھی بنی۔ چنانچہ جن اخبارات

نے اس پر ملے جلے جذبات کا اظہار کیا۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

لندن: ڈیلی ٹیلیگراف۔ لندن ٹائمز۔ نیوز کرانیکل۔ ڈیلی میل۔ فنانشل نیوز۔ فنانشل ٹائمز۔

مانچسٹر گارڈین۔

آئرلینڈ: آئرش ٹائمز۔

ہندوستانی پریس: لیڈر (الہ آباد)، فارورڈ کلکتہ، امرت بازار پٹریکا۔ انڈیا بازار پٹریکا۔ ہندوستان

ٹائمز۔ نیشنل کال۔ مدراس میل (مدراس) روزنامہ سن (برما)۔

اخبارات کے علاوہ جن مسلمان رہنماؤں نے اس رپورٹ کی حمایت کی۔

۱۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال لاہور۔ ۲۔ عبداللہ یوسف علی۔ بمبئی۔ ۳۔ مسٹر پیر بخش پشاور۔

۴۔ مسٹر ایچ۔ اے۔ غزنوی کلکتہ۔ ۵۔ ڈاکٹر شفاعت احمد الہ آباد۔ ۶۔ سر سلطان احمد

پٹنہ۔ ۷۔ سر ظفر اللہ (مرزائی)۔ ۸۔ سر عبدالرحیم۔ ۹۔ سر عبدالقیوم۔

ہندو رہنما۔ ۱۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور (شانن ٹیکن)۔ ۲۔ سر تیج بہادر سپرو۔ ۳۔ بابو

راجندر پرشاد صدر کانگریس کمیٹی۔ ۴۔ این۔ سی۔ کاکو دپوتا، ۵۔ اچاریہ کرپالانی

(سندھ)۔ ۶۔ سر شادی لال (سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ۔ مسٹر ستیہ مورتی

مدراس۔ سر کشور سنگھ پٹنہ۔

۲۵۔ نومبر کو برطانیہ کی پارلیمنٹ میں مندرجہ بالا رپورٹ کو ٹوٹھی پارٹی نے بنیادی طور پر

مسترد کر دیا۔

ہندوستان کے متعلق انگریز مظہن تھا کہ اس نے قریباً ڈیڑھ

صدی سے اپنے غلاموں کے درمیان منافرت کی جو تخم ریزی

لندن میں خوف و ہراس

کی ہے اس پودے کے برگ و بار اپنی بہا پر ہیں اور جو انٹ سیلڈٹ کمیٹی کی رپورٹ کا مسترد کر دینا اس یقین کا مزید ثبوت ہے۔ برطانیہ کو سب سے بڑی مشکل ہٹلر کے ارادوں نے پیدا کی کہ اس کے ہر ہتھے ہوئے قدم دوسری جنگ عظیم کو قریب تر کر رہے تھے۔ اس ذہن سے مسٹر چرچل کی یہ تقریر قابل غور ہے جو انہوں نے ۲۹ نومبر ۱۹۳۲ء کو دارالعلوم میں کی۔

”میں ایران کو توجہ دلاؤں گا کہ ہمارے پاس فوجی تحفظ کے انتظام کافی ہیں۔ اس وقت دنیا کی نگاہیں جرمن پر تکی ہوئی ہیں کہ وہ اپنی بحری فوج اور اسلحہ میں بہت بڑا اضافہ کر رہا ہے۔ وہ اپنی فضائی قوت کو بھی بڑھا رہا ہے۔ وہ اس قوت سے لندن کو ایک ہی حملے میں تمس تمس کر سکتا ہے، جیسا کہ اس نے کہا ہے کہ: میں آئندہ سالوں میں اپنی فضائی قوت میں اضافہ کریں گا۔ جرمن عہدہ دار سائی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی فضائی طاقت بڑھا رہا ہے۔ جرمن اپنے اسلحہ میں جو اضافہ کر رہا ہے، اس کا راز معروض کرنا ضروری ہے۔“

۱۹۳۶ء کے اختتام تک جرمن کی فضائی قوت برطانیہ سے بچا پاس فیتہ دار

زیادہ ہو جانتے گی اور ۱۹۳۷ء میں یہ طاقت وہ چند بڑھ چکے گی۔

اس سے دو روز پیشتر، ۲۲ نومبر کے اخبارات میں فرانس کے اکبر وزیر نے کہا تھا کہ:

”جرمن نے آئندہ جنگ میں فرانس کو ہرگز کے اٹھانے فوجی اور دیگر

کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جرمن نے زیادہ سے زیادہ فوجی اور ہتھیاروں کو اسلحہ

ہیں اور ہونڈل کے لیے دوسرے ہتھیاروں کو ہرگز کے ہتھیاروں کے برابر

فوج کے لیے ہتھیاروں کو ہرگز کے ہتھیاروں کے برابر

اس اجلاس میں جرمن کے ہر ہتھے ہرنے اسلحہ کے متعلق بھی فرما

اظهار کیا گیا

مسٹر چرچل اور فرانس کو اس وجہ سے بھی پریشانی ہوئی کہ لندن کے ایکس اخبار نے فرانس

نے اپنی ۳- نومبر ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں یہ اگکشاف کیا کہ

”ہٹلر نے لندن میں ان کی پارٹی کے پابلیکٹی سے کہا ہے کہ میں لاکھ پونڈ

خرچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لیے اس نے اپنے مخصوص آدمی لندن بھیجے ہیں۔“

ان حالات کے پس منظر میں بقول لندن ٹائمز ۳۔ نومبر ۱۹۳۲ء:

» حال ہی میں سرکاری گزٹ میں جو قانون شائع ہوا ہے جس کی رو سے فوجوں کی اشاعت کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ لہذا بحری فوجی معاملات پر بحث کے دوران بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔

اس اعلان کی رو سے کسی قسم کی خبر شائع نہیں ہوگی جس کی اجازت حکومت نہ دے۔ خاص کر جن خبروں میں فوجی نقل و حرکت یا فضائی بندرگاہوں کی ترقی اور ترتیب کا ذکر ہو۔“

امنی دنوں یکم دسمبر ۱۹۳۲ء کو پیرس میں ایک تقریر کے دوران فرانسیسی نمائندے نے پبلر سے درخواست کی کہ:

» وہ لیگ آف نیشنز میں شامل ہو کر مشرق میں یورپین پالیسی کے ساتھ تعاون کریں۔

فرانسیسی نمائندہ نے گزشتہ دنوں کی اس خبر کو غلط قرار دیا کہ روس اور فرانس کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہوا ہے۔“

اقوام یورپ فکر و تدبیر کی بے پناہ صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ مستقبل کے فیصلے انہوں نے دنیا جھکتی ہے مگر قوت کے سامنے

پیشتر سے کر لیے ہوتے ہیں۔ ان کے سیاستدان ہواؤں کے رخ پر اپنی عمارت کی نیواٹھاتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بادل ہنوز ہواؤں کی تربیت میں تھے لیکن دانشوران اوتنگ نے فضاؤں میں اس کی بوسونگھ کر اپنے اندازے اور اندیشوں کے نقشے لیکر نے شروع کر دیے۔

ہندوستان غلام ہونے کے باوجود بھی بڑی قوت کا مالک ہے۔ لیکن برطانوی سامراج

نے اسے پرکھ کے برابر وقعت نہیں دی اور بڑی جرأت کے ساتھ کنزرویٹو پارٹی کے رہنما  
مسٹر چرچل نے اپنے ملک کے وزیر اعظم کے فیصلے کو رد کر دیا اس لیے کہ

غلام سے جو بھی ہوگا وعدہ ضرور ناپائیدار ہوگا۔

اور جرمن سے اس لیے خوف زدہ ہیں کہ کل کا آفتاب اس کے عروج کا آفتاب ہوگا۔ حالانکہ  
ہنوز دلی و دراست۔ لیکن

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر

ناخانے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا!

مجوزہ جو انٹنٹ سیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر ہندوستان کی سیاسی  
جماعتوں کی راستے:

## پسند اپنی اپنی

مسلم کانفرنس۔ ۳۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کے اجلاس لاہور میں مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے  
» برطانوی تجویز کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ جس میں صوبوں کے گورنروں کو بے پناہ  
اختیار دے دیے گئے ہیں۔ اس طرح صوبوں کی خود مختاری بیکار ہو کے رہ  
گئی ہے۔ تاہم ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ دستور کے ذریعے  
جو کچھ دیا گیا ہے۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تاکہ آئینی طریقوں سے  
دستور میں اصلاح کرائی جاسکے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی: ۶۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو پٹنہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں دو دن کی سلسل  
بحث کے بعد سیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے کہا:

» کانگریس نے انجام کار انتہائی غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ حکومت ہند

کے آئندہ دستور کا جو خاکہ وائنٹ پیپر میں پیش کیا گیا ہے اسے مسترد کر دیا جائے

اس کے مقابلہ میں قابل اطمینان شکل عرفتین ہے کہ ایک دستوری اسمبلی کے

ذریعے جدید نظام حکومت ترتیب دیا جائے۔ اسمبلی کے جدید انتخاب میں

دستوری اسمبلی کے مطالبے کی نہایت واضح اور بعین الفاظ تائید جو رکھی ہے۔

برطانوی پارلیمنٹری رپورٹ اکثر اعتبار سے وائنٹ پیپر کی تجاویز سے بھی

بدتر ہے۔ ہندوستان کی ہرجااعت اسے رحمت پسندانہ اور ناقابل قبول قرار دے چکی ہے۔ پارلیمنٹری رپورٹ کا مقصد چونکہ یہ ہے کہ اجنبی قوم اس ملک کے باشندوں پر مسلط رہے اور نہایت ہی گراں مصارف کے ساتھ اثر انداز ہوتی رہے۔ لہذا یہ رائج الوقت دستور سے بھی زیادہ خطرناک اور ضرر رساں ہے۔ اندر سے حالات کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ اس سکیم کو مسترد کر دیا جائے۔

چودھری افضل حق : ۱۷۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو پنجاب کونسل میں بحث کے دوران چودھری افضل حق نے اپنی ایک تجویز پیش کی کہ :

”سیکٹ کمیٹی کی رپورٹ ہندوستان کی خواہش کو پورا نہیں کرتی اس لیے اس ایوان کی رائے میں اسے مسترد کر دینا چاہیے۔“

آپ نے کہا، ملک کی یہ متفقہ رائے ہے کہ رپورٹ کو مسترد کر دیا جائے کیونکہ حکومت اس خیال پر عمل پیرا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا گروہ موجود ہے جو بڑی سے بڑی سکیم کو بھی خوش آمدید کہنے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر وقت آنے پر حکومت خود اندازہ کر لے گی کہ اس گروہ کی عوام میں کوئی قیمت نہیں۔

لندن کی لیبر پارٹی : ۱۱۔ دسمبر ۱۹۳۲ء دارالعوام میں بحث کے دوران سٹراٹھیلے نے کہا :

”جو انٹرنٹ سیکٹ کمیٹی کی رپورٹ غیر تسلی بخش ہے اسے مسترد کر دیا جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آئندہ سکیم جو رپورٹ میں درج ہے۔ موجودہ آئین سے بہر حال کچھ نہ کچھ بہتر ہے، لہذا جو چیز بہتر ہے اسے قبول کر لینا چاہیے۔ لیکن ملک

کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ مجوزہ سکیم موجودہ آئین سے کسی قدر بہتر ہے یا نہیں اصل سوال یہ ہے کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے جو وعدے وقتاً فوقتاً ہندوستان

کے ساتھ کیے گئے تھے آیا وہ وعدے اس رپورٹ سے پورے ہوتے ہیں یا نہیں۔ ۱۹۱۷ء میں حکومت کی طرف سے ذمہ دار اور خود مختار حکومت کا وعدہ دیا

گیا تھا اس کے بعد اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ آیا ذمہ دار خود مختار حکومت کے معنی درجہ نوآبادیات سے یا نہیں۔؟



جب سر میکلم ہیلی ہوم نمبر تھے تو انہوں نے اسمبلی میں یہ اعلان کیا تھا کہ اس کے معنی درجہ نوآبادیات کے نہیں ہیں۔ لیکن اس کے بعد لارڈ اردن نے دائرے کی حیثیت سے اور مٹر رنر نے میکڈانلڈ نے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس امر کا یقین دلایا کہ ہندوستان کا نصب العین درجہ نوآبادیات ہے۔ لیکن موجودہ رپورٹ میں ان تمام دعووں کے متعلق بد عمدی کی گئی ہے۔

ہم نے اس ایوان میں سائمن کمیشن کے تقرر کے خلاف بھی آواز بلند کی تھی لیکن ہمارے مڈریٹ دوستوں نے سائمن کمیشن سے تعاون کیا۔ بعد میں ہر ایک سیرتق نے اس امر کو تسلیم کر لیا کہ سائمن کمیشن کو مقرر کرنا غلطی تھی۔ ممکن ہے کہ اب بھی حکومت اور ایڈریٹ ہائی آواز پر کان نہ دھریں۔ لیکن انہیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان پر موجودہ رپورٹ کی بنا پر ایک آئین کو مٹھو نسا سخت غلطی ہے۔ اس کے بعد آپ نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے متعلق تحفظات پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا:

”رپورٹ میں کوئی ایسا وعدہ بھی موجود نہیں جس میں اس امر کا یقین دیا گیا ہو کہ آئندہ کسی وقت ان تحفظات کو مٹایا جائے گا۔ آئندہ آئین کے تحت وزراء کی حالت ایسے دور کی سی ہوگی۔ جس کے گھوڑے کی باگیں دوسرے آدمی کے ہاتھ میں ہوں گی۔“

آخر میں آپ نے ایوان سے اپیل کرتے ہوئے کہا:

”برطانوی حکومت اور برطانوی عوام کا وقار اسی میں ہے کہ اس تجویز کو مسترد کر دیا جائے۔“

سبھاش چندر بوس کو نوٹس | غیر ملکی حکومت اس سے نا آشنا نہیں تھی کہ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان کو اپنی غلامی کا احساس ہو چکا ہے۔ اور کسی وقت بھی اس چمکانی کے شعلے بلند ہو کر ایوان فرنگی کو خاک کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر وہ ایسے عناصر سے غافل نہیں تھی جس کے متعلق اسے ذرا سا بھی شبہ ہو کہ اس کے ارادوں میں بغاوت

پرورش پارہی ہے۔

بنگال کے بابو سبھاش چندر بوس کانگریسی ہونے کے باوجود ہاتھ مٹا گا ندھی کی عدم تشدد کی پالیسی کے سخت خلاف تھے۔ وہ اندرون خانہ دہشت پسند تحریک کے صرف معاون ہی نہیں اس کے حامی بھی تھے۔

دوسری جنگ عظیم سے متعلق جیسے جیسے حکومت کا احساس بڑھتا گیا۔ ہندوستان میں برطانوی پالیسی اسی قدر سخت ہوتی گئی۔ ان دنوں بابو سبھاش چندر یورپ میں تھے انہیں اطلاع ملی کہ ان کے والد بیمار ہیں۔ اس پر ۶ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کلکتہ پہنچے تو انہیں گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس دوران ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ مگر حکومت نے انہیں نہ تو والد کی ارحمتی کے ساتھ شمشان بھومی تک جانے دیا۔ اور نہ ہی کسی عزیز واقارب سے ملنے کی اجازت دی۔ بخود کتابت پر بھی قدغن لگا دی۔

۸ دسمبر کو ایک نوٹس کے ذریعے سبھاش بابو کو حکم دیا گیا کہ وہ دو دن گھر ٹھہر کر یورپ واپس چلے جائیں ورنہ انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے جواب میں سبھاش بابو نے حکومت سے ۷ جنوری ۱۹۳۵ء تک ہندوستان میں رہنے کی اجازت چاہی اور دوسری صورت میں انہوں نے کہا کہ ملک بدر ہونے سے بہتر ہے کہ مجھے جیل بھیج دیا جائے۔

۹۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو حضرت امیر شریعت سید عطار اللہ شاہ بخاری کو **شاہ جی کی گرفتاری** گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے قادیان کانفرنس کے موقع پر تقریر کے دوران حکومت کے دو فرقوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۲ دسمبر کو انہیں گورداسپور ڈسٹرکٹ جیل میں دیا گیا۔ عدالت نے ضمانت پر رہا کر دیا۔

اگر انسان کا ضمیر مجرم ہو تو ہزار تحفظ بھی اسے موت سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ حکومت ہند نے ریاستوں کو ہمیشہ

اپنے دامنِ عافیت میں محفوظ رکھا۔ لیکن بریاستی حکمران اپنی رعایا سے خوفزدہ تھا۔ اور یہ خوف کسی وقت بھی ان کی موت کا ذریعہ بن سکتا۔

برطانیہ کی موجودہ سکیم کے تحت فیڈریشن کی صورت میں بھی ریاستوں کی نصف آبادی کو اس میں شمولیت کا حق دیا گیا تھا۔

اس پر بھی ریاستہائے ہند غیر مطمئن رہیں۔ اس سے پیشتر جولائی ۱۹۳۲ء کو ہمارا جہ پٹیالہ، نواب آف بہادر پور اور تین دوسرے والیان ریاست کی طرف سے وائٹ پیپر کے پیش نظر حکومت سے تحفظ مانگا گیا تھا۔ اس خط کے جواب میں حکومت نے کہا:

”ہم اپنی جگہ پر آپ کی تائید و حمایت کا یقین دلاتے ہیں کہ تاج برطانیہ کے ساتھ آپ کے معاہدات کے ذریعے آپ کو جو مراعات حاصل ہیں، ان کو غصب کرنے کی کسی کوشش کے مقابلے میں ہم آپ کی اور آپ کے رفقاء کے کار کی ہر ممکن امداد کریں گے۔“

اس خط کے نیچے ڈیوک آف ڈنڈسٹر کے علاوہ مٹھرا چوہل اور برطانوی پارلیمنٹ کے مینبریں ممبروں کے دستخط ثبت تھے۔

یہ خط ہندوستان کے ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کے اخبارات میں شائع ہوا۔ اس پر بھی ان کا ضمیر مطمئن نہیں تھا کیونکہ نہیں یقین ہو چکا تھا کہ ریاستی نظام کا برطانوی سہارا آج نہیں توکل ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ

”۱۲۔ دسمبر کو بمبئی میں ریاستہائے ہند نے اپنا اجلاس طلب کر لیا۔ مگر بغیر کسی فیصلے کے آئندہ جنوری پر ملتوی کر دیا گیا تاہم انہوں نے اپنے تحفظات کی ضرورت کو سختی سے محسوس کیا اور نئی سکیم میں ریاستہائے ہند کے تحفظ پر زور دیا۔“

پنجاب کونسل کے ۱۸۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کے اجلاس میں چودھری  
**قادیان کانفرنس کا ذکر** | افضل حق نے سوال اٹھایا:

”کیا اوزار کانفرنس قادیان کے موقع پر حکومت نے مرزا بشیر الدین محمود کو کوئی نوٹس دیا تھا؟  
 جواب: (دزیر خزانہ) ہاں ایک نوٹس زیر دفعہ ۱۲۴۔ اور دوسرا قانون ترمیم ضابطہ فوجداری کے تحت دیا تھا۔“

سوال: کیا حکومت کو معلوم ہے کہ اس کے بعد جج کے خطبوں میں مرزا بشیر الدین محمود حکومت سے

مطالبہ کرتا رہا ہے کہ حکومت اس سے معافی مانگے ؟  
جواب: حکومت ان خطبوں کے معنی نہیں سمجھتی۔

سوال: کیا حکومت نے بشیر الدین محمود سے معافی مانگی ہے ؟  
جواب: نہیں۔

سوال: کیا حکومت نے اس پر توجہ دی کہ اگر حکومت نے اس سے معافی نہ مانگی تو بشیر الدین محمود اس کے علاوہ کیا کرے گا ؟  
جواب: نہیں۔

کیپور تھلہ کا نیا وزیر اعظم | ۲۰۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو مہاراجہ کیپور تھلہ نے دو سال کے لیے ایک انگریز کرنل فیشر کو اپنی ریاست کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

وزیر اعظم نے چارج سنبھالتے ہی ۲۱۔ دسمبر کو چودھری عبدالعزیز کے بھائی کپتان عزیز احمد اور نقیٹنٹ صدیق احمد جنہیں گزشتہ تحریک کے دنوں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ ان کی تمام پابندیاں ختم کر کے ان کی جائیداد و اگزار کر دی۔ نیز چودھری عبدالعزیز کے بڑے بھائی چودھری عبدالرشید کو کیپور تھلہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مقرر کر دیا۔ آپ کو فوجداری کے اختیار سونپے گئے (آپ تحریک سے پیشتر بھی اسی عہدے پر فائز تھے۔)

وائسرائے ہند کی تقریر | اخبارات اور رہنمایاں ہند کی رائے کے بعد وائسرائے ہند نے ۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کلکتہ یورپین ایسوسی ایشن کی دعوت

میں ہوان کے اعزاز میں دی گئی تھی تقریر کرتے ہوئے کہا:

”میرے سامنے صرف دو متبادل صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ اس رپورٹ کو قبول

کر لیا جائے اس بنا پر کہ اس میں صحیح طریق پر صوبائی خود اختیاری حکومت

آل انڈیا فیڈریشن اور مرکز میں بڑی حد تک ذمہ داری دی گئی ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ اس سکیم کو بالکل بے پرواہی کے طور پر مسترد کر دیا

جائے جس کا مقصد یہ ہوگا کہ موجودہ دستور کو غیر معین مدت تک برداشت کیا

جائے۔ اس بات کا یقین ہے کہ اگر ہم نے خلوص کے ساتھ اس پر عمل کیا تو ہمیں

معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستانیوں کے لیے لندن میں مکمل ذمہ داری کی طرف بہت بڑا قدم اٹھایا گیا ہے۔

**معادہ وارسائی کو خطرہ** | بہادر تو ہیں اپنی شکست کو زیادہ عمر نہیں دیتیں۔ وہ نزاں میں کھلانے ہوتے پھول کی طرح نئی بہار کی منتظر رہتی ہیں۔

زمانہ لاکھ کئے لیکن نوزخ تاریخ کے اوراق ان کی فتح کے انتظار تک خالی چھوڑ دیتا ہے۔  
۱۱۔ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمن نے اتحادی طاقتوں کے سامنے شکست کھائی اور اس شکست کا معادہ وارسا کے مقام پر ہوا۔

وارسا پولینڈ کا مرکزی شہر ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر اس شہر کے کنارے گھنے جنٹوں میں ریل کے ایک ڈبے میں فرانس سمیت باقی اتحادی قوتوں نے جرمنوں سے دولت آمیز معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ یہی معاہدہ تاریخ میں معادہ وارسا کہلایا۔ اس معاہدے کے تحت جرمن کو غیر معینہ مدت کے لیے تہی دست کر دیا گیا تھا۔ مگر پچیس سال گزرنے پر شہر نے اٹھ کر ڈیڑھ تو کم کو اس دولت کے انتقام پر ابھارا، تو یورپ کے ان تجارتی چنچ اٹھے۔ ۱۹۳۳ء کے انجباروں نے ایک سا مضمون شائع کیا، جس کا متن یہ ہے۔

۱۔ معادہ وارسائی میں جرمن کو کہا گیا تھا کہ وہ صرف ایک لاکھ فوج رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس نے تین لاکھ کر دی ہے۔

۲۔ اسے صرف چار ہزار تک آفیسر رکھنے کی اجازت تھی مگر اس نے آفیسروں کی تعداد اٹھارہ ہزار کر دی ہے۔

۳۔ جرمن کو اپنے طور پر تنظیم و امن کے لیے پولیس کی معینہ تعداد کی تالی کر لی تھی۔ مگر اس نے نہ صرف پولیس کو فوجی ٹریننگ دینی شروع کر دی ہے بلکہ اس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب کر لی ہے۔ چنانچہ ایک اطلاع کے مطابق اس وقت تک پچاس ہزار افراد فوجی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ منظم فوج کے علاوہ تین لاکھ کے قریب ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔

۴۔ پانچ لاکھ افراد لیبر گوروں میں شامل ہیں۔ گوان کے پاس ہتھیار نہیں تاہم

انہیں پوری فوجی ٹریننگ دی جا چکی ہے۔

ان کے علاوہ تمام جرمن اسلحہ سازی کے کارخانوں میں شب و روز کام کر رہے ہیں۔ ان کارخانوں کے کارکنوں کو تاکید ہے کہ اندر کی کارروائی باہر نہ پہنچے۔

ان حالات کے پیش نظر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جرمن کو اتحادیوں نے ۱۹۱۸ء میں ناکارہ کر دیا تھا وہ آج کم از کم بارہ لاکھ فوج میدان میں لاسکتا ہے۔ جہاز ران کمپنیاں اس کے علاوہ کام کر رہی ہیں۔ بحریہ کی تنظیم الگ ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ ٹینک تیار کیے جا رہے ہیں۔

جرمن کی ان جنگی تیاریوں کو یورپین صحافت نے معاہدہ وارسائی کے خلاف ایک منظم سازش قرار دے کر اپنے دانشوروں کو یقین دلانا چاہا کہ جرمن کے اس اقدام سے دوسری جنگ عظیم کے بادل اٹھانے کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔

**قائد اعظم کی واپسی** | برطانوی سکیم اور دوسرے سیاسی حالات نے ہندوستان کے سیاستدانوں کو باہم خور و فکر کی نئی دعوت دی۔ حالیہ انتخاب کے نتائج نے فکر و نظر کی نئی راہیں کشادہ کر دیں۔ انہی دنوں ۲۶۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ سات ماہ کی غیر حاضری کے بعد ہندوستان پہنچے۔ ان کی غیر حاضری کے دوران بمبئی کی شہری سیٹ سے انہیں اسمبلی کے لیے بلا مقابلہ منتخب کر دیا گیا تھا۔



تین سو پینسٹھ دنوں کی مسلسل مسافت کے بعد ۱۹۳۴ء مغرب کی گمراہیوں میں ڈوبنے لگا تو آسمان نے اسے شفق کے درپوں سے دور تک دیکھا کہ وہ اپنے دامن میں نامراد یوں کے ہزاروں داغ چھپانے کی کوشش میں تھا۔ یہ داغ غلام ہندوستان کی باہم چھپش کو نمایاں کر رہے تھے۔ رخصت ہونے والے سال نے اپنے پیچھے جن واقعات کو چھوڑا۔ غلامی کی تاریخ میں یہ کشمکش حیات کے درمیان میں گزرنے والے دنوں میں شمار ہوں گے۔ ان دنوں غیر ملکی اقتدار نے غلاموں کو کبھی سنہری فریب دیے اور آئین کے ایسے ایسے خوبصورت جال بنے کہ ہر تار سے فریب سلطنت عیاں تھا۔

ان دنوں برطانوی حکومت کا تازہ شاہکار پارلیمنٹری رپورٹ تھی جسے خود برطانوی صحافت اور مذہب ناپسند کر چکے تھے۔ کانگریس، مسلم لیگ اور مجلس احرار کے علاوہ ہندوستان کا رجعت پسند طبقہ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ریاستہائے ہند کے رڈ ساجن کے راج سنگھاسن کی دور برطانوی کھونٹے سے بندھی تھی۔ انہیں بھی یہ رشتہ ختم ہوتے دکھائی دے رہا تھا کہ ۱۹۳۵ء کی صبح نمودار ہوئی۔ سننے سال کے شاہ حاور نے اپنی کرنوں میں عالم کائنات کو محیط کر لیا۔ زمین و آسمان اُجلے مکر سے آراستہ دکھائی دینے لگے۔ اس اجالے میں غلاموں کے مقدر نے نئی کروٹ لی۔ ماضی کے بھرے ہوئے خون شدائے وطن نے غلامی کے سیاہ داغ اپنی زنجیروں سے ایسے رنگین کیے کہ ہندوستان کے فائنشوروں کے پھروں سے ندامت ٹپکنے لگی۔

ڈوبتے ستاروں اور ابھرتے سورج کے متحدہ ہندوستان کو ایک نیا دلولہ دیا۔ اور اس تازہ جذبات کے طوفان میں غلامی کی زنجیریں ٹوٹی نظر آئیں۔ ڈیڑھ صدی کے جے ہوئے غیر ملکی قدم اکھڑتے دکھائی دیے۔ ایوان برطانیہ بیدار ہندوستان کے احساس سے گھبرا سا گیا اور اس

کی ہر تجویز اس کے اپنے فریب کی آئینہ دار بن گئی۔

۲۶۔ دسمبر کو مسٹر محمد علی جناح ہندوستان کے ساحل پر اترے اور ۲۸ دسمبر کو انہوں نے

اپنے پریس بیان میں کہا جو یکم جنوری ۱۹۳۵ء کے اخبارات میں شائع ہوا ہے  
 ”برطانیہ کی یہ اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ برطانوی ہند کا کوئی دوسرا ریاستان  
 اس کی حمایت نہیں کرے گا“

آخر میں آپ نے کہا:

”اس وقت برطانوی حکومت اس پوزیشن میں ہے کہ وہ جس قسم کا دستور  
 چاہے، ہندوستان پر مسلط کر سکتی ہے۔ لیکن ہم اس پر اظہارِ تاسف کیسے بغیر  
 نہیں رہ سکتے کہ حکومت نے ہندوستان کی کمزوری کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔  
 اس سکیم کا مقصد ہندوستان کو حقیقی حکومت خود اختیاری دینا نہیں بلکہ  
 برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا ہے۔ مجھ سے دریافت کیا جا رہا ہے کہ کیا ہندوستان  
 اب بھی کوئی متحدہ اسکیم پیش کر سکتا ہے۔ ہاں میرا جواب یہ ہے کہ اگر یہ ممکن ہو  
 تو سائن کمیشن کی رپورٹ کی طرح اجائنٹ کمیٹی کی رپورٹ بھی دریا بردی جا سکتی ہے۔“  
 ہم نے سوچا تھا کہ نصف سے کریں گے فریاد  
 ہائے افسوس کردہ بھی تیرا چاہنے والا نکلا!

چودھری عبدالعزیز کی اسل

گزشتہ برسوں سے کپور تھلہ کے حوام جن بنیادی حقوق کے لیے برسرِ پیکار تھے۔ انہیں  
 یقین تھا کہ ہمارا جہ کی پیرس سے واپسی پر ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ لیکن حکومت  
 بہر طور حکومت ہے، خواہ وہ بہت سے رقبے پر ہوا چند گز زمین پر۔ اس نشے میں حاکم کا  
 مزاج منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ عروج و زوال کے کلیہ سے بے نیاز جب وہ اس سفر پر نکلتا  
 ہے تو راستے کی ہر چیز سے ماورا ہو کر گزرتا ہے۔

ہندوستان میں اجنبی راج کی طنائیں ٹوٹنے والی ہیں۔ اور اس کے اقتدار کا سورج انھلا  
 میں ہے، مگر ریاستی حاکموں کا غرور ہنوز جوان دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اپنی رعایا سے انصاف  
 کرنے میں اپنے ضابطے سے بھی انحراف کر رہے ہیں اور دوسری طرف اپنے غیر ملکی آقاؤں سے



اپنی حفاظت کی درخواستوں پر دستخط کرتے نہیں تھکتے۔

مہاراجہ کپور تھلہ نے ریاست میں پہنچ کر اپنے نظام میں جو تبدیلیاں کیں اور عایا کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اٹا اس درد میں اضافہ ہوا۔ البتہ ریاست کے نئے وزیر اعظم نے حالات کو نئی ڈگر پر لانے کی سعی کی ہے۔ دیکھیں اونٹ کس کر ڈٹ بیٹھتا ہے؟

ریاستی حکام نے گزشتہ تحریک کے سلسلے میں چودھری عبدالعزیز کو پانچ سال قید با مشقت کی سزا دے رکھی ہے بدلتے ہوئے حالات کے تحت جماعت کی اجازت سے چودھری عبدالعزیز کی سزا کے خلاف ۸ جنوری کو ریاست کے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی گئی جس کی پیروی لاہور کے میاں عبدالعزیز نے کی۔ انہوں نے بحث کے دوران یہ موقف اختیار کیا۔

”چودھری صاحب کی تحریک مہاراجہ کی ذات کے خلاف نہیں بلکہ ریاستی نظم و نسق میں اصلاح کی تحریک تھی“

بحث سننے کے بعد عدالت نے حکومت کے جواب کے لیے مقدمہ کوئی روز کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس سے پیشتر ۲ جنوری کو کپور تھلہ زمیندارہ کانفرنس میں مہاراجہ سے حسب ذیل مطالبات کیے گئے۔

- ۱۔ ریاست کے بڑھتے ہوئے افلاس کے پیش نظر مالیر میں اس حد تک تخفیف کر دی جائے کہ انگریزی علاقہ کے مساوی ہو جائے۔ اگر موجودہ مالیر میں سچاؤ نہیں کی کر دی جائے تو محققہ انگریزی علاقے کی اراضی کے برابر ہو جائے گی۔
- ۲۔ مالیر کی آمدہ قسط سے بیکاری یا حق الخدمت لینے کا طریقہ نختہ کر دیا جائے۔
- ۳۔ ریاست میں قانون سازی کی ایک مجلس قائم کی جائے، جسے ملکی انتظام اور تحریری اختیارات دیے جائیں۔ مجلس وضع قانون کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اس کے فوجی اخراجات کے تمام مصارف ملک کی نگرانی میں کرے۔
- ۴۔ چودھری عبدالعزیز اور دیگر سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا جائے۔
- ۵۔ محصولات میں تخفیف کر دی جائے۔
- ۶۔ سیاسی مجالس کے انعقاد سے پابندی ختم کر دی جائے۔

۷۔ کرنل قشر وزیر اعظم ریاست کے زیر نظر ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جائے جو زمینداروں کی شکایات کی تحقیقات کر کے ان کی فلاح اور مہبود کے وسائل بہم پہنچانے کی سفارش کرے۔

۸۔ شہریت کے بنیادی حقوق یعنی آزادی تحریر و تقریر اور آزادی عقاید کا فوراً اعلان کرے نیز آئندہ کے لیے یقین دلایا جائے کہ کسی شخص کو بغیر قانونی انصاف کے اور کھلی عدالت میں سماعت کے سزا دی جائے۔

۹۔ جو انٹل کمیٹی کی رپورٹ ریاستی باشندوں کے لیے ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ یہ ریاستوں کے ملکی مطالبات کو پورا نہیں کر سکتی اور نہ ہی ریفرنڈیشن میں ریاستوں کو کافی نمائندگی دے سکتی ہے۔

**فرانس اور اٹلی میں معاہدہ** | حالات جیسے جیسے آگے بڑھ رہے ہیں یورپ میں ریاستوں کے ذہن دوسری بری لڑائی کے نقشے لیکر رہے ہیں لہذا

ان کی فکر امن کے لیے ہے لیکن ہوس ملک گیری میں انسانوں کا خون ان کے نزدیک بے قیمت شے ہے۔ سمندر کے پانی اور آسمانوں کے ستارے گواہ ہیں کہ گزری ہوئی جنگ عظیم میں انہی لوگوں نے آدمیت سے باہر رہ کر کیا کر دیا تھا اور آنے والے کل کو ان کے اردے کیا ہیں۔

۸۔ جنوری لندن کے اخبارات کے مطابق اٹلی میں روم کے مقام پر فرانس اور اطالیہ کے معاہدے پر موسولینی اور فرانس کے وزیر خارجہ مسٹر ایم الاول نے مشترک معاہدے پر دستخط کیے ہیں جن کی اجالی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ فرانس نے اطالیہ کی اس درخواست کو منظور کر لیا ہے کہ وہ اسے اپنی سینیا کے اندر اپنی تجارت کو بڑھانے اور نوآبادیاتی مقصد کو پورا کرنے میں آزادانہ اقدام کی اجازت دے۔

۲۔ تیونس کے اطالوی باشندوں کو دونوں ملک اطالوی قومیت قائم رکھنے کی اجازت ہوگی۔

۳۔ اطالیہ شمالی علاقہ کی ایک پٹی فرانسیسی افریقہ کی سرحدات تک جو آٹھ سو اسی

میل لمبی اور تسو میل چوڑی ہوگی۔ فرانس کے حوالے کرے گا۔

۴۔ اس کے علاوہ اطالیہ کو فرانسیسی شمالی لینڈ میں بھی ایک علاقہ مل جائے گا جس میں اوبس کی بندرگاہ شامل نہیں ہوگی۔ نیز عدیس ابابا ریوے کے حصے دو ہزار سے تیس ہزار کے درمیان تک خرید سکے گا۔

فرانس اور لندن کے عوام اس معاہدے پر خوش ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اس طرح اعلیٰ جرمن کو تنہا چھوڑ دے گا۔

۱۰۔ اسی تاریخ کو ایک نازی آفیسر نے جوان دنوں ہندوستان آیا ہوا تھا۔ بمبئی کے مشہور اخبار ”سینٹیل“ کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے کہا:

”چند ہفتوں تک جرمنی اور جاپان کے درمیان خفیہ طور پر ایک فوجی معاہدہ ہونے والا ہے، جس کے تصور سے یورپین سلطنتوں میں زیادہ پریشانی اور اضطراب بڑھ رہا ہے۔“

نازی آفیسر نے مزید کہا:

”جرمن اپنی جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔ چنانچہ جرمن پروپگنڈا اور بیرونی ڈاکٹر گوبلز نے اس سلسلے میں جرمنی کے ہر گھر ریڈیو سیٹ پانچواں لے ہیں اور ہوائی حملے کے وقت خاص ہدایات جاری کی جائیں گی۔“

اسی ہفتہ ہٹلر کے ہوائی سفر کے دوران جبکہ وہ تفریح پر تھا کسی نا معلوم شخص نے ہوائی جہاز کے ذریعے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یہ خبر اگرچہ ۹۔ دسمبر ۱۹۳۵ء کو ہوئی تھی لیکن جرمن حکام نے مصلحتاً اس خبر کو جنوری کے پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ یہ شخص کیسے تھیق نہیں ہو سکی۔ تاہم یہ معلوم ہے کہ یہ کوئی غیر ملکی شخص تھا۔ حملہ کے وقت ہٹلر کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

ہٹلر کا پیغام | سالوں کے دنوں ہٹلر نے نازی پارٹی کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے کہا:

”۱۹۳۵ء کے لیے نہایت گرمجوشی کے ساتھ ہماری آرزو ہے کہ جرمن نازیوں

علاقہ اس کو واپس کر دیا جائے جو اپنی صدائے نوح آشام سے دنیائے جہان کے  
 روبرو جرمن کے لیے ذلت کا نشان بنا ہوا ہے۔  
 ہٹلر نے آگے چل کر کہا:

«ایک سال قبل جرمنی جس قدر طاقتور تھا آج اس سے کہیں زیادہ طاقتور  
 ہے۔ لورنازی پارٹی جرمن قوم کی سیاسی آرزوں کی آئینہ دار ہے۔ جرمن سب  
 سے زیادہ عزت اور امن کا طالب ہے۔ خدا کا فضل شامل رہا تو ہم اپنی قوم کے  
 لیے روزانہ خوراک بھی حاصل کر سکیں گے۔»

فرانس اور اٹلی کے مابین مصالحت۔ جرمن اور جاپان کا مل بیٹھنا۔ ہٹلر کے ہوائی سفر پر  
 نامعلوم شخص کا حملہ اور ہٹلر کا سال نو کے موقعہ پر اپنی پارٹی کو پیغام۔ ان واقعات کے  
 ساتھ ساتھ موجودہ ہندوستان کی سیاسی بے چینی کا اندازہ کرتے ہوئے برطانوی پالیسی پر  
 غور کریں کہ لندن میں لیبر پارٹی کی حکومت کس نوعیت سے ہندوستان کے حالات کو  
 سمیٹ رہی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو مراعات دینے میں مخلص ہے۔  
 بلکہ یورپ کے افق پر جنگ کے بادل جس تیزی کے ساتھ وہاں کی فضا کو مگدڑ کر رہے ہیں۔  
 برطانیہ کا حکمران طبقہ مجبور ہے کہ وہ اپنے گھر کے بچاؤ کے لیے ہندوستان کا سیاسی تعاون حاصل  
 کرے۔

سبحاش بابو کی یورپ روانگی | ان حالات کے باوجود کہ ایوانِ فرنگی کی ہر اینٹ جرمن  
 کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت سے مخالف ہے حکومت ہند

اپنی گرہ کمزور کرنے کو خوشی سے تیار نہیں۔ سبحاش بابو اپنے والد کی بیماری اور پھر انتقال پر یورپ سے  
 کلکتہ آئے تھے۔ ظاہر ہے یہ کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا۔ مگر اس پر بھی حکومت نے نہیں والد کی  
 موت کی مذہبی رسوم میں شمولیت کی اجازت نہیں دی۔ نیز انہیں یورپ واپس جانے پر مجبور کر  
 کر دیا۔ بالآخر انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔

۸۔ جنوری کو پولیس کی نگرانی میں انہیں یورپ روانہ کر دیا گیا۔ ۱۰۔ جنوری کو وہ ناگپور ریلوے  
 اسٹیشن پر پہنچے اور اخباری نامہ نگاروں سے غیر رسمی گفتگو کے دوران کہا:

”گو میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہوں۔ اس لیے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ تاہم یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان سیاسی طور پر انحطاط کے دور سے گذر رہا ہے۔“

اس وقت ملک کے سامنے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت عوام کے

بوش اور دلولہ کو قائم رکھا جائے۔“

(کانگریس کے متعلق) کانگریس کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا پارلیمنٹری طرز عمل ہی اس کو سیواراج کی منزل تک پہنچا دے گا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر زبردست اور متحدہ رائے عام کی حمایت حاصل ہو جائے تو پارلیمنٹری جمیٹیشن سے مقصد براری ہو سکتی ہے۔“

پارلیمنٹری رپورٹ کے متعلق

کسی ہندوستانی کی کسی دائرہ میں خواہ کچھ ہی رائے ہو لیکن اس رپورٹ کو وہ ہرگز پسند نہیں کر سکتا۔

آل پارٹیز کی ضرورت نہیں

میں آل پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کا مخالف ہوں۔ جس زمانہ میں کانگریس نے سامن کمیشن کے متعلق بیروں سے اتحاد کیا تھا، تو گول میز کانفرنس کے اعلان کے ساتھ ہی بیروں نے اپنا رخ پھیر لیا تھا اور کانگریس غریب منہ تکتی رہ گئی تھی۔ اس لیے متحدہ محاذ کا عمل پیش نہ کیا جاسکا۔ ہر شخص اتحاد عمل کو پسند کرتا ہے۔ لیکن آل پارٹیز سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔“

گاندھی جی کے متعلق

میں گاندھی جی کی علیحدگی کو بھی عملی خیال نہیں کرتا۔ اس لیے کہ کانگریس ان کے مجوزہ پروگرام پر عمل پیرا ہے۔ اس وقت بھی کانگریس کی ایکڑیکٹو پیران کے عقیدت مندوں کو اقتدار حاصل ہے۔ کانگریس میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں، جن کا خیال اور جذبہ حب الوطن تو مسلم ہے لیکن ان کا نقطہ نظر کانگریس سے ذرا مختلف ہے۔

اس کے لیے مجھے افسوس ہے۔

میری رائے میں کانگریس کی مجلس عاملہ من حیث الجماعت نمائندہ کھلانے کی حق دار نہیں۔ البتہ انہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کانگریسیوں کی نمائندہ جماعت ہے۔“

ہٹلر ازم

آپ سے ہٹلر اور ہٹلر ازم سے متعلق سوال کیا گیا کہ کیا آپ ہٹلر کے بے حد مداح ہیں؟

”یہ میری معلومات میں اضافہ ہے۔“

یہ درست ہے کہ اس کے نظام میں بے شمار ایسی چیزیں موجود ہیں جو ہندوستان کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً اقتصادی اعتبار سے وہ سرمایہ داروں کی گرفت میں ہے اور جہاں تک معاملات کا تعلق ہے وہ برطانوی نظام کا حامی ہے۔

یورپین سیاست کے متعلق میری رائے ہے کہ ہم کو اس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ ہندوستان اندھا دھند فسطائیت یا اشتراکی آئین کو اپنے ہاں رواج دے۔“

زندگی کے سفر میں راستے کا تعین اہم اور ضروری ہے۔ اس کے بغیر آدمی کے لیے

شیخ عبدالحمید سندھی کو احرار کی دعوت

منزل پر پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ منزل مذہب کی ہو کہ سیاسی اقتدار کے حصول کی۔ اس سے غافل رہنے والا مسافر موت تک پہنچتے پہنچتے اکثر موڑوں پر الجھتا ہے۔ یہی عقیدہ ہے جو انسانی عمارت کا بنیادی پتھر ہے۔ اگر اس میں تذبذب ہو تو زندگی کی عمارت کمزور ہو جاتی ہے۔

مجلس احرار کے ادنیٰ کارکن سے لیڈر تک مذہب کے ساتھ اپنے سیاسی عقیدے پر بھی دلجمعی سے قائم رہے۔ ان کے نزدیک ملک کی آزادی دیگر فروعات سے کہیں زیادہ مقدم تھی۔ وہ ہندو اور انگریز سے اپنے اپنے محاذ پر ہمہ اوقات برسرِ پیکار رہے۔ ان میں سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ اس لڑائی کے لیے وہ مخلص ساتھیوں کی تلاش میں سرگردان رہتے۔ ان کی

نگاہیں ہمیشہ ایسی شخصیتوں کیلئے دارتہیں۔ یہ لوگ بہتر کارکن کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیتے جبکہ ملک کی دوسری سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں یہ رواج نہیں تھا۔ احرار رہنماؤں کا یہ کردار ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سندھ میں ان دنوں جو گھرانے سیاسی فرنٹ پر کام کر رہے تھے۔ ان میں سر غلام حسین بلایت اللہ انگریزی اقتدار کے خواہاں تھے۔ ان کا ہر قدم غیر ملکی اقتدار کے استحکام کے لیے اٹھتا رہا۔ دوسرے درجے پر جی ایم۔ سید تھے۔ یہ اپنی سیمان طبیعت کے باعث ہمیشہ ٹھکانے بدلتے رہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

سمر و خاندان بھی سندھ کا معروف خاندان ہے۔ اس کا صوبے کے ڈیپارٹمنٹ پر خاصہ اثر ہے۔ حوام میں بھی ان کی جان پہچان تھی تاہم مستقبل واضح نہیں۔ اگرچہ محمد ایوب کھوڑا بھی سندھ کے معروف کارکن رہے ہیں لیکن ان کے بیرون کا زمانہ مسلم لیگ سے وابستہ رہا۔ عبدالحمید سندھی صوبہ سندھ کے سرنجاں مرئج سیاسی رہنماؤں میں شمار رہے۔ بیہن انونٹ نہیں بنے۔ یہی وجہ ہوئی کہ یہ سندھ کی بے راہرو سیاست میں ابھرنے سکے۔ احرار رہنماؤں کے سندھ کے ریٹناروں سے اس موقع کو اپنی تیسرے میں پروتا چاہا۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۳۵ء کو صدر آل انڈیا مجلس احرار مولانا عبدیہ اکرم نے شیخ عبدالحمید سندھی کو حسب ذیل خط لکھا۔

مجلس احرار اسلام ہند

THE MAJLIS-I-AHRAR-I-ISLAM HIND,  
LAHORE.

Office Copy  
No. 2795

Date. 1. 1. 1935

مذکورہ نامی صاحب شیخ عبدالحمید۔ ایم ایس شوگر کراچی

السلام۔ راجہ راجہ پور سے مولا بنیافوس کے آگے اسمبلی کے اجلاس میں نام رہے۔

دو تیراہ سے۔ (اسی وقت تو میں ان کو لکھ رہا تھا کہ وہ لکھتا)

عدت سے خیال تھا۔ کہ آپ کو علم لہرار اسم بندہ ساقی شہل ہونا کہ دعوتِ حق پر مدد دینا فریضہ ہے۔ اور  
 مرد دل سے یہ جوش ہے کہ بندہ اور ہر قوم اور ہر مملکت اور ہر ملک کے مسلمانوں کا ایک مرکزی تعلق رہنا چاہیے۔ تاکہ  
 ہر مسلمان میں ہم ایک دوسرے کے شریک و شریکین بنیں۔ ہر قوم کے مسلمانوں کی ہر قوم کو مدد ہے۔ ہر قوم کے مسلمانوں کو مدد ہے۔  
 علم لہرار نے ہر قوم اور ہر مملکت کو آپ کے سامنے رکھا۔ اس لئے میں امید کرتا تھا کہ آپ خود ہر قوم کے شریک و شریکین بن جائیں۔  
 اور ہماری خدمت میں ہمیں جو جوش تھا۔ اور ہر قوم میں ہمیں جو جوش تھا۔ اور ہر مملکت میں ہمیں جو جوش تھا۔ علم لہرار کا نام

اور ہر قوم اور ہر مملکت میں ہمیں جو جوش تھا۔

مشہور تھے علم لہرار نے جو نام شروع کر رکھا ہے اس سے ہی آپ نے فریضہ کو شروع کیا۔ ہر قوم شروع  
 ہو جائے۔ میں امید کرتا تھا کہ آپ ہر قوم کے شریک و شریکین بن جائیں۔ اور ہر مملکت میں ہمیں جو جوش تھا۔

دستخط: محمد سعید  
 مولانا حبیب الرحمن صاحب لودھی

وڈیروں کی سیاست میں الجھے ہوئے مندھ کے حالات شیخ عبدالمجید سندھی کے درمیان  
 ایسے حائل ہوئے کہ انہوں نے مجلس احرار کی دعوت کو آئینی طور پر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔  
 البتہ گاہے گاہے مشوروں میں شامل ہوتے رہے۔ آگے چل کر سومرو خاندان احرار کی ماں میں ماں ملانا  
 رہا۔ جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔

سال رواں ہندوستان کی جدید آئینی سیاست کا سال تھا۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبوں  
 کو جو خود مختاری سونپی گئی تھی۔ ملک کی ہر سیاسی جماعت صوبائی اقتدار کے لیے مصروف کار تھی۔ بہت  
 حد تک میونسپل انتظامیہ اس کے لیے ضروری معاون سمجھے گئے۔ پنجاب کے خصوصی حالات  
 تھے، جن کی محرک یونینٹ پارٹی تھی۔ اس میں شامل ہر سرکاری آدمی میونسپل کمیٹی کے الیکشن میں  
 براہ راست ملوث تھا۔ ان کے نزدیک شہری سیاست میں کامیابی لازمی تھی۔ چنانچہ وڈیروں کی  
 فرسٹ اس بنیاد پر بنائی اور لکھوائی جا رہی تھی۔ عورتوں کو بھی اسی سال وڈیروں کی فرسٹ میں شامل  
 کیا گیا۔ اگر پردہ دار گھرانوں کو آئین کی اس شق سے ناواقف رکھا جا رہا تھا۔ تاکہ اس کمی کو مخصوص  
 عورتوں کے وڈوں سے پورا کیا جاسکے۔ مجلس احرار کو جب یونینٹ پارٹی کی اس سازش کا پتہ چلا  
 تو اس کے پنجاب کے مختلف ڈپٹی کمشنروں کو اپنے طور پر ہر سرکار کے ذریعے مطلع کیا۔ اس ضمن میں





تجویزیں اور افواہیں | یورپ کے حالات اور ہندوستان میں سیاسی بیداری سے برطانوی زوال کے آثار صاف اور واضح دکھائی دے رہے تھے۔ گو برطانوی

سیاستدانوں نے ہندوستان کو ات دینے کے لیے پارلیمنٹری رپورٹ کا ایک مہرہ پھینکا۔ مگر ہندوستانی بساط کے کھلاڑیوں نے حکومت کی اس چال کو بھانپ کر ایسی چال چلی کہ برطانوی دانشور اپنی پوکھی مھول گئے تاہم سمجھتے ہوئے پرائس نے اپنی آخری نو میں سمجھایا لیٹے کی نرید کوشش کی۔ جب ہندوستان کے پارلیمنٹری رپورٹ پر اپنی آخری رائے قائم کر رہے تھے۔ عین اسی دنوں مختلف تجاویز اور افواہیں سننے میں آئیں۔ دہلی کے بعض اخبارات نے یہ خبر شائع کی:

”حکومت کو اس بات کا پختہ یقین ہو چکا ہے کہ آل انڈیا کانگریس ابھی مردہ نہیں ہوئی، اس میں زندگی کے آثار باقی ہیں۔ لہذا حکومت کے پیش نظر تجویز ہے کہ گاندھی کو لندن بلا کر انہیں کہا جائے کہ وہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل اپنے ساتھ لائیں۔ اس کے بعد ان کی مرضی کے مطابق مجوزہ انڈیا بل میں چند ترمیمات کر دی جائیں۔“  
(روزنامہ انقلاب ۱۲-۱۰-۱۹۲۵)

”پنجاب کے ہندو اور سکھوں نے ایک مشترک تجویز دی کہ تقسیم بنگال کی طرح پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے الگ کر دیا جائے۔ نیز پنجاب کے وہ اضلاع کہ جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جدا کر کے انہیں سندھ سے ملا دیا جائے۔ اس طرح پنجاب کے دو حصے ہو جائیں گے۔“  
(روزنامہ انقلاب ۱۶-۱-۱۹۲۵)

”پنڈت مدن موہن مالوی نے انٹی کمیونل ایوارڈ کمیٹی بنائی اور اس کے تحت اعلان کیا کہ ۲۴ جنوری کو ہندوستان میں ہندوؤں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جلسے کیے جائیں اور جلوس نکالے جائیں۔“

رو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اعلان کیا کہ ۲۵۔ جنوری کو نماز جمعہ کے بعد مسلم حقوق کی حفاظت میں جلسے کیے جائیں اور قراردادیں پاس کی جائیں۔

اسی طرح سیاسی افواہیں بھی عام تھیں۔

” آئندہ اسمبلی کا صدر کون ہو۔“

کانگریس مسٹر آصف علی یا تصدق احمد شیروانی کا نام تجویز کر رہی ہے جبکہ مسٹر محمد علی جناح سر عبدالرحیم کی حمایت میں ہیں اور اگر کانگریس اور اسمبلی کے مسلم ارکان میں کوئی بات طے ہو گئی تو پھر کانگریس سر عبدالرحیم کی حمایت کرے گی۔ سندھ کے سر غلام حسین جنہیں سرکاری حمایت حاصل ہے، اصدات

کے امیدوار ہیں۔ بظاہر یہ انڈی پیڈنٹ پارٹی میں شامل ہیں لیکن اسمبلی کی افواہ ہے کہ انڈی پیڈنٹ پارٹی سر عبدالرحیم کی حمایت کر رہی ہے۔ لہذا یہ مایوس دکھائی دیتے ہیں۔“ (روزنامہ انقلاب ۲۵-۱-۱۸)

ملکی اخبارات نے ان افواہوں اور تجاویز کو اپنے کاموں میں کافی اچھالا لیکن سندھ و سمان کی سیاست جس موڑ پر تھی اس کے لیے پلٹ کر دیکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لہذا باوجود تمام جھوٹے اپنی آگ میں اپنا رامن جلا کر رہ گئے۔

انڈی پیڈنٹ پارٹی کا قیام | ۱۹۔ جنوری کو اسمبلی کے سولہ مسلم ارکان نے ڈالیا

ضیاء الدین کے مکان پر جمع ہو کر اسمبلی میں انڈی پیڈنٹ پارٹی قائم کی۔ مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) اس پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے۔ مسٹر جناح کے علاوہ سر عبدالرحیم، سر غلام حسین، ہدایت اللہ، سر محمد یعقوب، ضیاء الدین احمد، مسٹر عبدالمتین، چودھری، مسٹر ظہر علی، مسٹر کے۔ ایل۔ کاباد اجرا، مسٹر رضی حسن، سید عبداللہ مارون، ڈاکٹر غلام نبھیب نیزنگ ایسے لوگ اس اجلاس میں شامل تھے۔

اسی طرح کانگریس کی اسمبلی پارٹی کے منتسب ارکان نے بھی کے مسٹر بھولا بھاد

ضیاء الدین کو اسمبلی میں اپنا پارٹی لیڈر منتخب کیا۔

سرکاری پارٹی کے لیڈر سر این این۔ سرکار تھے۔

۱۱۔ جنوری ۱۹۲۵ء کو نئی اسمبلی کا پہلا اجلاس شروع ہوا تو کانگریس، اسمبلی کا اجلاس انارمی پنڈنٹ پارٹی اور سرکاری پارٹی کے ارکان کو یکے بعد دیگرے نشستیں میں۔ پارٹی لیڈر سامنے کی نشستوں پر بیٹھے۔

اس سے ایک روز پیشتر کانگریس نے اپنے اسمبلی کے ارکان کو تاکید کی کہ وہ گاندھی ٹوپی پہن کر اجلاس میں شریک ہوں۔ جو لوگ گپڑی باندھتے ہیں، انہیں بھی ہدایت ہوئی کہ وہ گپڑی اتار کر گاندھی ٹوپی پہنیں۔

کانگریس کی اس انداز سے اسمبلی میں شمولیت نے ایک نیا درانہ کھارتنگ پیدا کیا کیونکہ اسمبلی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

۱۶۔ جنوری کو ریاست کے دیہاتی عوام نے زمیندارہ لیگ کے حکم پر مالہ کی تخفیف کے

مطالبے پر ایک روزہ بھوک ہڑتال کی۔ ان کی بھاری میں شہری عوام نے بھی اس روز کھانا نہ کھایا۔ بعض دیہاتوں سے اطلاع ملی کہ ماؤں نے اپنے شیرخوار بچوں کو بھی دودھ نہیں دیا۔ اس واقعہ کی اطلاع تاروں کے ذریعے والٹر رائے ہند، ہمارا جہ کپور تھلہ اور پوٹیشیل ایجنٹ کے علاوہ اتر کے مرکزی دفتر کو بھی پہنچائی گئی۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر ۱۷ جنوری کو کپور تھلہ ریاست کے چند غیر جانبدار مسلمانوں کا ایک وفد ہمارا جہ کپور تھلہ کو وفد کی صورت میں ملا۔ جنہوں نے ہمارا جہ سے مطالبہ کیا۔

۱۔ سلطان پور کے واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے۔

۲۔ جو لوگ اس وارڈ میں مجرم ثابت ہوں انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔

۳۔ ریاست میں بہت جلد ایک ذمہ دار اسمبلی قائم کی جائے۔ جس میں فرقہ

وارانہ تناسب سے نشستیں مقرر کی جائیں۔

۴۔ مالہ میں فوراً تخفیف کی جائے۔

ہمارا جہ نے وفد کو یقین دلایا کہ کڑی فشرز آجائے تو حالات پر غور کیا جائے گا۔

اس سے پیشتر ۸۔ جنوری کو مہاراجہ کپور تھلہ اعلان کر چکے تھے۔

”ہمیں اپنی رعایا کی خوشحالی کا ہمیشہ خیال رہا۔ تاہم کچھ عرصہ سے ریاست کے زمینداروں کا ہم پر گلہ چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ہم نے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے کہ وہ دیکھیں کہ زمینداروں کی ضرورتیں کیا ہیں۔ ہماری رپورٹ کے مطابق ریاست میں پیشہ ورا قوام کی مالی حالت درست ہے۔ اس کے باوجود کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے، جس کے ارکان کے ناموں کا اعلان آئندہ ماہ کر دیا جائے گا، تاکہ وہ صورت حال سے ہمیں آگاہ کرے۔“

دستخط مہاراجہ بہادر جگجیت سنگھ۔ ۸۔ جنوری ۱۹۲۵ء

۱۰۔ جنوری کو مسٹر خالد لطیف گابا ایم ایل۔ اسے لوہا لے کر احرار کو ملاقات کی دعوت | کپور تھلہ کے سیکرٹری کا تار ملا۔

”مہاراجہ بہادر احرار کے وفد سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کا منشا ہے کہ حال ہی مسلمانوں کی طرف سے چودھری عبدالعزیز بیگھا والہ کی گرفتاری پر مسلمانان ریاست اور بیرون ریاست میں جو ایچی ٹیشن ہوا اس کے متعلق مہاراجہ بہادر احرار کے وفد سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ ملاقات، ضروری کو ہوگی۔“

ان حالات کے باوجود حکومت اپنے کام میں مصروف تھی۔ اور دفتر احرار پر پولیس چھاپہ | ایسے عناصر کی حفاظت اپنا فرض سمجھتی۔ جو ان دنوں بھی حکومت کے مفاد سے چھٹے ہوئے ہیں۔ گویا انہیں یقین تھا کہ انگریزی اقتدار کی جڑیں کھوکھلی نہیں ہو سکتیں۔ حالانکہ اجنبی راج کی بنیادیں اکھڑ چکی تھیں اور یہ محل آج گلا کہ کالج اس گروہ میں قادیانی ٹولہ پیش پیش تھا۔ اپنی دیرینہ وفاقوں کے باعث اس باطل مذہب کے لوگ احرار کی بلکی سی جنبش بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ احرار کے شاعر احمد یار خاں زرنی نے اپنی چند پنجابی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ جن میں مرزائیوں کے خلاف ایک نظم شامل اشاعت تھی۔ گو اس میں کوئی تلخ بات نہیں تھی۔ مگر قادیانی لیڈر نے فوراً آسمان پر اٹھالیا۔ اس ہتکامہ آرائی پر پنجاب پولیس نے زرنی صاحب کا مجموعہ کلام ضبط کر لیا اور

اس کتاب کی تلاش میں پولیس نے لاہور مجلس احرار کے دفتر پر چھاپہ مار کر مطلوبہ کتاب کی چھداکاپیاں برآمد کر کے اپنے ساتھ لے لیں۔

یہ ۲۱۔ جنوری ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔

نیشنل لیگ کا قیام (قادیانی جماعت) | دوسرے اصولوں کی طرح سیاست کے بھی چند اصول ہیں جن میں فریب

جھوٹ، دھوکہ، ادغاء، انکار و فرار نمایاں ہیں۔ اقتدار کے حصول میں انہی الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔ شخصی حکومت کا راج ہو کہ جمہور کا۔ سیاست دان اپنی ضرورت کے لیے اس دائرے سے باہر نہیں ہوتے۔ البتہ مذہب کا اپنا ضابطہ ہے جس میں الفاظ کی گنجائش نہیں اور نہ یہ طریق کار اس دائرے میں واجب قرار دیا جاسکتا ہے۔

غیر ملکی ضرورت نے مذہبی اصولوں کو اپنی خواہشات کے سانچے میں اس انداز سے ڈھالا کہ اسلام ایسا پختہ عقیدے کا مذہب بھی ظاہری نظروں میں داخل ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کی سب سے بڑی ذمہ داری قادیانیوں پر عائد ہوتی ہے۔ کہ انہوں نے سیاسی پارٹی ہوتے ہوئے بھی اپنے اوپر اسلام کا لیبل چسپاں کیے رکھا۔ اور عیسائی حکومت کو اولی الامر تک کہہ دیا۔

۱۹۳۴ء میں مجلس احرار نے ہندوستانی عوام کو اس فریب سے آگاہ کیا وگرنہ علماء کی اکثریت بھی اس ٹوٹے کو مسلمانوں ہی کا فرقہ خیال کرتی رہی۔

۱۸۵۷ء کی ہنگامی اور انقلابی تحریک میں تشدد اور قتل و غارتگری کے بعد فرنگی حکمرانوں نے اپنے لیے جن تحریکات کو ہندوستان میں مفید پایا۔ قادیانی تحریک ان کے نزدیک زیادہ کارآمد سمجھی گئی اور پھر یہ تحریک کیونکر پروان پڑھی۔ گذشتہ اوراق میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔

لڑائی ہتھیاروں سے ہو یا ناخن تدبیر سے دشمن کو شکست دینے کے لیے کئی رنوں ہسے لڑی جاتی ہے۔ مجلس احرار نے بجائے تبلیغ کے مزارعوں پر سیاسی رخ سے حملہ کیا اور اس چادر کو اس بری طرح تار تار کیا کہ قادیانیت و اشکات بطور پر نشکی ہو گئی۔

سانپ کے بدن سے کبجلی اترتی تو اس کی ہر شے نظر آنے لگی۔ کرگسوں سے شاہین کا لباس چھین لیا گیا تو ان کے پروں میں پرواز کی سکت نہ رہی۔ بیٹھڑ شیر کی کھال اڑھے ہوئے تھی لیکن جیسے ہی یہ ملمح اتر تو خوف و ہراس کا عالم ختم ہو گیا۔

قادیانی احرار کے اس حملے کو سمجھ گئے اور وہ بھی اسی رخ سے مقابلے میں اترے۔ قادیانی مذہب کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے ۱۹ جنوری جمعہ کے روز اپنی عبادت سے پہلے حسب ذیل تقریر کی:

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر وہ جماعت جو یہ سمجھتی ہے کہ اس کے حالات ایسے ہیں کہ اسے قانونی حد کے اندر رہتے ہوئے حکومت کے پاس اپنا معاملہ پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اسے لازم ہے کہ وہ موجودہ انجمن سے الگ ایک ایسی انجمن بناتے، جس میں کوئی سرکاری ملازم نہ ہو۔ اس کے بعد جو جماعتیں اس قسم کی درخواست کریں گی۔ میں خور کے بعد ان کو اجازت دے دوں گا۔“

اس کے بعد بشیر الدین محمود نے کہا:

”میں اس کی اجازت دیتے ہوئے اپنی طبیعت پر ایک بوجھ محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ میں نے جماعت کو سیاسیات سے علیحدہ رکھنے کے لیے اکیس سال کے لمبے عرصے تک سخت جدوجہد کی ہے۔ اور اس کے لیے اپنی اور بیگانوں سے گالیاں کھائی ہیں۔ مجھے اسی وجہ سے قتل کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ لیکن اب میں مجبور ہو کر اس کی اجازت دے رہا ہوں۔ اس وقت ہماری جانیں اور ہمارے بیوی بچوں کی جانیں خطرے میں ہیں۔ میں نے اپنی عمر کا ایک حصہ اس کوشش میں صرف کیا ہے کہ حکومت برطانیہ کی نیک نامی میں اضافہ ہو اور وہ مستحکم ہو۔ لیکن چونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ جب وہ لوگ ہم پر حملہ آور ہوئے جن سے ہم اس لیے رٹتے رہے ہیں کہ وہ حکومت کے خلاف منافرت پھیلانے اور اس

کی جڑوں کو کمزور کرنے والی حرکات کرتے تھے۔ تو ہمیں کچھ پتہ نہیں لگتا کہ حکومت کیا کر رہی ہے۔ اس لیے میں مجبور ہوں کہ جماعت کو اجازت دے دوں کہ جس حد تک شریعت، سیاست میں دخل دینے کی اجازت دیتی ہے، اسے اسے کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے فتنہ و فساد کیے بغیر انصاف کو قائم رکھتے ہوئے اور محبت کے جذبات کو کچلے بغیر ان خود مختلطی کے طور پر وہ سیاسیات میں دخل دے سکتی ہے۔“

(الفضل قاریان ۲۵-۱-۲۰۰۰)

بعد میں اس جماعت کا نام نیشنل لیگ رکھا گیا۔

**اسمبلی کی صدارت** | سر عبد الرحیم امرتھ تصدق احمد شیروانی کے مقابل کامیاب ہو گئے۔ عبد الرحیم کے حق میں ستر اور شیروانی کو باسٹھ ووٹ پڑے۔ سر محمد علی جناح کی انڈین نیشنل پارٹی نے سر عبد الرحیم کی اور کانگریس نے سر تصدق احمد کی حمایت کی۔

**وائسرائے کی تقریر** | جنوری کے تیسرے ہفتے کلکتہ یورپین ایسوسی ایشن کی دعوت کے موقع پر وائسرائے ہند نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

”ہندوستان کی اس تاریخ پر نظر ڈالیے، جبکہ برطانیہ کا ہندوستان سے تعلق قائم نہیں تھا۔ ہم اہل برطانیہ، ہندوستان میں امن اور نظم و نسق لائے، اور اس ملک کا سیاسی گلزار ہمارے ہاتھوں سے لگا اور پروان پڑھا اور اسی وجہ سے اس نے ترقی کی۔ آزادی کے نئے خیالات پیدا ہوتے اور ہماری طرف سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آل انڈیا نیشن میں مجھے برطانوی کارنامہ شگب بنیاد نظر آتا ہے۔“

**تحفظات**: خصوصاً حقوق اور تحفظات کے لیے۔ ایک طرح پر یہ تحفظات خود مجوزہ ترقی کا ایک جزو ہیں۔ اس کی وجہ یا سبب مقصد اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے امتثال اقتدار ایک حقیقی چیز ہے جو محتاج تحفظات ہے



تاکہ ہم ایک طریق حکومت سے محفوظ طور پر دوسری طرز حکومت تک پہنچ سکیں۔  
براہ راست انتخاب: (وائسرائے نے کہا) میں ذاتی طور پر اور میری حکومت  
فیڈرل مجلس آئین ساز میں براہ راست انتخاب کے حامی تھے۔ لیکن دوسری  
طرف کے دلائل بھی زبردست تھے۔ ساریہ امر واقعہ ہے کہ اگر ہندوستانی  
رائے کسی قسم کی ترمیم ضروری خیال کرے تو بجلی چر اپنی تجاوز پارلیمنٹ کے  
رو برو پیش کر سکے گا۔ تاکہ ہندوستان کو کسی قسم کی شکایت نہ رہے۔

(آگے چل کر وائسرائے نے کہا) میری سہمشہ یہ آرزو رہی ہے کہ ہندوستان  
دولت مشترکہ برطانیہ کے دیگر ارکان کے مساوی درجہ حاصل کرے۔ کیونکہ ہندوستان  
کے حالات اور سلطنت کے دیگر اجزاء (نوآبادیات) سے مختلف ہیں! اس کا  
دستور اساسی بھی برطانیہ کے کل اجزاء کے دستور سے مختلف ہو سکتا ہے۔

فیڈریشن وہ راستہ ہے جو ہندوستان کو یقینی طور پر ترقی پر گامزن کر دے  
گا۔ لہذا مجوزہ دستور کی سکیم اس قابل ہے کہ اس پر انتہائی محنت اور جانفشانی  
کے ساتھ عمل کیا جائے۔

۲۲ جنوری - نئی دہلی میں والیان ریاست کا ملتوی  
شدہ اجلاس از سر نو شروع ہوا جس کی صدارت

## والیان ریاست کا اجلاس

ہمارا جہ پٹیا لہ نے کی۔ اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے وائسرائے نے کہا  
"والیان ملک کی یہ خواہش ہے کہ تا وقتیکہ مجوزہ دستاویز کار ریاستوں کے  
متعلق مطالبہ پورا نہ کیا جائے وہ اپنا فیصلہ فی الحال ملتوی رکھیں۔  
مجھے ذاتی طور پر یقین ہے کہ ہندوستانی ریاستوں کے لیے طریق کار یہ ہوگا  
کہ وہ فیڈرل سکیم کو منظور کریں۔"

آپ کو معلوم ہے کہ آپ پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا گیا۔ فیڈریشن بار داخل  
ہونا، نہ ہونا، آپ والیان ریاست کی مرضی پر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ  
آپ کو اس سکیم میں کافی یقین دلا چکا ہوگا کہ جدید دستور میں ان کی

کے تحفظ کے لیے کسی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ میں صدق دلانہ توقع رکھتا ہوں کہ ولیم ریاست اپنے خاص مفاد سے بے پرواہ نہ ہوں گے نیز اس آئینی ترقی میں برطانوی ہند ریاست ہائے ہند، سلطنت کے سیاسی مشیر کو مدد دیں گے۔ آخر میں آپ نے کہا:

”میں آپ کو دو باتیں یاد دلاتا ہوں، جو میں نے گزشتہ اجتماع کے موقع پر کہی تھیں۔ اول یہ کہ جن ولیم ریاست نے پہلی گول میز کانفرنس میں اپنا یہ عزم صمیم ظاہر کیا تھا کہ وہ برطانوی ہند میں شریک ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ کہہ کر فیڈریشن کو ایک ممکن چیز بنا دیا تھا۔ غالباً میں نے کہا تھا کہ کوئی ریاست جب تک کہ دستاویز پر شرکت کے دستخط نہ کرے گی اس کو آخر فیڈریشن میں داخلے کا ذمہ وار نہ سمجھا جائے گا۔ میرے یہ دونوں ریمارک آج بھی صحیح ہیں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسے وقت میں جب کہ دور رس تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ ریاستیں یہ کہیں کہ انہیں اس امر کا یقین دلایا جائے کہ ان کے اہم مفاد کو پس پشت نہ ڈالا جائے گا۔ جہاں تک قابل عمل کا تعلق ہے اس امر کی انتہائی کوشش کی گئی ہے کہ جو ریاستیں، فیڈریشن میں شرکت کا فیصلہ کریں گی ان کی پوزیشن محفوظ رہے۔“

دائیں رائے کی تقریر کے بعد مہاراجہ پٹیل نے بحیثیت ریاستوں کے ریاستوں کی قرارداد | چانسلر کے حسب ذیل قرارداد پیش کی:

”ایوان ولیم ریاست اپنے سابقہ اعلان کی دوبارہ تصدیق کرتا ہے

کہ:

ریاستیں آل انڈیا فیڈریشن میں شرکت کے لیے تیار ہیں۔ بشرطیکہ وہ ناگزیر شرائط اور ضمانتیں جن پر زور دیا گیا ہے، دستور میں شامل کر دی جائیں لیکن ایوان اس مسئلے کے متعلق اپنی رائے اس وقت تک کے لیے محفوظ رکھے گا۔ جب تک کہ آئین میں اصلاحات کے متعلق پارلیمنٹری بل مجوزہ معاہدہ

شرکت نیزوائٹس کے نام دستاویز کلیتاً معلوم نہ ہو جائیں اور ان کی جانچ نہ کر لی جائے۔ ایوان اس امر پر بھی زور دینا چاہتا ہے کہ فیڈریشن کا اجراء اور اس کی کامیابی جملہ متعلقہ پارٹیوں کے اعتماد اور اشتراک اور ریاستوں کی سیادت اور معاہدات کے تحت ان کے حقوق کو بلا حذر تسلیم کیے جانے پر منحصر ہے۔

علاوہ بریں ایوان انفرادی طور پر ریاستوں کے تصفیہ طلب مطالبات فیڈریشن میں داخل ہونے سے پیشتر طے ہو جانے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔  
قرارداد کی تائید ہمارا جہ بیکانیر نے کی اور یہ قرارداد منظور کی گئی۔

اس اجلاس سے ایک روز پیشتر لندن کے اخبار "ڈیلی میل" نے اپنے افتتاحی نوٹ میں لکھا۔

”ہندوستان کے وہ حکام جن کے ہاتھ میں حکومت کا انتظام ہے بہت سماجیت، چاٹلوسی اور جبر سے والیان ریاست کو اس امر پر آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ سرکاری بل کو منظور کریں۔ اگر وہ ازراہ حاکمت ایسا نہ کریں گے تو اپنی قبر آپ کھودیں گے۔“

والیان ریاست کو لازم ہے کہ وہ اپنا اور ہندوستان کا تحفظ کر کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ایک اور نمایاں خدمت انجام دیں۔

(روزنامہ انقلاب ۲۵-۱-۲۴)

سجاش بابو کی کتاب پر پابندی | ۲۵- جنوری کے ہندوستانی اخبارات نے گزٹ آن انڈیا کی ایک غیر معمولی اشاعت میں اعلان کیا،

کہ قانون مجریہ ۱۸۷۸ء کے تحت گورنر جنرل بااجلاس کونسل کے فیصلہ کے مطابق ڈسٹرکٹ اینڈ کونبرہ جونس سٹریٹ لندن ڈیپوسیٹریٹ نمبر ۱۸ انگلستان کا کوئی نسخہ برطانوی ہند میں نہ پہنچے۔

نہ ہی اس کتاب کا کوئی ترجمہ، نہ اس کی کوئی نقل، نہ اس کا کوئی اقتباس ہندوستان میں لے پائے۔  
نوٹ: "سجاش بابو کی اس کتاب کا نام" ۱۹۲۴ء سے جماد آزادی تھا۔ یہ کتاب انہوں

نے دورہ یورپ کے دوران آئرلینڈ میں لکھی تھی۔“

**یوم احتجاج** | ۲۶ جنوری کو کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد نے اعلان کیا کہ فروری کو سارے ہندوستان میں پارلیمنٹری رپورٹ کے خلاف یوم احتجاج منایا جائے۔ اس روز جلسے کیے جائیں اور جلوس نکالے جائیں۔

**حکومت کی خوش فہمی** | برطانوی حکمت عملی کے تحت پارلیمنٹری رپورٹ ہندوستانوں کے لیے کسی رخ سے بھی قابل قبول نہیں تھی۔ یہاں تک کہ برطانیہ کا ڈریٹ گروہ بھی اس رپورٹ سے مطمئن نہیں تھا۔ ہندوستان کے اچھوت جنہیں پونا ایکٹ کے تحت اس رپورٹ میں ہندوؤں کے برابر سیاسی پوزیشن حاصل ہو چکی تھی ان کے رہنما ڈاکٹر امیتکار نے بھی اپنے ۱۲ جنوری کے بیان میں جدید دستور کو اچھوتوں کیلئے ناپسند کیا۔ والیان ریاست نے بھی (آئندہ چل کر) برطانیہ پر عدم اعتماد کا اظہار کر دیا۔ حالانکہ ریاستہائے ہند برطانوی اقتدار کا آخری سہارا تھیں۔

اس کے باوجود حکومت اس خوش فہمی میں تھی کہ چونکہ ہندوستان کی اقوام باہم ایک دوسرے پر اعتماد نہیں رکھتیں لہذا ہمارے بات رہ جائے گی۔ دوسری طرف کانگریس مٹر محمد علی جناح کی پہلی تجویز پر راضی نہیں تھی اور آخری تجاویز پر ان کا ذہن جناح سے متفق تھا۔ تیسری اور آخری بات کہ اسمبلی میں بھولا بھائی ڈیسیائی کی تقریر جس نے یہ امید دلائی تھی کہ کانگریس اور اسمبلی کے مسلم ارکان کسی موڑ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ تاہم حکومت کو یقین تھا کہ کانگریس مٹر جناح کی کمیونل ایوارڈ کی تجویز سے راضی نہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھے۔ اسمبلی کے اندر اور تمام ملک میں ان دنوں یہی افواہ کام کر رہی تھی۔ انجارات اپنے کاموں میں اسی قسم کی بحث کر رہے تھے۔

**مسلم لیگ کا اجلاس** | ۲۲ جنوری کو مٹر محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ کا اجلاس نئی دہلی میں ہوا۔ جس میں نواب مٹر محمد یوسف، سرفیروز خاں نون، عبدالمبین چودھری، راجہ غضنفر علی، ڈاکٹر ضیا الدین احمد، حافظ بدایت حسین مٹر تصدق احمد شيردانی (کانگریس)، سید مرتضیٰ حسن، مٹر خالد لطیف گابا (انوار)، خان بہادر حاجی رحیم بخش، مولانا شوکت علی، میاں احمد یار خاں دولتانہ، مولوی محمد شفیع داؤدی شریک

ہوئے۔ یہ اجلاس دو دن تک جاری رہا۔

آخری دن حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

”آل انڈیا مسلم لیگ نے جو انٹنٹ پارلیمنٹری رپورٹ پر نہایت احتیاط اور دیانت کے ساتھ غور کیا ہے اس کی رائے یہ ہے کہ اس میں جو آئینی تجاویز درج ہیں وہ وائٹ پیپر کی ان تجاویز سے بھی زیادہ حد درجہ بے حقیقت ہیں لہذا جب تک متعلقہ اقوام کی طرف سے کوئی متفق علیہ بات پیش نہیں کی جاتی مسلم لیگ فرقہ وارانہ برطانوی اعلان کو بہ طور منظور کرتی ہے۔ نیز اس بنیاد پر ہر پارٹی اور جماعت سے تعاون کے لیے تیار ہے، جو اہل ہند کے لیے کوئی تسلی بخش دستور مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہو“

گزشتہ سال جنوری میں مہاراجہ کپور تھلہ نے  
**کپور تھلہ فرنچائس کمیٹی کی سفارشات**  
 حسب ذیل افراد پر مشتمل ایک فرنچائس کمیٹی  
 تشکیل دی تھی۔

۱۔ دیوان بشمبر داس وزیر داخلہ۔ ۲۔ سردار کشن سنگھ چیف جسٹس۔ ۳۔ سردار کپور سنگھ  
 بار ایٹ لا۔ ۴۔ ڈاکٹر ابوالفضل صدیر بار ایسوسی ایشن اور ۵۔ پنڈت کنول نارائن ایڈووکیٹ  
 ان حضرات نے مسلسل ایک سال کی تحقیق کے بعد حسب ذیل تجاویز مرتب کیں۔

۱۔ ارکان اسمبلی کی کل تعداد ۲۵ ہوگی جن میں ۳۰ براہ راست انتخاب سے  
 آئیں گے اور ۱۵ نامزد ہوں گے۔

۲۔ مختلف تحصیلوں کا تناسب اس طرح طے پایا۔

کپور تھلہ۔ ۹۔ سلطان پور۔ ۷۔ پھگواڑہ۔ ۷۔ ۵۔ بنگلہ۔ ۱۔ اس

طرح یہ تعداد ۲۹ بنتی ہے لیکن سرکاری رپورٹ میں اسی طرح درج ہے۔

۳۔ کمیٹی نے کرنل فشر (نئے وزیر اعظم) اور دیوان بشمبر داس کے نام صدر  
 اور نائب صدر کے طور پر پیش کیے۔

۴۔ انتخاب مخلوط ہوگا۔ اقلیتوں کو نشستیں حاصل کرنے کیلئے پانسنگ دیا جائیگا۔

۵- اچھوتوں کو خاص نمائندگی کا موقع دیا جائے گا۔

۶- حق رائے دہی کے لیے اکیس سال کی عمر اور تین صد روپے کی جائیداد اور پندرہ روپے مالیہ اور تعلیمی اعتبار سے میٹرک کو لیشن کی شرط لگائی گئی ہے۔  
فرنیچر کی کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوتے ہی ہمارا ہر لے سابق وزیر اعظم میاں سر عبدالحمید کو حکم دیا کہ جب تک وہ ریاست کا واجب الادا قرض ادا نہ کریں، نیر ریاست کی جو جائیداد ان کے پاس ہے وہ ریاست کو واپس نہ کر دیں۔ انہیں اپنی جائیداد فروخت کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ رہن رکھ سکتے ہیں۔

(نوٹ۔ بعد میں ہمارا جرنل نے یہ حکم واپس لے لیا تھا۔) روزنامہ انقلاب ۲۵-۱-۲۶

فاسخ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنون میرا | ہندوستان کے آئینی مسائل حل ہو رہے تھے۔ اقوام ہند فرنگی دستور اساسی پر بحث

میں مصروف تھیں کہ ایسے میں بھی ہندو، انگریز کی شہ پاکر ہندو سماج کی اوٹ میں مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے سے باز نہیں رہا۔

قصور کے پالارام اور کراچی کے منھورام نے خاتم الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توہین کی جس پر غازی محمد صدیق، غازی عبدالقیوم نے انہیں جہنم واصل کیا۔ اس پر غیر ملکی قانون نے ان نوجوانوں کو سزائے موت دی۔

مجلس اہل حالات کے پیش نظر خاموش تھی، تاہم اسمبلی میں اس کا نامزدہ مسٹر خالد لطیف گاباجا جی فیسلے کے مطابق اپنی ذمہ داریاں نبھار رہا تھا۔

۲۸۔ جنوری کو مسٹر گابا نے اسمبلی میں ہوم ممبر کو چند سوالات کے متعلق نوٹس دیا۔

کیا ہوم ممبر برائے کرم یہ بتائیں گے؟

و۔ کیا حکومت کو مسلم حلقوں کی طرف سے اور اسی باب میں ملک بھر کی جماعتوں کی طرف سے متعدد تاریں موصول ہوتی ہیں کہ غازی عبدالقیوم کی سزا کو جنہیں کراچی عدالت سے موت کی سزا مل چکی ہے، ملتوی کر دیا جائے۔  
ب۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ محمد صدیق نامی شخص کو اس ہوم میں کہ اس نے قصور

کے پاللام کو توہین پیغمبر کی سزا دی، لاہور کی عدالت سے منزلے موت ہوئی ہے ج۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ مذکورہ بالا دونوں مقدموں میں ملزمان نے جو کچھ کیا اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے؟

اس بنا پر ملک کے کروڑوں مسلمان غازی عبدالقیوم اور غازی محمد صدیق کی ہمت اور جرات پر انہیں مبارک باد دے رہے ہیں۔ لہذا حکومت کو ان مقدمات پر توجہ دیتے ہوئے دونوں کی سزائے موت تبدیل کر کے عبور دینے شوریٰ سزا دے دینی چاہیے۔“

**پہلو دھری عبدالعزیز کی رہائی** | ریاست کپورتھلہ میں گذشتہ سالوں سے جو کچھ ہو رہا ہے تاریخ ان چشم دید واقعات کو اپنے دامن میں گره دے چکی ہے۔ ریاست کے حالات جب اس موڑ پر پہنچے کہ راعی اور رعایا حقوق کے بازار میں کھلم کھلا آنے سامنے اکھڑے ہوئے تو ریاست کے حکمران کی آنکھیں کھلیں۔ اس وقت بغاوت کی آگ راج محل تک پہنچ چکی تھی۔ قریب تھا کہ راج سنگھاسن جل کر راکھ ہو جاتا۔ مہاراجہ کپورتھلہ پیرس سے وطن واپس پہنچے۔

ریاستی حکمرانوں نے محض ذاتی وقار کے لیے گزشتہ ربع صدی سے اپنے حوام سے جو آنکھ مچولی کی اور ظلم و جور کی جس بھٹی میں ریاستی حوام جلے یہ وقت کا عظیم المیہ ہے۔ بالآخر مظلوموں کا خون راج گدیوں کو اپنے طوفان میں تنکے کی طرح بہا کر لے گیا۔

سونے کا تاج پہننے والے سردوں پر جب خاک آلود جوتے پڑے تو سر کا ایک ایک بال چیخ اٹھا۔

وطن پہنچ کر والی ریاست نے کپورتھلہ کے حالات کا بغور جائزہ لیا اور اس زنجیر کی ایک ایک کڑی توڑ ڈالی جس نے ریاستی مظلوموں کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اپنے باغ سے وہ تمام کانٹے چن کر پھینک دیے جن کی چھن سے پھول زخمی ہو رہے تھے۔ اپنے انصاف کے دریچوں سے مظلوم رعایا کی ضرورتوں کو دیکھ کر مہاراجہ کپورتھلہ اپنے انصاف کے یوان میں آن بیٹھا۔

جنوری کے آخری ہفتے ریاست کے جنرل پولیس انسپکٹر کی معیت میں ریاست کے سب سے بڑے باغی چودھری عبدالعزیز بیگوالیہ کو سنٹرل جیل کپور تھلہ سے اپنے محل میں بلا بھیجا۔

جب وہ محل میں پہنچے۔ ہمارا جہ نے سب سے پہلا سوال ان سے یہ کیا۔  
 ”مجھے بتایا گیا ہے کہ مجلس احرار روسی طریق پر جائیدادوں کی تقسیم چاہتی ہے۔ اور مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ تم راج گدی کے دشمن ہو، اور اشتراکی اصولوں پر ریاست میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہو۔“

چودھری عبدالعزیز: ”میرے خلاف رپورٹیں سرتاپا غلط ہیں۔ اور نہ ہی مجلس احرار تشددانہ انقلاب کی حامی ہے۔ میں خود ریاست کا سب سے بڑا زمیندار ہوں میرے متعلق یہ قیاس کہ میں لوگوں کی جائیدادوں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہوں بالکل غلط ہے۔“

یہ درست ہے کہ مجلس احرار انقلابی جماعت ہے اور میں ریاستی لوگوں کے حقوق کا حامی ہوں۔ غریبوں کی جائز حمایت مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ جس ملک کی عام آبادی تکلیف میں ہو اس کا والی قابلِ قدر نہیں۔ میں نے ریاستی ٹرینیشن اس لیے جاری کیا تھا کہ ریاست ایسے آفسروں اور اہلکاروں سے پاک اور صاف ہو اور رعایا کے جائز حقوق کا خیال رکھا جائے۔  
 ہمارا جہ: ”مجھے کیسے اطمینان ہو کہ تم انقلاب برپا کرنا نہیں چاہتے؟ اور مجلس احرار انقلابی جماعت نہیں ہے؟“

چودھری صاحب: ”میں اس کے متعلق ہر طرح کا یقین دلانا چاہتا ہوں، لیکن جہاں تک پرامن ذرائع کا تعلق ہے۔ مجلس احرار کانگریس کی طرح عوام الناس کے حقوق کی طالب ہے۔“

ہمارا جہ: میں اکتی طریق سے اصلاحات حاصل کرنے کا مخالف نہیں، مجھے بہت ہی غلط رپورٹیں پہنچائی گئی تھیں کہ تم گدی کے مخالف ہو اور تشدد کے ذریعے انقلاب پیدا



کرنے کی خواہش رکھتے ہو۔

اس گفتگو کے بعد چودھری صاحب واپس جیل بھیج دیے گئے اور دوسرے دن تمام سیاسی قیدی چودھری صاحب سمیت ریاست کی جیلوں سے رہا کر دیے گئے۔  
چودھری صاحب رہا ہو کر مکان میں پہنچے تو ہنوز پولیس ان کے مکان کے ارد گرد پہرہ دے رہی تھی۔ اتنے میں چودھری افضل حق ایم ایل۔ اے، چودھری عبدالرحمن راہنوا ایم۔ ایل۔ اے ان سے ملنے آئے۔ اس طرح شہر کے دوسرے لوگ بھی ان سے ملاقات کرتے رہے۔

چودھری عبدالعزیز | خالق  
روز آفرینش

سے جن لوگوں کو اپنی مخلوق کی خدمت کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ چودھری عبدالعزیز ان میں سے ایک تھے۔  
رہیں باپ کا رہیں بیٹا گھر کی تمام آسائشیں چھوڑ ریاست کی مظلوم آبادی کے دکھ درد میں شریک ہو گیا۔  
۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۵ء کی ابتدا تک موصوف کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، تاریخ اس کی ہمیشہ شاہد رہے گی۔



(چودھری عبدالعزیز بیگم والید)

دل کا غنی اور مال کا غنی برابر نہیں ہوتے۔ اس بازار میں دونوں اپنا اپنا بھاؤ رکھتے ہیں۔ اس منڈی میں تہی دامن ہونا انسان کے لیے عظیم گالی ہے۔ لیکن دولت مند اگر خدا کی راہ میں تہی دامن ہو جائے تو اس کی قیمت سوا ہوتی ہے۔ چودھری عبدالعزیز ریاست کا بٹراز مینڈار تھا۔ سینکڑوں مربع اراضی کا مالک ریاستی عوام کے لیے پہلے حکومت کا باغی کہلایا۔

اور جب تمام اٹلاک بحق سرکار ضبط ہو گئی تو بجز عزم حق کوئی فقیر ہو کر جیل خانے چلا گیا۔ ۵۔

پھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

چودھری عبدالعزیز رہائی کے بعد نہ صرف کپور تھلہ بلکہ ہندوستان میں غیر فانی شہرت کا مالک بن گیا۔ وہ جس شہر پہنچا عوام کو دیدہ دل فرس راہ پایا۔ یہ رونقیں اور یہ ہوگا ہائے زندگی جاری و ساری تھے کہ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو چودھری عبدالعزیز اپنے گاؤں میں انتقال کر گئے۔ اناللد وانا ایہ راجون۔

چودھری صاحب ۱۸۹۵ء میں اپنے شمال ہریانہ ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری فضل احمد خاں تھا۔ تعلیم میٹرک تک تھی جسے چودھری صاحب نے اپنے اموں محمد نواب خاں تحصیلدار کے ہاں گجرات اور جہلم میں حاصل کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر اپنی زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

یہ ۱۹۳۲ء کا دور تھا۔ ملک میں تحریک کشمیر اور مجلس احوار کے عام پورچے تھے۔ چنانچہ آپ احوار میں شامل ہو گئے۔ اپنی خداداد قابلیت کے باعث بہت جلد آل انڈیا مجلس احوار کی ورکنگ کمیٹی کے رکن منتخب ہو گئے۔

چوہدری صاحب تین بھائی تھے۔ آپ کے بعد چودھری عبدالرشید کپور تھلہ کی کورٹ کے جج تھے۔ ان سے چھوٹے عزیز احمد تھے جو ریاست کی طرف سے بحیثیت میجر دوسری جنگ عظیم میں شامل ہوئے۔ لیکن سقوط برما کے بعد آپ انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے۔ یہاں آپ کی حیثیت سمبھاش چندوس کے بعد دوسرے درجے پر تھی۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۶۵ء میں ساہیوال میں انتقال کر گئے۔

چودھری عبدالعزیز زینہ اولاد سے محروم تھے۔ اپنے بھائی چودھری عبدالرشید کے بچے کے سرفراز کو گود لے رکھا تھا۔ آجکل یہ نوجوان ہالینڈ میں ہے۔ باقی خاندان کا مونکے ضلع گوجرانوالہ میں ہے۔ البتہ چودھری عبدالرشید سابق جج ہائیکورٹ کپور تھلہ جن کی عمر تادم تحریر اسی سال کے قریب ہے، لگا ہے گا ہسپتالی لاہور کی رہائش گاہ ۶۴۔ مرننگ روڈ پر نظر آتے ہیں۔

جنوری کے حالات سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اسمبلی میں پارلیمنٹری رپورٹ کو مسترد یا ترمیمات کرانے میں دونوں متحارب گروپ دکانگریس

## اسمبلی کا اکھاڑا

اور انڈی پنڈنٹ پارٹی) ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ملکی ضرورت انہیں مجبور کر رہی ہے کہ وہ غیر ملکی حکومت کو اس موڑ پر شکست دیں چنانچہ ۲۳ جنوری کو دہلی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر صدر کانگریس بابو راجندر پرشاد اور مسلم لیگ کے صدر مٹر محمد علی جناح کے درمیان فرقہ وارانہ مسئلے پر جو گفتگو شروع ہوئی اس نے حالات کو مزید جلادہی اور باہم محبت کے ٹمٹاتے چراغ میں پھر سے روشنی پیدا ہوئی۔

یکم فروری کو بھولا بھائی ڈیسانی نے اسمبلی کو اپنے ساتھیوں کے دستخطوں سے پارلیمنٹری رپورٹ کے متعلق مندرجہ ذیل ترمیم کا نوٹس دیا۔

اس اسمبلی کی رائے ہے کہ رپورٹ کی مجوزہ سکیم کو برطانوی اقتدار کی تویح اور اقتصادی مفاد کے جذبے کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ اور اس بنا پر اہل ہند کو کوئی قابل ذکر اختیارات حاصل نہیں ہوتے اور اگر اس سکیم کو قبول کر لیا گیا تو دستور ہند میں سیاسی اور اقتصادی ترقی کی بجائے تنزل اور انحطاط رونما ہو جائے گا۔

چنانچہ یہ اسمبلی گورنر جنرل سے سفارش کرتی ہے کہ حکومت ملک معظم کو اس بات کا مشورہ دے کہ وہ کسی ایسے دستور کو منظور نہ کرے جو اس سکیم پر مبنی ہو۔

۲۔ فروری کو انڈی پنڈنٹ پارٹی کے لیڈر مٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) نے جو انٹ پارلیمنٹری رپورٹ پر حسب ذیل ترمیم کا نوٹس دیا۔

۱۔ اسمبلی فرقہ وارانہ اعلان کو اس کی موجودہ صورت میں اس وقت تک کے لیے قبول کرتی ہے، جب تک اس کے مقابل کوئی متفق جلیہ سمجھوتہ پیش نہ ہو

۲۔ صوبہ جاتی حکومتوں کی سکیم کے بارے میں اس ایوان کی یہ رائے ہے کہ یہ

نہایت قابل اعتراض، بغیر تسلی بخش اور مایوس کن ہے۔ کیونکہ اس میں بعض نقائص پائے جاتے ہیں۔ خاص کر دوسرے چیمبر میں گورنروں کو خاص اختیارات فوج اور پولیس کے متعلق دفعات اور صیغہ جات خفیہ سروس۔ ان نقائص کی وجہ سے عہدیداروں اور کونسلوں کا حقیقی ربط اور ان کی ذمہ داری ناکارہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے جب تک ان قابل اعتراض نقائص کو دور نہ کیا جائے، ہندوستان کے کسی حصے کو بھی تسلی نہ ہوگی۔

۳۔ مرکزی گورنمنٹ آل انڈیا فیڈریشن کی سکیم کے مطابق اس اسمبلی کی صامت الفاظ میں یہ رائے ہے کہ یہ سکیم اصولاً ہی غلط ہے اور برطانوی ہند کے لوگوں کو نامنظور ہے۔ اس لیے حکومت ہند سے سفارش کی جاتی ہے کہ وہ ہر مجبستی کی حکومت کو مشورہ دے کہ اس سکیم پر مبنی کسی آئین کو پاس نہ کریں اور اس بات کا بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ فوراً اس بات کو سوچنے کی کوشش کی جائے کہ صرف برطانوی ہند میں کسی طرح حقیقی اور مکمل ذمہ دار گورنمنٹ قائم کی جاسکتی ہے اور اس غرض کے لیے ہندوستانی رائے عامہ کو معلوم کرنے بلا تاخیر تمام پوزیشن پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ گورنمنٹ نے قانونی ممبر کی بنیاد یہ بتلایا کہ کانگریس جو انٹنڈ پارلیمنٹری رپورٹ کی تجاویز کو کھلم کھلا رد کرتی ہے تو دفعہ علی علی میں مندرج ترمیم بھی اتنا ہی اثر رکھتی ہے۔

(تاریخ کانگریس بمصنف ڈاکٹر بی۔ پٹاجائی۔ سیتہ رام پریٹس۔ ۵۷۵)

۴۔ فروری کو اسمبلی میں پارلیمنٹری رپورٹ پیش کر دی گئی۔ دوسری کارروائی کے علاوہ سر این این۔ سرکار نے بحیثیت سرکاری پارٹی کے رپورٹ پر بحث کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس پر بنگال کے فضل حق نے اعتراض اٹھایا اور کہا کہ اب اس پر بحث نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پارلیمنٹری رپورٹ کو برطانوی ایوان میں بل کی شکل میں پیش کیا جا چکا ہے۔

صدر نے کہا یہ اعتراض صحیح نہیں۔ البتہ ارکان اپنی تقریروں میں اسے گورنمنٹ آف انڈیا بل کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کانگریس لیڈر کی بحیثیت سے مٹر بھولا بھائی ڈیسا نے اپنی

ترمیم پیش کرتے ہوئے چالیس منٹ تقریر کی اور کہا:

”ہم بالکل واضح طور پر بتانا چاہتے ہیں کہ پیش کردہ دستور بے کار ہے۔ اور اس سے ہندوستان قطعاً خوش نہیں ہوگا اور نہ اس سے وہ مقصد پورا ہوگا جو حکومت کے پیش نظر ہے۔ اگر ہمارے پاس وہ طاقت موجود ہوتی جس کی بنا پر ہم حکومت کو اپنے استحقاق یا خواہش کے مطابق عمل پر مجبور کرتے۔ ورنہ ہمارے پاس یقیناً اس قدر خودداری تو موجود ہے کہ جس چیز کی ہمیں ضرورت نہیں اسے واپس کر سکتے۔ اس ترمیم کی تحریک پر میں اپنی ذمہ داری محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے کہ سرکار نے کہا ہے یہ تخریبی نہیں۔ اور اگر اسے تخریبی بھی کہا جائے تو حقیقی مقصد تعمیر ہے۔

ایک وقت تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اہل ہند نے اسے خوشنودی اور رضا مندی کے ساتھ تسلیم کرتے ہوئے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ اس کے بعد تعلیم کا دور شروع ہوا تو اہل ہند نے اہل برطانیہ سے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ عدل و انصاف کی بنا پر ہندوستان کو اس کا حق دے دیں گے سو وقت بھی گزر چکا ہے۔ گذشتہ تیس سال سے ہندوستان میں حالات و واقعات کا رد عمل شروع ہے۔ ہندوستان کو یہ بتلایا گیا ہے کہ برطانیہ خنک میں مسدود آبادیوں کے استحکام اور بقا کے لیے شریک ہے۔ لیکن اس دن میں جو معاہدات کیے گئے ان کی تکمیل کا کبھی وقت نہ آیا۔ یہ تاریخ انسانیت کا نہایت ہی درناک باب ہے لہذا اب حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر اہل ہند حکومت خود اختیار کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

بہر حال رپورٹ کے مصنفین نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہم ایسی حکومت چاہتے ہیں جس کے وزیر منتخب مجلس وضع آئین کے روبرو جواب دہ ہوں۔ آپ نے امریکہ اور سوئٹزرلینڈ کی مثالیں دے کر بتایا کہ وہاں ہر سیاسی، نسلی اور اقتصادی اعتماد کے راستے میں زبان اور نسلی امتیازات حائل نہیں ہوتے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ خدا اور اس کے بندوں

کے درمیان ایک منفرد رشتہ ہے جسے دنیاوی ضروریات اور اخراض کے لیے خراب نہیں کیا جاسکتا۔

اہل برطانیہ دوسرے لوگوں کو کیوں اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ مذہب کے نام پر اپنے آپ کو تقسیم کریں اور ان پر حکومت برطانیہ کا اقتدار قائم رہے؟

اس کے بعد سکھ لیڈر سردار منگل سنگھ نے کہا۔

”اگر دستور اساسی کی ترکیب تلی بنیاد پر رکھی گئی تو سکھ اپنے تمام فوجی مطالبات کو نظر انداز کر دیں گے۔ فرقہ وارانہ فیصلہ خطاب یافتہ مسلمانوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ مگر عام مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔“

۶۔ فروری کو اسمبلی کے اجلاس میں کانگریسی لیڈر کی مسٹر محمد علی جناح کی تقریر

تقریر کے بعد مسٹر محمد علی جناح نے پارلیمنٹری رپورٹ

پر اپنی ترمیم کے سلسلے میں تقریر کے دوران کہا:

”میں اس اہم موقع پر اپنی اس غلط فہمی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو ”اسٹیشن مین“ جیسے ذمہ دار اخبار میں میری روش کے متعلق لکھا گیا۔“

اخبار مذکور نے ۲ فروری کو مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے کانگریس پارٹی کا کارنامہ جذبہ نسلی منافرت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس پارٹی کو نئے نئے حلیف ملتے رہیں گے۔ آغاز میں مسٹر جناح گول میز کانفرنس کے پر جوش رکن اور فیڈریشن کے حامی تھے۔ اب وہ اس سکیم سے غیر متعلق ہو گئے ہیں اس وجہ سے بعد کے گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں انہیں مدعو نہیں کیا گیا۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا۔

”میں پورے زور سے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ میرے دل میں نسلی نفرت کا جذبہ نہیں۔ میں آغاز میں بھی گول میز کانفرنس کا پر جوش حامی ہی نہیں بلکہ پر جوش تریں حامی تھا۔ جہاں تک کہ یہ سکیم کامیاب نہ ہوئی اور نہ ہندوستانوں کو مطمئن

کر سکی۔

مذکورہ اخبار کا آخری حوالہ ایک بیہودگی ہے جس کا ارتکاب کوئی ذمہ دار اخبار نہیں کر سکتا۔ میں اخبار میں اعلان کرتا ہوں کہ میں فیڈریشن سکیم کو اس درجہ سے ناقصی بخش کتنا ہوں کہ گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں دعوت شرکت نہیں دی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے آخری اجلاسوں میں اس درجہ سے مدعو نہیں کیا گیا کہ میں زیر غور سکیم کا سخت مخالف تھا۔

مولا بھائی ڈیسا کی پیش کردہ ترمیم پر بحث کرتے ہوئے مٹر جنرل نے کہا: "اس کا مطلب تمام سکیموں کی نامنظوری اور فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق غیر جانبداری ہے۔"

فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق جہاں تک میرے ذاتی رائے کا تعلق ہے، میرا جذبہ خودداری اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہندوستانی منافقت کر کے کوئی فیصلہ نہ کریں۔ میں اس فیصلے کو اس لیے تسلیم کرتا ہوں کہ اس کے بغیر کوئی حل کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مجھے ڈیسا کی اس نظریے سے پورا اتفاق ہے کہ مذہب، قومیت اور زبان کو سیاسیات کے دائرہ میں داخل نہیں کرنا چاہیے لیکن اقلیتوں کا مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ ہے اور دوسرے ملکوں نے بھی اسے حل کیا ہے۔ میں سیاسی طور پر اقلیت کا تحفظ چاہتا ہوں۔"

مٹر ڈیسا کی کہتے ہیں۔

"پہلے حاصل کرو اس کے بعد تقسیم کرو۔ میں کتا ہوں کہ پھر ہاتھ مارا گا ندھی نے کیوں پرانے تیاگ برت دھارن کر کے معاہدہ پونا کیا۔ میں بندوؤں کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے یہ معاہدہ کر کے اپنے پسماندہ بھائیوں کو مطمئن کر دیا لیکن کیا انہوں نے تقسیم سے پہلے حصول کا انتظام کیا۔؟ اس جذبے کے ساتھ ہم

سے بھی ہاتھ ملانے سے ہم تیار ہیں۔

کانگریس کے متعلق حکومت کے متضاد بیانات!

”حکومت کبھی تو یہ کہتی ہے کہ کانگریس ہندوستان کی نمائندہ ہے۔ اور کبھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ مختصر باغی گروہ ہے۔ ان دونوں باتوں سے میں کیا نتیجہ نکالوں؟ لیکن انہائے وطن کی ایک جماعت پیروں تو تحریک لگا رہے ہیں۔ تو آپ اپنے چورچل، لائیڈ، اڈوائزر کے متعلق کیا کہتے ہیں؟“

اگر میں اس طرح گفتگو کا جواب دوں جس طریق کو وہ پیار کرتے ہیں، تو آپ کو فوراً ہندوستان سے نکال دوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ مرکز کے لیے جو آئین تجویز کر رہے ہیں وہ موجودہ آئین سے بھی بدتر ہے۔ مجوزہ آئین کے معنی تو یہ ہیں کہ برطانیہ، ہند کے لیے وہ کچھ چاہتا ہے کہ جس کے لیے اس نے نصف صدی گزشتہ کام کیا ہے وہ سب قربان کر دیا جائے۔ میں اس موقع پر وایان ریاست سے بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

”کیا یہ ذمہ داری جو انہوں نے مرکز کے لیے تجویز کی ہے، اور جس پر وہ فیڈریشن میں شامل ہونے پر آمادہ نہیں ہیں کیا وہ اپنی رعایا کو بھی یہ حقوق دینے کے لیے تیار ہیں؟“

ہوم ممبر: مسٹر خلیج آپ بحث کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔

مسٹر خلیج: ہوم ممبر! میرے مطلب کو غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ حکومت اس مسئلے پر نظر ثانی کرے اور میرے وطن میں ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔ لارڈ اردن نے اعلان کیا تھا کہ آئین ان تجاویز پر مبنی ہوگا، لیکن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے ہوگا۔ لیکن مجوزہ آئین غالباً ان تجاویز پر مبنی ہے، جن پر کنزرویٹو پارٹی کے ارکان کی اکثریت متفق تھی۔ اس میں ہمارے ساتھ کوئی اتفاق رائے نہیں کیا گیا۔

اس بحث کے نتیجے میں جب اسمبلی میں ووٹ لیا گیا تو کانگریس کو اکثریت اور باقی ایوان



کو بہتر روٹ ملے اس پر مسٹر جناح کی تجویز منظور کر لی گئی۔

تحریک کپور تھلہ کا خاتمہ | غلاموں کا مذہب، سلطنت کی ضرورت اور اس کا منشا ہوتا ہے۔ اس نقشے کو لیکرنے اور اس میں رنگ بھرنے کا

طریق بھی وہی لوگ ایجاد کرتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں نظام سلطنت کی لاٹھی ہوتی ہے۔ وہ عوام کو جیسے چاہتے ہیں، ہانکتے ہیں۔

متحدہ ہندوستان میں انگریزی راج نے اچھے بھلے مذہبی اصول رکھنے والی اقوام کو اپنی پالیسی اور ضرورت کے لیے اس بری طرح استعمال کیا کہ آئندہ نسلیں انہیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ بینڈ باجوں کی آواز، اینٹوں کے ڈھیر کا خدا اور بانس کے بنے ہوئے تصوراتی مزار اور درختوں کی ٹہنیاں اور پتوں پر نہ جانے اجنبی راج میں کس قدر انسانوں کا خون ضائع ہوا ہوگا۔

جب وقت کی ضرورت ختم ہوگئی تو عیب و ثواب کوئی عیب و ثواب نہ رہا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی مشغل تھا جو اب ختم ہو گیا۔

سلطان پور لودھی کا قضیہ اصولاً اور مذہباً کوئی اتنا اہم نہیں تھا کہ اس کے لیے انسانی لہو کی ضرورت ہوتی۔ محض تعزیر داری اور درخت کی چند شاخوں کا رونا تھا۔ مگر اس وقت کے وزیر اعظم نے صرف اپنی ملازمت اور وفاداری کے لیے ناکردہ گناہ، مسلمانوں کا خون بہانا مناسب سمجھا اور آج جب ریاستی حاکموں کی مرضی ہے کہ اس ڈرامے کو بہ طور ختم کرنا ہے تو یہ ختم ہو گیا۔

ریاست کے نئے وزیر اعظم نے ۶ فروری کو سلطان پور لودھی کا فیصلہ اس طرح سنایا۔

”سلطان پور کے سکھوں اور مسلمانوں کی مشترک کمیٹی تعزیر کے راستے کی نسبت

جھگڑا ختم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ لہذا میں حکم دیتا ہوں کہ متنازعہ دیوار

دگور دوارہ اور کربلا کے درمیان، کو فوراً منہدم کر دیا جائے۔ اور اسے یہاں

سے چھ فرٹ پیچھے تعمیر کیا جائے۔ نیز متنازعہ درخت کے متعلق متعینہ راستہ

سے تعزیروں کے گزرنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔

میں یہ بھی حکم دیتا ہوں کہ اس راستے کی ممانعت درخت کے متبرک  
 ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ امن میں خلل پڑنے کے اندیشے کے باعث ہے۔  
 اگر کہیں سے انصاف مل سکے تو سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے اُن رہنماؤں کو جمع  
 کروا جنہوں نے تعزیر کے احترام میں درخت کی ٹہنیاں کٹوانا مناسب سمجھی تھیں،  
 جنہوں نے درخت کو مذہب کا مقدس نشان جان کر تعزیر کو گزرنے کی اجازت  
 نہیں دی تھی۔

جنہوں نے درخت کو دیوتا جان کر انسانی خون بہانے کو جائز سمجھا تھا۔  
 ان سب سے سوال کرو کہ ایک انگریز کے حکم پر تم سب چپ کیوں ساہ گئے تمہارے  
 مذہبی اعتقادات کہاں چلے گئے تمہاری زبانوں پر کس نے سانپ بٹھا دیا کہ تم بولتے نہیں ہو؟  
 راستہ تبدیل کر دیا گیا۔ دیوار گرا دی گئی۔ درخت کو متبرک ماننے سے انکار کر دیا گیا۔  
 شیعہ کہاں ہیں؟ کہ آج تعزیر کا راستہ تبدیل کر دیا گیا ہے۔  
 سکھ کہاں ہیں کہ گوردوارہ کی دیوار گرا دی گئی۔

ہندو کہاں ہیں کہ بڑے درخت سے دیوتا کا لباس چھین لیا گیا ہے۔

مگر اب تاپ سخن کہاں؟ کہ ضرورتِ ملوکیت ختم ہو چکی ہے۔

اسی تاریخ کو مہاراجہ نے وزیرِ اعظم کے مشورے پر ان تمام افسران کو ملازمت سے  
 سبکدوش کر دیا جنہیں سلطان پور کے حادثہ میں ملوث سمجھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ریاست  
 کے وزیر داخلہ بشمبر داس کو بھی جلیحدہ کر دیا گیا اور ایہ میں بھی قدرے خفیف کر دی گئی۔  
 اس کے ساتھ ہی دو سال کی جدوجہد کے بعد تحریکِ کپور تھلہ ختم ہو گئی۔

آزادی وطن کی جدوجہد میں شریک رہ کر بھی اوزار ریاستِ کشمیر، الورا اور کپور تھلہ کے حوام  
 کو ان کے انسانی اور پیدائشی حقوق دلانے میں ہمہ تن مصروف رہے۔ آئندہ تاریخ کا مورخ  
 ان کے لیے الگ باب قائم کرے گا۔ حالات کچھ ہی ہوں مگر اس کا احترام کرنا پڑے گا۔  
 کہ چند بوریہ نشینوں نے باوجود مخالفت کے باوجود اپنا چہرہ روشن کیے رکھا۔

برطانوی سامراج کی بقاء کے لیے ریاستوں کا وجود ازل سے ضروری تھا اور فرنگی ان سنگھانوں

کی پابندی میں ہر ممکن اعانت کرتا رہا۔ مجلس احوار کے نزدیک ان طنابوں کو توڑنا لازمی تھا جو انہی سہارا تھیں غیر ملکی سامراج کا۔ اس آمر سے پر نواب، راجے اپنی مظلوم رعایا پر ظلم و ستم ڈھانے میں دلیر اور شیر ہوتے جا رہے تھے۔ احوار اس طوفان کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور اپنی قربانیوں سے اس ظلم کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔

کشمیر اور اور پور تھلہ کے حوام اور ان کی آنے والی نسلیں احوار کو ہمیشہ سلام کرتی رہیں گی۔ جن امرینوں میں برطانوی رپورٹ پر اسمبلی کے علاوہ سارے ہندوستان میں لے دے ہو رہی تھی۔ انہی دنوں ۱۹۱۹ء فروری کو یونان برطانیہ میں انڈیا بل پر بحث جاری تھی۔ سر سمویل ہور نے مجوزہ بل پر اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

”برطانیہ کی پالیسی کے مطابق ہندوستان کا نصب العین درجہ نوآبادیات ہے۔“

موجودہ انڈیا بل میں تمہید کے فقدان کا مطلب یہی ہے کہ حکومت سابق معاہدات پر کار بند ہے اور ۱۹۱۹ء ایکٹ کی تشریح کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ برطانیہ کے نزدیک ہندوستان کا نصب العین درجہ نوآبادیات ہے۔ موجودہ انڈیا بل درجہ نوآبادیات کو حاصل کرنے کے لیے ایک زینہ ہے۔

اور جب ہندوستان اپنے میں حکومت خود اختیاری کے حصول کی صلاحیت پیدا کر لے گا اس وقت انگلستان اپنے تمام سابقہ وعدوں کی تکمیل کر دینگا۔

یہ سر پارٹی نے کہا:

اس بل پر بحث کے دوران یہ سر پارٹی کے اراکین پارلیمنٹ نے کافی ہنگامہ آرائی کی اور کہا، ”ہماری یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کو جہاں تک ممکن ہو جلد سے جلد ایسی ترقی دی جائے جیسی کہ انگلستان کو حاصل ہے۔“

برطانوی حکومت کے نظم و نسق کی خوبی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا

ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کی زندگی کا معیار کہاں تک درست ہے۔“

نوٹ، انگلستان کے تمام اخبارات نے سر سمویل ہور کی اس تقریر پر انہیں بڑی داد دی کہ یہ تقریر ہندوستان کے حق میں ہے۔

## مسٹر جناح کی صدر کانگریس کو دعوت

۲۳۔ جنوری کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر کانگریس اور مسلم لیگ کے صدر

کے مابین صلح کی جس گفتگو کی ابتدا ہوئی تھی اسمبلی کی کارروائی کے باعث وقتی طور پر اس میں تعطل آگیا۔ جیسے ہی فرصت ملی۔ ۱۰۔ فروری کو مسٹر جناح نے ایک خط کے ذریعے بابو راجندر پرشاد کو از سر نو دعوت دی۔

”اگر ہو سکے تو آپ اسمبلی کے دوران مجھ سے ملاقات کریں۔“

آپ کا ایم۔ اے۔ جناح

کانگریس کے صدر نے ۱۲۔ فروری کو پہلی پہنچنے کا وعدہ کیا۔

## سرکاری ممبران کی رائے

۱۲۔ فروری کو کونسل آف سٹیٹ میں مجوزہ رپورٹ پر بحث ہوئی۔ نامزد ممبر سر محمد یامین نے تجویز پیش کی کہ پارلیمنٹری

رپورٹ کو قبول کر لیا جائے۔ یہ تجویز چونکہ آراء کے مقابلہ میں بین آراء سے منظور کر لی گئی۔ راجہ غضنفر علی کی بھی اسی قسم کی تجویز تھی جو پیشتر منظور ہو چکی تھی۔

## جناح راجندر گفتگو

اسمبلی میں انڈی پنڈنٹ ٹنٹ پارٹی کے لیڈر مسٹر محمد علی جناح اور آل انڈیا کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد کے درمیان فرقہ وارانہ

فیصلے پر ۱۲۔ فروری کو نئی دہلی میں پھر سے گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس ضمن میں راجندر پرشاد نے ہندو مہاسبھا کے رہنما بھائی پرمانند کو بھی اس گفتگو میں شمولیت کی دعوت دی۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ تاہم راجندر، جناح گفتگو اس موضوع پر تھی۔

۱۔ مخلوط انتخاب کے ساتھ پنجاب اور بنگال کی آبادی کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے نشستوں کا تعین۔

۲۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں مسلم نیابت کا توازن۔

اس گفتگو سے پیشتر اعلان کیا گیا تھا کہ یہ مذاکرات انفرادی ہیں۔ اگر ہم کسی نتیجے پر پہنچے تو اپنی اپنی جماعتوں کے ارکان سے مشورہ کریں گے۔

۱۵۔ فروری کو بھولا بھائی ڈیسیائی نے لاہور پہنچ کر سکھ رہنماؤں سے فرقہ وارانہ مسائل پر

بات چیت کرنا چاہی لیکن اس میں بھائی پرمانند کی طرح گیتانی کو تار سنگھ نے بھی کانگریسی لیڈر سے ملاقات کے لیے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا:

»جب تک کانگریس کمیونل ایوارڈ کے متعلق اپنی پالیسی تبدیل نہیں کرتی

ان سے بات چیت فضول ہے۔«

اس طرح پنجاب ہندو مہا سبھا نے بھی اعلان کیا کہ:

»اگر مسلمانوں سے کانگریس کا کوئی سمجھوتہ ہوا تو ہندو مہا سبھا اسے قبول

نہیں کرے گی۔«

اسمبلی کانگریس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسانی نے لاہور میں سرمنویر لال، ارٹھے بہلولہ

درگاڈاس، پنڈت نانک چند، لالہ گلن ناتھ، سرگول چندنارنگ، سردار منگل سنگھ، سردار

سر دول سنگھ کوشیر، گوپال سنگھ قومی سے حالات و واقعات پر گفتگو کی۔ لیکن وہ لپٹے مشن

میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے۔

۱۶۔ فروری کوئی دہلی میں مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ

کا اجلاس ہوا۔ جس میں جناح، راجندر گتنگو کے ضمن میں مسٹر جناح

نے تمام ممبران سے رازداری پر حلف لیا۔ اور پھر تمام گفتگو جو اس وقت تک ہو چکی تھی انہیں بتائی

اس اجلاس میں طے پایا کہ مسلم لیگ کی طرف سے کوئی تجویز پیش نہ کی جائے۔ اگر کانگریس کوئی

تجویز پیش کرے تو اس پر غور کرنے سے تامل نہ کرنا چاہیے اور نہ گفتگو میں حصہ لینے سے انکار

کرنا چاہیے۔

اس اجلاس میں خان عبدالصمد چکنئی اور عبدالعزیز کی رہائی کا طالب کیا گیا۔ سندھ جیل

حضرات اس اجلاس میں شریک ہوئے۔

سرفیروز خان نون، سر محمد یعقوب، مولانا غلام بھیک نازنگ، خان بہادر رحیم بخش،

عبدالمتین چودھری، نواب احمد یار خاں دولتانا، راجہ غضنفر علی وغیرہ۔

۱۸۔ فروری عربی کالج دہلی کے ایک سیاسی مباحثہ کی صدارت

مسٹر جناح کی تقریب کے دوران مسٹر محمد علی جناح وقتاً فوقتاً نے کہا۔

”ہندوستان کی بساط سیاست پر ایک طرف عظیم الشان ہندو قوم ہے اور دوسری طرف مسلمان۔ ہم نے ہندوؤں کو متعدد بار صلح پر آمادہ کرنا چاہا اور ان کی طرف دستِ تعاون بڑھایا۔ لیکن ہر مرتبہ مسلمانوں کے ساتھ نہایت ہی حقارت آمیز سلوک کیا گیا اور یہ کہنا صحیح نہیں، کہ گول میز کانفرنس میں فرقہ وارانہ گفتگو میں ناکامی کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔ مسلمانوں نے دو مرتبہ مخلوط انتخاب پر فرقہ وارانہ سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر بار پہاری رائے کو ٹھکرا دیا گیا اور اس کی بڑی دہر ڈاکٹر مونجھے اور مسٹر جیکار جیسے لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ ہم تنہا بیوقوف نہیں کہ اتحاد کی ضرورتوں کا احساس نہ رکھتے ہوں۔ ہم اتحاد چاہتے ہیں اور صرف ملک کے مفاد کی خاطر۔“

آپ یقین جانتے کہ ہندوستان میں کوئی خوددار ہندوستانی ایسا نہ ہوگا جو اتحاد کا خواہاں نہ ہو۔ کیونکہ اتحاد کے بغیر دنیا کی نظروں میں ہم ذلیل و خوار نظر آتے ہیں“ اسمبلی میں اپنی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

”میں اتنا کم عقل نہیں ہوں کہ اسمبلی میں جو انٹنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ پر جو مباحثہ ہوا اس پر اسمبلی نے جو فیصلہ دیا اس کو میں اپنی ذاتی فتح سمجھ لوں۔ بلکہ یہ تمام ملک کی فتح ہے۔ میں تو اس کی کامیابی کا ایک ذریعہ تھا۔ لیکن یہ فتح کا فخری حیثیت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔“

میں یہ بھی یقین رکھتا ہوں کہ اسمبلی کے فیصلے کے بعد حکومت اپنا سامان اٹھا کر بمبئی سے لندن روانہ ہو جائے گی۔ یقین جانتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد نہ ہوگا ہم کوئی چیز حاصل نہ کر سکیں گے۔ میں حصولِ اتحاد کے لیے اپنی انتھاک اور انتہائی کوشش صرف کروں گا۔ اگر میں اس میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً ہندوستان کی جنگِ آزادی نصف سے زائد کامیاب ہو جائے گی۔“

واقعات شاید ہیں کہ جب کبھی ہندوستان میں مسلم حقوق کا سوال سامنے آیا۔ مجلسِ احرار نے اپنی جماعتی حیثیت کو ذرا محسوس کیا۔

نمائندہ احرار کا بیان

لیکن جہاں کہیں اس سلسلے میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بات چلی اجراء تے اپنے کو ہمیشہ علیحدہ رکھا۔ اگرچہ اس دور میں مسلم لیگ پرسروں اور خان بہادروں کا قبضہ تھا اور ان خاصہ سے مسلم حقوق کی نگہداشت کا گمان کرنا ایک سراب کی حیثیت رکھتا تھا اس پر بھی اجراء بنیادوں نے نتیجے کا انتظار کیے بغیر کسی فیصلے پر رائے زنی سے اعتراض کیا۔

۲۲۔ جنوری کو جناح، راجندر گفٹگو شروع ہوئی اور کچھ دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی۔ ۱۰۔ فروری کو یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا اس پر ۲۰ فروری کو دہلی میں جناح، راجندر گفٹگو کے متعلق اخباری نمائندوں نے مجلس اجراء کی رائے معلوم کرنے کے لیے مسٹر خالد لطیف گابا سے بیان دینے کو کہا۔ انہوں نے کہا:

”ملک کے ہر ہی خواہ کو اس گفٹگو کے لیے جناح اور راجندر بابو کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو اکثریت کی طرف سے رواداری کی ضرورت ہے۔ انٹی کمیونل ایوارڈ کی کوششیں مجوزہ گفٹگو کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی اس قسم کی دھمکیوں سے مسلمان مرعوب ہو سکتا ہے۔ اگر فریقین نے کوئی قابل قبول سمجھوتہ مرتب کر لیا تو اجراء کو اس پر بڑی مسرت ہوگی۔“

خالد لطیف گابا نے آگے چل کر کہا:

”اس موقع پر اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء کا برطانوی پالیسی پر نہایت گہرا اثر پڑا تھا۔ لہذا موجودہ نہاد مسلم میثاق بھی دور رس نتائج کا حامل ہوگا۔“

ہندوؤں اور سکھوں کی دیکھا دیکھی بنگال کے مسلمانوں کی طرف سے بنگال  
بنگالی مسلمان  
مسلم لیگ کے صدر مولوی عبد الکریم ایم۔ ایل۔ سے نے ۲۰ فروری کو  
جناح، راجندر گفٹگو کے دوران مسٹر جناح اور راجندر پرشاد کو تارکے ذریعے مطلع کیا کہ:  
”بنگال کے مسلمانوں کو اکا دن فیصد نشستیں ملنی چاہیں۔“

اس موقع پر چاہیے تو یہ تھا کہ پنجاب کا مسلمان دونوں رہنماؤں کو اپنے صوبے کے تفرات

بھیجتا لیکن چونکہ پنجاب کے مسلمان پراہرار کا اثر غالب تھا اور اہرار کی پالیسی کا اظہار خالد لطیف گایا کر چکے تھے۔ لہذا پنجاب خاموش رہا۔

**والیان ریاست** ۲۵۔ فروری کو بمبئی پٹیالہ ہاؤس میں والیان ریاست کا ملتوی شدہ اجلاس اپنے آخری فیصلے کے لیے ہمارا چہ پٹیالہ کی صدارت میں شروع ہوا۔ جس میں چھوٹی بڑی چالیس ریاستوں کے فرماؤں نے شرکت کی۔

اس اجلاس میں برطانوی رپورٹ کے متعلق ہمارا چہ پٹیالہ نے ایک قرارداد پیش کی۔ جس کی تائید نواب آف بھوپال اور ہمارا چہ بیکانیر نے کی۔ اس قرارداد پر جوہن گھنٹے بحث رہی۔ آخر میں والیان ریاست نے دستور اساسی کو نا منظور کرتے ہوئے انڈیا بل اور مجوزہ دستور میں ترمیم کا سختی سے مطالبہ کیا۔

اس قرارداد کے جواب میں ۲۷۔ فروری کو دارالعوام لندن میں وزیر ہند سر سموتیل ہول نے کہا:

” والیان ریاست نے برطانوی حکومت پر الزام لگایا ہے۔ کہ حکومت اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہی۔ میں والیان ریاست کو صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ الزام غلط ہے۔ اور اگر مسودہ قانون ہند کی ترتیب و تدوین میں مجھ سے کوئی خامی رہ گئی ہے تو میں اس میں مطلوبہ ترمیمات کرنے کو تیار ہوں۔ والیان ریاست کا مطالبہ ہے کہ ہندوستان میں بائرفیڈریشن قائم کی جائے۔

میں خود بھی اس کا حامی ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے والیان ریاست نے فیڈریشن کے متعلق اپنے نظریے میں تبدیلی نہیں کی۔ اگر حکومت برطانیہ اور والیان ریاست دونوں فیڈریشن کے قیام کے موید ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے اور پارے باہن فیصلہ نہ ہو۔

والیان ریاست کے چند مطالبات کا ذکر انڈیا بل میں کیا گیا ہے۔ اس کا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان کے مطالبات منظور کر لیے جائیں گے۔ ہمارے اور والیان ریاست کے درمیان کوئی وسیع نخلج حاصل نہیں۔“



**نئے رفیق سفر** | موسمی تغیرات کے دن بھی عجیب ہوتے ہیں۔ زمین اودھے اودھے نئے نیلے نیلے پھول اگتی ہے۔ شاخیں بھوٹتی ہیں۔ ان پر جوان پتے ہمارے آمد کا اعلان کرتے ہیں۔ کلیاں جو بن کے ابھار سے گل بوٹوں میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔ درخت اچلے پیرہنوں سے آراستہ فضاؤں میں رنگ بھاراں بکھیرتے ہیں، کہ ساری کائنات مسکرا اٹھتی ہے۔ عشاق کے دل انہی دنوں نافہ آہو کی طرح اپنے جذبات میں رنگ بھرتے ہیں۔ حسن دریاؤں میں لہروں کی طرح دل کی موجوں سے کھیلتا ہے۔ حسن و عشق کے سنگم میں اسی موسم میں نکھار آتا ہے۔ پھر کبھی جھنگ کے جیلے آباد ہوتے ہیں، اور کبھی پنجاب کے کنارے ساون بھاؤں کے انتظار میں رود کوہیاں ریت کے گھروندے بناتی ہیں اور گرا دیتی ہیں۔

فطرت اپنی بوتاموئیوں کا یہ تماشہ دکھتی ہے۔ انوار آئندہ موسم کے انتظار میں یہ پہلے فضاؤں میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

سیاسی تنظیموں کے جوار بھاٹا میں بھی اسی طرح تغیر آتا رہتا ہے۔ نئے ساتھی نئی آرزوؤں کے ساتھ جماعتوں میں شریک ہوتے ہیں تو کارواں کی زینت بڑھتی ہے۔ سالانہ قافلہ اپنی ذمہ داریاں نئے رفیقوں میں تقسیم کرنے پر خوشی محسوس کرتا ہے۔ جوان امنگیں نئے احساس سے جب اس بوجھ کو سنبھالتی ہیں تو جماعتوں میں ترقی کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے ملک و ملت کو نئے کارکن میسر آتے ہیں۔ اگر یہ مخلص ہوں تو بڑے کے سائے کی طرح بہا رہی بہا رہتی ہے۔ درندہ فوج مخلص لوگوں کا ہجوم ایک بھیڑ ہے اور بس۔

سال رواں کے یہی دن تھے جب مجلس احوار میں نوابزادہ نسر اللہ خاں رئیس جتوئی ر ضلع مظفر گڑھ، مظہر نواز خاں بی۔ ا۔ سے ملتان۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن سجادہ نشین آلودہ شریف ر ضلع سیالکوٹ، حکیم عبدالسلام ہری پور ہزارہ۔ خان مہدی زمان خاں کھلہ بٹ ضلع ہزارہ۔ عبدالرب نشتر پشاور۔ غازی محمد حسین ضلع لاکپور۔ میر عبدالقیوم ایڈووکیٹ لاکپور، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لاکپور۔ چودھری عبدالستار دہلی۔ ایم۔ ایم بشیر علی گڑھ دیوپی، سردار محمد شفیع رئیس عثمان والا ر ضلع لاہور، شامل ہوئے۔ ان کی آمد سے جماعت میں نئی روشنی نئے خیالات اور جذبات ابھرے۔ اس کے ساتھ ہی مرکزی ورکنگ کمیٹی میں تبدیلیاں آئیں پچاسچہ نوابزادہ

نصر اللہ خاں، حکیم جہد السلام، صاحبزادہ فیض الحسن، سردار محمد شفیع، خاں سدھی زمان، خواجہ عبدالرحیم  
عاجز اور قاضی احسان احمد کو مرکزی عاملہ میں شامل کر لیا گیا۔

سیاسیات میں اُن جماعتوں کی عمر ڈھلتے آفتاب کی طرح ہوتی ہے، جس کے رہنماؤں میں  
جوہر قابل کی پہچان نہ ہو سہارا رہنما جذبات کے ساتھ خلوص کی جانچ پڑتال کرتے ہیں اپنے دل  
کے آئینے کو سامنے رکھتے۔ اگر اس میں کوئی میل نہیں تو آنے والے کے خلوص پر بھی شبہ نہیں  
کیا جاسکتا۔ گو (POLITICAL ORGANISATIONS) میں ہمہ اقسام کے لوگ آتے ہیں اور  
ان کی پرکھ پر جماعتیں برس ہا برس گزار دیتی ہیں، پھر کہیں اعتماد بحال ہوتا ہے۔ لیکن غیر ملکی غلامی  
کے دنوں جذبہ ہزیت کا فرما ہونے کی شرط ضروری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اہوار رہنما نووارد کو صفت تول  
میں جگہ دیتے۔ بدیں وجہ مخالفین، اہوار کارکنوں سے ناراض رہتے۔

۱۱ مارچ ۱۹۲۲ء - جنوری کو مسٹر محمد علی جناح اور بابو راجندر پرشاد  
جناح، راجندر گنگو کا خاتمہ کے درمیان جس گفتگو کا آغاز ڈاکٹر مختار احمد انصاری  
کے مکان پر ہوا تھا۔ بالآخر یکم مارچ کو دونوں رہنماؤں نے بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ایک مشترک  
انجاری بیان کے ذریعے اس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔  
مشترک بیان: نئی دہلی۔ یکم مارچ راجندر پرشاد اور مسٹر جناح کی گفتگو کے متعلق مندرجہ ذیل  
بیان جاری کیا گیا ہے۔

”ہم نہایت افسوس اور دیانت کے ساتھ فرقہ وارانہ مسئلے کو اس اسلوب پر  
حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، جو تمام پارٹیوں کے نزدیک قابل قبول  
ہو۔ لیکن ہمیں اس بات پر افسوس ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود ہم کوئی نازد  
مرتب نہیں کر سکے۔

ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ملک کی ترقی فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق  
سے ہی پروان پڑھ سکتی ہے اور بہ حالات موجودہ ہم توقع کر سکتے ہیں کہ بعض  
ایسے عناصر پیدا ہو جائیں گے جو آئندہ اس طرح کی کوشش کو بار آور کر سکیں۔“  
اس پراسیوی ایٹڈ پریس نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

## جناح راجد گنگوکی ناکامی پر

• جناح اور راجد بابر نے اپنے طویل مذاکرات میں جو اساسی اصول جمع کر لیے تھے۔ اگر بات ان میں رہتی تو یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ مسلم لیگ اور کانگریس بھی اسے منظور کر لیتیں۔ لیکن انہوں نے چونکہ دوسری پارٹیوں کو بھی رضامند کرنا چاہا۔ اس لیے انہیں اپنی خواہش میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

(روزنامہ انقلاب - ۳ - مارچ ۱۹۲۵ء)

سکھوں کا اخلاق | ۲۔ مارچ کو مسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ نے مشترکاً پریس بیان میں

اعلان کیا کہ

۱۔ پنجاب میں مسلمانوں کو آئینی اکثریت نہ دی جائے۔

۲۔ رائے دہنگی کے مختلف معیار رائج نہ کیے جائیں۔

۳۔ مرکز میں مسلمانوں کو وہی اقلیتی نیابت دینی جلتے جسے ان کے نمائندے الہ آباد

میں منظور کر چکے ہیں۔

غازی عبدالقیوم کو پھانسی | آئین ۱۹۲۵ء کے نافذ العمل ہونے کے دن جیسے جیسے قریب آتے گئے۔ فرنگی حکمران نئے جیلے بہانے تلاش کرتے

رہے تاکہ اقوام ہند کسی طرح متحد نہ ہو سکیں۔ ایک طرف اگر ہندوستانی رہنما اپنی مشترک کوششوں میں مصروف تھے کہ کسی طرح برطانوی آئین کو شکست دے سکیں، تو دوسری طرف حکمران گولہ بھی خائف نہیں تھا۔

اول ۱۹۲۵ء میں غازی عبدالقیوم نے توہین رسول کے جرم میں لالہ نھورام کو کراچی

میں قتل کر دیا تھا۔ عبدالقیوم ضلع ہزارہ کی ایک دور افتادہ بستی غازی کار بنے والا تھا۔ نزدیکی

کرنے کے لیے کراچی آیا۔ تو ان دنوں آریہ سماج جیدتا باد اسندھ کے سیکرٹری نھورام نے

”ہرٹری آف اسلام“ نامی کتاب شائع کی تھی۔ یہ رنگیلار رسول (نعوذ باللہ) جیسی کتابوں

سے مانعہ مواد پر مشتمل تھی۔ وہ توہین رسول کو برداشت نہ کر سکے اور اس پر اچھا خاصہ ہندکا

ہوا۔ اگرچہ نھورام کو حکومت نے گزرتار کر لیا، لیکن وہ ضمانت پر رہا ہو چکا تھا۔ اس مقدمے

کے حالات بھی وہی رنگ اختیار کر گئے، جو پنجاب میں راجپال کے قتل سے پیدا ہو گئے تھے چنانچہ مقدمہ زیر سماعت تھا۔ ہندو، مسلمان بھاری تعداد میں کارروائی سن رہے تھے۔ ایک دن نھورام اپنے دوستوں کے درمیان کمر عدالت میں خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ غازی عبدالقیوم نے تیز دھار نجر سے قتل کر دیا۔

دوران مقدمہ عبدالقیوم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس کے باوجود کارروائی طویل تر ہوتی چلی گئی۔ آخر غازی صاحب کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا اور تمام ہالتوں سے اپیل خارج ہوئی۔ ۶۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو پھانسی کا دن مقرر ہوا، مگر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے جوش کے پیش نظر مقرر کردہ تاریخ ملتوی کر دی گئی۔ نیز اخبارات کو دفعہ ۱۲۲ کے تحت منع کر دیا گیا کہ وہ اس ضمن میں کوئی کارروائی شائع نہ کریں۔ اس سے مسلمان قدرے مطمئن ہو گئے کہ شاید غازی کی سزائے موت عبور دیر پائے شور میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ لیکن ۲۰۔ مارچ کو یکایکی بغیر کسی اطلاع کے غازی عبدالقیوم کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور ان کی لاش حکام جیل نے خود ہی دفن کر دی۔ مسلمانوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے لاش کو نکال کر اس کا جلوس نکالا۔ اس پر کراچی میں خاصہ ہنگامہ ہو گیا اور گورنمنٹ نے مسلمان ہجوم پر گولی چلا دی۔ اس کے نتیجے میں بقول ہوم سیکریٹری حکومت ہند، جس نے اسمبلی میں احوال کے نمائندہ خالد لطیف گابا کے جواب میں کہا کہ پینتیس مسلمان شہید اور ستر سٹھ کے قریب زخمی ہوئے ہیں۔ تفتیس کے قریب مسلمان ایسے تھے جنہیں معمولی زخم آئے۔

کراچی کے اس واقعہ نے ملک بھر میں سنبھلتے ہوئے فرقہ وارانہ حالات میں از سر نو زہر گھول دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آنکھوں کے ڈور سے پھر مٹرخ دکھائی دینے لگے۔

یورپ کے سیاستدان اپنی جگہ مطمئن تھے کہ ہٹلر باوجود معاہدہ وارسائی سے ہٹلر کا انکار اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے معاہدہ وارسائی سے انحراف نہیں کر سکتا۔ فرانس، برطانیہ کا اتحادی ہونے کے باعث مطمئن تھا۔ لیکن ۱۶۔ مارچ کو ہٹلر نے معاہدہ وارسائی سے باضابطہ طور پر انکار کر دیا اور ان تمام پابندیوں کی تعمیل سے انکار کر دیا جو تجدید اسلحہ کے بارے میں جرمنی پر لگائی گئی تھیں۔ اور ساتھ ہی ہٹلر نے کھلم کھلا اسلحہ کی دوڑ

شروع کر دی۔ اس پر بھی برطانیہ اور فرانس نے کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ ان کے نزدیک جرمنی کے پاس اسلحہ بہت ہی کم ہے اور وہ اتنا زیادہ سا ان تیار نہ کر سکے گا جو ان کے لیے پریشانی کا باعث ہو۔ تاہم ہٹلر کے اس اعلان سے برطانوی سیاست دانوں کی بھنویں تن گئیں۔ اور ان کے ذہن کی تمام بساط اٹ گئی۔ فکر کے تمام نقشے بدل گئے، جو وہ جرمن کے متعلق سوچے ہوئے تھے۔ برطانوی دانشوروں کو یقین تھا کہ جرمن حبشہ کے خلاف اٹلی سے تعاون کرتے ہوئے اس طرانی میں شریک ہو کر اپنی محدود طاقت ضائع کر لے گا۔ اس بنیاد پر فرانس اور برطانیہ اٹالیہ اور حبشہ کی جنگ میں فریق نہیں بنے۔ لیکن ہٹلر نے باوجود اٹلی کا حامی ہونے کے نہ صرف خاموشی اختیار کی بلکہ فرانس کے خلاف مہم شروع کی کہ فرانس اور روس کے معاہدہ سے سارے یورپ میں اشتراکیت کو پھیلنے کا موقع ملے گا۔ اور اس طرح سارے یورپ سٹالن کی آغوش میں چلا جائے گا۔ لہذا اقوام یورپ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اشتراکیت کے دیوہیکل سے محفوظ کرے۔ جرمن اس سلسلے میں ہر ملک سے تعاون کرنے کو تیار ہے۔

یورپ کے قریباً سبھی سرمایہ داران حکومتوں پر غالب تھے۔ ان کے نزدیک روس کا نظام ان کی موت کا پیغام ثابت ہو سکتا تھا اس لیے وہ جرمن پراپیگنڈے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ عوام سمیت پورا یورپ اپنے حکمرانوں کے خیالات پیچھا اٹھا۔ ان حالات نے یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے آثار مزید واضح کر دیے، جس سے برطانوی سیاستدانوں کے چہروں کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

اپریل ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے ہندوستان بھی برطانیہ سے خوش نہیں تھا۔ ایسے میں برطانوی حکومت دو طرفہ مشکلات میں الجھ گئی۔ اگر یورپ میں دوسری بڑی اٹالی کا کوئی امکان ہے تو برطانیہ کو ہندوستان کے تعاون کی بہر حال ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اتحادیوں کو پہلی جنگ عظیم میں فتح ہر سرغلام ہندوستان نے بندھوایا تھا، اور مستقبل میں بھی یہی کام دے سکتے تھے۔ خصوصاً پنجاب کا صوبہ برطانیہ کی فوجی چھاؤنی سمجھا جاتا تھا اور اس صوبے کا امن حکومت کو اپنی ضرورت کے لیے نہایت اہم تھا۔ لیکن مجلس سوار کا وجود اس راستے میں پہاڑی سے بھی بلند تر تھا۔ جبکہ نئے آئین کے تحت انتخابات قریب آ رہے تھے۔ ان حالات میں حکومت کسی ایسی پارٹی کو پنجاب کی غمناک

سو پنا پسند نہیں کرتی تھی جو اس کی منشا کے خلاف ہو۔ چنانچہ اس اہم ضرورت اور سیاسی اغراض کے تحت یونینٹ پارٹی کو آگے بڑھایا گیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جس طرح انگریزوں نے تعلیم کے بہانے سرسید کو آگے بڑھا دیا اور غیر مسلم کے درمیان نفرت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی طرح شہری اور دیہاتی کے درمیان تفریق پیدا کرنے کے لیے ۱۹۲۲ء کو میاں سرفضل حسین سے کام لیا گیا اس دور میں پنجاب کا گورنر سر مالکم ہیلی تھا۔ یہ انگریزی اقتدار کا منہجا ہوا آدمی تھا اس نے جون ۱۹۲۲ء کو اپنے عہدے کا چارج سنبھالتے ہی میاں سرفضل حسین کی حکومتی سرگرمیوں کو ذاتی طور پر پسند کیا۔ یہ حقیقت اصول کی نہیں محض اتنا کی خاطر تھی۔ گورنر نے سرفضل حسین سے دسمبر ۱۹۲۳ء میں یونینٹ پارٹی قائم کر کے سر چھوڑا اور اس کی ہر ہر چیز میں پنجاب کونسل کے اندر کام کر رہے تھے، خواہ مخواہ لڑائی بول لی اس کے نتیجے میں سر شہاب الدین اور احمد یار خاں دو لٹانہ کو آگے بڑھایا۔ پھر ان کے مقابل نون اور ٹوانے۔ زمیندار اور زراعت پیشہ لوگوں کے نمائندے بن کر سامنے آئے۔ آگے چل کر یہی لوگ یونینٹ پارٹی کھلائے اور ان کے رہنما سر میاں فضل حسین تھے۔

اس دوران میں ملک میں فرقہ وارانہ اور سیاسی تحریکات نے اس پارٹی پر منوں مٹی ڈال دی لیکن ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے الیکشن کے لیے ان گڑھے مریوں کو غیر ملکی ہاتھوں نے پھر سے اکھاڑا۔ اول اس لیے کہ دیہاتی علوم پران و ڈیروں کا اثر تھا اور فوجی بھرتی کے لیے بھی انہی کا وجود اہمیت رکھتا تھا۔ دوسرا ڈیروں کی اکثریت بھی دیہاتوں میں تھی اور آئندہ انتخاب کا انحصار بھی اسی طبقے پر تھا۔

لہذا مجلس احوار اور اس طرح کی انتہا پسند جماعتوں کے خلاف انگریزوں کا اس محاذ کو منظم کرنا اہم سیاسی چال تھی۔

اس ضمن میں علامہ اقبال اپنی کتاب ”حرف اقبال“ کے صفحہ ۱۱۹ پر لکھتے ہیں:

”شہزی اور دیہاتی مسلمان کی تیز کے لیے کون ذمہ دار ہے؟ جس کی بدلت مسلمان جماعت بگڑ رہی ہیں تقسیم ہونے اور دیہاتی حصہ خود ہیست سے گروہوں میں بٹ گیا جو ہر دم آپس میں برسر پیکار رہتے ہیں۔“

سرپرٹ ایمرن پنجابی مسلمانوں کی صحیح قیادت کی عدم موجودگی کا گلہ کرتے ہیں۔  
اسے کاش! وہ سمجھ سکتے کہ حکومت کی اس شہری دیہاتی تمیز نے جسے وہ خود غرض  
سیاسی جیلہ بازوں کے ذریعے برقرار رکھتی ہے، جماعت کو ناقابل بنادیا ہے کہ  
وہ صحیح رہنما پیدا کر سکے۔ میرے خیال میں اس حربے کا استعمال ہی اس غرض  
سے کیا گیا ہے تاکہ کوئی صحیح رہنما پیدا نہ ہو سکے۔“

اسی طرح کمیونسٹ پارٹی کے رہنما سجاد ظہیر (بھئی)، اپنے کتابچہ مسلم لیگ اور یونینسٹ  
پارٹی کے صفحہ ۸ تا ۱۰ پر لکھتے ہیں:

۱۹۳۵ء میں میاں سرفضل حسین رائے کی کونسل کی ممبری سے سبکدوش ہونے  
کے بعد پنجاب واپس آئے۔ اس مرتبہ انہوں نے نیا بھیس بدلا اور فرقہ پرستی کنجلاسنہ  
آواز اٹھانے لگے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک گناہ مقلد شائع کرایا اور اس  
میں پنجاب کی تمام مصیبتوں کا واحد علاج یہ بتایا کہ ایک غیر فرقہ دار پارٹی قائم کی جائے۔  
میاں صاحب اس وقت تک فرقہ پرستی کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ ان کی اس  
تبدیلی کو دیکھ کر لوگ حیران تھے۔ مگر میاں صاحب مرحوم کی کوئی بات مصلحت سے خالی  
نہیں ہوتی تھی۔ ملک میں عنقریب نیا دستور آنے والا تھا۔ اس دستور نے پہلے کے  
مقابلہ میں بہت زیادہ لوگوں کو حق رائے دی عطا کیا تھا۔ رجعت پسندوں کا راج  
قائم رکھنے کے لیے نئی صوبائی اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کرنا ضروری تھا اور اس  
کی صورت صرف یہ تھی کہ سبھی رجعت پسند کیا مسلمان اور کیا ہندو یا سکھ مل کر زور لگائیں۔  
پہلی قانون ساز مجلسوں میں سرکاری اور نامزد کیے ہوئے ممبروں کی تعداد زیادہ ہوا  
کرتی تھی۔ حق رائے دہندگی بہت محدود تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وزیروں  
کو خود گورنر مقرر کیا کرتا تھا اور وہ کونسل کے منتخب ممبروں کے سامنے جواب دہ  
نہیں ہوتے تھے۔ لیکن نئے دستور میں اب یہ باتیں ممکن نہ تھیں۔ پھر سب سے  
بڑا خطرہ یہ تھا کہ کانگریس نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پنجاب کے مسلمانوں میں جمعیت اہرا کو بھی مقبولیت اور بہ دلچسپی سے مانا جاتا تھا۔

یہ لوگ بھی ابتدا میں کانگریسی تھے اور آگے چل کر انہوں نے اپنی ایک علیحدہ جماعت قائم کر لی تھی۔ پنجاب کے سکھوں اور نوجوانوں میں کسان سبھا اور نوجوان سبھا کی تحریکیں کافی مضبوط ہو چلی تھیں۔ رحبت پسند لوگ یہ آثار دیکھ کر سمجھے جا رہے تھے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ ان تمام رحبت پسندوں کو ملا کر ایک مضبوط پارٹی قائم کی جائے جو کانگریس اور لیگ، احرار اور کالیوں اور کسانوں اور مزدوروں کی دشمن ہو۔ نوکر شاہی کی بھی یہی خواہش تھی۔ ہندوستان میں محدود قسم کی جمہوریت بھی اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ ہر صوبے کے گورنر اور ان کے سیکریٹریوں کے محکمے بھی طرح طرح کے منصوبے باندھ رہے تھے اور ساز باز کر رہے تھے تاکہ آنے والے انتخابات میں کسی طرح بھی جمہوری عناصر کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ انتخابی حلقوں کی حد بندی کے لیے جو کمیٹیاں مقرر کی گئیں انہوں نے قوم کے ان دشمنوں کے مفاد کا خیال رکھا۔ انتخابی حلقے اس طرح بنائے جا رہے تھے کہ حکومت کے پھوڑوں اور رحبت پسندوں کو انتخاب لڑنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ پنجاب میں میاں سرفضل حسین کے مشورے سے جو انتخابی حلقے بنائے گئے وہ پنجاب کے بڑے بڑے دولت مند زمینداروں کیلئے بے حد مفید تھے۔

قوم کے تمام رحبت پسند دشمنوں کو ایک جماعت میں لے آنا اور حکومت کے تمام ہتھکنڈوں سے کام لے کر ان کو اسمبلی میں منتخب کرنا یہی یونینسٹ پارٹی کے بانی میاں سرفضل حسین کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ لیکن میاں صاحب ہر دم بڑے ہوشیار تھے۔ انہوں نے اتنے پرہیز نہیں کیا انہوں نے ترقی پسند جماعتوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کی بھی کوشش کی۔ ان کو امید تھی کہ اگر مسلمانوں کی ترقی پسند جماعتوں مثلاً مسلم لیگ، کانگریسی مسلمانوں، اتحاد ملت اور جمعیت احرار میں آپس میں نفاق پیدا ہو جائے اور یہ سب مل کر کانگریس سے متحد نہ ہونے پائیں تو یونینسٹ پارٹی یعنی رحبت پسندوں کی متحدہ پارٹی کی کامیابی بالکل یقینی ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ یونینسٹ پارٹی کی کامیابی چار باتوں پر منحصر تھی۔



پہلی یہ کہ پنجاب کے تمام رجسٹریڈ پنڈتوں کو بطور بڑے بڑے دو لاکھ روپے کی  
خطاب یافتہ شخصیات، وظیفہ یاب فوجی افسر، کپتان ایجر، ٹیننٹ، اڈیلڈر، رگاؤں کا  
سرنج، نمبردار، رگاؤں کا تحصیلدار، دو لاکھ روپے وغیرہ سب متحد ہو جائیں۔ یہ تمام عناصر  
برطانوی سامراج کی پیلو اور اس کے پروردہ ہیں۔ ان کو صرف اپنے حلو سے مانڈے  
سے مطلب ہے اور تخت اٹھانی اور جمہوریت سے وہ نفرت کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ سامراجی نوکر شاہی کی طاقت سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کی  
خاص صورت یہ تھی کہ انتخابی حلقوں کی حد بندی کرنے میں یونینسٹ پارٹی کے ممبروں  
کی سولتوں کا خیال رکھا جائے پھر اس کام میں ضلع مجسٹریٹوں، پولیس اور ضلع کے  
چھوٹے بڑے تمام افسروں کی مدد حاصل کی جائے تاکہ وہ مخالف امیدواروں کو  
ہر طرح ہراساں اور پریشان کریں اور حلو کو طرح طرح سے مجبور کر کے یونینسٹ  
ممبروں کو ووٹ دلوائیں۔

تیسرے یہ کہ پنجاب میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لیے اس امر کا خاص  
خیال رکھنا چاہیے کہ تمام مسلمان ایک ترقی پسند پروگرام کی بنیاد پر آپس میں متحد ہو سکیں۔  
چوتھے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ترقی پسند مسلمانوں کا انگریزوں  
اور کالیوں کا کوئی متحدہ محاذ قائم نہ ہو سکے۔ ایسا متحدہ محاذ اگر قائم ہو گیا تو اس کا  
مطلب یہ ہو گا کہ پنجاب کے لوگوں کی اکثریت متحد ہو گئی اور اس کا نتیجہ صرف یہی ہو  
سکتا ہے کہ نوکر شاہی اور اس کے پٹھوؤں کو شکست ہو اور جمہور کا میاں ہو۔  
اس لیے اس خطرے کو کبھی بھولے سے بھی پاس نہیں آنے دینا چاہیے۔

پنجاب کے رجسٹریڈ پنڈتوں کے یہی منصوبے تھے اور ان کی پشت پر  
سامراج کی طاقت تھی۔

مختصر یہ کہ اسی پالیسی کے تحت ان دنوں پنجاب میں سرفضل حسین کے عام چرچے ہونے  
لگے۔ سرکاری اور نیم سرکاری لوگ انہیں عام دعوؤں پر مدعو کرتے۔ روزنامہ انقلاب لاہور خاص کر  
اس مشن میں پیش پیش تھا۔ یہاں تک کہ یوم سرفضل حسین منایا گیا۔ سماج میں ان کی زندگی کی دعائیں

مانگی گئیں۔ بلدیہ لاہور نے انہیں سپانسامہ پیش کیا۔

یہ سارا کچھ آئندہ الیکشن کی تیاریوں کا پیش خیمہ تھا، کیونکہ میاں سرفضل حسین یونینسٹ پارٹی کے سربراہ مقرر ہو رہے تھے۔ اور اس کھیل کو کامیاب بنانے کے لیے سر سکندر حیات کو ریزرو بینک کا ڈپٹی گورنر بنا کر کلکتہ بھیج دیا گیا تھا۔ یہ ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔

۲۲ مارچ۔ دہلی میں نواب ڈھاکہ کی صدارت میں آل انڈیا کیمینٹل ایوارڈ کانفرنس ہوئی۔ جس میں دیگر رہنماؤں کے علاوہ یہ لوگ

بھی خاص طور پر دعوت میں شریک ہوئے۔

نواب آفت چھتری، مولانا شوکت علی، سراسے ایس۔ ج۔ غزنوی، سر محمد یعقوب، سرفلام حسین ہدایت اللہ، سر محمد یامین خاں، خواجہ حسن نظامی، سیٹھ عبداللہ ہارون، راجہ خضنفر علی، مولانا شفیع داؤدی، سید غلام بھیک نیرنگ، سراسے کے فضل حق اور نمائندہ احرار سطر خالد لطیف گابا ایڈووکیٹ لاہور۔

اس کانفرنس میں حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

”کانفرنس کی رائے ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ مسلمانان ہند کے جائز مطالبات سے کلیتاً کم ہے۔ لیکن چونکہ ملک کے سامنے اس سے بھتر کوئی سکیم موجود نہیں جس کو بالاتفاق منظور کر لیا گیا ہو۔ اس لیے مسلمانوں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ اسی کو منظور کر لیا جائے۔ اور جب تک فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق کوئی متفقہ فیصلہ منظور نہیں ہو جاتا اسی ناریولا پر عمل کیا جائے“

۲۰ مارچ کو غازی عبدالقیوم کو پھانسی دینے کے بعد کراچی میں مسلمانوں کے اجتماع پر جو ظلم ہوا۔ مرکزی مجلس احرار نے ۲۲۔ مارچ کو اس کے خلاف

**حادثہ کراچی پر احتجاج**

بطور احتجاج لاہور میں چودھری افضل حق ایم ایل سی کی صدارت میں ایک عام اجلاس منعقد کیا، جس میں مولانا حبیب الرحمن کی تقریر کے بعد حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

۱۔ یہ اجلاس کراچی میں گولی چلانے کے خلاف جس سے متعدد مسلمان شہید ہوئے ہیں زبردست صدارتے احتجاج بلند کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ

اس واقعہ پر غیر جانبدارانہ تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جائے۔ نیز اس حادثے میں شہید ہونے والوں کے قُرشا اور مجروحین کی مناسب امداد کی جائے۔

۲۔ یہ اجلاس مناسب سمجھتا ہے کہ کراچی کے حادثہ خون کی خلاف ورزی کے لئے احتجاج بند کرنے کے لیے انفرادی کوششوں کی بجائے اجتماعی کارروائی کی جائے۔ چنانچہ یہ اجلاس قراردادیں ہے کہ ۲۹۔ مارچ ۱۹۲۵ بروز جمعہ تمام جماعتیں کراچی کے حادثہ کے خلاف آواز بلند کریں اور آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا جائے۔ نیز شہداء کے پسماندگان کی امداد کے لیے روپیہ فراہم کر کے ریلیف کمیٹی کراچی کو بھیجا جائے۔

کراچی کے حادثہ کی تحقیقات کے لیے مجلس احرار مرکز کی طرف سے **احرار وفد کراچی کو** مولانا عبدالغفار غزنوی کی قیادت میں ایک وفد ۲۶۔ مارچ کو کراچی روانہ کیا گیا۔ اسی طرح سکھ (سندھ) میں احرار کا اجتماع ڈاکٹر محمد عمر کی صدارت میں ہوا اور اسی طرح کی قرارداد منظور ہوئی۔

صدر مرکزی مجلس احرار اسلام ہند مولانا حبیب الرحمن کے بیان اور مجلس احرار کی تائید میں روزنامہ "الغلاب" لاہور نے ۲۹۔ مارچ کے شمارہ میں حسب ذیل **نوٹ** شائع کیا۔

۱۰ ہزار اختلاف کے باوجود جو ہمیں مجلس احرار سے ہے، ہم اس بات کی حمایت اور تائید کرتے ہیں کہ ۲۹۔ مارچ کو کراچی حادثہ کے خلاف اجتماعی طور پر پورے ہندوستان کے ساتھ یوم احتجاج منایا جائے۔

سندھ کے ذمہ دار پولیس حکام نے کراچی میں عوام پر گولی چلانے کے جواز پر اعلان کیا کہ سرکاری حکام نے غازی عبدالقیوم کی لاش دفن کر دی تھی لیکن عوام نے قبر کھود کر غازی مرحوم کی لاش نکال لی۔ اس کا جلوس نکالاجس سے شہر میں فساد کا خطرہ تھا۔

پولیس کا مذکورہ بالا اعلان شریعت کے خلاف تھا کہ غازی مرحوم کی لاش قبر کھود کر نکالی گئی ہے۔ اس پر سندھ کے ذمہ داروں نے ۲۴۔ مارچ کو حسب ذیل اعلان شائع کیا۔

”یہاں تک تو درست ہے کہ پولیس نے غازی کی میت کو لحد میں اتار دیا تھا۔ لیکن اس پر نہ تو ہنوز پتھر رکھے گئے تھے اور نہ ہی مٹی ڈالی گئی تھی۔ مسلمانوں کے اصرار پر ذمہ دار حکام نے شہید کا منہ دیکھنے کی اجازت دے دی اور اس کے لیے لاش نکال کر باہر رکھ دی تاکہ لوگ شہید کا منہ دیکھ سکیں۔ لہذا یہ غلط ہے کہ قبر کھود کر لاش نکالی گئی ہے۔“

جمعیتہ علمائے ہند نے کراچی کے واقعہ پر زبردست احتجاج کیا اور اس ضمن میں صدر جمعیتہ علمائے ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ نے اپنے پریس بیان میں کہا کہ پولیس نے گولی چلا کر نہایت سفاکی کا مظاہرہ کیا ہے۔

**روس اور برطانیہ میں اتحاد** | ہندوستان بھر کے اخبارات نے ۲۴ اپریل کو یہ خبر جلی عنوان سے شائع کی کہ۔

”برطانیہ کے نائب وزیر خارجہ انتھونی ایڈن نے دورہ ماسکو کے موقع پر روس کے ڈکٹیٹر سٹالن سے ملاقات کی کہ آئندہ روس اور برطانیہ بین الاقوامی حالات میں ایک دوسرے کے دوست رہیں گے۔“

نوٹ: مندرجہ بالا خبر کو ہٹلر کے ۱۶ مارچ کے اعلان کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ روس اور برطانیہ اتحاد دراصل جرمن اور جاپان کے خلاف ایک تحریک ہے۔

۴ اپریل کو حکومت بمبئی نے ہوم سیکریٹری کے مشورے پر مجلس احرار **تحقیقات سے انکار** کے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا کہ کراچی کے واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے۔

اس سے انکار کرتے ہوئے گورنر بمبئی اور والٹر رائے ہند نے اپنے مشترک فیصلے میں نھورام کے قتل پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام واقعات تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہا، کہ ان حالات کے پیش نظر مزید کسی تحقیقات کی ضرورت نہیں۔

اس سرکاری بیان کے خلاف راجہ غضنفر علی نے سنٹرل اسمبلی میں تجویز پیش کی کہ کراچی سے متعلق از سر نو تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جائے۔ نیز مسلم اخبارات نے بھی اس پر زور دیا اور مجلس احرار نے

حکومت کے اس ایک طرفہ فیصلے پر سخت احتجاج کیا۔ سنٹرل اسمبلی کے ممبر خالد لطیف گلہ نے اپریل کو پریس بیان میں کہا کہ

حکومت بمبئی کے اعلان کو صرف ایک فریق یا ایک طرفہ بیان کہا جاسکتا ہے۔ کوئی شخص بھی اسے کسی غیر جانبدار ٹریبونل کا فیصلہ قرار نہیں دے سکتا۔ تحقیق سے انکار کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کسی غیر جانبدار تحقیقات سے گریز کر رہی ہے اور یہ بیان بھی خود مشکوک اور حکومت کی مذمت کے لیے کافی ہے۔ اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ ہجوم کو میوہ شاہ کے قبرستان میں جمع ہونے سے روکا جاسکتا تھا، یا منتشر کیا جاسکتا تھا۔ اور نہ ہی اس بات کا کوئی جواب دیا گیا ہے کہ گولی چلانے سے پہلے کوئی احتیاط ہی کیا گیا ہو۔

اسمبلی میں تحریک اقوام پر جن لوگوں نے دوٹو دیے ان میں زیادہ تر ہندو شامل تھے۔ لیکن مسلمانوں نے ان کے خلاف کبھی اس بنا پر اعتراض نہیں کیا کہ ایک صریح طور پر فرقہ وارانہ مسئلے میں ان کو شامل نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مذکورہ بالا تمام کارروائی کا جب حکومت نے کوئی اثر  
**شیخ عبدالمجید سندھی کا استعفیٰ**  
 قبول نہ کیا تو ۱۲- اپریل ۱۹۳۵ء کو شیخ عبدالمجید سندھی

نے بمبئی کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ: ”میں نے بحیثیت صدر ہاؤس کراچی لیگ وائسرائے ہند کو باہمی گفتگو کے موقع پر مطلع کر دیا تھا کہ تحقیقات کے لیے ایک خالص غیر مسلم کمیٹی قائم کی جائے لیکن افسوس ہے کہ میرے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا گیا، اور نہ ہی سرکاری بیان میں میرے مطالبے کا کوئی ذکر کیا گیا ہے۔ اس حادثہ میں پچاس کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور ایک سو پچاس زخمی۔ مگر اس عظیم حادثہ کی غیر جانبدار تحقیقات سے وائسرائے ہند نے صاف انکار کر دیا ہے۔“

انہی حالات تمام مسلمانوں کو حکومت کی اس روش پر نہایت رنج اور غصہ ہے۔ چنانچہ اس کے اظہار کے لیے میرے پاس دوسرا کوئی ذریعہ نہیں کہ میں

بمبئی کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو جائوں“

اس روز جمعیتہ علماء نے ہند کے صدر اور ناظم اعلیٰ مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید نے حکومت ہند کو انتباہ کیا کہ کراچی کے حادثہ کی اگر غیر جانبدارانہ تحقیقات روک دی گئی تو اس کا نتیجہ حکومت کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔

جیسے کہ اوپر عرض کر دیا گیا ہے کہ برطانوی ہند کے نزدیک احرار کے خلاف ملک گیر فہم پنجاب ہندوستان کے دیگر صوبوں سے عسکری اختیار سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ غیر ملکی حکومت کو اپنے اقتدار کی طنائیں سنبھالنے کے لیے جن چوبداروں کی ضرورت تھی۔ پنجاب کے بعض اضلاع کو اس میں اولیت حاصل رہی۔ مجلس احرار آل انڈیا تنظیم ہونے کے باوجود پنجاب پر خاصہ اثر رکھتی تھی۔ آل انڈیا کانگریس کے بعد حکومت مجلس احرار پر خاصی نظر رکھتی تھی۔ اور اس کے خلاف ہر روز نئے چیلے بہانے تراشے جاتے۔

۱۸۔ اپریل ۱۹۳۵ء کے روزنامہ ”انقلاب“ لاہور کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔  
 ”عالمگیر اور عالم سوز جنگ شروع ہونے پر تمام بین الاقوامی خانہ جنگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور ملک کے تمام باشندے سے بلا اختلاف مذہب و ملت بیرونی طاقتوں کے مقابل تیار ہو جاتے ہیں اس طرح جب کسی گاؤں میں یا قصبہ میں مسلح نوجواروں کو مشپ تارک کی پروہ پوشی سے فائدہ اٹھا کر حملہ آور ہوتے ہیں تو وہاں کے تمام لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت، دوست و دشمن مدافعت کے واسطے تیار ہو جاتے ہیں۔“

آج ہندوستان کے مسلمان بھی ایسی محشر تیز مشکلات میں مبتلا ہیں ہندوستان کے طرز حکومت میں جو تبدیلیاں عنقریب رونما ہونے والی ہیں۔ ان میں اگرچہ گورنر اور گورنر جنرل کو غیر محدود اختیار دے دیے گئے ہیں۔ باوجود اس کے اکثریت قوت زور اقتدار سے اقلیت کو کچلنے اور مٹانے کے واسطے اصلاحات جدید کی زیر حمایت کافی ضرب لگا سکتی ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانان ہند کا یہ فرض ہے کہ اس وقت وہ اپنے اندرونی اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر کامل یک جہتی اور اتفاق کے ساتھ ایک متحدہ آواز میں اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنی مذہبی آزادی اور روایات کو قائم رکھنے کے واسطے میدانِ عمل میں گامزن ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت بھی مسلمان خانہ جنگی میں مبتلا ہیں اور فروعی مسائل میں مذہبی اختلاف کو اور ایک فرقے کو دوسرے فرقے کی تخریب اور نسبت و شتم میں مبتلا کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے ہمارا قومی وقار اور اثر غیر قوموں کی نظر میں روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی سنی، شیعہ اور وہابی۔ بدعتی کے اختلافات کو نسل اور اسمبلی کے انتخاب میں نہایت بدنام صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بعض بالخصوص پنجاب کے بعض اضلاع میں عوامتاً مسلمین اور فرقہ احمدیہ کے مابین مخالفت نے ایک ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، جس سے آئندہ ناخوشگوار نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم مسلمانوں سے پر زور اپیل کرتے ہیں کہ خدایا کم از کم اس وقت کی خانہ جنگی اور اندرونی نزاعات سے قطع نظر کر کے کامل اتحاد اور اتفاق کے ساتھ اصلاحات جدید میں اپنے حقوق کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے واسطے ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔ اور بلا اختلاف عقائد مسلمانوں میں جو شخص مفید اور کارآمد ثابت ہو اس کی پوری اعانت اور امداد کریں۔

#### الداعیان

- ۱۔ آنریبل نواب بہادر خواجہ حبیب اللہ ممبر کونسل آف سٹیٹ ڈھاکہ۔
- ۲۔ آنریبل مسٹر محمد سہروردی ممبر کونسل آف سٹیٹ بمبائے
- ۳۔ آنریبل سید محمد پاشا۔ بہار۔ ممبر کونسل سٹیٹ مدراس۔
- ۴۔ آنریبل سر محمد یامین خاں۔ سی آئی اے ممبر کونسل آف سٹیٹ یوپی۔
- ۵۔ آنریبل عبدالحمید ممبر کونسل آف سٹیٹ بمبائے۔
- ۶۔ آنریبل خاں بہادر علی بخش، محمد حسین سندھ ممبر کونسل آف سٹیٹ۔

- ۷۔ آنریبل جن امام بہار اٹلیسیہ۔ ممبر کونسل آف سٹیٹ۔  
 ۸۔ اے۔ کے۔ فضل حق۔ ممبر اسمبلی بنگال۔  
 ۹۔ خاں صاحب شیخ فضل حق پراچہ۔ ممبر اسمبلی (بھیرہ ضلع سرگودھا)۔  
 ۱۰۔ نبی بخش الہی بخش بھٹو۔ ممبر اسمبلی۔  
 ۱۱۔ اے۔ ایچ۔ عبداللہ۔ ممبر پنجاب۔ کونسل۔  
 ۱۲۔ پکتان سردار شیر محمد خاں۔ سی۔ آئی۔ اے۔ ایم۔ پی۔ امی ممبر اسمبلی پنجاب۔  
 ۱۳۔ محمد ابراہیم ہارون۔ ممبر کونسل۔ ممبئی۔  
 ۱۴۔ خاں صاحب صدیق علی خاں ممبر اسمبلی۔ سی۔ پی۔  
 ۱۵۔ میجر نواب احمد نواز خاں۔ سی۔ آئی۔ اے۔ یو۔ پی۔ ممبر اسمبلی۔  
 ۱۶۔ مولوی سر محمد یعقوب۔ کے۔ اے۔ ممبر اسمبلی۔  
 ۱۷۔ خواجہ حسن نظامی۔

اس بیان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ احرار کے خلاف کن اطوار سے سازش ہو رہی تھی

۲۰۔ اپریل کو لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا پچاسواں سالانہ  
حمایت اسلام کی قرارداد اجلاس نواب چھتاری کی صدارت میں منعقد ہوا کہ عوام نے  
 انجمن کے نمائندوں سے مطالبہ کیا کہ چونکہ سر ظفر اللہ مسلمانوں کا نمائندہ نہیں، لہذا اس  
 اجلاس میں اس کے خلاف قرارداد پیش کی جائے۔ اس پر تمام اجلاس میں ہنگامہ ہو گیا۔  
 اور صدر سمیت تمام لوگ پنڈال سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اتنے میں عوام نے شیخ قتیبت  
 کر لیا اور حافظ محمد یعقوب نامی ایک شخص کی صدارت میں انجمن کا منتشر اجلاس دوبارہ شروع  
 ہوا تو سر ظفر اللہ کے خلاف قرارداد پیش ہو کر پاس ہو گئی۔ قرارداد کے الفاظ یہ تھے۔  
 ”چونکہ سر ظفر اللہ قادیانی ہے اور قادیانی مسلمان نہیں اس لحاظ سے ظفر اللہ  
 غیر مسلم ہے لہذا اس کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے فوراً الگ کر دیا جائے۔“  
 حادثہ کراچی کی تحقیقات سے حکومت کا انحراف  
کراچی کے حادثہ پر احتجاج عوام میں اشتعال کا باعث بنتا چلا گیا۔ ۲۱۔ اپریل



کو مرکزی مجلس احوار نے لاہور دہلی دروازہ میں چودھری افضل حق ایم ایل سی کی صدارت میں ایک عوامی اجلاس منعقد کیا، جس میں سنٹرل اسمبلی کے ممبر مہر خالد لطیف گابا نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

”میں نے اسمبلی میں کراچی گولی چلانے کے متعلق صدارتے احتجاج بلند کرتے ہوئے جو تحریک التوا پیش کی وہ کثرت آراء سے منظور ہو گئی۔ تمام مسلم ارکان اسمبلی اور کانگریسی ارکان نے بھی تحریک کے حق میں ووٹ دیے۔ حکومت نے اس کے باوجود تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے سے انکار کر دیا۔

میری قرارداد کا منشا وہ تھا کہ حکومت کی حکمت عملی کی مذمت کی جائے اور حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ کراچی میں نہتے اور پر امن ہاتھی جلوں پر پانٹرنگ کے متعلق تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ گولی چلانے والے افسروں کو سزا اور سپانڈگان شہدار اور مجروحین کو کافی تاوان دیا جائے۔

تحریک منظور ہو چکی ہے لیکن حکومت اپنے حکام کے مظالم پر پردہ ڈالنے کی غرض سے تحقیقات کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اگر حکومت سچائی پر ہوتی تو تحقیقات سے ہرگز انکار نہ کرتی۔“

اس کے بعد اسمبلی میں مجلس احوار کے دوسرے نمائندے سید محمد احمد کانٹھی ایڈووکیٹ الہ آباد ہائی کورٹ نے جلسہ میں، تقریر کے دوران کہا۔

”تحقیق کے گریز سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت خفائش کو چھپانے پر تلی ہوئی ہے۔ میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ حکومت کو تحقیقات کرانی پڑے گی اور پبلک کی پر زور آواز کے سامنے جھکن پڑے گا۔ نیز جو لوگ کراچی کے حادثہ کو فرقہ وارانہ رنگ سے رہے ہیں وہ ملک اور قوم کے دشمن ہیں۔“

اس کے بعد شیخ عبدالمجید سندھی سابق ایم ایف نے جو علی کراچی سے اور ان کی ورلڈ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے لاہور آئے تھے۔ تقریر کے دوران کہا:

”میں مسلمانان سندھ کی طرف سے مہر خالد لطیف گابا اور مجلس احوار کا شکریہ

اذا کرتا ہوں کہ انہوں نے مطلوبوں کی حمایت میں اسمبلی کے اندر اور سارے ملک میں حصہ لیا۔

حکومت بمبئی نے اعلان شائع کرایا ہے کہ اب تحقیقات کی ضرورت نہیں حالانکہ حکومت کے ذرائع میں تھا کہ بے گناہ ہجوم پر گولی چلانے والوں کے خلاف پورا پورا نوٹس لیتی۔ مجروحین اور شہداء کے پسماندگان کو معقول مالی امداد دی جاتی۔ لیکن حکومت نے ایسا نہیں کیا بلکہ حکومت کی طرف سے حکام کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور انہیں گولی چلانے میں حق بجانب قرار دیا جا رہا ہے۔

نتھورام کے قتل کو چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ لیکن اس عرصہ میں کراچی میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ بلکہ کوئی معمولی جھگڑا تک نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ عبدالقیوم شہید کے جنازے کے ساتھ ہندو پھیری والے موجود تھے۔ مسلمانوں نے انہیں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ ہندو اخبارات کے نمائندے موجود تھے۔ انہیں بھی کچھ نہیں کہا گیا۔ اس بنا پر حکومت کے بیانات میں شب و روز کا تضاد ہے۔ ہوم ممبر کونسل آف اسٹیٹ کا بیان ہے کہ گولی چلانے والوں کی تعداد پینتیس تھی۔ انڈر سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کا بیان ہے کہ گولی چلانے والے پچیس تھے جنہوں نے رائفڈ چلائے۔ لیکن حکومت بمبئی کا ہوم سیکرٹری ان کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ حکومت کے ان بیانات میں اس قدر فرق موجود ہے کہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت حقائق کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔

آخر میں چودھری افضل حق کی تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

مرکزی اصرار و رنگ کمیٹی کا اجلاس

۲۲۔ اپریل کو مولانا جلیب الرحمن کی صدارت میں مرکزی دفتر لاہور میں حادثہ کراچی پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا۔ جس میں محمد اصغر کاظمی ایم ایل ایس شیخ جہا لمجید ندھی، چودھری افضل حق ایم ایل بی، خالد لطیف گابا ایم ایل ایس مولانا منظر علی

اظہارِ ایل سی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ شیخ حام الدین مولانا داؤد غزنوی نے شرکت کی۔ اجلاس میں حادثہ کراچی پر مندرجہ ذیل قرارداد پاس ہوئی۔

”مجلس احرار کا یہ مرکزی اجلاس حادثہ کراچی پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ فرنگی بلا و جبر، بلا ضرورت ظالمانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ نیز یہ اجلاس اس حقیقت کے اظہار کو نہایت ضروری خیال کرتا ہے کہ حکومت کا واقعہ کراچی کی تحقیقات سے انحراف کرنا دو باتوں کا بین ثبوت ہے۔

اول: حکومت کے پاس نہتے ہجوم پر گولی چلانے کا کوئی تفسی بخش جواب نہیں۔ دوم: حکومت مسلمانوں کو کمزور اور مردہ سمجھتی ہے اور مسلمانوں سے یہ توقع نہیں رکھتی کہ وہ اپنے مطالبات حکومت سے منوانے کے لیے قربانی دے سکتے ہیں اس اجلاس کی رائے ہے کہ فی الفور تمام اسلامی جماعتوں کا نمائندہ اجتماع مسلمان کراچی کے مشورے پر منعقد ہونا چاہیے۔ تاکہ تمام صورت حال پر غور کر کے مناسب رویہ اختیار کیا جائے“

یہ قرارداد مولانا عبدالعزیز غزنوی کی طرف سے پیش ہوئی اور اس کی تائید چودھری افضل حق نے کی۔ یہ قرارداد بلا کسی اختلاف کے منظور ہو گئی۔ اس کے بعد ایک اور قرارداد سید محمد احمد کاظمی نے پیش کی، جس کی تائید میں خالد لطیف گابا نے کہا:

”یہ اجلاس اسمبلی میں واقعہ کراچی کے التواء کی تجویز کے بارے میں کانگریس پارٹی کے تعاون کو بنظر استحسان دیکھتا ہے۔ اور سٹر بھولا بھائی ڈیسیائی لیڈ آف کانگریس پارٹی اور دیگر مسلم ممبران تائید کنندگان کی خدمت میں مدینہ تبریک پیش کرتا ہے اور ان سب کی خدمت میں مجلس احرار کی طرف سے مبارک باد پیش کرتا ہے کہ ان کی انصاف پسندی نے ایسے نازک وقت میں ملک کی مکرر فتنہ کو ایک حد تک ساڑ گار رہنے دیا۔ نیز امید ہے ان کا تدبیر معاملات

بزرگواران بس  
بہارِ حیات و شادمانی کے لیے  
بہارِ حیات و شادمانی کے لیے



# آپنی اپنی حرکتیں آپنی اپنی حرکتیں

The Society of **THE SURE** Lahore.

شہزادہ شاہجہاں  
شاہجہاں شاہجہاں  
شاہجہاں شاہجہاں  
شاہجہاں شاہجہاں  
شاہجہاں شاہجہاں

لاہور۔ یوم شنبہ یکم شعبان المعظم ۱۳۵۰ھ القیس مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۳۱ء

ممبران



ایضاً صورت مولانا ظفر علی خان مراد آبادی

پر وہ موت سے نکلنے کی حیات جاوید  
 جس نے دھایا تھا تمہاری مہم کی بنیاد و ک  
 ہدیاں جی ہیں جو ناتوا ہو ہے گارا

ہلاکو (۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء)

کیونکہ ہوں آج اس اخبار کے گم گم چہرے  
 جس کے اوراق کی زینت مرے اشعار ہوئے

ظفر علی خاں

کہ مسلمان شہادت کے طلبگار ہوئے  
 پھر مسلمان اسی جذبہ سے شہادت ہوئے  
 قصہ آزا دا کی کشمیر کے مہم سے ارت ہوئے

مجلس احرار اسلام کا پہلا روزنامہ

کو اصل روشنی میں پیش کر کے فرقہ وارانہ کشمکش دور کر کے باہمی رواداری کو ترقی دے گا۔

**قادیانیوں کا سالانہ بجٹ** | اہرار کے خلاف حکومت ہی مصروفیت کا نہیں تھا۔ رحبت پسند طاقتوں کی رہنمائی میں قادیانیوں کو لہر بھی اہرار سے اپنا انتقام لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۲۳۔ اپریل ۱۹۳۵ء کو قادیان میں مرزائیوں کا سالانہ اجلاس ہوا۔ تو انہوں نے آئندہ سال کے لیے گیارہ لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا۔ اس میں ستر ہزار روپیہ جماعت مرزائیہ کے پروپیگنڈہ کے لیے اور بیاسی ہزار روپیہ اندرونی نظم و ضبط پر خرچ کرنے کے لیے۔

”روزنامہ انقلاب ۲۲۔ اپریل ۱۹۳۵ء“

تحریک مرزائیت سے آج تک قادیانیوں نے اس قدر بھاری بجٹ کبھی پاس نہیں کیا اب دیکھنا ہے کہ یہ روپیہ کہاں اور کس طرح خرچ ہوتا ہے؟

**بخاخ، راجندر فارمولا کی اشاعت** | ۲۲۔ اپریل کے اخبارات میں راجندر بخاخ فارمولا کا متن شائع کر دیا۔ جس میں حسب ذیل

تجاویز پر بحث ہوتی رہی، جو بنگالی ہندو اور پنجابی مسلمان کی طرف سے پیش کی گئی تھیں۔

۱۔ فرخچائز۔ اس اسلوب پر مرتب کیا جائے کہ صوبہ جات اور مرکزی انتخابات ہفتوں

مختلف اقوام کی آبادی کا تناسب قائم رہے۔ اور اس مقصد کے حصول میں

اگر ضرورت پڑے تو پھر مستقل فرخچائز کے اصول کو اختیار کر لیا جائے۔

۲۔ حلقہ ہائے انتخاب، نیابت کو غلط ملط نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ پنجابی سکھوں کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ فرقہ وارانہ اعلان میں ان کو ہوشیاری

دی گئی ہیں، ان کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اپنی مرضی کے مطابق حلقہ ہائے نیابت

منتخب کریں۔ اس کے بعد ہندوؤں کو فرقہ وارانہ اعلان کی مقررہ نشستوں کے

مطابق حلقہ ہائے نیابت کے انتخاب کا موقعہ دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد

فرقہ وارانہ اعلان کے مطابق باقی حلقہ ہائے نیابت مسلمانوں کو دیے جائیں گے

یورپین ہندوستانی عیسائیوں، اینگلو انڈین اور خاص حلقہ ہائے انتخاب ان میں

شامل نہیں ہیں۔

۴۔ بنگالی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہونا چاہیے کہ اگر یورپیوں سے انہیں کچھ نشستیں مل گئیں تو ان کو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔ ان دونوں کو مل کر یورپیوں کو اس بات پر رضامند کرنا چاہیے کہ وہ فرقہ وارانہ اعلان کے ذریعے اپنی مقررہ نشستوں میں سے زیادہ سے زیادہ ان کو دے دیں۔ ان کے تحت فرقہ وارانہ اعلان کے مطابق مسلمانوں کو جو نشستیں حاصل ہیں وہ ان کے لیے محفوظ ہیں۔ اور یورپیوں اور اینگلو انڈیز ہندوستانی عیسائیوں کے علاوہ خاص حلقہ ہائے نیابت بھی ان میں شامل نہیں ہیں۔

۵۔ اور اس کے علاوہ باقی ملاقات میں مسلمانوں کو نشستوں کی وہی تعداد دی جائے جو فرقہ وارانہ اعلان کی وجہ سے انہیں حاصل ہیں۔ خاص حلقہ ہائے نیابت پر یورپیوں اینگلو انڈیز اور ہندوستانی عیسائیوں کی نشستیں ان میں شامل نہیں۔

۶۔ اعلیٰ مرکزی مجلس وضع آئین میں مسلمانوں کی مقررہ نشستیں محفوظ رہیں۔  
۷۔ ان شرائط کی بنا پر سمجھوتہ ہونا چاہیے کہ تمام صوبہ جات اور مرکز میں جدا گانہ انتخاب کی جانے والی مخلوط انتخاب راج کیا جائے۔

اس فارمولا کو جب بنگالی ہندوؤں کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ایسی تجاویز پیش کیں جو اس کے بالکل متضاد تھیں۔ اور اس بات پر رضامند تھے کہ مخلوط انتخاب کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے نشستیں مخصوص کر دی جائیں لیکن وہ پرو نیشنل فرینچائزر کے مخالف تھے۔ اور ان کا مطالبہ تھا کہ ان کو بنگال میں پرو نیشنل مرکز میں باقی نشستیں مسلمانوں کے حصہ سے وضع کر کے دی جائیں۔

سکھوں نے بھی اس فارمولا کی مخالفت کی اور انہوں نے تو مخلوط انتخاب کی بنیاد پر بھی نشستوں کے تحفظ کو قبول نہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ انتخاب غیر مشروط طور پر مخلوط ہونا چاہیے اس کے علاوہ ان کا مطالبہ تھا کہ مرکز میں انہیں پانچ فی صدی نشستیں دینی جائیں۔ مرکزی کابینہ میں ایک وزیر اور پنجاب کی ملازمتوں اور رول باڈیز میں بیس فی صد عمدہ محسوز کر دیا گیا۔

نے اس بات پر بھی اعتراض کیا کہ پنجاب کی وزارت میں نصف سے زائد وزراء مسلمان کیوں ہوں؟ اگرچہ بنگالی ہندوؤں کی متضاد تجاویز اور پنجابی سکھوں کے مطالبات ناقابلِ معاہدہ تھے۔ پھر بھی مناسب سمجھا گیا کہ اگر مسلمان اس نامہ لے کر تسلیم کر لیں تو ان کو بھی اس پر رضامند ہونے کے لیے آمادہ کیا جائے گا۔ چنانچہ مسٹر جناح نے یہ مطالبہ پیش کیا، کہ ہندوؤں کی طرف سے پنڈت مالوی اس سمجھوتے پر دستخط کر دیں۔ کیونکہ ایسی طیش کا خاتمہ صرف ایسی صورت میں ہو سکتا ہے، لیکن یہ نہ ہو سکا لہذا صرف اسی بناء پر گفت و شنید ترک کر دی گئی۔

۲۵۔ اپریل ۱۹۲۵ء کو گورداسپور کے محشر پیرٹھ لکشمی نرائن نے سید شاہ جی کو سزا | عطار اللہ شاہ بخاری کو قادیان کانفرنس منعقدہ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے موقع پر صدارتی تقریر کرتے کے جرم میں چھ ماہ قید با مشقت کی سزا کا حکم دیا۔ تیز نہیں اسی وقت ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

ڈاکٹر اقبال کا استعفیٰ | کاغذ کے پھول بظاہر اپنی بہار دکھاتے ہیں اور کبھی کبھار دیکھتی نظر میں ان سے فریب بھی کھا جاتی ہیں۔ لیکن جیسے ہی عارضی ملمح اترتا ہے تو افسانہ آپ سے آپ کھرا ٹھکتا ہے۔ میں حقیقت نہیں ہوں۔“ ورنہ بہار کا نکھار موسم کے جوان ہونے تک حقیقت کے لیے خود ہی فریب بنا رہے۔

مرزائیت نے جھوٹ ہونے پر بھی اپنے کو سچائی کے پردے میں چھپانے رکھا۔ مگر جیسے ہی وقت کے اہتوں یہ چادر تار تار ہوئی تو اس سٹاس کی بوسے دماغ پھٹنے لگا۔ ۱۹۳۱ء میں کشمیر کی آزادی کو جو نقصان مرزائیت سے پہنچا اور پھر علامہ اقبال کو جیسے ہی حالات سے آگاہی حاصل ہوئی وہ کشمیر کمیٹی کی صدارت سے فوراً الگ ہو گئے اور وہیں سے انہوں نے مرزائیت کا مطالعہ شروع کیا اور آخر کو بے اختیار کھرا ٹھٹھے۔

وہ نبوت ہے مسلمان کے لیے برگِ حینش

جس نبوت میں نہیں توت و شوکت پیام

فقہہ ملت بیضا ہے امت اس کی

جو مسلمان کو سلاطین کا پرستار کرے۔

”ضربِ کلیم“



پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت  
کہتی ہے کہ یہ مومن پارہینہ ہے کافر

”ضربِ کلیم“

ان غلاموں اور مسک ہے کہ ناقص ہے کتاب  
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق۔

”ضربِ کلیم“

مرزائی مسلمانوں کا لباس اور اسلام کا رُوپ دھار کر اسلامی اداروں کے ساتھ دیکھ کی طرح  
چھٹے رہے۔ برطانوی سلماج تلے نہیں مسلمانوں کا نمائندہ قرار دے کر اپنے محکموں میں کلیدی  
آسامیوں پر فائز کیے رکھا۔ لیکن مجلس احرار نے فریب خوردہ مسلمانوں پر جب اس کفر کی  
اصلیت واضح کی تو باطل کو ہر موڑ پر شکست کھانی پڑی۔

لاہور کی انجمن حمایت اسلام اپنی بنیاد سے رحبت پسند مسلمانوں کی مذہبی پناہ گاہ  
رہی ہے۔ سروں اور خان بہادروں کے اس ادارے سے وابستگی بہترن آسان آدمی کیلئے  
باعث اطمینان تھی ماسلام کی حمایت کا عنوان دے کر اس ادارے نے ہمیشہ ایسی نسل کی  
آبیاری کی جو غیر ملکی حکمران کی بازوئے شمشیر بن گئی (اللہ ما شاء اللہ)

ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اس گروہ میں اپنے اس اقرار کے ساتھ شامل رہے۔

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں سے موہ لیتا ہے

گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا (بال جبریل)

مرزائی اپنی سیاسی ضرورت کے تحت انجمن حمایت اسلام سے والہانہ چھٹے ہوئے تھے  
اقبال کو، جو مزاسیت سے آشنا ہو چکے تھے، جب صحیح انجمن کو ان کانٹوں سے پاک کرنا پڑا تو  
انجمن کے اہول میں اضطراب پھیل گیا۔ اس سال ڈاکٹر اقبال انجمن حمایت اسلام کے مرکزی صدر  
تھے اس ذمہ داری کے پیش نظر جب انہوں نے مرزائیوں کو انجمن کی رکنیت سے خارج کرنا  
چاہا تو مرزائی اور مرزائی نوازان کے مقابل کھڑے ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال اپنے اہل  
کے باوجود اپنے کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء کو

انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ گوانہوں نے استعفیٰ کی وجہ اپنی بیماری قرار دیا تاہم انجمن حمایت اسلام کا اندرونی ڈھانچہ متزلزل ہو گیا۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔

**سکھوں میں ہنگامہ آرائی** | ایکٹ ۱۹۳۵ء کے رائج ہونے سے پیشتر اقوام ہند کے درمیان اختلاف اپنے عروج پر رہا۔ لیکن سکھ معمولی اقلیت ہونے کے باعث اس اکھاڑے میں نہیں تھے۔ البتہ کبھی کبھار ان کے نام کی صدارتے بازگشت ضرور سنائی دیتی۔ ۲۷ اپریل کو خصوصاً پنجاب کے اندر جبکہ سید عطار اللہ شاہ بخاری کی نزاریابی کے خلاف ملک گیر احتجاجی اجتماعات ہو رہے تھے۔ سکھ لیڈر بابا کھڑک سنگھ نے نے مندرجہ بالا کی دل کلمہ اجتماع میں اعلان کیا کہ وہ آئندہ ماہ سے برطانیہ کے فرقہ وارانہ اعلان کے خلاف مورچہ لگائیں گے۔ اس پر گیانی شیر سنگھ (سکھوں کا نابینا لیڈر) نے ان کی سخت مخالفت کی۔ اس پر سکھوں کے مابین کافی ہنگامہ آرائی ہوئی۔

**یکم مئی** | اسلام کے معاشی نظام میں انسانوں کے لیے وہ سارا کچھ موجود ہے جو فطرت نے ان کے لیے مناسب سمجھا۔ مخلوق کو مساوی حقوق دینے میں خالق نے اسلام میں زکوٰۃ کے طریق کو اس طرح رائج کیا کہ غریب اور امیر کے درمیان حد فاصل ہونے کے باوجود امیر پر قدغن لگادی کہ جب تک وہ اپنی دولت میں غریب کو حصہ دار نہیں ٹھہراتا اس کی تمام کمائی ناجائز ہے۔ دنیا کا کوئی دستور اس دستور شریعت کی برابری میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان دنیاوی قانون کو آئے دن کے جھگڑوں کا باعث سمجھنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسانوں کے درمیان کوئی چیز وجود نزع نہیں۔

یکم مئی ۱۸۸۶ء کو ٹسکاگو کے مزدوروں نے اپنے ملک کے کارخانہ داروں سے اپنی محنت کے اوقات متعین کرانا چاہے، جس پر طبقاتی جنگ کا آغاز ہوا اور یہاں تک، ایسی بھڑکی کہ مزدور اور کارخانہ دار کے درمیان ہمیشہ کے لیے نفرت کی لیکر کھینچ گئی۔

یکم مئی ۱۹۳۵ء کا یہی دن تھا جب بٹلر نے جرمن کے مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے

کہا کہ:

” اے جرمنی کے لوگو! تمہارے لیے ایک عظیم دور آیا ہے۔ لیکن اس دور کی عظمت اس بات میں منحصر ہے کہ ہمارے سامنے جو کام ہے ہم اس کی کامیابی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔“

(دیگر اقوام سے جرمنی کے افلاس کا موازنہ کرتے ہوئے ہٹلر نے کہا۔)

” ہمارے پاس نہ تو کوئی نوآبادی ہے، اور نہ خام اجناس ہیں، نہ زر مبادلہ ہمارے پاس تو صرف اپنی قوم کے نوجوان ہیں، جس پر ہمیں بھروسہ کرنا ہے۔ ہم جنگ نہیں چاہتے اور نہ ہی کسی قسم کی بے چینی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم اپنی قوم کی عزت کی ضرور حفاظت کریں گے تاکہ دنیا جان سکے کہ آج کا جرمن گندے ہوئے کل کا جرمن نہیں۔“

دہٹلر نے روس، برطانیہ اور فرانس کے درمیان معاہدات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”جرمن کے لاکھوں سپاہی فرانس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور یہ روس کو بھی پریشان کر سکتے ہیں۔ اگر آئندہ جنگ میں روس نے جرمنی کے خلاف فرانس کی کوئی مدد کی تو اس صورت میں جاپان جرمن کی پوری مدد کرے گا۔ جرمن جنگ نہیں چاہتا لیکن اس قسم کے معاہدات ہمیں شبہ میں ڈال رہے ہیں کہ ہم اپنی آبرو کے لیے اپنے کو مستحکم کریں۔“

(اسی اجتماع میں جرمن کے پروپیگنڈہ وزیر جنرل گوٹنگ نے کہا۔)

”دوسری قوموں کے سیاستدان یا مجلسِ اقوام کے بزدل بہادروں سے متاثر ہو کر ہم کبھی اپنے مطالبات سے دست کش نہیں ہوں گے۔ جرمن کی فضائی قوت اب پہلے سے کہیں زیادہ مسلح ہے۔ ہم جرمن کے تحفظ سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے۔“

مطالبات کے لیے معاہدات ایک فضول چیز ہے۔ جرمن جو حاصل کرے گا اپنا زور بازو سے حاصل کرے گا۔“

## گلگت پر برطانیہ کا قبضہ

وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا۔

۱۹۳۱ء میں مجلس اہوار نے جب محسوس کیا کہ برطانیہ کسی

نہ کسی طرح کشمیر میں اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے گلگت پر قبضہ چاہتا ہے اور اس کے لیے مرزائیوں کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ ان دنوں ریاست کشمیر کے محکمہ تعلیم میں خواجہ جمال الدین (لاہوری مرزائی) بڑی اہم پوسٹ پر متعین تھا۔ چنانچہ اس کی وساطت سے کشمیر میں سارا کھیل کھیلا گیا۔ جس کی تفصیل زیر نظر کتاب کی جلد اول میں آچکی ہے۔

روس کی دیواریں گلگت سے سنبھلی تھیں اور راستے میں پہاڑوں کا طویل سلسلہ حائل تھا۔ لہذا فوجی ضرورت کا تقاضہ تھا کہ گلگت برطانیہ کے قبضے میں ہو۔ تاکہ وہاں پر وہ اپنی فوجی چھاؤنی قائم کر سکے۔ یہ جانتے ہوئے کہ انگریز کشمیر کی بھاری ٹوٹنا چاہتا ہے۔ مجلس اہوار نے ہمارے کشمیر کے خلاف کیوں بڑی بھڑائی پھیری؟ یہ ایک سوال ہے جو سیاسی ذہنوں میں گردش کرتا رہے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کمیٹی کی بنیاد سے پیشتر ہی ریاست کے اندرونی حالات میں ایسا زہر گھول دیا گیا تھا کہ جس سے وہاں کے مسلمان کی جان و مال کے ساتھ اس کا ایمان بھی ضائع ہو جانے کا ڈر تھا۔ اب ایک طرف ریاست میں انگریز کی ضرورت کام کر رہی تھی تو دوسری طرف تیس لاکھ کشمیری مسلمانوں کے ایمان کا سوال تھا۔ مجلس اہوار نے مسلمان کے ایمان کو انگریز اور ریاست سے کہیں زیادہ قیمتی خیال کرتے ہوئے ریاست کے معاملات میں مداخلت ضروری سمجھی ان حالات میں جب شہر یک اپنے عروج پر پہنچی تو ریاست کے ہمارے سربراہی سنگھ نے اہوار سے نجات حاصل کرنے کے لیے انگریز سے گلگت کا سودا چکا لیا۔ آخر چار سال خاموش رہنے کے بعد، اہمی کے اخبار "انقلاب" نے یہ خبر کسی اہمیت کے بغیر شائع کی۔

”گلگت برطانیہ کی سپرداری میں دے دیا گیا۔“

”۱۵۔ مئی۔ شملہ کی اطلاع کے مطابق حکومت کشمیر عنقریب گلگت کا تمام علاقہ حکومت برطانیہ کے حوالے کر دے گی۔ لیکن اس کا ردوائی کی کوئی نمائندگی نہیں ہوگی۔“

## دوسری جنگِ عظیم کے آثار | جرمن قوم کے حوصلے اور ٹہلے کے جنگی ارادوں نے اقوامِ یورپ میں تہلکہ مچا دیا۔ برطانوی یونان

دوسری جنگِ عظیم کے مستقبل پر غور کرنے لگا۔ ۱۴۔ مئی کو برطانوی وزیر خارجہ مٹراڈن نے جو گذشتہ کئی دنوں سے زیرِ علاج تھے، اپنی صحت یابی پر ایک تقریر کے دوران کہا، میں اس بات کا کئی دفعہ اظہار کر چکا ہوں کہ ہم مجلسِ اقوام میں جرمن کی واپسی کے منتظر ہیں۔ باقی جہاں تک اسلحہ کا تعلق ہے، جرمن اس بات پر زور دے رہا ہے کہ معاہدہ اسلحہ مرتب کیا جائے۔ لیکن اس معاہدے کی حقیقت اس بات پر ہو کہ وہی اسلحہ ہو جو اقوام کی بنیاد میں ضرورت ہو کیا جرمن اس پابندی کو برداشت کرنے کو تیار ہے؟

تجدیدِ اسلحہ کے متعلق جو بحث اب تک ہوئی ہے، اس میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ فوجی تعداد مقرر کی جائے۔ مثلاً برطانیہ کے مسودہ میں بڑے عظیم کی تین بڑی سلطنتیں ہیں۔ فرانس، جرمن اور اٹلی کے لیے حسبِ ذیل تعداد مقرر کی جا چکی ہے۔

فرانس ————— دو لاکھ

جرمن ————— دو لاکھ

اٹلی ————— دو لاکھ اور

روس ————— پانچ لاکھ

جرمن ہاضی میں اس معاہدہ کی تائید کرتا آ رہا ہے اور اب اس اصول کے خلاف کو اس نے ناپسند کیا ہے۔ اور اصل واقعہ یہ ہے کہ مجلسِ تجدیدِ اسلحہ نے اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور آئندہ معاہدے کا انحصار جرمن کے رویہ کو قرار دیا گیا تھا۔

بہر حال اگر سی قوم کو اپنی حفاظت کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ مجلسِ اقوام میں شامل ہو کر اجتماعی امن کے کیے کو نشتر اور گھنٹو کرے۔

## مجلس اہوار کا نمائندہ مسٹر خالد لطیف گاہا میر اسمبلی خالد لطیف گاہا کی لندن روانگی

مجلس اہوار کا نمائندہ مسٹر خالد لطیف گاہا میر اسمبلی  
ایمپائر پارلیمنٹری اجلاس میں شرکت کیلئے ۲۰ مئی  
کو لندن روانہ ہو رہے تھے۔ اس کے اعزاز میں ۱۹ مئی کو مجلس اہوار نے عصر اندوہا جس میں قریباً سبھی سیاسی  
جماعتوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر خالد لطیف گاہا نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ  
”ہندو پرپس نے مجھ پر آرام لگایا ہے کہ میں یورپ میں ہندوؤں کے خلاف کوئی  
سازش کرنے جا رہا ہوں اور اس سازش میں مسٹر جناح اور سر آغا خاں شامل ہیں۔  
میں ہندوؤں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی قسم کی کوئی سازش کرنے نہیں جا رہا۔  
بلکہ میرا جانا محض ایمپائر پارلیمنٹری کانفرنس کے سلسلے میں ہے۔ البتہ اگر بندت  
آئی ہے جیسا کہ اطلاع ہے کہ وہ لندن جا رہے ہیں، انہوں نے مسلمانوں کے  
خلاف اگر وہاں کوئی فرقہ وارانہ بات کہی تو ممکن ہے اس کا جواب دینا پڑ جائے۔  
ہاں حادثہ کراچی کے متعلق حکومت کی پالیسی پر ضرور بحث کروں گا کہ وہ واقعہ کی  
تحقیقات کرے۔“

## کرنل لارنس کا انتقال | ۱۹ مئی کے ہندوستانی اخبارات نے رینجرز سرخوں سے شائع کی۔

”عرب میں جٹوں اور عربوں کے درمیان تصادم کے بانی کرنل لارنس، جن کا  
گذشتہ دنوں موٹر سائیکل سے حادثہ ہو گیا تھا، ایک مسو بیالیس گھنٹے پہلے  
کے بعد انتقال ہو گیا ہے۔ برطانوی رہنماؤں نے جن میں مسٹر چوہدری بھی شامل  
ہیں کرنل لارنس کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے کہا: ”برطانوی شہنشاہیت کو  
کرنل لارنس کی موت سے بے پناہ صدمہ پہنچا ہے۔“

اس خبر کا پس منظر بیان کرتے ہوئے بعض اخبارات نے لکھا:

پہلی جنگ عظیم کے دوران اس شخص (کرنل لارنس) نے اپنی زبان دنی، دلاؤ و غیر شخصیت  
اور برطانوی خزانے سے کام لے کر سارے عرب میں ترکوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکائی  
شریف حسین اور ان کے خاندان کو سارے حجاز کی حکومت کا لالچ دے کر خلافت عثمانیہ کے

خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کیا۔

جب برطانیہ نے کرنل لارنس کے ان وعدوں کو بوشریف حسین سے کیے تھے پورے نہ کیے تو کرنل لارنس یوس ہو کر گوشہ نشین ہو گیا۔

ایک طرف لندن میں کرنل لارنس کی موت پر ماتم کیا جا رہا تھا، تو  
**دفتر احرار پر چرافال** | ہندوستان میں مجلس احرار کے دفاتر چرافالوں سے جگمگا رہے تھے

اسی روز مجلس احرار کے مرکزی ناظم اعلیٰ مولانا مظہر علی انظر نے اس کی وضاحت میں کہا:

» موت سب پر آتی ہے، لہذا کسی کی موت پر خوش ہونا زیب نہیں دیتا۔

لیکن کرنل لارنس کی موت ایک آدمی کی موت نہیں کہ جس پر مجلس احرار کو افسوس ہو

بلکہ یہ برطانوی مشن کی موت ہے، جس کے تحت لاکھوں ترکوں کا عربوں کے

ہاتھوں خون بہایا گیا اور حرم کی مقدس سرزمین کو مسلمان کے بے گناہ خون سے

آلودہ کیا گیا۔ سینکڑوں عورتوں کی عصمت دری ہوئی، لاکھوں بچے یتیم ہوئے۔

آخر اس مشن کے تحت حجاز کی سرزمین پر برطانوی اقتدار کا پرچم لہرانے لگا۔

اس لیے مجلس احرار کو کرنل لارنس کی موت پر مسرت ہے کہ اس سے برطانیہ

کا مشن ایشیا میں پھیلنے سے رک گیا۔

اسلام اور عیسائیت کے درمیان اختلاف کی دیوار کسی حاضنی واقعہ

کی محک نہیں اور نہ ہی دونوں مذاہب کے پرچم کسی ایک فضا میں

**کرنل لارنس**

لہاتے ہیں۔ داعی اسلام کی تشریف آوری سے پیشتر تشلیت کے کونے عقیدہ توحید کو زخمی

کرتے رہے۔ لیکن جیسے ہی اسلام کی صبح طلوع ہوئی۔ عیسائیت کے اندھیرے سے مزید اجاگر ہو کر

سامنے آئے۔ پھر صدیاں گزر چکی ہیں کہ یہ متحارب مذاہب آمنے سامنے رہے۔ اس دوران

رہوڑ جیسے جرنیل صلاح الدین ایوبی جیسے بہادروں کے مقابل آئے۔ مگر اسلام کا پرچم بہ طور

بلند رہا، تاہم عیسائیت کے سینوں کی آگ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وقت ملنے پر

اپنی تیش دکھانے سے باز نہیں رہی۔

عرب ایشیائی مرکز کے پڑوس میں ہوتے ہوئے جغرافیائی حد بندیوں کے باوجود کھر سے



### کرنل لارنس انگریزی لباس میں

یہ روزگار ہے اس طرح مذہب کے میدان میں شکست خوردہ عیسائیت نے ہر سیاسی بساط پر مسلمانوں کو شہرہ سے کرات دینے کی تدبیریں سوچیں۔  
 ترک اور عرب قوم کے درمیان تعلق کی پختہ گرہ کشائی پر عیسائی سلطنتوں کی دیرینہ نظریں تھیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم سے ایک سال پیشتر ۱۹۱۳ء میں عرب کے صحرائوں سے عرب





### کرنل لارنس عربی لباس میں

قومیت کی تحریک نے جنم لیا۔ یہ دور وہ ہے جب سارا حجاز خلافت عثمانیہ کے زیر نگین تھا۔ چونکہ دنیا نے مسیح پان اسلام ازم اور اسلام کی بین الاقوامی دعوت سے مخالف تھی۔ انیسویں علم تھا کہ اگر مختلف نسل کے مسلمان متحد ہو گئے تو سارے یورپ کے لیے ان کا وجود ایک عظیم خطرہ بن جائے گا۔ چنانچہ عرب ترک اتحاد کو بدنام کرنا عیسائیت کے لیے اہم اور ضروری

مستند بن گیا۔ اس سازش کے تحت ترکوں کو درس دیا گیا کہ عرب اور مصر سے ان کا کوئی نسلی  
رشتہ نہیں، لہذا انہیں وطنیت کو انوثیت اسلامی پر مقدم رکھنا چاہیے اور دوسری طرف عربوں سے  
کہا گیا کہ ترک اسلام چھوڑ چکے ہیں اور انہیں مذہب سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ ترک جانتے ہیں کہ  
عرب اپنی زبان چھوڑ کر ترکی طرز تکلم اختیار کر لیں۔ نیز ترکوں نے قرآن کریم سے انبیاء کے  
اسمائے گرامی نکال کر ان کی جگہ تاتاری بادشاہوں کے نام درج کر دیے ہیں۔

اس کام کے لیے ابتدا میں عیسائی پادری عربی لباس پہن کر عربی زبان میں عرب قبائل  
میں وعظ کرتے رہے۔ ۱۸۶۱ء میں ڈنمارک میں پہلی دفعہ عیسائیوں کا وفد یمن کے علاقے میں  
بھیجا گیا۔ اس وفد کا لیڈر نیو میرٹ نامی ایک عیسائی تھا، جس نے منافرت کی اس تحریک کو  
ہوادے کر سارے عرب کی تحریک بنادی۔ اور یہی تحریک آئندہ چل کر عرب قومیت کی بنیاد کہلائی۔  
تاریخ ایک اور شخص حسن بن قلیل کا ذکر بھی کرتی ہے جو امیر فیصل کی فوج میں شامل تھا۔  
جس کی عمر کا ایک حصہ عیسائی ممالک میں گزار چکا تھا۔ حقیقت میں یہ مسیح تھا۔ گو اس نے علانیہ  
اپنے عقیدے کا کبھی اظہار نہیں کیا لیکن تحریک دعوت عربیہ کی تائید و حمایت اور اپنے عیسائی  
افکار کی تبلیغ سے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یہ شخص شام کی فوج کے تمام عرب سپاہیوں  
کو سلطنت عثمانیہ سے بغاوت پر ابھارتا رہا۔

(بغاوت عرب اور کرنل لارنس ص ۱۸۰ - مصنف مولانا پلوع حسن حجت)

جب تک بادِ سموم کا گزر صحنِ چین سے نہ ہو۔ پھول پتیاں بہاروں سے اٹھکیاں کرتی رہتی  
ہیں۔ سلاؤ گل کے چہروں کا نکھار دھوپ کی تمازت کو شرمندہ کرتا ہے۔ پیلے پیلے اور اوڑے  
اور سے پھول نو بیا ہتا دہن کی طرح اپنے سہاگ کے گیت بادِ صبح گاہی سے بے مہار گاتے  
ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ خندم اٹھتے بیٹھتے صحنِ چین سے مستیاں کرتی ہے۔ اس کے ناچنے  
اور تھرکنے کے معصومانہ انداز ساون بھادوں کی برستی گھٹاؤں میں جو بن پر ہوتے ہیں۔ لیکن جوئی  
صواؤں کے بگولے پتی ریت کی جھولیاں بھر کر باغ میں داخل ہوتے ہیں، ہر شاخ پر ادا سی  
چھا جاتی ہے۔ پتے ویران موسم کی طرح منہ لٹکانے پر نشان دکھائی دیتے ہیں۔ ہر روش پر  
نزاں کے آثار ہو یاد ہونے لگتے ہیں۔ ہواؤں کے رخ بدلتے ہیں تو سورج کبھی کا رنگ زند

پڑجاتا ہے۔ سرودھمن بانع کے انگن میں کھڑے رہ جاتے ہیں۔  
 قوموں کے عروج و زوال کی داستان بھی کچھ یوں ہی سی ہے جب ضمیر فروش برطان پڑھتے  
 ہیں۔ غدار وقت کے سہارے سردار کھلانے لگتے ہیں تو ملت انحطاط کے دور میں داخل ہوتی  
 ہے۔ پھر وہی ہوتا ہے جو گذشتہ پون صدی سے اقوام عرب سے ہو رہا ہے۔  
 حالانکہ کرنل لارنس خود ایک خط میں جو اس نے ۱۹۲۰ء کو لندن ٹائمز کے نام لکھا۔ اس  
 حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ ”عرب ترکوں کی سلطنت سے خوش تھے“ لیکن سیاسی اغراض  
 نے انہی کے ہاتھوں پر اپنی ضرورت کے پھول اپنے گلے میں ڈال لیے جو بعد میں کانٹے  
 ثابت ہوئے

۱۹۱۳ء میں ترکی حکومت نے عرب رہنماؤں سے بگڑتے ہوئے حالات پر پیرس میں  
 گفتگو کی۔ اور جانبین میں ایک معاہدہ طے پایا، جس کی رو سے عرب صوبے سلطنت عثمانیہ میں  
 خود مختار ہوں گے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ عربی زبان عام سکولوں میں تعلیمی زبان تسلیم کی جائے۔  
 نیز پارلیمنٹ میں عربوں کے لیے مناسب تعداد میں نشستیں مخصوص ہونی چاہئیں۔

اس معاہدے کی سیاہی خشک نہ ہوئی تھی کہ پہلی عالمگیر جنگ نے سارے یورپ کو  
 پیٹ میں لے لیا۔ ترک، جرمن کے ساتھ ہو کر اتحادی طاقتوں سے ٹکرانے لگے۔ اس طرح  
 ترکوں کا عربوں کے ساتھ معاہدہ دھڑے کا دھڑا رہ گیا۔ یہی دن تھے کہ کرنل لارنس عرب کی سیاست  
 میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی نمائندے عرب لیڈروں سے ملنے جا پہنچے کہ

”اگر ترکی اتحادیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوا تو عرب ملکوں کا رویہ کیا ہوگا؟“  
 اس کے فوراً بعد برطانیہ کے وزیر جنگ لارڈ کچنر نے قاہرہ کی برطانوی ایجنسی کو تارکے

ذریعے پیغام دیا،

”اگر جنگ میں عرب برطانیہ کا ساتھ دیں تو انگلستان عربوں کی جدوجہد آزادی

میں ان کی حمایت کرے گا“

لارڈ کچنر کا یہ پیغام ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مکہ میں شریف حسین کو ملا۔ اسی طرح کا ایک اور

پیغام سوڈان کے انگریز گورنر جنرل کا بھی شریف مکہ کو ملا۔

ان برطانوی بیخامات نے عربوں کو نئی زندگی بخشی۔ کرنل لارنس عرب قبائل میں مختلف لہجے، مختلف طرز تکلم کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا۔

”عرب عربوں کا، اور ترکی ترکوں کا“

عرب شیوخ سے دو ماہی ملاقات میں اس انداز سے گفتگو کرتا اس دوران شریف حسین کے چاروں بیٹے (جد اللہ، فیصل، حسن اور زاہد) برطانوی و حدود پر مطمئن تھے۔

کرنل لارنس کہتا ہے کہ:

”ہم نے بالآخر شاہ حجاز کو اتحادیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا“

(ڈیلی ایکسپریس لندن ۲۰-۵-۲۸)

اس نئی معاہدے کے باوجود (جو بحر قلزم کے ایک غیر آباد ساحل پر شریف مکہ اور انگریزوں کے درمیان طے پایا) شریف حسین ترکوں کو بظاہر اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہا۔

شرف حسین کا مطالبہ

”شمال میں سرسینہ تک، جنوب میں بحر ہند تک اور مشرق میں ایرانی سرحد تک میری حدود“

تسلیم کر لی جائے“

”سرسینہ، سکندریہ اور حمیض وغیرہ عرب میں شامل نہیں لہذا ان علاقوں پر شریف مکہ کی سیادت تسلیم نہیں کی

برطانیہ کا جواب

جاسکتی۔ البتہ مشرقی اور جنوبی حدود کے متعلق اس کا مطالبہ منظور کیا جاتا ہے“

فرض ان شرائط پر انگریزوں سے شریف مکہ کا معاہدہ طے پا گیا اور اس نے ۵-جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے توپ کا پہلا گولا مکہ میں اپنے محل سے چھوڑا دوسری جانب سلطان جلال محمد نے جہاد کا اعلان کر دیا، جس میں مقدس جنگ کی حیثیت سے حصہ لینا تمام مسلمانوں کا فرض تھا۔ مگر شریف مکہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کہلاتا تھا اور اسلام کے مقدس شہر کا محافظ تھا۔ انگریزوں کے حق میں بغاوت کی رہنمائی کر کے اس جہاد کا زور توڑتا رہا۔ عربوں کی اس بغاوت نے ترکی اور جرمنی کی مشترک محم کو بیکار کر دیا۔

(”تاریخی واقعات“ مرتبہ نصیر احمد جامی)

جنگِ عظیم کے خاتمے پر ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو انگریزوں نے جشنِ فتح منایا۔ اس تقریب میں شریفِ حکیم اور اس کا بڑا بڑا کا فیصل کرنل لارنس کی معیت میں لندن پہنچے اور بعد میں یہ لوگ پیرس روانہ ہو گئے کہ صلح کانفرنس میں شامل ہو سکیں۔ یہاں پر لارڈ جارج اور ولسن جیسے برطانوی ممبر اور ان کے سامنے کرنل لارنس کی قیادت میں شریف مکہ اور فیصل بیٹھے۔



الشریف الحسین بن علی



فیصل

اس مجلس میں شریف مکہ نے اپنے مطالبات دہرائے کہ عرب کے تمام علاقے ان کے حوالے کیے جائیں۔ جبکہ ان کے بڑے بڑے فیصل نے مطالبہ کیا کہ اسے صرف شام کا بادشاہ تسلیم کر لیا جاتے لیکن ولسن اس پر رضی نہیں تھا۔

جنگ کے دوران کرنل لارنس شریف مکہ سے سارے حجاز کی بادشاہت کا وعدہ کرتا رہا۔

شامیوں کو یہ فریب دیا جاتا رہا کہ شام تمہارا اور صرف تمہارا ہے اور فیصل کو یقین دلایا گیا تھا کہ شام تمہارے اقتدار میں رہے گا۔

لیکن جنگ کے اختتام پر یہ تمام وعدے پس پشت ڈال دیے گئے۔ نہ شام شامیوں کو ملا اور نہ فیصل کو اور نہ ہی شریف مکہ کی تمناؤں کا پورا رخ روشن ہوا۔

تیس دنوں پر جتنے ہم تو یہ جان بھوٹ جانا کہ خوشی سے مرزا جاتے گرا اعتبار ہوتا

ہوایا کہ شام پر فرانس کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا عراق پر فیصل کا لیکن انگریز حاکم کے تحت

رہا فلسطین تو اس میں عربوں کی بجائے یہودیوں کا مرکز قائم کر دیا گیا۔ اس طرح باقی حجاز کے ٹکڑے کر دیے گئے۔ شریف مکہ نے آنکھیں دکھائیں تو اسے مالٹا کے بوزیر سے میں نظر بند کر دیا۔ کرنل لارنس اور شریف مکہ کی وساطت سے عرب مسلمانوں کی مرکزیت کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی شاید صدیوں نہ ہو سکے۔ اگر دستِ قضا بڑھ کر لارنس کے ارادوں کو روک نہ لیتا تو ممکن ہے یہ فرنگی خدار ایشیائی ممالک میں جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اسی طرح کا اور تاشا بھی کرتا۔ مجلس اہوار نے اسی خوشی میں اپنے دفاتر پر چراغاں کیے کہ ایک خدار فرنگی کی موت سے کئی مسلمان ممالک محفوظ ہو گئے! الحمد للہ۔

**لارنس** اس کا پورا نام ٹامس ایڈورڈ لارنس تھا۔ اس کی ولادت ۱۸۸۸ء میں بمقام ترمیڈوک میں ہوئی جو شمالی ویلز میں واقع ہے۔ اس کا والد ٹامس لارنس آئرش نسل سے تھا اور ماں دین مسیح کی تبلیغ کرتی تھی۔ اس کی تعلیم آکسفورڈ میں مکمل ہوئی۔ لارنس نے جب فوج میں بھرتی ہونے کی خواہش ظاہر کی تو طبی مجلس نے اس کے قد قیامت اور ڈیل ڈول کو دیکھ کر جواب دے دیا۔

لارنس فوج میں بھرتی تو نہ ہو سکا لیکن محوڑے دنوں ہی میں اسے برطانیہ کے خفیہ محکمہ میں لے لیا گیا۔ صحرائے عرب کے متعلق اس کا علم وسیع تھا۔ عربوں کے رسم و رواج اور فکری رجحان کا مطالعہ کر چکا تھا۔ عربوں کی مہمان نوازی اور ترکوں کی مہمان نوازی کی بدولت اس نے بہت سے راز ہائے دونوں پر وہ معلوم کر لیے تھے۔ زمانہ جنگ میں جن خدار عربوں نے ترکوں کے خلاف فلسطین، عراق اور شام میں سازشیں کیں۔ ترکی افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع انگریزوں اور فرانسیسیوں کو دیتے رہے، ان میں بڑے بڑے صاحبِ جہہ حامد و شیوخ شامل تھے۔ ان لوگوں کو لارنس کے توسط سے ہدایات ملتی تھیں۔ اس کی معرفت روپیہ دیا جاتا تھا۔ غرض لارنس اپنی استعداد خاص کی بدولت محوڑے ہی دنوں میں ان عرب جاسوسوں کا سردار بن گیا جو حجاز مقدس سے ایشیائے کوچک تک پھیلے ہوئے تھے اور انہی خدمات کے صلے میں لفٹیننٹ سے لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی اور پھر جلد کرنل بنا دیا گیا۔

لارنس اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے کوئی باوقار شخص نہیں تھا اور یہی وجہ ہے

کہ لوگ اسے دیکھ کر اس کے خصائل اور سیرت کے متعلق کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا قد پانچ فٹ ساڑھے پانچ انچ تھا۔ اس کے گورے رنگ سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنی عمر کا ایک حصہ عرب جیسے تپتے ملک میں بسر کیا ہے یا اس کی آنکھیں نیلی تھیں جو یہیم حرکت کرتی رہتی تھیں۔ اس کی ٹانگیں جسم کے بالائی حصے کے مقابل چھوٹی اور حقیر نظر آتیں۔ اس کا سر بہت بڑا تھا۔ عام طور پر اپنا دایاں ہاتھ سینے کے نیچے باندھ کر رکھتا اور سفر میں سر جھکا کر چلتا۔

کنل لارنس کے مداحوں میں لارڈ جارج، لارڈ کزن، برنارڈ شا اور ٹامس ہارڈے جیسے باشعور برطانوی لوگوں کے نام ملتے ہیں۔

**جرمن اور برطانیہ** | وقت کے طلوع و غروب کے ساتھ سلطنتوں کے ارادے اور مزاج میں تغیر کوئی بڑی بات نہیں۔ خصوصاً بڑی طاقتیں حالات کو ہمیشہ اپنی انراض کے سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ جب ان کے ارادوں کی تکمیل ہو چکتی ہے تو ان سانچوں کو خود بخود توڑ دیتی ہیں۔

برطانیہ بیسویں صدی کی سب سے اہم قوت قرار دی گئی تھی۔ پہلی بڑی برطانی کے بعد کمزور قوموں کے مقدر اس سلطنت کے قبضہ اقتدار میں رہے۔ جس طرح چاہا اپنی مرضی اور رضا پر استعمال کیا۔ فاتح کی حیثیت سے مفتوح اقوام کے ساتھ اس نے جن اطوار سے اپنی تاریخ مرتب کی، مورخ اس کو حقیقت ماننے سے انکار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی نظر میں یہ اولیٰ انصاف اور دیانت کے خلاف مرتب کیے گئے ہیں۔ لیکن جیسے ہی مفتوح اناج پر غالب نظر آیا فاتح نے اپنے مصنوعی سہارے تلاش کرنے شروع کیے۔

۲۲- مئی کو ہٹلر نے سیاسی بساط پر ایک نئی جہال چلی۔ یعنی اس نے فرانس اور روس کے

درمیان معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

”اس معاہدہ کے متعلق کوئی ذمہ دار بیان نہیں شائع کیا گیا، جس سے اس کے انراض و مقاصد واضح ہوں۔ کیونکہ جرمن! روس اور فرانس کے فوجی اتحاد کو لیگ آف نیشنز کی سپرٹ کے خلاف سمجھتا ہے۔“

جرمن! آسٹریلیا کے اندرونی معاملات میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا اور نہ

اس کی خواہش ہے کہ آسٹریلیا کا جرمنی کے ساتھ الحاق ہو۔  
مجھے افسوس ہے کہ آسٹریلیا کے ساتھ ہمارے تعلقات خراب ہیں۔ اور  
اس کشیدگی کا نتیجہ ہے، کہ اٹلی کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات ناخوشگوار ہو گئے  
ہیں۔ حالانکہ جرمن اور اٹلی کے مغل میں کوئی تصادم نہیں۔“  
ہٹلر نے جرمن کے بحری بیڑے کے متعلق کہا:

”برطانیہ کے پاس جتنے بیڑے وزنی جہاز ہیں، جرمن کو ان کا پینتیس فیصد  
رکھنے کی اجازت دی جائے، اگر اس مطالبے کو منظور کر لیا جائے تو جرمن کا  
بحری بیڑا، فرانس کے بحری بیڑے کے مقابل میں پندرہ فی صد سے بھی کم فزنی  
ہوگا۔“

آگے چل کر ہٹلر نے روس کے سوا باقی تمام ممالک کے ساتھ ہوائی مساوت کا مطالبہ کر کے سبک دیا  
”جرمنی بڑی بڑی توپوں، ٹینکوں اور آبدوز کشتیوں کا خاتمہ کرنے اور  
جنگی جہازوں کے وزن کی حد مقرر کرنے نیز اسلحہ پر پابندی منظور کرنے کے  
لیے تیار ہے۔“

بین الاقوامی حالات پر جرمنی کے رویے کی وضاحت کرتے ہوئے ہٹلر نے کہا:  
”۱۶ اپریل کو جنیوا میں جو مطالبہ کیا گیا تھا، جرمن گورنمنٹ نے اسے  
نا منظور کر دیا۔ صرف جرمنی نے ہی معاہدہ وارسائی کو نہیں توڑا بلکہ ان طاقتوں نے  
بھی توڑا ہے، جو اسلحہ کو کم کرنے کے مطالبہ کے متعلق جرمنی کی شکایت کرتی  
ہیں حالانکہ معاہدہ کی رو سے وہ ایسا کرنے کی پابند نہیں۔“

لیگ آف نیشنز نے حال ہی میں جرمنی کے خلاف جو امتیازی فیصلہ  
دیا ہے، وہ جرمنی کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ لیگ آف نیشنز میں واپس جائے  
جب تک تمام الجھاؤ میں انصاف اور مساوت پیدا نہ ہو جائے۔ ایدریس  
حالات جرمنی چاہتا ہے کہ معاہدہ ورسیلو پر جس میں مغتوح اور فاتح قوم  
میں امتیاز روا رکھا گیا ہے، اخطیہ ترمیم کھینچ دی جائے اور لیگ آف نیشنز



کوئی ایسا سمجھوتہ نہ کرے جس میں اس کے تمام نمبروں کے مساوی درجات کو تسلیم نہ کیا گیا ہو اور بین الاقوامی زندگی میں تمام اقوام کو مساوی حقوق حاصل نہ ہوں۔ حکومت جرمنی کسی ایسے سمجھوتے پر دستخط نہیں کرے گی جس کی شرائط اس کے خیال میں پوری نہ ہو۔ ہاں وہ ان تمام معاہدوں کی خواہ وہ موجودہ گورنمنٹ سے پہلے ہی کیوں نہ کیے گئے ہوں پابند رہے گی۔ جس پر اس نے اپنی مرضی سے دستخط کیے ہیں۔ جب تک معاہدہ لوکارنو پر دستخط کرنے والی دیگر طاقتیں اس معاہدے کی پابند رہیں گی جرمن بھی ان معاہدوں پر پیدائندہ ذمہ داریوں کو قبول کرتا رہے گا۔ چونکہ دوسری طاقتوں نے تخفیف اسلحہ کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا اس لیے جرمن نے معاہدہ ورسیلز کے اس آرٹیکل کا پابند رہنے سے انکار کر دیا ہے جس کی رو سے جرمن کے خلاف امتیازی سلوک رفا رکھا جا رہا تھا۔

جرمن غیر مشروط طور پر ان احساسات کا احترام کرے گا جو اقوام کی بین الاقوامی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جرمن اجتماعی سسٹم میں شامل ہونے اور لوکارنو پیکٹ کے علاوہ ہوائی طاقت کے متعلق معاہدہ کرنے کے لیے بھی تیار ہے اور اس سلسلے میں جو بھی گفتگو ہوگی وہ اس میں شامل ہوگا۔ جرمن گورنمنٹ اپنے ہمسایوں کے ساتھ جارحانہ کارروائی نہ کرنے کے متعلق الگ معاہدہ کرنے کو بھی تیار ہے۔ جرمن گورنمنٹ کسی حالت میں بھی جرمن فوج کی از سر نو تنظیم کے کام کو بند نہیں کرے گی۔

جرمن کے اس کام سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ جرمن اپنے اسلحہ جات کو بھی کم کرنے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ دوسری طاقتیں بھی ایسا کرنے پر آمادہ ہوں۔ جرمن سمندر میں بھی کسی کا حریف نہیں بننا چاہتا۔ کیونکہ وہ برطانیہ کے اس معاہدے کو تسلیم کرتا ہے کہ برطانوی سلطنت کے استحکام کے لیے اسے زبردست بحری طاقت کی ضرورت ہے۔ لیکن یورپ میں اپنی مستی کو قائم رکھنے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہے۔ نیز جرمن اسلحہ پر پابندی عائد کرنے

یا اسے ختم کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہے۔  
 جرمن ایسا معاہدہ کرنے پر بھی آمادہ ہے، جس کی رو سے کوئی ملک  
 دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دے سکے۔“

ہٹلر کی اس تقریر سے جرمن پریس اور عوام نے بہ تاثر لیا کہ ہٹلر نے برطانیہ کی رائے عامہ  
 کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء نے اقوام ہند کے مابین جو انتشار ڈال دیا تھا، برطانیہ کی گرتی ہوئی دیوار  
 کو یہ انتشار بھی سنبھالانا دے سکا۔ تاہم برطانوی سیاستدانوں کو جرمن ہٹلر کی مندرجہ بالا تقریر  
 میں اپنے لیے قدر عافیت نظر آئی اور انہوں نے ہٹلر سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس وقت  
 کو غنیمت جانا۔ اور دوسرے روز ۲۳ مئی کو برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بالڈون (جس کے متعلق  
 ان دنوں یہ افواہ تھی کہ وہ رنز سے میکڈانلڈ کے بعد وزیر اعظم ہونے والے ہیں) نے پارلیمونٹ  
 میں اپنی تقریر کے دوران ہٹلر کی گزشتہ روز کی تقریر کے جواب میں کہا:

”ہٹلر کی تقریر میں امید کی ایک جھلک ہے۔ ہمیں اس روشنی کو حاصل  
 کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم ایک بار پھر یہ چاہتے ہیں کہ دیگر ممالک کے  
 دنوں پر جرمن کا بونوٹ طاری ہو چکا ہے اسے نکال دیا جائے۔“

بین الاقوامی ریاست کے پس پردہ کھلے دنوں جو کچھ متواتر رہا ہے اس  
 سے برطانیہ بھی خائف تھا اور اس خوف کی خاص وجہ بین الاقوامی حالات سے لاعلمی  
 تھی۔ اب جرمن نے صحیح صحیح حالات بے نقاب کر دیے ہیں۔ لہذا وہ وقت قریب  
 آ رہا ہے جب کہ تمام یورپین ممالک اپنی خواہش صاف صاف بیان کر دیں گے۔  
 گزشتہ نومبر میں نے جو جرمن کے جنگی جہازوں اور ہوائی بیڑے کے متعلق  
 اعداد و شمار پیش کیے تھے وہ یعنی برائصاف ہیں اور گزشتہ چھ سالوں میں  
 جرمن نے مزید ہوائی جہازوں کی تیاری کے کام میں نمایاں توسیع کر لی ہے۔  
 دراصل ان امور کے متعلق ہمیں کسی قدر غلط فہمی ہوتی تھی۔ جن دنوں مرجان  
 سامن نے جرمن میں ہٹلر سے ملاقات کی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ

جرمن کی ہوائی طاقت برطانیہ کے برابر ہو گئی ہے۔ بعد کی تحقیق سے پتہ چلا کہ ساڑھے آٹھ سو جنگی جہاز ہیں جو ہوائی جنگ کی صورت میں نہایت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہٹلر نے سر جان رائٹس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جرمن ہوائی طاقت کے لحاظ سے دراصل فرانس کا ہم پلہ ہونا چاہتا ہے۔ گویا ہٹلر فرانس کے بین بین چل کر نپدہ سو جنگی جہاز تیار کرنے کے درپے ہے۔ ان حالات میں برطانیہ کے لیے اس موقع کو غنیمت جان کر چاہیے کہ وہ بین الاقوامی امن کے لیے کوشش کرے۔“

اصناع کے نزدیک اس کی برخلیق ایک عظیم شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ کوئی عظیم زمین زلزلہ | شخیلات کے ہجوم میں کھو کر جب وہ موزے قلم سے صفحہ قرطاس پر لٹھی سیدھی لکیروں کے ہیولے لکیرتا ہے تو اس کی اپنی فطرت کہ اٹھتی ہے کہ زیری کائنات میں میرا جواب نہیں۔ حالانکہ عارضی رنگوں کے امتزاج کی یہ کاغذی عمارت ہوا کے ایک جھونکے سے اپنی تمام رونق ضائع کر بیٹھتی ہے۔ لیکن اس پر بھی گمراہی کا یہ عالم ہے کہ بے اختیار بول اٹھتا ہے۔

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی رسوا کر دیا

میں ہی تو ایک راز تھا، سینہ کائنات میں

اگر مصور کا غذا ز مٹی کے کھدوں پر اس قدر مسرور اور مغزیر ہو سکتا ہے تو کائنات کائنات کو یہ حق کیوں نہیں کہ وہ ارض و سماوات کا الگ و خالق ہے۔ ہونے پہلے حقیقی شہ پاروں پر اپنے احکام نازل نہ کرے؟ اور نہیں اپنی رضا پر تہہ پہاڑ سے اس کی کبھی کبھار مٹی کی ان رنگین موزوں میں ایسا ہیجان اٹھتا ہے کہ ان کے رنگوں سے دریاؤں میں بغاوت پرا بھارتے ہیں تو یہ آپسے باہر ہوا مٹتی ہیں۔ ناچنی ہوائی تیلیاں فساد برپا کرتی ہیں مگر جیسے ہی تار ٹوٹتی ہے یہ بے بس و سرگردان ہونے لگتی ہیں۔ تو آپ حکیم نے اسی پر کہا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ مِمَّا كَسَبَتْ أَيْدِي  
النَّاسِ لِيُبَذَّ بِقَهْمِهِمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

ترجمہ: پھیل گیا فساد جنگل اور دریا میں لوگوں کی ہاتھ کی کمائی سے تاکہ چکھایا جائے ان کو کچھ  
مزہ ان کے کام کا کہ شاید واپس آجائیں۔

یہی حوادث کائنات ہے جسے ہادی دنیا زلزلہ کہتی ہے اس سے فطرت کی مراوانسانوں کو ان  
کے برے افعال پر عبرت دینا مقصود ہوتا ہے نہ کہ تباہی۔

ہندو تھیالوجی کے نزدیک دھرتی کا تمام بوجھ بیل دیوتا کے سینک پر ہے اور جب وہ اپنا  
سینک تبدیل کرتا ہے تو زمین کانپ اٹھتی ہے۔ اپنے پاؤں (گناہوں) سے دھڑکتے ہوئے  
دل اسے زلزلہ کہتے ہیں۔ پھر وہ دھن دولت سے اپنے پاپ دھونے کی کوشش میں فقیروں  
کو خیرات بانٹتے ہیں۔

سائنس دان زلزلے کو زمین کے بخارات سے تعبیر کرتے ہیں ان کی رائے ہے کہ جہاں  
کیں بخارات کو نکاس کی راہ نہیں ملتی وہیں زلزلہ آتا ہے۔

انسانوں کا دل بذاتِ خود ایک کائنات ہے اور یہ کائنات اس قدر کمزور ہے کہ اس کو لگنے  
کو نگاہ کی ایک ہلکی سی چوٹ پارہ پارہ کر جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے: ہ  
مت کسی کا دل دکھا اور مت کسی کی آہ لے  
دل کے دکھ جانے سے ناداں عرش بھی ہل جائے،

یہ حقیقت ہے کہ جب دل کی دنیا میں زلزلہ آتا ہے تو مجرور پر کانپ اٹھتے ہیں۔

صدیوں پہلے سقراط نے کہا تھا کہ زمین گردش میں ہے اور اسے اس جرم میں زیر پنا  
پڑا۔ لیکن آج سمندر ہوں کہ پہاڑ زمین ہو کہ آسمان۔ اس طرح لرزہ براندام ہیں کہ کائنات کا  
سکون جنس گراں بنتا جا رہا ہے۔ بدیں و بقرآن حکیم کا یہ فیصلہ درست ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ

فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ مِمَّا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُبَذَّ بِقَهْمِهِمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

ترجمہ: پھیل گیا فساد جنگل اور دریا میں لوگوں کی ہاتھ کی کمائی سے تاکہ چکھایا جائے  
ان کو کچھ مزہ ان کے کام کا کہ شاید واپس آجائیں۔

یکم جون کے اخبارات کی پہلی سرخی تھی۔  
 • ۳۱ مئی رات پورنے تین بجے کو ۸.۵ میں شدید زلزلہ آیا جس میں ہزاروں جانیں  
 تلف ہو گئیں۔ شہر اور دیہاتوں کا نشان تک مرٹ گیا۔ کوئٹہ کا بابو محلہ اس سے خاصہ  
 متاثر ہوا۔ چالیس ہزار سے زیادہ اموات ہوئیں۔ سرکاری اطلاع چھاس ہزار کی ہے۔



پلک جھپکنے ہی عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہو گئیں

مورخین کی تحقیق ہے کہ کورہ ارض پر سب سے پہلا زلزلہ "کوریتھوگریس" میں ۸۵۶ء میں آیا تھا اور اس میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد پینتالیس ہزار تھی۔



(یہ طائف میں زلزلہ کے وقت رک گیا تھا اس سے رزلے کے صحیح وقت کا پتہ چلتا ہے)  
 ممکن ہے کہ مورخین کی تحقیق صحیح ہو لیکن اگر اسلام کی سطح پر پرکھا جائے کہ زمین انسانی  
 گناہوں سے کانپ اٹھتی ہے تو مورخ کی رائے پر اختلاف لازم آتا ہے۔ کیونکہ انسان پور  
 گناہ کا رشتہ روزِ آفرینش سے قائم ہے۔ آرزوؤں اور تمنائوں کا گوارہ انسان شاہراہِ زندگی کے  
 ہر موڑ پر فریب کھاتا ہے اور فریب خوردہ انسان اپنے عصیاں پر مطمئن ہونے کے ساتھ بعض

دفعہ سے نیکی کا درجہ دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہی گمراہی انسان کے گناہوں کی پہلی منزل ہے۔  
 اگر اس حقیقت کو درست مان لیا جائے تو مؤرخین کی تحقیق غلط ہو جاتی ہے۔ طوفانِ نوح  
 فرعون مصر اعدائے اور آتے دن کوہِ آتشیں کے پھٹنے کو کیا سمجھا جائے، جس میں ہزاروں نہیں  
 لاکھوں جاہیں تلف ہو چکی ہیں۔ یہ بھونچال نہیں تو اور کیا ہے۔  
 بہر حال ۳۰ اور ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی درمیانی شب کو ٹیٹہ کی تباہی کی چشم دید گواہ ہے کہ اس  
 رات کی صبح ہزاروں مرنے والوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

بے آب و گیاہ پہاڑوں کے درمیان پیسٹھ ہزار کی یہ آبادی جس میں ہر سال تفریح کے لیے  
 آنے والوں کی تعداد قریباً بیس ہزار کا اضافہ کر دیتی تھی کو ٹیٹہ میں مئی کے دنوں موسم تبدیل ہو جاتا ہے  
 لیکن اس سال موسم گرا اس ماہ بھی سرد رہا۔ اس طرح اس بد نصیب شہر کی آبادی تباہی کے دنوں  
 اسی ہزار کے قریب تھی۔

برطانیہ کے ایک صحافی رابرٹ جکین اپنی تصنیف "کو ٹیٹہ کے تیس سیکنڈ" میں اس قیامت  
 صغریٰ کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

”ہوایں خشکی تھی۔ چاند ابتدائی دنوں کا تھا بلبلوں کے آوارہ سائے ادھر ادھر  
 بھٹک رہے تھے۔ کچھ بے گھر لوگ فٹ پاتھوں پر سو رہے تھے اور جن کے گھر  
 تھے وہ بند کمروں میں آنے والی تباہی سے بے خبر گہری میند میں مبتلا تھے۔“

اس رات کو ٹیٹہ کے جانور عجیب سی بولیاں بول کر اپنی بے چینی کا اظہار  
 کر رہے تھے۔ گھوڑے، بھینس، بکریاں اپنی اپنی جگہ پر نہایت اضطرابی کیفیت  
 میں مبتلا تھے۔ لیکن نہ تو کسی نے ان کی آواز سنی اور نہ توجہ دی۔

○

کو ٹیٹہ بلوچستان کا واحد مقام نہ تھا جہاں تین بجکر تین منٹ پر موت،  
 زندگی پر حاوی ہو گئی تھی۔ زرا زلے کا پھیلاؤ ستر میل لمبے اور سولہ میل چوڑے  
 علاقے تک تھا۔ قلات کا معروف قصہ مستونگ بھی آمانا اہلاکت و تباہی  
 کے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔“

ایک اور واقعہ نگار آفاقی لکھتا ہے۔

۳۱- مئی ۱۹۳۵ء کی صبح ————— آج کی صبح کو بیڑ میں اندھا سورج  
 طلوع ہوا۔ آج کوئی ہنسا مسکراتا بچہ سکول نہ جاسکا آج کوئی خاتون قندھاری بازار  
 خریداری کے لیے نہیں آئی۔ آج کسی بنک کا دروازہ کاروبار کے لیے نہ کھل سکا۔  
 آج کو بیڑ شہر کے تمام بازار اچانک اتم کناں نظر آتے ہیں۔  
 اندھا سورج ہر طرف تاریکی اور بربادی کی کرنیں پھیلا رہا ہے۔“

○  
 نصف رات کے قریب گرد و پیش کے ماحول میں کچھ مبہم سا تغیر رونما ہونے لگا۔  
 گھٹن اور جس کی سی کیفیت بڑھنے لگی۔ کچھ ہی ثانیہ بعد مغرب کی طرف سے سائیں  
 سائیں کا شور بلند ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس شور نے آندھی کا روپ دھار  
 لیا۔ کو بیڑ شہر شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً خونناک اور مہیب آندھی کی لپیٹ میں آچکا تھا۔  
 ابھی آندھی کا زور تھمنے نہ پایا تھا کہ مغرب کی طرف سے زیر زمین ایک جھٹکے کی  
 برق رفتار اور جھجلا دینے والی لرآئی اور مشرق کی طرف گونڈ گئی۔ یہ مشکل چند ثانیہ گزر  
 ہوں گے کہ مشرق کی طرف سے اسی طرح کی ایک خونناک زیر زمین لرآئی۔ معاً یہ  
 خیال گذرا کہ دونوں مخالفت لہروں میں ایک زبردست قسم کا ٹکراؤ ہوا ہے۔ بس  
 پھر کیا تھا کو بیڑ شہر ایک لڑخیز گڑا گڑا ہٹ کے سمندر میں ڈوب گیا۔

پینتالیس سیکنڈ تک گڑا گڑا ہٹ اور زلزلے کے بے رحم جھٹکوں کا سلسلہ  
 جاری رہا اور اس کے ساتھ جھونپڑیوں، مکانوں اور دکانوں کے انہدام کا غیر معمولی  
 شور و خونا اٹھا کہ الامان! سوئے ہوئے زندہ انسان عمارتوں کی چھتوں تلے  
 آکر کچلے گئے، معصوم بچے اور الٹروڈ شیز انہیں، بونوالوں کے حسین بچے میں پہنچے  
 ہوئے تھے۔ پھر بھی بھی لوٹ کر اس حقیقی دنیا میں نہیں آسکے۔ جان بوسینوں  
 میں عزم و ہمت کے چراغ روشن کیے سو رہے تھے دوبارہ آنکھ نہ کھول سکے۔  
 ہر طرف گرام مچ گیا۔ مکان گر رہے تھے۔ زمین پھٹ رہی تھی۔ پہاڑوں سے



قوی ہیکل پتھر اور بھاری بھر کم پٹانیں نشیبی آبادیوں کی طرف ٹھک رہی تھیں اور وہ بد قسمت ہو اس قیامت صغریٰ کی زد میں آ رہے تھے اپنی دل روز بیخ و پکار سے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے یہ سلسلہ صبح ہونے تک جاری رہا۔ بچے قیم ہونے رہے۔ ہائیں اپنے تخت ہائے جگر سے محروم ہوتی رہیں۔ بہنوں کے بھائی بزاروں من مٹی کے بوجھ تلے سسک سسک کر دم توڑتے رہے۔

اسی طرح رات بھر زندگی اور موت، موت اور زندگی کے درمیان تصادم جاری رہا۔

○

میں نے دیکھا کہ انگریزوں نے لاشیں لواحقین کے سپرد نہیں، بلکہ بڑے بڑے گڑھے کھودے اور مسلمان اہل ہندو اسکھ یا عیسائی کا امتیاز کیے بغیر لاشوں سے بھر دیے۔ ایک ایک گڑھے میں سو سو افراد دفن کیے گئے۔

بہرستان کانسٹیبل پراج بھی موجود ہے :

جس کو رکھے ساتیاں

بعد الصمد رانی لیتے ہیں :-

» بابو محلہ میں ایک ڈرائیور رہتا تھا۔ اس کا گھر بھی زلزلہ میں تباہ ہو چکا تھا۔ جب سات دن کے بعد اس کے گھر کی کمرانی کی گئی تو اس کا شیر خوار بچہ زندہ تھا اور اٹھوٹھا چوس رہا تھا۔

○

۳۰ مہنی کی رات کو بھاری مرغی نے انڈوں میں سے تیرہ بچے نکالے۔ یہیں گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ زندہ بچ رہیں گے۔ قدرت کا کرشمہ دیکھنے تبین دن کے بعد جب بلراٹھیا گیا تو مرغی اپنے پردے تلے بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔ انہیں باہر نکالا تو سفید بچے بلے پر ڈاری لینے لگے

○

ایک خاتون بلے کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئی۔ مگر اس کی تین اماں کی شیر خوار

بچی زندہ بچ گئی اور اسے نواش تک نہ آئی۔

۵

ایک مجوزہ میں نے اپنی نظروں سے دیکھا ہے۔ میرے اور موسیٰ خاں رسلو گورنر مغربی پاکستان کے استاد سید غلام حسین معمر تھے۔ ان کے اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک بچی پال رکھی تھی۔ حادثے کی رات سید غلام حسین، ان کی بیوی اور سہ پالک بیٹی سب گھر ہی میں تھے۔ حادثے کے دن گھنٹے بعد ان کا پتہ لگانے ان کے گھر پہنچا تو مکان ڈھیر ہو چکا تھا۔ ساتھ والی دو منزلہ عمارت بھی ان کے مکان پر گری تھی۔ ہاتھوں سے ملہا مٹھانا شروع کیا۔ چند دوست بھی میرے ساتھ تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد بلے سے آواز سی سنائی دی۔ کان لگایا تو یقین ہو گیا کہ استاد محترم زندہ ہیں۔ کچھ دیر کے بعد آواز صاف سنائی دینے لگی۔ میں نے کہا ”ہم پہنچ گئے ہیں تو استاد محترم نے جواب دیا کہ سٹور میں سے کدال اور بلیچ لے کر بلے کو بٹاؤ۔ ہم نے مسلسل جدوجہد کے بعد گھر کے مینوں افراد کو باہر نکالا۔

ان کے بچ رہنے کی وجہ دوشہ تھی۔ جو گرتے وقت آپس میں اوپر کی طرف مل کر زمین میں دھنس گئے تھے۔ جو بلے پڑتا تھا یہ شہتیر اسے روک لیتے۔ استاد غلام حسین، ان کی بیوی اور سہ پالک بیٹی۔ مینوں ان شہتیروں کی اوٹ میں بچے ہوئے تھے۔“

”روزنامہ مشرق۔ نئی دہلی ایڈیشن۔ کوئٹہ نمبر۔ ۲۸۔ مئی ۱۹۶۷ء“

احرار کا کوئٹہ ریلیف کمیٹی | چاہیے تو یہ تھا کہ اس قیامت صغریٰ میں انسان انسان کے کام آتا۔ کوئٹہ کے مصیبت زدگان کے لیے دنیاوی

دھندوں سے چند دنوں کے لیے ہاتھ کھینچ لیا جاتا۔ مگر ملک بھر کی سیاسی جماعتوں نے اپنی دنیاوی ضرورتوں کو ترک نہ کیا۔ وہ آئندہ انتخاب کی تیاریوں میں بدستور مصروف رہیں لیکن احرار نے شعبہ خدام حلق کے تحت لاہور دہلی دروازہ سے باہر کوئٹہ ریلیف کمیٹی قائم کر دیا۔ بارہ ڈاکٹر اور پچاس کمیوڈروں کی ایک جماعت پوری تیاری کے ساتھ کوئٹہ روانہ کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی

رضا کاروں کی بھرتی کا کام اعلان کر دیا گیا جو کوئٹہ سے آنے والے زخمیوں کی دیکھ بھال میں مجلس احرار کا ہاتھ بٹائیں۔ نیز مصیبت زندگان کی امداد کے لیے ایک ریلیف فنڈ جاری کیا گیا۔

مقامی ریلیف کمیٹی کے انچارج ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان ایم۔ بی۔ بی۔ ایس مقرر تھے کمیٹی دہلی دروازے سے اکبری دروازے تک پھیلا ہوا تھا۔ سو سے زائد برقی پنکھے اور اسی قدر برقی روشنی کا انتظام تھا۔ مجلس احرار نے کوئٹہ سے لاہور تک تمام اسٹیشنوں پر اپنے رضا کار متعین کر دیے تھے جو زخمیوں کی ہر طرح تیمارداری کرتے۔ امرتسر اور لاہور میں ۲۰ جون تک دو ہزار سے زائد کوئٹہ سے زخمی پہنچ چکے تھے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ احرار نے اپنے تمام تبلیغی اور سیاسی پروگرام ملتوی کر دیے اور تمام رہنما لاہور مرکز میں جمع ہو گئے۔

احرار کوئٹہ ریلیف کمیٹی کے امدادی کاموں میں مقامی کانگریس، انجمن حمایت اسلام لاہور اور دیگر مسلم جماعتوں نے پورا تعاون کیے رکھا۔ چھ لاریاں روزانہ لاہور ریلوے اسٹیشن سے مجروحین کو کمیٹی تک پہنچانے میں دن رات مصروف تھیں۔ کمیٹی میں مختلف جگہوں پر لاڈلہ اسپیکر لگا دیے گئے تھے تاکہ تکلیف یا ضرورت کے وقت کسی ڈاکٹر کو بلانے میں دقت نہ ہو۔ میونسپل ہسپتال لاہور کے ڈاکٹر بھی ہمہ اوقات زخمیوں کو طبی امداد دیتے۔ لاہور کے محترم گھرانوں کی عورتیں زخمی بہنوں کی تیمارداری کرتی تھیں۔

کمیٹی کے انچارج چودھری افضل علی تھے۔ جو کوئی لمحہ گزارے بغیر کمیٹی کے ارکان گھومتے پھرتے اور ہر طرح کے کام کی نگرانی کرتے۔ اسی طرح امرتسر ریلیف کمیٹی کے انچارج مولانا عبدالسلام سہدانی تھے اور ان کے معاون شیخ صادق حسن رئیس امرتسر، مولانا عبدالکریم مہتابہ خواجہ عبدالرحیم عاجز اور مرزا غلام نبی جانباز تھے۔ پنجاب کے سرکاری حکام نے بھی اس سلسلے میں پوری طرح تعاون کیا۔ وائسرائے ہند لارڈ وننگٹن اور اس کی بیوی نے احرار ریلیف فنڈ میں پانچ ہزار روپیہ دیا۔ اس وقت کمیٹی میں زخمیوں کی تعداد سینکڑوں تھی۔

یکم جون سے ۵ جون تک مجلس احرار کے چار مختلف وفد مصیبت احرار وفد پرابندی

زندگان کی امداد کے لیے کوئٹہ روانہ ہو چکے تھے۔ اور ان کی رپورٹ کے مطابق ہر طرح کی اشیاء کو ٹر روانہ کی جا رہی تھیں کہ ۵ جون کو حکومت بلوچستان نے ڈاکٹر

عبدالقوی نعمان انچارج ریلیف کمیٹی کو تار کے ذریعہ مطلع کیا۔  
 ”کوئٹہ میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے۔ وہاں ہر طرح کی بیرونی مداخلت ممنوع  
 قرار دے دی گئی ہے، لہذا ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی مزید خدمات سے  
 فائدہ نہ اٹھا سکے۔ برائے لوازش اب آپ کو کوئٹہ میں اپنی ریلیف پارٹیاں  
 نہ بھیجیں۔“

اس کے ساتھ ہی چوتھے اجراء وفد کے سیکرٹری مولانا عبدالغفار غزنوی نے جکیب آباد  
 سے چودھری افضل حق کو تار کے ذریعہ مطلع کیا کہ:  
 ”ملٹری آفیسروں نے ہمیں جکیب آباد کے ریلوے اسٹیشن پر روک لیا ہے  
 آپ ڈپٹی کمشنر لاہور کے ذریعہ ان افسراں سے کوئٹہ جانے کی اجازت لے کر دیں  
 کیونکہ ابھی کوئٹہ میں امداد کی سخت ضرورت ہے۔ نینز کمیل اور سامان خورد و نوش  
 بھی روانہ کریں۔“

”روزنامہ انقلاب لاہور ۶-جون ۱۹۲۵ء“

**صدر مرکز کا حکم** | مولانا جلیب الرحمن لدھیانوی صدر مرکز پر مجلس اجراء نے ماتحت  
 مجلس کو حکم دیا کہ وہ کوئٹہ مصیبت زدگان کی امداد کے لیے مقامی  
 ٹاکٹروں کو جو بغیر معاوضے کے کام کریں فوراً لاہور روانہ کریں۔  
 حکومت بلوچستان کے مطابق کوئٹہ میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے  
 باوجود یورپین مجروحین کے لیے ہاتھ دہرا ریلیف کمیٹیاں کوئٹہ پہنچ رہی ہیں۔ خاص طور پر ان  
 کے ذمہ ہے کہ انگریز خاندان کی دیکھ بھال کی جائے۔ انہی دنوں وائسرائے ہند کوئٹہ ریلیف  
 فنڈ جاری کیا گیا جس میں دیکھتے دیکھتے لاکھوں روپے جمع ہو گئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری  
 سرمایہ دار وائسرائے کے ریلیف فنڈ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر امداد کرتے چلائے۔  
 سرکاری آفیسر ہر روز اجراء ریلیف کمیٹی دیکھتے آتے لیکن امدادی رقوم وائسرائے فنڈ میں  
 دیتے۔ اس کے مقابل اجراء ریلیف فنڈ میں بیس ہزار سے زیادہ روپیہ جمع نہیں ہوا۔ جس  
 کی تفصیل ہر روز شام کو شائع ہونے والی بلٹین میں درج کر دی جاتی تھی۔

**احرار کیمپ کا معاہدہ** | لاہور۔ ۶۔ جون۔ آج تیسرے پہر میں نے مجروحین کو نوٹہ کے اس کیمپ کا معاہدہ کیا جو مجلس احرار نے بائع بیرون دہلی دروازہ میں قائم کر رکھا ہے۔ بحالات موجودہ ایک سو سے زائد بستروں کا انتظام شامیانوں کے نیچے مجروحین کے علاج کا بیک وقت انتظام ہے۔ ایم۔ بی۔ ہائی سکول کی عمارت میں بھی مجروحین ہیں۔ اس کیمپ میں عورتیں اور بچے بھی مجروحین ہیں جن کی دیکھ بھال کے لیے عورتیں مقرر ہیں۔ پناہ گزینوں کے نام کار حشر موجود ہے۔ سبلی کے پکھے اور روشنی کا بہترین انتظام ہے۔ مجروحین کی نورا ک کا انتظام بھی خوب ہے۔ ڈاکٹر عبد القوی نعمان، ڈاکٹر عبدالرحیم خاں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس سابق سول سرجن اور ان کے ساتھ دوسرے ڈاکٹر بہترین مصروف ہیں۔

بیشیت مجموعی احوار کیمپ نہایت مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایسے میں مسلمانان لاہور کا فرض ہے کہ وہ مجلس احرار کی دل کھول کر امداد کریں۔ کیونکہ اس وقت صرف یہی ایک کیمپ ہے جو مجلس احرار نے قائم کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے سکے آمین۔  
(عبدالمجید سالک۔ مدیر روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۸۔ جون ۱۹۲۵ء)

**برائی نیکی سے خائف** | نیکی بہر حال نیکی ہے، اسے کرتے رہنا چاہیے۔ برائی نیکی سے خائف رہ کر اسے ڈرانے دھمکانے کے کئی بہانے تلاش کرتی ہے۔ مگر ایک وقت آتا ہے جب انسان کے فائدہ اعمال میں نیکی واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

۴۔ جون کو روزنامہ "انقلاب" لاہور کے ایڈیٹر عبدالمجید سالک نے احوارِ طیف کیمپ دیکھا۔ اور اس کی روداد اگلے روز اپنے جہد سے میں شائع کی۔ لیکن ۹۔ جون کے شمارے میں اپنے ادارتی نوٹ میں لکھتے ہیں۔

» ان دنوں بعض حضرات حکومت ہند کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ احرار کو نوٹہ ریف کے سلسلے میں اس قدر آگے جانے کی اجازت نہ دے کیونکہ اندیشہ ہے کہ وہ اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہ اٹھائیں۔

(محترم مدیر انقلاب اگر ان مشیروں کے نام شائع کر دیتے تو بات صاف ہوجاتی لیکن

اس مہم سے ادارتی نوٹ سے کئی شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصرار کی بڑھتی ہوئی شہرت سے مزارائیوں کو خطرہ ہو۔

اس کے دوسرے روز حکومت ہند نے اخبارات کے نام ایک پریس نوٹ جاری کیا کہ ”کوئٹہ کے متعلق کوئی خبر یا پریس نوٹ جو شائع ہو، وہ حکومت کی نگرانی میں ہو۔ اس پر پابندی سختی سے ہو۔“

**لاوارث بچے** | مصیبت کے دنوں میں بھی کفر اپنی شرارتوں سے باز نہیں رہا۔ چنانچہ کوئٹہ کے زلزلہ میں زندہ بچ رہنے والے یتیم اور لاوارث بچوں کو ہندو اور عیسائی مشنری اپنے جال میں پھانسنے کے لیے کوئٹہ سے لاہور تک تمام ریلوے اسٹیشنوں پر بھرپور حملے کرتے رہے۔ غیر مسلموں کی ان حرکات کے پیش نظر چودھری افضل حق ایم ایل نے ۱۳ جون کو پریس بیان کے ذریعے ہندو اور مسلمانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا: ”کوئٹہ کے مصیبت زدگان کا کام ابھی پورے طور پر شروع نہیں ہوا۔ لیکن مختلف فرقوں نے یتیم بچوں اور مظلوم عورتوں کے اغوا کا کام شروع کر دیا ہے جس فرقے کے دماغ کے کسی گوشے میں دوسری قوم کے بچوں اور عورتوں کے اغوا کا خیال ہوا انہیں خوف خداوندی سے ڈرنا چاہیے۔ بجائے دوسری قوم کے اغوا کا خیال کرنے کے انہیں اپنے ہزاروں بھیک مانگنے والے لوگوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہزاروں ہندو مسلمان بچے اور عورتیں بھوک کے دکھ سے ملک میں مارے مارے پھر رہے ہیں ایسے وقت میں محبت اور نیک دل لوگ اپنی قوم اور مذہب کے ان بد نصیبوں کی امداد کیوں نہیں کرتے؟

میں تمام ہندو مسلمان دوستوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مصیبت زدگان کی بلا تفریق مذہب امداد کریں۔ فضول افواہوں کی طرف توجہ نہ دیں نیز کوشش کریں کہ ہندو عورتیں اور ہندو بچے ہندوئیل کے سپرد کر دیے جائیں۔ مسلمان عورتوں اور بچوں کو مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔ اس طرح باہمی اتحاد کو بڑھائیں

کسی قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا بدترین اخلاقی گناہ ہے مجھے امید ہے کہ کوئی انصاف پسند ایسا گناہ نہیں کر سکتا۔

مجلس احرار اس وقت صرف اور صرف انسانی ہمدردی کے طور پر کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی امداد کر رہی ہے۔ ہمارے کمیپ میں نہ صرف ہندو مسلمان بل کہ مصیبت زدگان کی امداد کر رہے ہیں بلکہ سکھ اور عیسائی بھی اس مصیبت میں ہمارے معاون ہیں۔ ہماری یہ منشا ہے کہ زیادہ سے زیادہ متحد ہو کر کام کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ تمام شہروں میں کام کرنے والی ریفیٹ پارٹیاں پورے تعاون سے کوئٹہ کے مظلومین کی امداد کریں گی۔ ایسا نہ ہو کہ کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی امداد کی بجائے باہمی بد اعتمادی سے لڑائی جھگڑا شروع ہو جائے۔ کوئٹہ والوں کی امداد کرتے کرتے کہیں دوسری مصیبت ملک پر نہ آجائے۔

**کوئٹہ اور مجلس احرار** لاہور ہسپتال کو چھوڑ کر امداد مصیبت زدگان کوئٹہ کے دوسرے تمام مراکز میں مجلس احرار کے کمیپوں کو براہ اعتبار سے فونٹ جمل

ہے۔ اس مجلس نے باشندگان لاہور میں زخمیوں اور پناہ گزینوں کی امداد کا بے پناہ جوش پیدا کر دیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ چار پائیاں البتہ سے اور ہسپتال کے ساز و سامان خیمے اشامہانے ایشیا خورد و نوش اور پہننے کے کپڑے، اغرض ہر چیز با انفرامہیا کی جارہی ہے اور ہر روزان کمیپوں میں بے شمار پناہ گزین مہلکین اور زخمی آئندہ دست ہو کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ اور کارکنان احرار کی مخلصانہ خدمت کا شہر بھر میں چرچا ہو رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مسلمان آئندہ بھی مجلس احرار کی امداد میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں گے۔

ایشیا سے مذکورہ بالا کے علاوہ نقد روپیے کی بھی سخت ضرورت ہے مختصر حفاظت اس طرف بھی توجہ فرمائیں۔ بعض اخباروں میں احرار کے کام کی تعریفیں کی جاتی ہیں مگر ان کے کاموں اور انجمن اسلامیہ اور انجمن اشاعت اسلام پر یہ دواور سب کچھ کیے جا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ جملے محض احمقانہ جذبے کے تحت کیے جا رہے ہیں۔ ان کے کاموں کی تعریفیں کیے جا رہے ہیں۔ ایسے شغل میں صرف ہونا نہایت افسوسناک ہو گا۔ تمام جماعتوں کو مل کر اس کی اصلاح کی جائے۔

مطابق خدمت کی ہے۔ مجلس احرار کے حُسنِ عمل کا اعتراف تمام ملک میں کیا جا رہا ہے اور یقین ہے کہ مجلس کے حامی دوسری جماعتوں کو برا بھلا کہنے وغیرہ بھی احرار کی عظمت و مصیبت زدگان کی امداد جاری رکھیں گے۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور، ۱۲ جون ۱۹۳۵ء)



میوہسپتال کا چارج | لاہور میوہسپتال میں کوئٹہ سے آنے والے مجرد عین کا چارج بھی احرار کے حوالے کر دیا گیا۔ اس ضمن میں چودھری افضل حق ایم۔ ایل۔ اے سے روزانہ صبح و شام میوہسپتال پہنچ کر مجرد عین کو دیکھنے ان کی ضرورت کا خیال کرتے۔ زنانہ احرار لطیف کیمپ کی پنچارج رشیدہ لطیف کو میوہسپتال زنانہ وارڈ سونپ دیا گیا۔

(چودھری افضل حق)

احرار بلٹین | کوئٹہ ریٹیف کیمپ کی طرف سے ہر شام بلٹین شائع ہوتا تھا اور ساتھ ہی تمام دن کا حساب آمد و خرچ بھی درج ہوتا۔ اس طرح ۲۲ جون کے بلٹین میں اعلان کیا گیا کہ "یکم جون سے ۲۰ جون تک دو ہزار دو سو پچاسی روپے کی آمد ہوئی۔ اس کے مقابل اسی تاریخ کو وائسرائے ہند کے ریٹیف فنڈ میں بائیس لاکھ روپے جمع ہو چکا تھا۔"

وائسرائے کا اعتراف | تقریباً ایک ماہ بعد خدمتِ خلق کے جذبے سے قائم کردہ کوئٹہ ریٹیف کیمپ اٹھا دیا گیا۔ مصیبت زدگان تندرست ہو کر گھروں کو جا چکے تھے، پورے انہیں لاہور میوہسپتال تبدیل کر دیا۔ لاوارث بچوں کو پنجاب کے مختلف خیراتی اداروں کے سپرد کر دیا گیا۔ بیوہ عورتوں کو کچھ تو ان کے وارث لے



گئے اور پورہ گئیں انہیں دارالامان بھیج دیا گیا۔ اس طرح مجلس احرار انسانی فرائض سے سرفرو  
 یعنی۔

» ہر کہ خدمت کرو اور مخدوم شدہ کے مصداق مجلس احرار کو ہندوستان بھر میں شہرت ملی۔  
 اپنے اور پرانے اس خلوص کا اعتراف کرنے لگے گھروں سے نکل کر یہ شہرت حکومت کے  
 ایوان تک جا پہنچی وائسرائے ہند لارڈ ونگلڈن نے احرار کی ان خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں  
 وائسرائے ہاؤس نیو دہلی بلا بھیجا۔ اس موقع پر احرار ورننگ کمپنی کی آراء تقسیم ہو گئیں ایک  
 گروہ وائسرائے کے سٹیفنڈیٹ کے حق میں تھا اور دوسرا حکومت کی اس وادہ تحسین کے خلاف  
 موقف دونوں کا درست تھا۔ اول الذکر کی رائے تھی۔

» جب ہم نے کسی سیاسی ضرورت یا غرض سے کوئٹہ کے مسیبت زدگان کی  
 امداد نہیں کی تو پھر ہمیں اس مسئلہ میں حکومت کے تعاون کو پسند کرنا چاہیے  
 اور اتنی سی بات پر حکومت کی ناراضگی لینا درست نہیں۔»

دوسرے گروہ جس میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری شامل تھے، کی رائے تھی  
 » اگر ہم نے کسی سیاسی ضرورت یا غرض سے یہ کام نہیں کیا تو پھر ہمیں  
 حکومت کی خوشنودی کی بجائے اس کا صلہ اللہ تعالیٰ سے لینا چاہیے۔» (دوسری  
 دلیل تھی)

ملک ہمارا اتنا ہی بھی ہمارے ملک کی ہوئی۔ بھائی بھی ہمارے مرے  
 ہم نے جو کچھ کیا ہے، انسانیت کے لیے کیا ہے۔ انگریزوں سے سٹیفنڈیٹ یا  
 انعام کے لیے نہیں۔ لہذا ہمیں وائسرائے ہاؤس نہیں جانا چاہیے۔  
 اس پر کافی دیر بحث رہی۔ آخر اول الذکر گروہ کو شکست ہوئی اور احرار رہنماؤں نے  
 وائسرائے کوٹنے سے انکار کر دیا۔

جیسے ہی احرار کو سٹیفنڈیٹ کمیٹی سے فارغ ہوئے کراچی کے مسئلے کو پھر اٹھا  
 یا گیا۔ حکومت اراوتما اپنے اس ظلم پر پردہ ڈال رہی تھی۔ جس کے باعث  
 سینکڑوں مسلمان شہید اور زخمی ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ایوان لندن میں بھی اس ظلم کی

صدر نے بازگشت سنائی دی، لیکن حکومت کے فیصلے میں کوئی جنبش نہ آئی۔ آخر صدر آل انڈیا مجلس احوار نے ۲۱ جون کو تمام ہندوستان میں پوم کراچی منانے کا پھر سے اعلان کرایا۔ جس کی تائید میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا حسرت موہانی، علی گڑھ یونیورسٹی، مفتی کفایت اللہ صدر جمعیتہ علمائے ہند اور بمبئی خلافت کمیٹی کے رہنماؤں نے پریس بیان دیے، جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ

”کراچی کے واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے۔ مگر حکومت نے ایسی ضد پکڑی ہے کہ وہ اس جائز بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر آگے چل کر حالات بگڑ گئے تو اس کی تمام ترمذ مرداری حکومت ہند پر ہوگی۔“

۲۶ جون کو مجلس احوار کے ناظم مولانا منظر علی اظہر نے مسلمان ہند ووٹروں کی فہرست سے پیل کی کہ

”جدید راستے دہندگان کی فہرست تیار ہو رہی ہے۔ یہ خبر سرکاری طور پر بھی شائع ہو چکی ہے۔ تمام مسلمان بلا سیاسی اختلاف اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے نام درج کرائیں۔“

اگر کوئی کلرک اس سلسلے میں کسی قسم کا تساہل کرے تو اس کی اطلاع فوراً دفتر احوار کو کریں۔ یہ فہرست پندرہ جولائی تک مکمل ہو جائے گی، لہذا اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنی چاہیے۔“

دنیا کبھی طاقت کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے اور کبھی ضرورت  
**جرمن، برطانوی معاہدہ** کے سامنے جھکتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانوی اقتدار کا سورج نئے زاویوں سے ابھرا اور شکست خوردہ طاقتیں فرنگی کے دیرو سپر انداز ہونے پر مجبور ہو گئیں۔ مگر جیسے ہی یہ دوپہر ڈھلی اور شام کے دھندلکے دکھائی دیے تو آسمان کے ستارے بھی ایوان برطانیہ میں چھید کرنے لگے۔ جرمن نے اکھڑے ہوئے قدموں میں ٹھہراؤ آیا۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ قوت کا توازن کبھی ایک ہاتھ نہیں رہا۔ میدان جنگ میں ہار جانے والی تو ہیں جب سنبھالا لیتی ہیں تو پھر سے ہوئے شیر کی طرح اپنے شکار پر چھبٹتی ہیں۔

جرمن نے ۱۹۱۸ء میں مات کھا کر ورسیلز کے مقام پر اتحادیوں کے ہاتھوں ایک اور شکست کھائی کہ جرمن کو ان کے سامنے پارہ پارہ کر کے اتحادیوں نے اپنی بھولی میں ڈال لیا۔ لیکن دل لخت لخت کو جوڑنے کے لیے جرمن قوم نئے عزم سے آراستہ ہو کر میدان کارزار میں آن پہنچی۔ فرانس اور برطانیہ روس سمیت ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ہٹلر نے جرمن چانسلر کی حیثیت میں کبھر سے ہوئے دانوں کو پھر ایک تسلیح میں پرو دیا۔ جوان سمیت جرمن حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اگرچہ اتحادیوں کے پسینے چھوٹتے رہے لیکن بہار کو آنا تھا وہ آکر رہی۔

۱۱۔ جون ۱۹۳۵ء کو رنزے میکڈانلڈ کی جگہ مسٹر بالڈون کو برطانیہ کا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ موصوف اس سے پیشتر وزیر خارجہ کی حیثیت سے جرمن سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے اور خاص کر اس سال ۲۲ مئی کو اپنی تقریر میں مسٹر بالڈون، ہٹلر کی امن پسند پالیسی پر پسندیدگی کا اظہار کر چکا تھا۔ چنانچہ نئی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی جون کے آخری دنوں انہوں نے ہٹلر سے ایک معاہدہ کر لیا۔ جس کی رو سے

۱۲۔ جرمن کا یہ حق مان لیا گیا کہ وہ اپنی بحری قوت برطانیہ کے مقابل پینتیس

فیصد تک بڑھا سکتا ہے۔ نیز اسے ہمسایہ ممالک کے برابر ہوائی فوج رکھنے کا اختیار بھی مل گیا۔

اس طرح سترہ سال کے بعد معاہدہ ورسیلز جس کی وجہ سے جرمن کے دامن پر رسوائی کا داغ لگ چکا تھا، عملی طور پر ختم ہو کے رہ گیا۔ اس معاہدے کو لندن کے اخبارات نے برطانیہ کی سب سے بڑی غلطی قرار دیا اور ہٹلر کی بلند تہمتی پر اسے مبارک باد دی اور کہا کہ برطانیہ کی نرم پالیسی، ہٹلر کے روشن مستقبل کی ضامن بن کر ابھرے گی۔

ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات بھی برطانیہ کے لیے غیر مفید تھے۔ اقوام ہند حکومت کے کسی فیصلے سے مطمئن نہیں تھیں۔ اس موڑ پر حکومت کی یہ بنیادی پالیسی رکہ قوموں کو باہم لٹاؤ اور حکومت کرو، بھی قیل ہو چکی تھی۔ حالانکہ ہندو مسلمان دست و گریبان تھے۔ تاہم انگریزوں کی ان حالات میں بھی اپنے لیے سکون نہیں تھا۔ اسی صورت میں جلسے

کیسے بن پڑا اس کے وقتی طور پر ہٹلے سے معاہدہ کر کے اپنے دامن کا ایک سراگ سے بچایا۔ اور اپنی دانست میں وہ یورپ کی دوسری بڑی جنگ سے محفوظ ہو گیا۔ ہندوستان پر اس معاہدے کا اثر ہوا کہ حکومت ہند اس لیساطہ پر نئی چالیں چلنے لگی۔

مسجد شہید گنج تحریک مسجد شہید گنج اور اس کے اسباب | جب تو میں کسی انقلاب کی زد میں آتی ہیں تو حوادث

آپ سے آپ رونما ہوتے۔ خواہش زمانہ اس انقلاب کی راہنمائی کرنی ہے۔ عوام کے ہاتھ اٹھتے ہیں۔ زبان دل سے ہم آہنگ ہو کر ہاتھوں کی معاون ہوتی ہے۔ بس پھر کیا ہوتا ہے، دلوں کی آگ عمارتوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ امن گوشہ عافیت میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ بغاوت کے انہی مشعلوں میں کبھی سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں اور کبھی تو میں اپنا وقار کھو بیٹھتی ہیں۔

یہی حال سیاسی جماعتوں کا ہے۔ یہ جب عوامی محاسبہ میں آتی ہیں تو اپنے دستور یا منشور کی اوٹ میں بچاؤ کے راستے تلاش کرتی ہیں۔ لیکن عوام کی آنکھوں میں اترتا ہوا خون انہیں کہیں مان نہیں لینے دیتا۔ جذبات غلط ہوں یا صحیح، وقت کا اٹھا ہوا طوفان ساحل مقصد پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ اور جب حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے تو اندھیر گردی اپنا کام کر چکی ہوتی ہے۔ افسانہ حقیقت کو جھٹلا کر اپنے قارئین میں مقبولیت پا چکا ہوتا ہے۔

عزیز مصر کے محل سے شہادت عثمان غنی تک اگر ناکر وہ گناہوں کے خون کو صبح کیا جائے تو کئی نہریں بہ نکلیں اور دجلہ و فرات کو اپنی تنگ دامن کا گلہ ہو۔

دجلہ و فرات کی موجوں نے واقعات کرب و بلا پر اپنی آنکھیں کیوں بند کر لیں۔ حقیقت جان کر بھی دریاؤں کا پانی حسین کے قدموں تک کیوں نہ آن پہنچا؟۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید تاریخ کو اپنی رنگینی کے لیے حسین کی بجائے دشمنان حسین کا خون تلاش کرنا پڑتا۔ لیکن عوام کے جذبات سے کھینے والے جب اپنے شکار کے لیے نکلتے ہیں تو راستے کی ہر شے کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اپنا مفاد ہوتا ہے اور بس جب انسان یہاں پہنچتا ہے تو پھر نہ برائی برائی رہتی ہے۔ نہ نیکی کو مان مٹی ہے۔ انسان کا یہ کردار انسانیت کے چہرے پر ایک بد نما داغ ہے۔

زعمائے اہرار شخصی طور پر اس قدر بلند کردار کے وارث رہے کہ حامد بہار اچھل کود  
کے باوجود ان تک نہ پہنچ سکے۔ فطرت نے ہمیشہ انہیں اپنے حصار میں رکھا۔ بادِ سموم کے  
جھونکے ان کے دامن سے پیٹے کہ وہ چل جائے لیکن بہار آنے پر نغزوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔  
تحریک مسجد شہید گنج کے

پس منظر میں بھی یہی ارادے  
کار فرما تھے کہ ان کے خلوص  
پر چھینٹے اڑانے جائیں۔  
لیکن گرد و غبار چھینٹنے پر جو  
سورج طلوع ہوا تو اس  
کے دامن پر نہ تو کوئی داغ  
تھا اور نہ آنچل پر کوئی  
بادل کا فلک کہ جس سے  
دھوپ چھینٹنے سے نکھا  
نہ آئے۔ مستقبل کا  
مورخ چشم دید گواہ بن کر  
سامنے آیا کہ تاریخ کے  
ورق غبارِ اود نہ ہوں  
مخالف قوتوں نے  
اہرار رہنماؤں کے سامنے  
جو کانٹے بکھیرے وہ



(مولانا ظفر علی خاں)

انہیں خود اپنی پلکوں سے صاف کرنے پڑے۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک کبھی خلافت عثمانیہ کے لیے، کبھی آزادی وطن کے لیے اور کبھی

ریاستی حوام کی بہتینی کے لیے جو جدوجہد اور رہنمائی کے لیے انہیں ہندوستان پر

شہرت حاصل ہوئی اور وہ قافلہ ہائے ہجرت کے رہنما بن کر ابھرے۔ کانگریس کی سیاسی طاقت اور اجتماعیت سے انگریز مخالف تھا۔ لیکن مسلمانوں میں احرار کا بطور سیاسی طاقت کے ابھرنا

فرنگی حکمرانوں کو پسند

نہیں تھا۔ مسلمانوں میں

احرار کی مقبولیت سے

کانگریس بھی سوچ میں

تھی۔ خصوصاً پنجاب

کا ٹوٹی ہوئی مسلمان دنیاوی

انغراض کے صدقے میں

غیر ملکی بساؤ کا کامیاب

مرہ تھا۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء

کے تحت ہونے والے

انتخاب میں احرار کی

کامیابی مشکوک نہیں

تھی لیکن انگریز اس

کے لیے تیار نہیں تھا

کہ پنجاب، احرار الہی

انتہا پسند تنظیم کے



(میاں سرفضل حسین)

قبضہ میں چلا جائے۔ عسکری اعتبار سے پنجاب برطانیہ کیلئے بازوئے شمشیر زن تھا۔ پھر جبکہ

سرفضل حسین خود پنجاب کی وزارتِ خطمی کا امیدوار تھا اور اس کے لیے پیشتر سے اس نے

سرکندر حیات کو پنجاب کی عملی سیاست سے خارج کر دیا تھا۔ ایسے میں وہ احرار کو اپنے راستے

کا سنگ گراں سمجھ رہا تھا۔ اور اس کو ہمالیہ کو گراہتا اس کے لیے از بس ضروری تھا۔ چنانچہ

۱۱۔ جون ۱۹۳۵ء کو شملہ کے احرار رہنما میر احمد حسین کو پولیس کے ایک تھانیدار راجہ صبح صادق

لے۔ میر احمد حسین نیوہلی اور شملہ کے بہت بڑے کاروباری لوگوں میں شمار ہوتے۔ چونکہ سیاسی ذہن رکھتے تھے اس لیے احرار رہنما جب

کبھی شملہ یا دہلی جاتے، انہیں کے ہاں قیام کرتے۔

نے جو ان دنوں شملہ تھانہ میں تعینات تھا، ایک اطلاع کے ذریعہ خبردار کیا۔  
 ”میر صاحب! احرار رہنما اکثر آپ کے ہاں قیام کرتے ہیں انہیں مطلع کر دیں کہ  
 ان پر کوئی بڑی آفت آنے والی ہے۔“

**ایک اخباری خبر** | ۲۰۔ جون کے روزنامہ ”جے ہند“ لاہور نے اپنے ڈھوڑی کے  
 نامہ نگار کے حوالے سے ایک خبر شائع کی۔

”ڈھوڑی کانگریس کے صدر شیخ غلام رشومل نے کانگریس کے جلسہ عام  
 میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے، گزشتہ دنوں ڈھوڑی میں سرفضل حسین کی  
 کوٹھی بکروٹہ ہاؤس میں مولانا ظفر علی خاں مالک روزنامہ زمیندار لاہور اور سرفضل حسین  
 کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ آگے چل کر شیخ صاحب نے کہا، قادیان کے  
 خلیفہ بشیر الدین محمود بھی ان دنوں ڈھوڑی میں قیام پذیر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ  
 اس خفیہ ملاقات اور معاہدہ میں ان کا مشورہ بھی شامل ہو۔ بنا بریں مجھے یقین ہے  
 کہ میاں سرفضل حسین، خلیفہ محمود اور مولانا ظفر علی خاں کا بغیر کسی اطلاع اور پروگرام  
 کے یکاکی ڈھوڑی آنا کسی سیاسی اعراض سے خالی نہیں سمجھنا چاہیے:  
 خطرہ ہے کہ آئندہ چل کر ان خفیہ ملاقاتوں کے نتائج کے سلسلے میں سیاسی  
 اعتبار سے پنجاب میں کوئی نیا طوفان نہ اٹھے۔“

۱۵۔ نومبر ۱۹۳۴ء کے روزنامہ انقلاب، لاہور کا یہ فقرہ تو زیر نظر کتاب کے صفحہ نمبر ۷۲  
 پر قارئین دیکھ چکے ہیں۔

”احرار کی مخالفت کے لیے کوئی نیا میدان آراستہ کیا جائے۔“

مندرجہ بالا سلسلہ واقعات کی کڑیاں کہاں ملتی ہیں، ان کے نتائج کیا نکلتے ہیں یہ  
 مستقبل بتائے گا۔

**حادثہ مسجد شہید گنج** | ۲۸ سے ۳۰ جون تک احرار رہنما لاہور میں پراونشل احرار کانفرنس  
 میں مصروف تھے کہ ۲۸ اور ۲۹۔ جون کی درمیانی رات کو سکھ  
 مزدوروں نے رات کی تاریکی میں مسجد شہید گنج کو گرانما شروع کر دیا۔ اس دوران ایک سکھ مزدور

مسجد کی دیوار سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ اس کی اطلاع صبح لاہور کے مسلمانوں کو ہوئی تو انہوں نے ہنگامہ کر دیا۔ یہ خبر حیب گوردوارہ پر بندھاک کمیٹی کے سکھ لیڈروں کو امرتسر پہنچی تو وہ حیران ہو گئے۔ کیونکہ ان کے کسی پروگرام یا ارادے میں نہیں تھا کہ مسجد گرائی جائے۔

یہ درست ہے کہ مسجد گرانے والے سکھ تھے لیکن وہ صرف مزدور تھے! انہیں محض اپنی مزدوری سے غرض تھی۔ وہ سکھ جماعت کے صحیح ہوتے نہیں تھے۔ سکھ مزدوروں کی اس حرکت سے لاہور کی پرامن فضا اچانک زہراؤد ہو گئی۔ سکھ اور مسلمان آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ احوار رہنماؤں کو لائپور میں مسجد کی شہادت کی اطلاع ملی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اگلے دن خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ رجولائپور پر ونشل احوار کانفرنس کی استقبالیہ کے صدر تھے، کے مکان پر صوبائی رہنماؤں کا اجلاس ہوا۔ یکم جولائی کو مولانا ظفر علی خاں کی دعوت پر میاں عبدالعزیز بیرٹر کے مکان پر چند رہنما جمع ہوئے۔ جن میں مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ ڈاکٹر محمد عالم، چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی انصاری، میاں امیر الدین اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو شامل تھے۔ یہاں فیصلہ کیا گیا کہ سکھوں سے گفتگو کے لیے ایک وفد تشکیل دیا جائے۔ ہنوز اس کے لیے کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی کہ حکومت پنجاب نے لاہور میں دفعہ ۱۲۲ نافذ کر دی۔

یکم جولائی کو مرزا بیوں کے آرگن "الفضل" نے مرزا بشیر الدین محمود کا حسب ذیل پیغام اپنی قوم کے نام نقل کیا۔

”برادران اسلام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں اپنے ایک خطبہ میں اعلان کر چکا ہوں کہ چند اشتہارات موجودہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے عنقریب شائع کیے جائیں گے۔ احباب کو ان کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے۔ پوسٹر عمدہ جگہوں پر لگائیں جائیں اور چھوٹے اشتہار عقل اور سمجھ کے مطابق تقسیم کرنے چاہیں۔ کیونکہ جلد یہ سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ میں پھر اس اعلان کے ذریعے (مرزائی) جماعتوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ نوراً مندرجہ ذیل امور کے متعلق انتظام کریں۔



۱۔ وہ جلد دفتر تحریک جدید میں اطلاع دیں کہ انہیں کس کس قدر پوسٹروں اور اشتہاروں کی ضرورت ہو کر سے گی۔

۲۔ ان کی جماعت یا اگر فرد ہے تو وہ کس قدر رقم کے اشتہار قیمت پر منگوانا چاہتے ہیں۔ اشتہار صرف لاگت پر نہیں گے۔ کوئی نفع محکمہ ان سے نہیں لے گا۔ ہو سکتا ہے خرید زیادہ ہو اور جماعت پورے خرچ کی متحمل نہ ہو سکے تو کچھ حصہ قیمت پر اور کچھ مفت ارسال کیا جائے۔

۳۔ بنکال، سندھ اور صوبہ سرحد کی جماعتوں کو چاہیے کہ بنکالی اسٹریٹی اور مشینوں میں ان اشتہاروں کے تراجم شائع کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں ایک مقبول حد تک دفتر تحریک جدید ان کی امداد کرے گی۔ مگر فیصلہ بذریعہ خط و کتابت ہونا چاہیے۔

۴۔ ہر جماعت یا فرد ان اشتہاروں کے چسپاں کرنے اور تقسیم کرنے کا انتظام فوراً کر چھوڑیں۔

۵۔ ہر جماعت یا فرد کو اس امر کا انتظام رکھنا چاہیے کہ ہر اشتہار ایسے ہاتھ میں جائے جہاں اس کا فائدہ ہو۔ اور اچھی جگہ پر پوسٹر چسپاں ہوں۔ سارے پوسٹر ایک دن لگائے جائیں کیونکہ بعض شریر دشمن انہیں بھاڑ دیتے ہیں۔ بلکہ دو تین دن میں لگیں تاکہ سب لوگ پڑھ سکیں۔

۶۔ اشتہاروں کی اشاعت کے بعد جماعت کے افراد ان کے اثرات کا اندازہ لگاتے رہا کریں اور مرکز کو اس کی اطلاع دیتے رہا کریں تاکہ اشتہاروں میں اس تجربے سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

۷۔ سب اطلاعات میرے نام یا سیکرٹری دفتر تحریک جدید کے نام ہوں۔

والسلام۔

خاکسار منیر محمود احمد

خلیفۃ المسیح ثانی احمدیہ امام جماعت

اسی رات بیرون موچی دروازہ مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ جس کے لیے کسی اجراء کے لیڈر کو دعوت نہیں دی گئی۔ حالانکہ میاں عبدالعزیز کے مکان پر جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس میں چودھری افضل حق اور مولانا منظر علی اظہر کے نام شامل تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس جلسے میں حکومت سے مطالبہ کیا جاتا کہ مسجد گرانے والے سکھ مزدوروں کے متعلق تحقیق کی جائے کہ انہیں اس کارروائی پر کس نے اکسایا ہے لیکن ہوا یہ کہ تمام مقرروں نے سکھوں کو من حیث القوم لکارا۔ اور انہیں طرح طرح سے دھمکیاں دیں۔

اس جلسہ کی کارروائی جب صبح ”زمیندار“ میں شائع ہوئی تو مزدوروں کی حرکت کو سکھ قوم کی حرکت قرار دیا گیا۔ آگے چل کر یہی معاملہ سکھ قوم کے لیے چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ۷۔ اور ۸ جولائی کو اس پر غور کرنے کیلئے سکھوں کی نمائندہ جماعت گوردوارہ پر بندھک کمیٹی نے اپنا اجلاس بلوایا۔ لیکن اس رات ریلوے کرین کے ذریعے مسجد کے مزید حصے گرا دیے گئے۔

یہ تمام کارروائی اس قدر عاجلانہ طور پر ہوئی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکا کہ ۲۹۔ جون سے ۸۔ جولائی کے عرصے میں یہ سارا کچھ کیوں اور کس طرح ہوا یا اس سارے کھیل کا اصل محرک کون ہے؟

اس وقت تک جو لوگ تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے ان میں مولانا ظفر علی خاں، ملک لال خاں (گوجرانوالہ)، اور ڈاکٹر محمد عالم پیش پیش تھے۔ آخر الذکر آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر رہ چکا ہے اور ابھی تک اس کا ذہن وہی تھا۔ ملک لال خاں خلافت تحریک کے بعد کبھی سننے میں نہیں آئے۔ رہے مولانا ظفر علی خاں نومبر ۱۹۲۵ء میں مسجد گرانے سے زیادہ سکھوں کے حق میں تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سر فضل حسین نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے پہلا گوردوارہ ایکٹ پنجاب کونسل میں پیش کیا تھا۔ یہ ایکٹ حکومت اور مسلمان ممبروں کے تعاون سے منظور ہوا تھا ان دنوں گوردواروں، مندروں اور مساجد کے انچارج سر فضل حسین تھے۔ روزنامہ ”بیاست“ کے مالک و مدیر سید حبیب نے یہ موقف لیا

تھا کہ گوردوارہ ایکٹ کے سلسلہ میں دوٹا دینے سے پہلے مسلمانوں کو سکھوں سے مسجد شہید گنج کی بازیابی کی بات کرنی چاہیے۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں نے ۳۰ جون ۱۹۲۵ء کے روزنامہ

”زمیندار“ میں لکھا:

لنڈا بازار کی مسجد: لنڈا بازار لاہور کی وہ مسجد جو شہید گنج کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ چند روز سے بعض مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اور معاشرہ سیاست میں یہ تحریک جاری کر رکھی ہے کہ گوردوارہ بل منظور ہو جانے سے پیشتر مسلمان اس مسجد کو سکھوں سے حاصل کر لیں۔

ہم کسی گذشتہ اشاعت میں اس مسجد کے متعلق اپنی حکمت عملی کا اعلان کر چکے ہیں اور ہمارا اب بھی یہی خیال ہے کہ سکھوں سے گوردوارہ بل کی حمایت کا معاوضہ وصول کرنا، مسلمانوں کی حق پرستی ادا کرنے کے شرف و وقار کے خلاف ہے۔ مسلمان گوردواروں کے معاملے میں سکھوں کی حمایت محض اس لیے کرتے ہیں کہ سکھ اپنے معاہدے کے آزاد کرانے کی کوشش میں بالکل حق بجانب ہیں۔

لنڈا بازار کی مسجد فوراً مل سکے یا نہ مل سکے، مسلمان حمایت حق سے باز نہیں رہ سکتے۔ اور ہم پنجاب کونسل کے مسلمان اراکین کی خدمت میں نہایت ادب سے گزارش کرتے ہیں کہ بل کے متعلق رائے دیتے وقت صرف اس قانون کی دفعات کو مدنظر رکھیں اور کسی مفروضہ وجہ اختلاف کو حمایت حق کے راستے میں حائل نہ ہونے دیں۔“

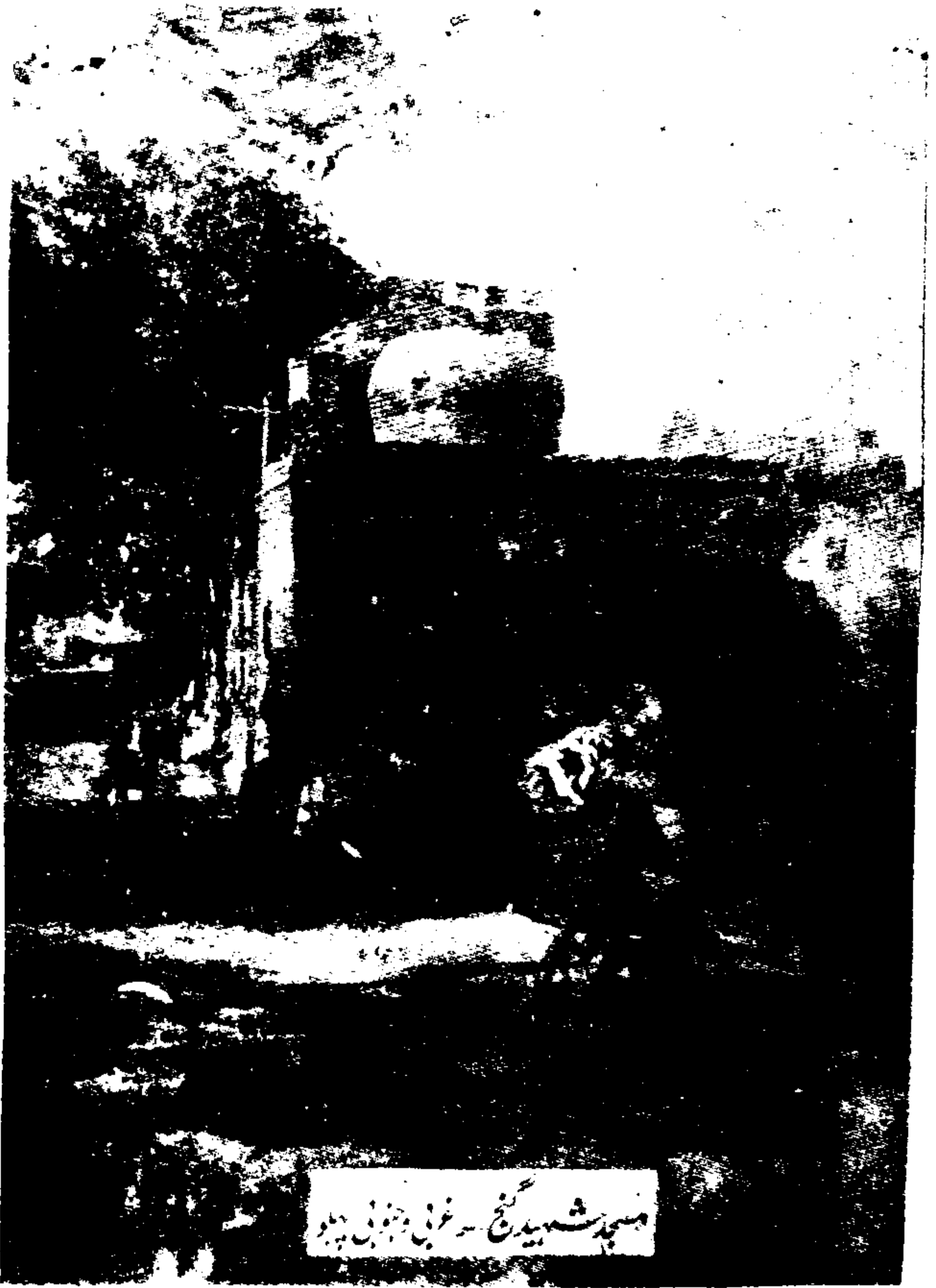
اس سے پیشتر ۱۹۲۲ء میں ملک لال خاں اسی مسجد شہید گنج کے متعلق گوردوارہ شرومنی کمیٹی سے ایک سمجھوتہ کر چکے تھے۔ اس کے متعلق مولانا ظفر علی خاں اخبار ”زمیندار“ کی اشاعت یکم جولائی ۱۹۲۲ء میں لکھتے ہیں۔

شرومنی گوردوارہ کمیٹی کا انصاف: شہید گنج لاہور میں زمانہ قدیم کی ایک مسجد واقع ہے جو مدتوں سے سکھ بھائیوں کے قبضہ میں ہے۔ اور اس

مسجد کے نواح میں پنجاب کے انہری مسلمان تاجدار کی قبر بھی ہے۔ اس جگہ کو سکھوں کے قبضے سے واپس لینے کے لیے مسلمانان لاہور نے ہر ممکن جدوجہد کی۔ کوشش بلین، روپے پیسے کا خرچ سب کچھ عمل میں آیا۔ عدالت کے دروازے کھٹکھٹائے گئے۔ حکام اور حکومت کے آستانوں پر نظریں جمای کر بیٹھے لیکن اس دور میں جبکہ ہندوستانی بھائی ایک دوسرے کے دشمن اور لوگوں کے پیاسے رہا کرتے تھے یہ کہاں ممکن تھا مسجد مسلمانوں کے قبضے میں آجاتی۔

آخر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ دور فتن ختم ہو گیا۔ محبت اور آسستی اتفاق و اتحاد کا دور شروع ہوا۔ اس دور کے شروع ہوتے ہی مسجد کا معاملہ دشمنان اتحاد کے سامنے مسلمانوں اور سکھوں کو سزا دینے اور ایک دوسرے سے جدا کرنے کا اچھا خاصہ بہانہ بن گیا۔ چند شریرانہ نفس ہستیوں نے جن کی آنکھوں میں باہمی اتحاد خارجی طرح کھٹکتا ہے، ساز باز اور باہمی مشوروں سے اشتہارات کے ذریعے سے مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی۔ اور عوام الناس کی مہبودی اور خدمت اسلام کے پروے میں پھوٹ ڈالنے کی طرح ڈالنی شروع کی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کے ہمت شکنڈے برے کار نہ آئے۔ آخر اتحاد و اتفاق کی برکت سے اس پرہیزگار مسئلے کا حل نکل آیا۔ جناب ملک لال خاں صاحب بوندتوں سے اس مسجد کو سکھ بھائیوں سے لینے کے لیے شرومنی گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے معزز ارکان سے گفت و شنید کر رہے تھے اور سکھ بھائیوں پر حکومت کی چشم التفات خصوصی کی وجہ سے اب تک نام نہاں رہے تھے امر تشریف لے گئے۔ شرومنی گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے مقتدر ارکان نے جناب ملک لال خاں صاحب اور محبت سے خیر مقدم کیا وہ ان کے دلی جذبات کی آئینہ داری کرتا تھا اور ان کے پوشیدہ خلوص کے احساس کو روشنی میں لاتا تھا۔ ہم شرومنی گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے ارکان کا شکریہ ادا

کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے واجب الاحترام ملک صاحب کی عزت افزائی



مسیحی شہید گنج - غزنی، جنوبی پنجاب

فرما کر ان کی مدتوں کی مساعی جمیلہ پر نظر کریم فرما کر مسلمانوں کو اظہارِ تشکر کا موقعہ دیا۔

کیا یہ اتفاق و اتحاد کی برکت نہیں کہ وہ مسجد جس کا قبضہ مدتوں سے باہمی  
 رنجش اور کدورت کا سرچشمہ بنا ہوا تھا اور جس کا ذکر دشمنان اتحاد کے لیے



مسجد شہید گنج - شروینی

سود مند ہو سکتا ہے آج باہمی مفاہمت و مصالحت شروینی گوردوارہ پر بندھ چکی ہے

کے فیصلے کے مطابق مسلمانوں کے قبضے میں آگئی ہے۔  
 ان مندرجہ بالا تاریخی اقتباس کے بعد ۱۹۳۵ء میں مولانا ظفر علی خاں کو مسجد شہید گنج  
 کے لیے کیا خیال آیا کہ وہ اس کے حصول میں تڑپنے لگے۔ ملک لال خاں سے بھی یہ  
 سوال کیا جاسکتا ہے کہ

» ۱۹۳۳ء میں آپ نے شروینی گوردوارہ پر بندھک کمیٹی سے جو سمجھوتہ

کیا تھا اس کے کاغذات کہاں ہیں؟

مگروں حضرات سے سوال کرنے کی بجائے ہر جلسے میں احرار سے تقاضہ کیا جاتا  
 رہا کہ مسجد کے لیے آگے بڑھ کر حکومت سے ٹکرائیں اور سول نافرمانی کریں۔ دیکھتے دیکھتے  
 مولانا ظفر علی خاں نے انجمن اتحاد ملت بنا ڈالی۔ اور احرار سرخپوش کے مقابل نیلی پوش  
 تحریک کا پرچار ہونے لگا۔

جو یعنی ہے تمہیں مسجد تو نیلی پوش ہو جاؤ!

(ظفر علی خاں)  
 کوچہ و بازار میں یہی گیت سنائی دینے لگا۔ جیسے جیسے مسجد کا قضیہ آگے بڑھتا گیا۔ فضا  
 احرار کے خلاف ہوتی چلی گئی۔ اس دوران مرزائیوں کی تحریک جدید کا دفتر قادیان کی بجائے  
 لاہور دفتر زمیندار کے قریب آگیا اور ان کی طرف سے قدام پوسٹر احرار کے خلاف شائع  
 ہونے لگے۔

ادبائش قسم کے لڑکے ٹولیاں بنا کر دفتر کے سامنے آتے اور زعمائے احرار کے خلاف  
 نعرے لگاتے۔ اب ایک طرف لوگوں کو ابھار کر لٹا بازار کی مسجد کی طرف بھیجا جا رہا تھا  
 کہ وہ پولیس کی لالٹھیاں اور فوج کی گولیاں کھائیں، تو دوسرا گروہ احرار کے خلاف شہر بھر  
 میں مظاہرہ کر رہا ہوتا کہ احرار والوں سے کہو کہ وہ مسجد کے لیے سول نافرمانی کریں۔

۱۔ روزنامہ انقلاب کا پریس نوٹ۔

۲۔ راہِ صبح صادق کی اطلاع۔

۳۔ مولانا ظفر علی خاں کا خاموشی سے ڈھونڈ پھینچنا۔

۴۔ مرزائی خلیفہ کا بیان۔

ان تمام کڑیوں کے جوڑنے سے ایک ایسی زنجیر بنائی جاسکتی ہے جس میں اجوار کو اطرافِ عالم میں جکڑنا صاف اور واضح طور پر سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ سارا ڈرامہ حکومت کی ایجنٹ پر ہو رہا تھا اور اس کے ہدایت کار فریضہ حسین تھے۔

برطانوی آئین کے مطابق وہ عمارت (خواہ مسجد ہو، مندر ہو، گوردوارہ ہو) **احرار کا موقوف** یا رہائشی مکان یا سادہ پلاٹ، جو بارہ سال سے زائد عرصہ اگر کسی کے

مخالفانہ قبضے میں رہے اور اس دوران کوئی کرایہ نامہ، بیعہ نامہ یا رجسٹرڈ نامہ نہ ہو اس پر مخالفت کا قبضہ بطور مالک سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اسلامی فقہ اس زمین کو بھی مسجد قرار دیتی ہے جس پر ایک دفعہ مسجد تعمیر ہو چکی ہو۔ خواہ یہ مسجد بعد میں کسی حادثے کا شکار ہو جائے، مگر غیر شرعی حکومت تو اس متابطے کی پابند نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ شہید گنج مسجد بنے لیکن اس وقت کے غیر ملکی قانون نے اسے محض ایک عمارت قرار دیا اور اس اعتبار سے جب کبھی مسلمانوں نے اس تاریخی مسجد کے حصول کے لیے قانون کو پکارا تو عدالتوں نے اپنا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف کیا۔

اس مسجد کا اصل نام عبداللہ خاں کی مسجد تھا۔ ۱۰۶۲ھ میں شاہجہان کے ولیعهد داراشکوہ کے خاندان رکھنا بنا نہ والا نہیں بلکہ سامان کی حفاظت کرنے والا محمد عبداللہ نے تعمیر کیا تھا۔ مغلیہ دور حکومت میں باغی سکھوں کو اس جگہ قتل کیا گیا تھا۔ جب ہمارا جہ رنجیت پنجا ب پر قابض ہوا تو اس نے سکھوں کی سمدھیاں جو یہاں قتل ہوئے تھے یہاں بنوا دیں۔ اس طرح سکھوں کی زبان میں یہ گوردوارہ شہید گنج قرار دیا گیا۔ ان تاریخی حقائق کے پیش نظر اجوار نے کسی غیر قانونی ہوکات کو نامناسب سمجھا اور نہ ہی مسلمانوں کو اس کی دعوت دی۔ ان کے نزدیک مسجد کا حصول صرف باہمی اتمامِ تقسیم سے ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ مگر مولانا ظفر علی خاں اور ان کے اخبار زمیندار میں روزانہ ایسا مواد شائع ہوتا جو مسجد کی بازیابی کے لیے کم اور اجوار کو سول نافرمانی پر اکسانے کیلئے زیادہ ہوتا تھا۔ جیل خانہ اجوار کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس سے خائف تھے۔

۱۔ مصنف کی دوسری کتاب حیات امیر شریعت میں مسجد شہید گنج کی پوری تاریخ شائع ہو چکی ہے۔



سوال اصول کا تھا کہ انگریز اپنے قانون کے مطابق اس مسجد کو مسلمانوں کی سست روی کے باعث غیر مسلموں کی ملکیت قرار دے چکا تھا۔ ایسے میں بات جھگڑے سے طے نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ دونوں قوموں کے رہنما مل کر ہی اس قضیے کو چکا سکتے تھے۔

چنانچہ ۴ جولائی کو گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے نمائندوں سے گفتگو کا دن طے ہوا۔ اس میں مولانا محمد داؤد غزنوی کو احرار کی طرف سے شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس سے پیشتر باہم رہنماؤں نے اپنی بنی مجلس میں جو گفتگو کی، مولانا داؤد غزنوی اپنی ڈائری میں اسے نقل کرتے ہیں۔

(مولانا داؤد غزنوی، مولانا ظفر علیخاں سے)

”آپ آئینی طور پر اس مسجد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے یا اگر ضرورت پڑی تو اس کے لیے سول نافرمانی بھی کریں گے؟“

ظفر علیخاں: ”ہم آئینی طور پر اس مسجد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔“

داؤد غزنوی: آپ نے اس مسجد کے تمام قانونی پہلوؤں پر غور کر لیا ہے۔ اس سے پیشتر اس مسجد کے حصول کے لیے مسلمانوں کی طرف سے جس قدر مقدمات دائر کیے گئے ان کے فیصلوں کو دیکھ لیا ہے؟“

ظفر علیخاں: ”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن پورے حالات معلوم کرنے کیلئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی ہے جو اس کے متعلق تمام دستاویز اور تاجی مواد اکٹھا کرے گی۔“

داؤد غزنوی: ”جس صورت میں کئی عدالتوں کے فیصلے اس مسجد کے سلسلے میں مسلمانوں کے خلاف ہو چکے ہیں اور پورے دو سو سال سے سکھوں کا اس مسجد پر قبضہ ہے۔ آئینی ایجنٹیشن سے آپ اس کو کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟“

ظفر علیخاں: اسمبل پنجاہ کونسل کے ذریعے تمام ہندوستان میں جلسوں کے ذریعے سو گورنمنٹ کو مجبور کر دیں گے کہ سکھوں سے اسے

مسلمانوں کے حوالے کر دے یا کم از کم آثارِ قدیمہ کے سپرد کر دے۔“  
 داؤد غزنوی: اس صورت میں کہ انگریزی عدالتیں کسی فریق کے حق میں فیصلہ دے دیں تو ان عدالتوں کے فیصلوں کا احترام رکھنا گورنمنٹ کا فرض ہو جاتا ہے۔  
 یہ ناممکن ہے کہ حکومت آپ کے جلسوں سے متاثر ہو کر اپنی تمام عدالتوں کے فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بلکہ ان کے صریح خلاف سکھوں سے متنازعہ فیہ مسجد چھین کر مسلمانوں کے حوالے کر دے۔“

ظفر علیاں: مجھے ایک بہت بڑے مسلمان افسر نے کہا ہے کہ آپ ایچی ٹیشن جاری رکھیں۔ حکومت یہ مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دے گی۔“

داؤد غزنوی: مولانا! میں تو ایک منٹ کے لیے بھی اس مسلمان افسر کی بات پر یقین نہیں کر سکتا کیونکہ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ عدالتوں کے فیصلوں کے برخلاف حکومت کوئی اقدام کر سکے اور نہ حکومت یہ جرأت کر سکتی ہے کہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے سکھوں سے جنگ خریدے۔

مجھے تو اس افسرِ عالی کی گفتگو آپ سے سن کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ حکومت مسلمانوں اور سکھوں کو لڑانا چاہتی ہے۔ بہر طور آپ کو بہت ہی خرم و احتیاط سے کام کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ نادانستہ طور پر حکومت کے اس مذہبِ ارادے کی تکمیل کے لیے آلہ کار بن جائیں۔“

ظفر علیاں: ”میں حالات و قرائن سے یہی اعتراف لگاتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے اس تحریک کو جاری رکھا تو مسجد مسلمانوں کو ضرور مل جائے گی۔“

”ایک خوفناک سازش یعنی تحریک شہید گنج کے مختلف دورِ صفت“

سکھ لیڈروں سے ملاقات | اس نجی گفتگو کے بعد وفد کے ارکان دو بجے کے قریب ہمارے رنجیت سنگھ کی سادھی کے متصل گوردوارہ میں سکھ لیڈروں سے ملنے گئے۔ اسٹارٹار سنگھ سردار منگل سنگھ اور گیانی گورکھ سنگھ مسافر ایسکریٹری گوردوارہ پر بند کھٹی سکھوں کی طرف سے گفتگو کے لیے یہاں موجود تھے۔ مسلم وفد کی قیادت مولانا ظفر علیاں

کر رہے تھے۔

سکھ صاحبان سے مسجد شہید گنج کی حوالگی کے مطالبے کو ظفر علیجاں نے نہایت مناسب الفاظ میں پیش کیا، جس کے جواب میں تارا سنگھ نے کہا:

”یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ یہ مسجد ہے یا کیا؛ لیکن اس حالت میں جبکہ مسلمانوں کے لٹھ بند جھنڈے لاہور کے بازاروں میں پھر رہے ہیں اور سکھ قوم کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ مسجد کی حوالگی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان حالات میں مسجد کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کرنا سکھ قوم کی توہین ہے۔“

ظفر علیجاں: ”آپ شائد ہندو اخبارات کے غلط بیانات سے متاثر ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے سکھ قوم کو کوئی دھمکی نہیں دی گئی۔ بلکہ ہم تو برادرانہ طور پر آپ سے درخواست کرنے آئے ہیں۔“

اس کے جواب میں تارا سنگھ نے روزنامہ زمیندار، سیاست اور انقلاب کے قائل پیش کیے۔ ظفر علیجاں نے مسر اخبارات دیکھ کر کہا:

”اگر مسلمان سکھ قوم سے اس کی معافی مانگیں اور میں اپنی ٹوپی آپ کے قدموں میں رکھ دوں تو کیا پھر آپ ان تحریروں کو نظر انداز کر کے مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے؟“

تارا سنگھ: ”مولانا صاحب! میں آپ کو اس گفتگو میں مخلص نہیں سمجھتا۔ کیونکہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں جن مندروں پر قبضہ کر کے ان پر مساجد تعمیر کر لی ہیں اور مندروں کے نشانات بھی موجود ہیں۔ کیا آپ لوگ وہ مندر مندروں کو واپس کرنے کو تیار ہیں؟“

ظفر علیجاں: اس وقت ہم کسی ہندو مسلم تنازعہ کے لیے نہیں آئے۔ ہم اس وقت سکھ نمائندوں سے بات چیت کر رہے ہیں۔ کیا ہم نے سکھوں کے کسی گوردوارے پر قبضہ کیا ہے؟“

تارا سنگھ: ”ہر قوم نے اپنے عہد حکومت میں اس قسم کی تحریکات کی ہیں۔“

یہی بقول آپ کے مسجد شہید گنج کی بات تو ہماری تاریخ شاہد ہے کہ اس جگہ پر  
سکھ قوم کے بہت سے بہادر شہید کیے گئے تھے اس لیے سکھ قوم کا ایک فرد  
بھی ایسا نہیں ملے گا جو شہید گنج واپس کرنے کا خیال بھی دل میں لاسکے۔

مصالحت کی تجویز | مارٹا رانگھ کی گفتگو سے اس مشترک اجلاس میں قدر تلخی پیدا ہوئی۔  
ارکان وفد نے فیصلہ کیا کہ مصالحت کی کوئی راہ نظر نہیں آتی لہذا واپس

چلنا چاہیے۔ اتنے میں مولانا داؤد غزنوی نے سکھ لیڈروں کے سامنے ایک تجویز پیش کی۔

۱۔ اگر آپ انہدام مسجد کے ارادے سے باز آجائیں اور منہدم شدہ حصے  
کی مرمت کرا دیں اور آئندہ مسجد کی حورمت کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں۔ نیز  
مزار حضرت کاوشاہ کے لیے پانچ فسطا کا راستہ مسلمانوں کو دے دیں تو زخمی  
دلوں کو قدر سکون ہو جائے گا۔

اس تجویز پر اجلاس میں فریقین کے چہروں سے گذشتہ تلخی ہلکی ہو گئی اور تارا شکھ نے  
مسکراتے ہوئے انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”ہاں! اس تجویز پر ہم غور کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ اس فیصلے پر اس قضیے  
کو ختم کر دیا جائے اور آئندہ کوئی سوال اس کے قضیے وغیرہ کا نہ اٹھایا  
جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسری انجمن اٹھ کھڑی ہو اور از سر نو اس قضیے کو  
شروع کر دے۔“

سید حبیب (روزنامہ ”سیاست“ لاہور) | یہ وفد مسلمانوں کا نمائندہ وفد ہے۔ اگر اس  
فیصلے کے بعد کسی نے مخالفت کی تو یہ ہماری

مخالفت ہوگی۔“

اس کے بعد تارا شکھ نے مولانا داؤد غزنوی کی تجویز کے متعلق اپنی جماعت کی طرف سے  
آماجی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

۱۔ آپ حضرات کے نزدیک (متنازعہ فیہ مقام) مسجد ہونے کی حیثیت سے  
متبرک مقام ہے اور ہمارے نزدیک یہ شہید گنج ہونے کے لحاظ سے تبرک

جگہ ہے۔ اس لیے دونوں قوموں کے احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس جگہ کے آداب اور احترام کے خلاف ہم کوئی کام کرنا نہیں چاہتے۔

آپ حضرات کو معلوم ہے کہ جب یہ مسجد مننتوں کے قبضے میں تھی تو اس کی بھیت پر ٹٹی بنی ہوئی تھی لیکن جب سے یہ جگہ گوردوارہ پر بندھک کیٹی کے قبضے میں آئی ہے، ہم نے ٹٹی اٹھوادھی صرف اس خیال سے کہ اس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔

مسجد کے گرانے کا سوال عرصہ سے ہمارے پیش نظر تھا، لیکن ہم اس تذبذب میں تھے کہ یہ کام مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث تو نہ ہوگا۔ روزنامہ "زمیندار" نے آج سے دس سال پہلے یہ لکھا تھا کہ موجودہ حالت سے بدھما یہی بہتر ہے کہ اس مسجد کو گرا دیا جائے تاکہ ہر روز مسلمانوں کے دلوں پر چرکے نہ لگیں۔ اس کے پیش نظر بالآخر یہی فیصلہ کیا گیا تھا کہ مسجد گرا دی جائے۔ یہیں قطعاً امید نہ تھی کہ ایسی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔"

(ایک خوفناک سازش - ص ۶۶-۶۷)

**بات بنتے بنتے رہ گئی** | جیسے کہ سکھ ایڈیٹری تجویز ان رہے تھے اور مسلم وفد کے ارکان میں سے میاں امیر الدین میونسپل کمشنر لاہور میری تائید پر تھے ہو سکتا تھا کہ یہ بات سرب سے پڑھ جاتی لیکن وہیں بیٹھے بیٹھے ظفر علی خاں اور سید حبیب کے درمیان حلقہ شروع ہو گئی۔ "زمیندار" نے یقیناً ایسا لکھا ہوگا جیسے کہ سکھ کہہ رہے ہیں۔ مگر روزنامہ سیاست نے انہیں سبھیوں کو مسجد گرانے کی کبھی رائے نہیں دی۔ قریب تھا کہ آپس کا یہ جھگڑا طویل پکڑتا، مولانا داؤد غزنوی نے درمیان سے بات کاٹنے کی کوشش کی۔

گزشتہ نعتوں کو آپ حضرات بھول جائیں اور میں نے جو تجویز مسالحت پیش کی ہے اس پر غور کریں تاکہ ہم کسی نتیجے پر پہنچیں۔"

ابھی یہ بات چل رہی تھی کہ مولانا ظفر علی خاں نے نہایت غیر عالمانہ انداز میں یہ

ماسٹر تارا سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

» اچھا ماسٹر جی! جیسے کہ مولانا داؤد خزنوی کی تجویز ہے، اگر مسجد کا مندرم شدہ حصہ کی آپ مرمت کرادیں اور مزار کے لیے پانچ فٹ کا راستہ دے دیں۔ مگر باقی امور کے لیے میں اپنا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ اس مصالحت کے بعد میں یہ حق عدالت کے ذریعے وصول کروں گا، جس سے مسجد واگذار ہو سکے۔  
تارا سنگھ: » مولانا صاحب! اگر یہ بات ہے تو پھر سارا کچھ آپ عدالت سے حاصل کریں۔  
قریب تھا کہ مسلم ارکان اٹھ کر چلے آئے کہ مولانا ظفر علیخاں سے علیحدگی میں بات کرنے کے لیے سکھ صاحبان سے گزارش کی کہ وہ ہیں ذرا علیحدگی میں بات کرنے کا موقع دیں پچنانچہ وہ سب اٹھ کر گوردوارہ کے اندر چلے گئے تو مسلم ارکان نے مولانا ظفر علیخاں کی خدمت میں گزارش کی:

» خدا کے لیے آپ مولانا داؤد کی تجویز کو مان لیں اور ضد نہ کریں۔ ہم پھر آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ایچی ٹمیشن سے مسجد نہیں ملے گی بلکہ مسلمان من حیث القوم ذلیل ہو جائیں گے۔

اس موقع پر میاں امیر الدین نے پھر میری تجویز کی تائید کی لیکن مولانا ظفر علیخاں نے کہا: » مسجد کی واگذاری کے بغیر اور کوئی مطالبہ نہیں ہے اور نہ ہم اس کے بغیر کسی دوسری چیز پر مصالحت کر سکتے ہیں۔

میرے ذہن میں مولانا ظفر علیخاں کی پھر وہی بات آئی کہ » مجھے ایک ذمہ دار افسر نے کہہ دیا ہے کہ آپ ایچی ٹمیشن جاری رکھیں مسجد آپ کو مل جائے گی۔ اس موقع پر مولانا سید حبیب فوراً بول اٹھے:

» میں نے یہ سنا ہے کہ کسی ذمہ دار شخصیت نے سکھوں سے کہا ہے کہ تم

دیکھ، حق بجانب ہو۔ قانون تمہاری حمایت پر ہے اور عدالت کے فیصلے

تمہاری پشت پناہی کر رہے ہیں۔ تم اگر مسجد گرانہ چاہو تو تم کو حق ہے اور

مسلمانوں کی شورش کی وجہ سے اگر سکھ خطرہ محسوس کریں۔ تو بالکل بیٹے فکر رہو

حکومت پولیس اور فوج کے ذریعے تمہاری حفاظت کرے گی۔  
اس راز کے فاش ہونے پر مولانا ظفر علیخاں سے پھر گزارش کی گئی۔

اب تو بات آپ سمجھ گئے ہونگے کہ یہ کوئی دشمن ہے جو ایک طرف آپ کو کہہ رہا ہے کہ تم ایچی ٹیشن جاری رکھو مسجد تمہیں مل جائے گی اور دوسری طرف سکھوں کو اکسایا جا رہا ہے کہ عدالت کے فیصلے تمہاری پشت پر ہیں تم مسجد کو گرا سکتے ہو۔

ظفر علیخاں کے آخری نعروں پر ہم سب مایوس ہوئے اور سکھ صاحبان کو بلا لیا گیا اور ان کے سامنے مسجد کی واپسی کی تجویز کا پھر سے اعادہ کیا گیا۔ اس کے جواب میں سکھ رہنماؤں نے کہا:

”آپ حضرات جو کچھ چاہتے ہیں، لکھ کر گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کو بھیج دیں۔ ہم اس وقت از خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کمیٹی جو فیصلہ کرے گی آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔“

اس جواب کے بعد مسلم ارکان واپس آگئے۔

(روزنامہ مجاہد لاہور۔ ۵ جولائی ۱۹۲۵ء)

سکھوں اور مسلمان رہنماؤں کی مندرجہ بالا ناکام گفتگو کے بعد حالات میں مزید سماجی پیدا ہو گئی۔ مسلمان نوجوان جتھوں کی صورت میں مسجد کی طرف بڑھنے لگے۔ پولیس کی لاطھیاں اور فوج کی گولیاں ان کا استقبال کرتیں۔ پنجاب کے دیگر اضلاع سے مسلمانوں کے قافلے لاہور پہنچنے لگے اور سکھ جتھوں کی آمد بھی شروع ہو گئی۔ اس سے پنجاب کی فرقہ وارانہ فضا مگر ہونا شروع ہوئی۔ اس دوران حکومت نے ریلوے کرین کی مدد سے راتوں رات مسجد کا افدنی حصہ بھی مسمار کر دیا۔ اس پر یہ آگ اور بھڑکی۔ نیز حکومت پنجاب نے ظفر علیخاں، سید حبیب الملک لال خاں اور اس طرح کے دوسرے لیڈروں کو پنجاب کے مختلف مقام پر نظر بند کر کے ان کے الاؤنس مقرر کر دیے۔

۱۰۔ جولائی کے روزنامہ ”انقلاب“ میں ایک خبر شائع ہوئی۔

» سرفریوز خاں لون کے مکان پر لاہور کے معزز علمائے کرام اور دوسرے لوگوں کا اجتماع ہوا۔ جس میں علمائے دین نے یہ فتویٰ دیا کہ مسجد کا گرایا جانا ناجائز ہے۔ یہیں کوشش کر کے اپنے حقوق حاصل کرنے چاہیں۔ بغیر کسی الجھے ہوئے۔

لیکن اس خبر کے نیچے کسی کا نام درج نہیں تھا۔

اسی طرح «۔ جولائی کے روزنامہ» انقلاب» میں نامہ نگار کے حوالہ سے ایک خبر شائع

ہوئی۔

» قانون کا بہر حال احترام کرتے ہوئے مسجد کے حصول میں مجلس احرار کو

اپنی روایتی شان کے مطابق میدانِ عمل میں آجانا چاہیے۔

اس خبر میں حکومت کو مسجد کے حادثے سے لا تعلق قرار دیا گیا تھا۔

تجویز ہو کہ تحریکِ محرک کے ذہن سے نکل کر اگر عوام کی زبان پر آجاتے، تو رسوائی کے

راستے کھل جاتے ہیں۔ کبھی کبھار کامیابی بھی ہوتی ہے، لیکن اس کی عمر دیر پانہیں ہوتی جاعتوں

کے رہنما ہوں کہ جنگ کے نقشے لکیر تے والے جو نیل کسی کو اپنا ہمزاز نہیں بناتے یہاں

تک کہ فتح و شکست واضح ہو جاتے۔ اس پر بھی یہ راز صرف تاریخ تک رہتا ہے۔

مسجد شہید گنج کی تحریک کو جس ذہن نے جنم دیا اس سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس

نے ظفر علی خاں ایسے جذباتی اور تلون مزاج آدمی کو اپنے راز میں شامل کر لیا۔ جذباتی دل

اور دماغ کا آدمی راز اگلنے میں دیر نہیں کرتا۔

مولانا ظفر علی خاں نے ڈلہوزی سے اترتے ہی اس راز کو »زمیندار» کے صفحات

پر اگل دیا، جس کے تحفظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہر ہندوستانی کا دماغ پھٹنے لگا۔ اب

یہ حقیقت واشگاف ہو کر سامنے آگئی کہ ڈلہوزی پلان کے پس منظر میں حصول مسجد سے کہیں زیادہ

احرار کی شہرت کو نقصان پہنچا کر آئندہ الیکشن میں یونینسٹ پارٹی کو کامیاب کرنا مقصود تھا

اگر حصول مسجد میں خلوص کار فرما ہوتا تو یہ ہم باہم مشورہ سے سر ہو سکتی تھی۔ جیسے کہ اکثر موڑ

بھی کہ بات بن جاتی لیکن تحریک کے رہنماؤں نے حالات کے راستے میں ارڈنا ایسے کانٹے



بکھیرے کہ نہ صرف مجلس احرار ایسی فعال جماعت اس سے متاثر ہوئی بلکہ مسلمان قوم کا وقار بھی مجروح ہوا۔

احرار اپنی دیانت کے آئینے میں تمام کارروائی کرتے رہے لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا سیاسی حریف نئے ارادوں سے حملہ آور ہوا ہے تو وہ سچائی اور انصاف کے اصولوں پر اپنا دفاع کرتے رہے۔

جن حالات میں مسجد گرائی گئی اس کی براہ راست ذمہ داری پر بھی پڑتی تھی۔ چنانچہ ۱۰ جولائی کو حکومت پنجاب نے حسب ذیل بیان کے ذریعے صورت حال واضح کر دی۔

ہاگڈ شترہ کئی دنوں سے سکھوں اور مسلمانوں سے حکومت نے بات چیت کی کہ کسی طرح کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔

واقعات اس طرح ہیں کہ متذکرہ بلاعات تقریباً ایک سو تتر سال سے سکھوں کے قبضے میں چلی آرہی ہے اور مقدمہ بازی کے بعد جس کی ابتدا ۱۸۵۳ء میں ہوئی۔ اس مسجد کے متعلق سکھوں کے دیوانی حقوق کی گوردوارہ ٹریبونل نے ۱۹۳۰ء میں آخری تصدیق کر دی۔ ٹریبونل کے فیصلے کے خلاف مسلمانوں نے کوئی اپیل دائر نہ کی۔ اس قانونی پہلو کے پیش نظر حکومت کی طرف سے سکھوں سے یہ اقرار لینے کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنے حقوق کو ایسے طریق پر استعمال نہ کریں جس سے مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچے۔

اس فیصلے کے مختلف امکاناتی حل طرفین کے ساتھ علیحدہ علیحدہ معرض بحث میں لائے گئے۔ اور سکھ لیڈروں کی طرف سے حکومت کو یہ بتایا گیا کہ انہدام کے حق میں یا خلاف کم از کم اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ جب تک ٹریبونل گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے اجلاس جوہ جولائی کو قرار پایا تھا نہ ہو جائے۔ اگرچہ حکومت کو ان حالات کا علم نہیں جن میں مسجد کے انہدام کا کیا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکھ لیڈروں کا اپنے انتہا پسند پیروؤں پر قابو نہیں۔ ، جولائی کی شام کو شاہ عالمی دروازہ

کے قریب ایک سکھ کی لاش پائے جانے کی اطلاع ملی۔ گو تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ موت تشدد سے نہیں ہوئی۔ لیکن سکھوں نے اسے فرقہ وارانہ قتل کی واردات سمجھ لیا، اور اس طرح ان میں جوش پیدا ہو گیا۔

ظاہری اسباب نواہ کچھ ہی ہوں لیکن مسجد کا انہدام ۸ جولائی صبح شروع ہو گیا۔ حکومت کو افسوس ہے کہ سکھوں نے اچانک کارروائی کرنا مناسب سمجھا جس سے تصفیہ کے تمام مواقع جاتے رہے۔ اس طرح سے صورتحال نہایت نازک ہو گئی اور فرقہ وارانہ منافرت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ایسے میں حکومت عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ فضا میں سکون قائم رکھیں اور امن قائم رکھنے میں مدد دیں۔“

حکومت پنجاب نے اس بیان میں اپنی پاک و امنی کارروائی منظر پر کرتے ہوئے اپنی بلا دوسروں کے گلے ڈال دی۔ حالانکہ تمام تیلیوں کی ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی۔ حکومت کے بیان کے بعد مجلس اہوار نے صورتحال واضح کرتے ہوئے اپنی پالیسی کی وضاحت کی۔

مندرجہ ذیل بیان مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۱۳۔ جولائی ۱۹۲۵ء کو شاہی مسجد لاہور میں زیر صدارت صاحبزادہ سید فیض الحسن سجادہ نشین آلومہار شریف مجلس اہوار اسلام ہند کی طرف سے پڑھ کر سنایا۔ اس اجلاس میں حاضرین کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی۔

”مسجد شہید گنج کے متعلق اور بخاری جماعت کی پوزیشن کے متعلق چھ گویاں ہو رہی ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختاط بیان پبلک کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اگر کبھی اس کی تفصیل بیان کرنے کا موقعہ ہوا تو مفصل بیان دیا جائے گا۔“

ابھی ہم تبلیغ کانفرنس کے سلسلے میں لائپور میں تھے کہ بذریعہ ٹیلیفون ہمیں لاہور سے صورت حال کے متعلق اطلاع دی گئی۔ فوراً خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ نائب صدر مجلس استقبالیہ تبلیغ کانفرنس لائپور کے مکان پر جمع ہو کر مجلس اہوار اسلام کے کارکنوں نے مشورہ کیا۔ رانا فیروز الدین ایڈووکیٹ

لاکپور نے مولانا ظفر علی خاں کے قریبی عزیز اور مجلس احرار کے معزز رکن ہیں۔ مسجد شہید گنج اور حالات پر روشنی ڈال کر خرم و احتیاط کا مشورہ دیا اور ایک پالیسی تجویز کر لی گئی۔ جب ہمارے کارکن لاہور پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ مسجد شہید گنج کے تحفظ کے لیے ایک مقتدر جماعت بنالی گئی ہے۔ جس میں مولانا ظفر علی خاں، ان کے بیٹے اختر علی خاں، اسید حبیب، ڈاکٹر محمد عالم، ملک لال خاں (گوجرانوالہ) شریک ہیں اور مسجد کے لیے ایسی کمیٹی مینشن کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ جب ایک مقتدر جماعت نے ہماری لاکپور سے واپسی سے پہلے کام سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا ہو تو مجلس احرار کا من حیث الجماعت دخل دینا مسلمانوں میں کشمکش کا باعث ہو جانا لازمی تھا۔ اور جائز طور سے اس اعتراض کا موقع مہیا ہوتا کہ احرار ہر ایسی کمیٹی مینشن میں ٹانگ اڑا دیتے ہیں۔ اور کسی دوسری جماعت کو خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو کام کرنے کا موقع نہیں دیتے۔

بنابریں خاموشی کو بہتر سمجھا گیا، لیکن ہم اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ خاموشی کے معنی مخالفت کے نہ تھے۔ بلکہ مولانا اسید محمد داؤد غزنوی جنرل سیکرٹری مجلس احرار اسلام ہند کا تمام مشوروں میں برابر شامل رہنے کا فیصلہ کیا گیا اور انہوں نے ابتداء سے انجمن تحفظ مسجد شہید گنج میں نہایت محنت سے خدمت کو انجام دیا۔ لیکن نواب صاحب آف مدوٹ کی کوٹھی پر ایک میٹنگ میں ایک خدر کی بنا پر شامل نہ ہونے کے لیے مولانا محمد داؤد کے خلاف پروپگنڈا بعض حلقوں سے شروع ہو گیا، جس کا تمام افسوس دفتر زمیندار کو ہونا چاہیے۔

پوزیشن کی وضاحت۔ اب مسجد گرا دی گئی تو بعض عاقبت نااندیش طبقوں کی طرف سے مجلس کی دانشمندانہ خاموشی کو مجرمانہ خاموشی بیان کیا گیا اور ملک میں ناکردہ گناہوں کے خلاف انتہائی طور پر پروپگنڈا شروع کر دیا۔ ہم نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے یہ جلسہ ضروری سمجھا۔ یہ واضح رہے کہ جس دن سے مسجد شہید ہوئی ہے، ہم باخبر آدمیوں سے برابر مشورہ کرتے رہے۔

کل میاں عبدالعزیز پیر پٹر نے ٹیلیفون کیا کہ مجلس احوار اب کیا کرنا چاہتی ہے اور میں اس سلسلے میں جماعت کے ذمہ دار ارکان سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔  
غور و فکر کی مجلس : چنانچہ میاں صاحب کو مجلس احوار کی ورکنگ کمیٹی میں شمولیت کی دعوت دی گئی اور انہوں نے اس ایجنڈیشن کی تمام تاریخ دہرا کر احوار کارکنوں کو کہا کہ آپ کو اس مسئلے میں رہنمائی کرنی چاہیے۔

ہم نے کہا کہ آپ تجویز کریں کہ کام کس طرح ہو؟۔ انہوں نے کہا اس وقت اجلاس برخواست کر دیا جائے اور میں چار بجے شام پھر آؤں گا۔ اور اجاب کے مشورہ کے بعد دوبارہ گفتگو کروں گا۔

چار بجے ان کا فون آیا کہ وہ اجاب سے مشورہ کر رہے ہیں۔ پھر آج صبح ان کا ایک آدمی پیغام لے کر آیا کہ میری استدعا ہے کہ آج کے جلسے میں کوئی اختلافی بات نہ کی جائے اور نہ ہی کوئی رائے اور پروگرام دیا جائے، جس پر تمام مسلمان پہلے سے متفق نہ ہو جائیں۔ میرے دوست مجلس احوار سے آج شام ضروری گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ میری احوار کارکنوں سے درخواست ہے کہ وہ اس نازک موقع پر اتحاد بین المسلمین کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

مجلس احوار نے اپنے کسی قول و فعل سے مسلمانوں کے مقاصدِ عالیہ کو نہ پہلے کبھی نقصان پہنچایا ہے اور نہ کبھی آئندہ پہنچانے کو تیار ہیں۔ آج یہ تحریر اس لیے مناسب سمجھی گئی کہ مبادا کسی لفظ سے کوئی خلط فہمی نہ پیدا ہو۔ اس بنا پر ہم حاضرین سے معذرت خواہ ہیں اور آج اس تحریر کے بعد کوئی تقریر نہیں کر سکے۔ امید ہے کہ آپ بھی ضبط و تحمل سے کام لیں گے۔ آپ مجھے تقریر کرنے سے معذور سمجھیں گے تاکہ مجلس احوار پر کوئی الزام نہ آئے۔

مسجد شاہ چراغ | شاہ صاحب نے اپنی مندرجہ بالا تحریر کے خاتمے پر کہا:  
 ”مسجد شہید گنج کے علاوہ ایک اور مسجد بھی ہے جس پر

حکومت پنجاب کا قبضہ ہے، جسے ہم عنقریب حکومت سے آزاد کرانے لگے۔“

مسجد شاہ چراغ کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے شاہ جی نے جس ارادے کا اظہار کیا تھا۔ حکومت پنجاب نے اس کے جواب میں ۱۶ جولائی کے اخبارات میں اعلان کیا:

”مسلمانوں کی طرف سے مسجد شاہ چراغ کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ مسجد ۱۸۶۰ء میں ایک ایسے آدمی سے خریدی تھی جو اسے ذاتی سکونت کے لیے استعمال کرتا تھا۔ مگر اب اس جگہ کو حکومت خالی کر دے گی۔ لیکن جیسے ہی سیشن عدالتوں کے کمرے جو زیر تعمیر ہیں، مکمل ہوئے مسجد شاہ چراغ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔“



### مسجد شاہ چراغ

یہ مسجد ایک درویش شاہ چراغ کے نام سے منسوب ہے، جو شاہ جہان کے عہد میں گذرے ہیں۔ شاہ چراغ اوج ترفیع (بہادپور) کے باشندے تھے اور حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی کی اولاد میں سے تھے۔ جن کا ۱۶۵۰ء میں انتقال ہوا۔ ان کا مزار شہنشاہ اورنگ زیب نے تعمیر کرایا تھا۔ اس مزار کے قریب ہی یہ مسجد نواب خان بہادر خان گورنر لاہور نے عہد شاہ کے عہد میں بنوائی تھی۔ جب زمام اقتدار سکھوں کے ہاتھ آئی تو اس مسجد پر سکھوں نے حملہ کر دیا اور بعد میں اسے

ایک مسلمان کے ہاتھ فروخت کر دیا جو اسے بطور مکان کے استعمال کرتا رہا۔ یہ مسجد ۱۹۰۰ء میں حکومت پنجاب نے خریدی اور اس میں اکاؤنٹنٹ کا دفتر قائم کیا گیا۔

**مرزائی اور تحریک شہید گنج** قوت باطلہ روزِ آفرینش سے اس تاک میں رہی کہ حق کے راستے روک کر اس پر گامزن افراد کو گمراہ کیا جائے۔ لیکن

اسلام کا پر تو جنہیں اندھیروں سے اجالوں میں لایا تھا وہ راستے کی روک ٹوک کے بغیر صراطِ مستقیم پر رواں دواں رہے، تاہم کئی موڑ آئے کہ جاوہ حق کے مسافروں کو کفر کی آگ سے اپنا دامن سمیٹنا پڑا۔

تحریک مسجد شہید گنج ایک ایسی سرخ اور بھیانک آندھی تھی کہ سچائی کو منہ چھپانے کیلئے اماں ڈھونڈنی پڑی۔ ہم رنگ زمین دامن اس عنوان اور فریب سے بچھائے گئے کہ ہر قدم الجھتا چلا گیا۔ بگڑے ہوئے عوام کی زبان اور ہاتھ بغیر کسی سوچ اور فکر کے اپنا کام کرتے رہے۔ ایسے میں احوار رہنماؤں کا خلوص سرپیٹ کر رہ گیا۔ اور دل و جان کا نذرانہ لے کر اس راہ پر آکھڑے ہوئے جو اصول کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس تحریک میں من حیث القوم مسلمان کو سیاسی اور مذہبی کس قدر ندامت اٹھانا پڑی اس کا جواب آئندہ تاریخ دے گی۔

مسجد شہید گنج ۸ جولائی کو گرائی گئی۔ لیکن قادیانی لیڈر بشیر الدین محمود نے یکم جولائی کو ہی اپنے مریدوں کو اطلاع کر دی کہ عنقریب عمدہ قسم کے اشتہار شائع کیے جائیں گے جنہیں عمدہ جگہ پر لگائیں اور سمجھاؤ لوگوں میں تقسیم کریں۔ نیز ان پوسٹروں سے متعلق عوام کے تاثرات بھی معلوم کریں۔ چنانچہ جیسے ہی انہدام مسجد کا واقعہ پیش آیا۔ مرزائی تنظیم (تحریک جدید) کے بارہ سو کارکن لاہور پہنچ گئے اور انہوں نے ”زمیندار“ کے برابر حجازی بلڈنگ میں اپنا دفتر قائم کر لیا اور یہیں سے ۳۰۰ سائز کے پوسٹر شائع ہوتا شروع ہوئے۔ لاہور سے ابھی پھر شمال مغربی صوبہ سرحد تک یہ پوسٹر شہروں کے علاوہ دیہاتوں، بستیوں اور گاؤں گاؤں تقسیم کیے گئے۔ ہر روز مختلف اقسام کے پوسٹر دیکھنے میں آتے۔ جن میں حصول مسجد کی بجائے احوار رہنماؤں کو گالیاں اور الزامات درج ہوتے۔ ان اشتہاروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

جھلی خطوط | انہی دنوں احرار رہنماؤں کے خلاف دو جھلی خط بھی شائع ہوئے۔ یہ خط پہلے روزنامہ زمیندار میں اور بعد میں اشتہاروں کی شکل میں لاکھوں کی تعداد میں عوام

تک پہنچائے گئے۔

خطوط دو گورداپور۔ ۲۲۔ جولائی ۱۹۳۵ء

برادر مکرّم چودھری (افضل حق) صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں دورے سے واپسی پر دفتر پہنچا، لیکن آپ موجود نہ تھے۔ زبانی طور پر تمام واقعات مولوی محمد شفیع صاحب سے کہہ آیا تھا۔ غالباً انہوں نے تمام نشیب و فراز بیان کر دیے ہوں گے۔ احتیاطاً دوبارہ عرض کرتا ہوں:

۱۲۔ جولائی کا شاہی مسجد کا اعلان بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ پبلک کارپوریشن ہمارے طرف پٹ چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دوسرے چوتھے دن کے بعد ایسا ہی ہنگامہ نیز بیان شائع کر دیا جائے۔ تاکہ مولوی ظفر علی خاں یا اس کی پارٹی سے عامۃ المسلمین کٹ جائیں۔ مکمل فیصلہ و اقتدار ہونے کے بعد ایجنڈیشن فوراً ختم کی جاسکتی ہے۔

تاکہ مسجد کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ مگر اس میں حصہ لینے سے اگر کامیابی ہو بھی گئی تو نام ظفر علی خاں کا ہوگا۔ کیونکہ اس تحریک کا قائد وہی تسلیم کیا جا چکا ہے اور ہمارا اور مجلس احرار کا وقار سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور کیلئے ظفر علی خاں کی کامیابی ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔

شاہ صاحب کو ہر ممکن طریق سے یقین دلانیں کہ ایجنڈیشن میں شامل ہونے سے جماعت فنا ہو جائے گی۔ انہیں مذہبی رنگ میں ہی قائل کیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبید الرحمن سے معلوم ہوا ہے کہ اعلان پڑھنے کے بعد وہ کچھ نرم ہو رہے ہیں اور انفرادی طور پر ایجنڈیشن میں شامل ہونے کا وعدہ بھی کر چکے ہیں۔ نملہ کے لیے انہیں سمجھائیے۔ ان کی شمولیت سے ہمارے کام آئے گا۔

قبل ہو جائے گی۔ میں مشاورت کے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکا۔ امید ہے  
آپ نے حسب منشا کارروائی کرائی ہوگی۔

احقر۔ منظر علی انظر

دوسرا خط۔

گورداسپور۔ ۱۲۔ ستمبر ۱۹۳۵ء

برادر مکرم چودھری صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
میں آپ کے اس خط سے حروف بحرف متفق ہوں کہ پیر صاحب حضرت  
پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پور، امیر ملت ہند و صدر مجلس اتحاد ملت ہند  
کی مخالفت نہ کی جائے۔ کیونکہ اس وقت قوم ان کے ساتھ ہے۔ نیز یہ مسلمہ  
بات ہے کہ وہ سول نافرمانی نہیں کریں گے۔ اس لیے ان کی حمایت کرنے میں  
ہی ہماری بہتری ہے۔ ۱۵۔ ستمبر کو پیر صاحب لاہور آ رہے ہیں۔ اپنے ورکرز  
کو ہدایت کر دیں کہ یہ جلسہ کامیابی سے ہونے دیں۔ نیز روزنامہ مجاہد میں نہایت  
تدبیر کے ساتھ مخالفت بھی جاری رکھی جائے اور اس جماعت میں اپنے آدمی  
بھی شامل کر دیے جائیں تاکہ ان کی سرگرمی سے اطلاع بھی ہوتی رہے اور وقت  
آنے پر یہ عمارت فوراً گرائی جاسکے۔ مگر کوئی کچا آدمی ان کے نزدیک تک بھی  
نہ جانے دیا جائے۔ شاہ صاحب سے کہہ دیں کہ اپنی تو جہات خاکساریت کی  
طرف زیادہ منعطف کریں۔ اس دشمن کا سدباب نہایت ضروری ہے۔

مسئلہ حجاز کے متعلق میرا مشورہ صرف اتنا ہے کہ سلطان کی براہ راست  
ہرگز مخالفت نہ کی جائے کیونکہ اس طرح یہ تحریک ہمارے لیے نقصان دہ  
نتیجہ ہوگی۔ یہ مانا کہ اس کی انگیخت میں اس کا بھی کوئی خاص فائدہ ہوگا۔ مگر ہمیں  
اس سے کیا؟ مگر ہمارا مطلب پورا پورا اہل ہو جائے۔  
پبلک کی توجہ شہید گنج ایچی ٹیشن سے ہٹانے کا اس سے بہتر اور کوئی حربہ

۱۔ چودھری صاحب کے اس خط کا میں ذکر نہیں کر رہا تھا۔



نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر سلطان حجاز پر کما حقہ اثر ہو گیا تو مالی مشکلات بھی حل ہو جائیں گی اور چندے کی مصیبت سے کچھ عرصہ کے لیے نجات حاصل ہو جائے گی۔ ہاں! یاد آیا کہ ۱۶ ستمبر کا جلسہ اگر لاہور میں ہوتا تو بہتر تھا۔ اگر لاہور کے حالات موافق نہ ہوں تو اچھرہ ہی میں سہی۔ یہ جلسہ بہت مفید رہے گا۔ کیونکہ تمام نمائندگان کی موجودگی میں ہوگا۔ اور کمزور طبیعتیں بھی مضبوط ہو جائیں گیں۔ ۱۶ ستمبر کے اجلاس میں شمولیت کی کوشش کروں گا۔ والسلام

احقر منظر علی اظہر

**جعلی خطوط کا محرک** | ان خطوط کا شائع ہونا تھا کہ بدگمانیوں نے عوام میں نیا جنم لیا۔ افسانہ حقیقت کا پیر من اور صے بزم آرائیوں میں مصروف ہو گیا۔ رہے سہے درست و احباب دشمنوں کی صف میں چلے گئے۔ یہ جادو اس قدر سر چڑھ کر بولا کہ سچائی کی قوت گریانی سلب ہو کے رہ گئی۔ احوار کے راستے میں مشکلات کے نئے پہاڑ ابھر نزاں نے بہار کے راستے روک لیے۔ گمراہی مرض کی طرح پھلتی چلی گئی۔ سپاہ رات کے ساتھ آگے بڑھ کر جھوٹ کے نئے پرائس روشن کرنے لگے۔ جس سے حقیقت کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس سارے ڈرامے کا ایک ایک کردار اپنی برہنگی پر غر مندہ ہونے لگا۔

شیخ محمد شریف شوق جوان دنوں مرکزی مجلس احوار کا آفس سیکرٹری تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ اسے جعلی دستخط بنانے کا بھی ملکہ حاصل تھا۔ بحیثیت مرکزی احوار آفس کے انسپراج کے تمام احوار رہنماؤں کے کاغذات اس کے قبضے میں تھے۔ چنانچہ اس کی خدمات جعلی خطوط بنانے کے ضمن میں حاصل کی گئیں اور اسے امرتسر اسماعیل غزنوی کے مکان پر لے جایا گیا۔ اور یہی جگہ جعلی خطوط مرتب کیے گئے۔ اور محمد شریف شوق سے مولانا منظر علی اظہر کے جعلی خطوط مرتب کئے۔ یہاں سے یہ خطوط روزنامہ زمیندار کے دفتر پنیچے اور پنیچے میں لایا گیا۔ انہیں انہما کی

۱۔ یہ شخص ان دنوں گوجرانوالہ کچری احاطہ میں عرضی نوٹس سے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی تازگی علیہ ذمہ من اول  
علیم نور الدین کا حقیقی نواسہ ہے۔

شکل میں شائع کیا۔ اس کا اعتراف مرزا محمود ان الفاظ میں کرتا ہے۔  
 ”ہمیں ان (احرار) پر غصہ ہے۔ پس اگر کوئی شخص احوار کے خلاف لٹریچر شائع کرتا ہے اور ہم اس کی اشاعت میں مدد دیتے ہیں یا خریدتے ہیں تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہمارے بعض آدمیوں نے ایسا لٹریچر خرید کر شائع کیا ہے یا اس کے شائع ہونے میں مدد دی ہے تو میں اسے برا نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسے ایک قومی خدمت سمجھتا ہوں۔“

(خطبہ مرزا محمود۔ ”الفضل“۔ ۱۹۔ ستمبر ۱۹۳۵ء)

اس طرح شیخ محمد شریف شوق کو مولانا منظر علی اظہر نے اپنی ایکشن پوٹیشن میں بطور گواہ پیش کیا تو اس نے عدالت کے رد برو اعتراف کیا کہ اس سے یہ خط مولوی اسماعیل غزنوی کے مکان میں لکھوائے گئے تھے۔ اس طرح محمد شریف شوق اپنے جھوٹ کا ایک اور حکہ اعتراف کرتا ہے:

”میں ایک ایکشن پوٹیشن کے سلسلے میں لاہور کی ایک عدالت میں یہ بیان دے چکا ہوں کہ چھٹیاں مولانا منظر علی اظہر کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ یہ میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ میں عدالت موصوف میں یہ بیان بھی دے چکا ہوں کہ مولوی محمد اسماعیل صاحب کے دولت کد امر میں ایک طے شدہ پروگرام کے تحت مجھے لے جایا گیا۔ کہ تمہارا خط اچھا ہے یہ دو چھٹیاں لکھ دو۔ چنانچہ مولوی محمد اسماعیل صاحب غزنوی الفاظ بولتے گئے اور میں لکھنا گیا۔ مولانا منظر علی اظہر کے جعلی دستخط بھی میں نے خود کیے۔“

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ان چھٹیوں سے مجلس احوار کو قتل کرایا جائے گا۔ اور مسجد شہید گنج کا ملبہ مجلس احوار ایسی فعال جماعت پر گرا دیا جائے گا۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ میرا یہ گناہ معاف کر دے۔“

محمد شریف شوق۔ (ماہنامہ تبصرہ۔ شمارہ اگست ۱۹۶۹ء)



اس ضمن میں راقم نے ۵/۹ کو شیخ محمد شریف ثناء  
کو ایک خط لکھا کہ وہ اصل حالات سے آگاہ کرے  
چنانچہ موصوف نے میری درخواست پر حسب ذیل  
جواب دیا جو اگست ۱۹۶۹ء کے شمارہ "تبصرہ"  
میں شائع ہو چکا ہے۔ (مصنف)

دموتوی اسمعیل نونوی بن کے مکان پر جعلی

محرری جا نیاز صد ۱ چھپیں مرتب ہوئیں

گزارش

25-5-69

السلام در قسمہ الہدایہ - گرامی نامہ شرف صدر اور

نوربا عرفی کے - کہ - یہ ان دنوں کا نقد سے نوازاں ہوا

بلکہ احزاب نقد کے دنز سے اس کو کٹری تھا - اس کا یہ پھولوں کا

سے نفاذ سال ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء کو جوہر انفلو

کے مہلوم اور ایک کٹریں شہزاد کے ساتھ سے دیہو کی راکھ اور

بہاں لکھی کے جہاں سے کہ لکھوں کو اور لکھوں کے لکھوں

کہ لکھی ہوئی ہوئیں - لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں

رہتوں سے - کہ وہ لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں

نواہی کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں

کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں

در لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں

لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں

لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں

لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں کے لکھوں

۵۹-۵-۶۹

اصرار کا ورنہ جھوٹ | اس وقت تک یہ بات کھل کر سامنے آچکی تھی کہ اندھیرے کے بادل چھٹ رہے ہیں اور حقیقت بلیوں اچھل رہی تھی کہ باطل

کا کھیل تماشہ حصولِ مسجد کے لیے نہیں، محض مسلمانوں میں انگریزی سامراج کے خلاف منظم اور فعال جماعت کو نقصان پہنچانا اور آئندہ الیکشن میں یونینسٹ پارٹی کو کامیاب کرانے کا ایک حربہ تھا

۱۔ ایک ہی سرکاری آفیسر مولانا ظفر علی خاں کو یقین دلاتا ہے۔

”تم ایچی ٹیشن جاری رکھو۔ مسجد تمہیں مل جائے گی“

۲۔ وہی سرکاری آفیسر (بقول سید حبیب) سکھوں سے کہتا ہے:

”تم مسجد گرا سکتے ہو۔ کیونکہ یہ تمہارا حق ہے۔ اگر مسلمان اس کے راستے

میں آئیں تو حکومت اپنی فوج اور پولیس سے تمہاری پشت پناہی کرے گی“

۳۔ یہی سرکاری آفیسر جس کے متعلق مرزائی لیڈر نے خود اعتراف کیا کہ:

”ایک ذمہ دار آفیسر نے جن کا میں نام نہیں لیتا، ایک محرز احمدی سے

کہا ہے کہ اگر تم لوگ شہید گنج کے سلسلے میں دلچسپی رکھتے ہو تو میں ایسے

آدمی بنا سکتا ہوں جو تمہارے حسبِ منشا کام کر سکتے ہیں“

ہفت روزہ ”الفضل“ (مرزائی آرگن)

خطبہ مرزا محمود۔ ۱۹۔ ستمبر ۱۹۳۵ء

آخر میں مولانا منظر علی انظر کی طرف منسوب جنلی چٹیاں اور دیگر تمام واقعات نے

جو جون کے آخری دنوں سے شروع ہو کر جولائی کے اختتام تک ہوتے چلے آئے تھے

احرار کے لیے تمام راستے صاف کر دیے اور وہ چراغ گل ہو گئے جو کبھی بادِ سموم نے جلانے

تھے۔ ابلیس کے اڑائے ہوئے چھینٹے حق کے دامن کو داغدار نہ کر سکے۔ وقت گواہی دینے

کو آن پہنچا کہ باطل کی تمام کارروائی شرارت پر تھی۔ اس پر بھی تہوں کا دعویٰ خدائی شرمندہ

ہوا اور وہ بدستور جھوٹ کی پتنگ کو ڈور ہلاتے رہے۔

احرار ایک متعینہ منزل کے مسافر تھے۔ راستے کا کوئی پتھر ان کے قدم نہ روک سکا۔

وہ چلتے گئے اور چلتے ہی رہے۔ اس دوران اگر کوئی دیوار آئی تو ان کے آہنی ارادوں کے سامنے ٹھہرنے لگی۔ بلاشبہ تحریک مسجد شہید گنج احرار کے راستے کا مشکل ترین موڑ تھا کہ تمام قوم سنگ اٹھائے ان کے سروں پر آگئی۔ گریبان چاک کر دیے۔ تمام طرازی اور بدکلامی سے اخلاق کی حدیں بری طرح زخمی ہوئیں۔ لیکن وفا شعار اور ایثار پیشہ احرار ملت اسلامیہ کی خفگی کو خندہ پیشانی سے سنتے اور برداشت کرتے رہے مگر تاجکے ۹۔

اخر ان آنکھوں کے ڈورے سرخ ہونے لگے، جن میں کل تک اپنی بے گناہی کے انسوتیر رہے تھے۔ ان زبانوں میں گویائی کی قوت لوٹ آئی جو اپنی وفا اور شرافت سنبھالے ہوئے تھیں۔ وہ ہاتھ آوارہ عناصر پر ابھرنے لگے جو اپنے اکابر کی اطاعت میں بندھے ہوئے تھے۔ پھر ان قوتوں کی گوشمالی کے لیے احرار نے عسکری قوت ترتیب دی۔ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے ایک سو نو جوان منظم اور مسلح کیے گئے۔ ان کی تربیت کی ذمہ داری لاہور کے مہر علم الدین اور سلاار معراج دین کے سپرد تھی۔ چند دنوں کی تربیت کے بعد احرار کا یہ درلی جتھہ (گوریے) چاق و چوبند ہو کر اپنا کام سرانجام دینے لگا۔ اس گروہ کی ڈیوٹی تھی کہ وہ احرار کے اجلاس میں اگر کہیں گڑ بڑ پائیں تو مشکوک لوگوں کے گرد بیٹھ جائیں۔ گروہ خاموشی سے جلسے کی کارروائی سنیں تو بہتر، ورنہ جلسے میں گڑ بڑ کرنے کی کوشش کرنے والوں کو نہایت امن سے اٹھا کر باہر لے جائیں اور خوب پٹائی کریں۔ یہاں تک کہ وہ آئندہ احرار کے اجتماعات میں مخالفت کرنے سے توبہ نہ کریں۔ البتہ گوریوں کو تاکید تھی کہ مخالفین کو نہ تو جان سے مارا جائے اور نہ ہلکے ضربات پہنچائیں۔

اس انتظام کے بعد ۱۶ ستمبر کو احرار نے اپنا پہلا جلسہ لاہور شہر کی بجائے اچھرہ میں کھا۔ مخالفین احرار کی اس سکیم سے بے خبر تھے۔ چنانچہ راقم کی انظم کے بعد حضرت امیر شریعت سید عطار اللہ شاہ بخاریؒ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو مخالفین نے حسب عادت ہنگامہ مہ کرنا چاہا۔ چند منٹ انہیں سمجھایا گیا۔ لیکن جب پانی سر سے گزر گیا تو پھر احرار گوریوں کو حکم دیا گیا کہ وہ جلسے کے انتظام کو سنبھالیں۔ بس پھر کیا تھا۔ کارروائی شروع ہو گئی۔ جلسے کا انتظام بیس منٹ کیلئے معطل رہا۔ پھر جو امن ہوا تو شاہ جی نے رات کے دو بجے تک نہایت سکون سے

تقریر کی۔ دوسرا جلسہ لاہور باغبانپورہ میں رکھا گیا۔ اس میں راقم کے علاوہ خطیب پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو خطاب کرتا تھا۔ اس میں گڑ بڑ کرنے کے لیے لاہور میگیکن کالج کے طالب علم بڑی تعداد میں جمع تھے۔ ابھی قرآن حکیم کی تلاوت شروع تھی کہ نادانوں نے وائائی سے اور بڑی ہوکرا حواری رہنماؤں پر کچھ پھراچھانا شروع کر دیا۔ احوار فورس پہلے سے تیار تھی۔ آج یہ ہاکیوں سے مسلح تھے۔ انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ بھاگتے ہوئے طلباء میں چند ایک بھاری بھارے طلباء بٹک پر گر پڑے۔ بھاگنے والے تو بھاگ گئے، جو رہے انہیں سٹریچروں میں لے جایا گیا۔

ایک ہفتہ بعد احوار لاہور شہر میں داخل ہوئے۔ یہ جلسہ دہلی دروازہ کے باغ میں رکھا گیا۔ اس کے لیے انتظامات کہیں وافر کرنے پڑے۔ اس وقت تک احوار کا یہ وڈی جمعہ مزید طاقت پکڑ چکا تھا۔ نوجوان بڑی تعداد میں شامل ہو چکے تھے۔ سچ مخالفین بھی بڑی طاقت میں لیس ہو کر آئے تھے۔ احوار گوریلے اس سے بے خبر نہیں تھے۔ اسٹیج سیکرٹری نے جیسے ہی اعلان کیا حضرات اب جلسے کی کارروائی شروع ہو رہی ہے۔ ایک دم سے ہجوم کا ایک ریلو اسٹیج کی جانب بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ اسٹیج پر قابض ہو جاتا کہ احوار رضا کار ہاکیوں اور لاطیوں سے مسلح ان کے سامنے اکھڑے ہوئے۔ کرائے کے آدمی مخلص رضا کاروں کے سامنے کہاں ٹھہر سکتے تھے۔ آمنے سامنے کی لڑائی بھیڑ میں فریقین زخمی ہوئے۔ اور آخر میدان احوار کے ہاتھ رہا۔ اور جلسہ رات بارہ بجے تک بغیر کسی مداخلت کے ہوتا رہا۔

لاہور کے بعد باقی پنجاب میں بھی یہی طریق اختیار کیا گیا تو پھر کہیں جا کر سکون ہوا۔ اسی پیشینگی پر دو گرام کو احواری سربر بھی کہا گیا اور یہ لفظ اب تک رائج ہے۔

مولانا ظفر علی خان کے یہ تین شعر اسی دور کی یادگار ہیں۔

سر بازار اچھلتی ہم نے دیکھیں پگڑیاں اپنی

پڑا ہے جب سے پالا فتنہ احوار سے ہم کو

بڑا آیا آستنی کا ہاتھ جب ان کی طرف ہم نے

جواب اس کا ملا تلوار کی جھنکار سے ہم کو

اگر ڈر ہے تو ہے احرار کی مسلم نمائی کا  
کوئی طاقت ڈرا سکتی نہیں کفار سے ہم کو

(”ہنگارستان“۔ مجموعہ کلام مولانا ظفر علیاں ص ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸)

نوٹ: تحریک مسجد شہید گنج، ۱۹۳۷ء کے جنرل انتخاب تک جاری رہی۔ اس کا انجام کیا ہوا؟  
اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔ (مصنف)

مسجد شہید گنج کے واقعات کو تاریخ کے دامن میں گرہ دینا رواں دواں تاریخ کا راستہ دیکھنا  
ہے۔ البتہ ایک موڑ کیسے جس پر مؤرخ کو خد لمحات کے لیے سستنا پڑا۔ اس سے بہتر کوئی دوسرا  
عنوان قائم کرنا درست نہیں۔ ہاں اس سارے ہنگامے کو سیاسی سازش بھی قرار دیا جاسکتا ہے جو  
محض مجلس احرار کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کی گئی تھی۔ جیسے کہ اس تحریک کے محرک  
مولانا ظفر علیاں خود اقرار کرتے ہیں۔

بھاری جیت میں ہے رندان کی موت کا پنہاں

پیام زندگی پہنچا ہے ان کی ہار سے ہم کو

(”ہنگارستان“۔ مجموعہ کلام مولانا ظفر علیاں ص ۱۱۸)

اس تحریک میں کرانے کے چند نوجوان بھی ملوث تھے، جن میں عبدالکریم شورش اس طائفہ کا  
یٹھ تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے اس سازش کے اندرون جھانک کر دیکھا تو اس کا دل گواہی دے  
اٹھا کہ حصول مسجد کی تحریک کوئی تحریک نہیں بلکہ یہ ڈرامہ صرف یونینسٹ پارٹی نے انتخاب جیتنے  
کے لیے رچایا ہے اور بس! — وہ فوراً مجلس احرار میں آ شامل ہوا۔ وہ پھر یہی شخص آئندہ چل  
کر آل انڈیا مجلس احرار کا جنرل سیکرٹری بھی بنایا گیا۔

انگریز اپنے اقتدار کے ڈوبتے سورج کو زندگی دینے کے لیے درپردہ جن حرکات کا مرتکب  
ہو رہا تھا۔ تحریک مسجد شہید گنج بھی اس کے کام کی تحریک نکلی۔ چنانچہ یہ وقتی تحریک پنجاب  
سے بیٹ کر ہندوستان کی ہر گہر سیاست پر اثر انداز ہوئی۔ اس کی طفیل اقوام ہند متحد ہوتے  
ہوئے اس موڑ پر پھر ایک مٹھو کر کھا گئیں۔ بعض ہندو لیڈر بھی سکھوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔  
اس ہم آہنگی نے مسلمان کو مزید مشتعل کر دیا۔

بارش کے تھمتے ہی آسمان پر قوس و قزح کی لہریں دیکھ کر قیاس ہونے لگتا ہے کہ اب بارش نہیں ہوگی۔ لیکن کبھی کبھار بادِ سموم رنگوں کے اس امتزاج کو اپنی لپیٹ میں لے کر قیاس آرائیاں ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح ۱۹۳۵ء کے سنبھلتے ہوئے حالات میں تحریک شہید گنج نے ایک نیاز پر گھولا کہ ۳۔ جولائی کو حکومت ہند نے اعلان کیا کہ:

”حال ہی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ دفعہ ۳۲ کے متعلق یہ گمان پیدا ہو گیا ہے کہ اس دفعہ کی رو سے ملک معظم کی حکومت کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ حسب منشا فرقہ وارانہ اعلان میں تغیر پیدا کرے گی۔“

کمیونگ میں اس خیال کی تردید کر دی گئی ہے۔ کمیونگ مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔

فرقہ وارانہ اطلاق کی حدود اور شرائط کے اندر رہتے ہوئے ملک معظم کی حکومت کا ہر گزارہ نہیں کہ وہ اس دفعہ کی رو سے حاصل شدہ اختیارات کے تحت پارلیمنٹ کے پاس کسی قسم کی تبدیلی کی سفارش کرے۔ تا وقتیکہ اقوام ہند کی طرف سے کوئی متفقہ لائحہ عمل پیش نہ کیا جائے۔“

(روزنامہ ”انقلاب“۔ لاہور۔ ۴۔ جولائی ۱۹۳۵ء)

جیسے ہی احرار کی عسکری قوت نے حالات کو درست راستے پر گامزن کیا اور فضائی کروٹ لی، واقعات نئے رخ پر آنے لگے۔ تو ۱۰ جولائی کو احرار نے لاہور شاہی مسجد میں عام جلسے کا اعلان کیا۔ مذکورہ تاریخ سے چل کر یہ پہلا موقع تھا کہ احرار کا اجتماع پر امن ماحول میں ختم کو پہنچا۔ مگر جلسے سے واپسی پر مسجد وزیر خاں کے چوک میں بلا کسی اشتعال کے پولیس نے ہجوم پر لاطھی چارج کر دیا۔ اس موقع پر چاہیے تو یہ تھا کہ پولیس کے متشددانہ رویہ کے خلاف احتجاج کیا جاتا۔ لیکن اس موقع پر مسجد وزیر خاں سے کرائے کے نوجوانوں نے اوار مردہ باوا اور رانہ بلیان اوار مردہ باو کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ حالانکہ احرار بے قصور تھے۔ مگر جب حالات کو بگاڑنا مقصود ہو تو اچھے برے کا امتیاز کون کرتا ہے۔

حالات کو مزید سدھارنے کے لیے ۱۹۔ جولائی کو حسب ذیل مشترک دعوت نامے پنجاب



کے مختلف اہل الرائے حضرات کو روانہ کیے گئے۔

”مکرمی و محرمی! السلام علیکم

ارکان مجلس تحفظ مسجد شہید گنج اور مجلس اوزار کے متحدہ اعلان کے مطابق آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ مسلمانان پنجاب کی مجلس مشاورت میں شریک ہوں۔ مسجد شہید گنج کے انہدام سے پنجاب کے مسلمانوں میں جو جوش پیدا ہو چکا ہے۔ اس کو صحیح راہ پر ڈالنے اور اس کے مفید نتائج پیدا کرنے کے لیے آپ کے مشوروں کی اشد ضرورت ہے۔ اور دیگر اکابر تو ہم کو بھی دعوت دی جائے۔

لہذا آپ سرہانی فرما کر ۲۷ جولائی کو لاہور پہنچ جائیں۔ اجلاس دو روزہ ہے

گا۔ پہلا اجلاس ۲۷ جولائی ۳ بجے شام اور دوسرا ۲۸ جولائی ۸ بجے صبح شروع ہوگا۔

الداعی: (مولانا) سید عطار اللہ شاہ بخاری

(مولانا) حبیب الرحمن - چودھری افضل حق

(مولانا) محمد داؤد غزنوی - (مولانا) منظر علی اظہر

عبداللہ قصوری - اختر علیجاں - لال دین قصیر

محمد یوسف حسن - ایڈیٹر نیرنگ خیال - لاہور

نوٹ: مجلس اوزار نے اپنا مرکزی اجلاس بھی اسی روز طلب کر لیا۔ تاکہ جو فیصلہ ہو اس پر فوری عمل کیا جاسکے۔

ممکن تھا مذکورہ اجلاس کے بعد پنجاب کے حالات میں قدر سکون ہو جائے۔ لیکن ۲۱ اور

۲۲ جولائی کو پولیس نے مسجد کی جانب بڑھتے ہوئے ہجوم پر لٹا بازار میں گولی چلا دی۔ جس کے نتیجے میں سرکاری رپورٹ کے مطابق کئی مسلمان شہید اور انہی کے قریب زخمی ہوئے۔

گولی چلنے اور مسلمانوں کی شہادت کے بعد جذبات میں نئے سرے سے بیجان پھیل

فتویٰ گیا۔ نیز خطرہ بڑھ گیا کہ پنجاب کے دوسرے اضلاع سے مسلمانوں نے قافلے لاہور پہنچنا شروع ہو جائیں گے۔ اسی صورت میں مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا ارباب علی نے ۲۴ جولائی کو حسب ذیل فتویٰ ایک عام اجتماع میں پڑھ کر سنایا جو مسجد میں منعقد ہوا تھا۔

» مولانا نے کتاب، شامی کا حوالہ پیش کرتے ہوئے فتویٰ دیا۔ جب مسجد شہید ہو رہی ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ مسجد کی حفاظت کریں اور اس حفاظت کے ساتھ ساتھ اپنے خون کی بھی حفاظت کریں اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔

روزنامہ انقلاب ۲۶ جولائی ۱۹۲۵ء

اس فتویٰ کا پڑھنا تھا کہ جلسہ میں شریک لوگوں نے شور مچا دیا کہ اگر یہی بات تھی تو علماء پہلے کیوں خاموش رہے۔ کیوں نہ مجمع کو آگاہ کیا؟۔ مرنے والوں کی جانیں کیوں خطر سے ہیں ڈالی گئیں اور اکثر لوگوں نے بے سمجھی میں اوزار رہنماؤں سے گستاخی بھی کی۔ مسجد کے اندر سینکڑوں لوگ علماء کی اس خاموشی پر زار و قطار رونے لگے پڑے اور فتویٰ دینے والوں پر آواز سے کہے گئے۔

اس کے ایک ہفتہ بعد جمعیتہ علمائے ہند کے امیر مفتی کفایت اللہ اور ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید کا حسب ذیل بیان اخبارات میں شائع ہوا۔

» مسجد شہید گنج کے انہدام پر جس قدر افسوس کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ اسی قدر مسلمانوں پر لاطھی چارج اور آتش باری کے نتائج الم انگیز ہیں۔ اور روح خرابا بھی۔ اس ضمن میں ہم جماعتی حیثیت میں تشویش کا اظہار حسب ذیل اعلان سے کرتے ہیں۔

۱۔ باوجودیکہ عدالتی فیصلے سکھوں کے حق میں تھے اور بدیں وجہ سکھ مسجد پر قابض تھے۔ سکھوں کے لیے مسجد کا گرا دینا، مسلمانان ہند کی انتہائی دل آزاری کرتا ہے۔ نیز اخلاقی اور وطنی حیثیت سے جائز نہیں تھا۔

۲۔ مذکورہ بالا دونوں باتوں کے باوجود حکومت قیام امن کی خاطر مسجد کے انہدام کو روک سکتی تھی۔

۳۔ جن مسلمانوں نے مسجد کے انہدام کے خلاف اظہار رنج و غم کیا اور اس کے لیے پرامن مظاہرے کیے حق بجانب تھے۔

۴۔ مسلمانوں نے باوجود انتہائی اشتعال انگیزی کے جو امن پسندی کا ثبوت دیا

وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

۵۔ مسلمانوں نے لاشی چارج اور آتش باری کے فہوش رہا موافقہ پر جس ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا وہ بے نظیر ہے! اس پر وہ تمام مسلمان مبارک باد کے مستحق ہیں۔

۶۔ جو مسلمان ان پر امن مظاہروں کے درمیان متعلقہ حکام کی ناعاقبت اندیشی نہ آتش باری سے شہید ہوئے وہ ہرگز اس تشدد کے مستحق نہ تھے۔ اور جو اس بناء پر شہید ہوئے یا مجروح ہوئے ہیں وہ ثواب کے مستحق ہیں۔

۷۔ مسجد جب ایک مرتبہ مسجد بن جائے تو قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے کوئی جاہلانہ دستور یا مخالفانہ قبضہ اس کو مسجد ہونے سے خارج نہیں کر سکتا۔

۸۔ اگر کوئی غیر منظم ایچی ٹیشن یا اعتبار سناج کے معنوی طور پر مفید نہ ہو تو اس ایچی ٹیشن کو ترک کر کے حصول مسجد کے لیے دوسرے ذرائع مثلاً باہمی مفاہمت پر غور کرنا چاہیے اور کوئی ایسا اقدام کرنا چاہیے جو فرزدان توحید کیلئے مفید ثابت ہو۔

۹۔ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے وہ تمام مسلمان زحما کے باہم مشورہ اور اتحاد عمل سے ہوتا کہ اس کا نتیجہ بہتر اور باعزت صورت میں نکل سکے۔

۲۶۔ جولائی کے مسلم اخبارات میں صدر بلدیہ لاہور ملک محمدین صدر بلدیہ لاہور کا بیان کا ایک بیان شائع ہوا۔

”اگر بعض بیان اور علماء کا فتویٰ جو اس وقت شائع کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے یہی علماء دونا دیدار علی، اس وقت جہات سے کام لے کر یہی اعلان پہلے کرتے تو گناہ مسلمانوں کا خون ضائع نہ ہوتا اور نہ ہی بے گناہ معصوم جانیں ضائع ہوتیں۔

انسوس کہ تحریک کے دنوں مذہبی رہنماؤں کی حیثیت سے انہوں نے نہ اپنی ذمہ داری نبھائی اور نہ ہی دکھانے مسلمانوں کو مسجد کی قانونی حیثیت سمجھائی کہ اس کا نتیجہ بہتر ہوتا۔“

(روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۲۶۔ جولائی ۱۹۳۵ء)

اس سے ایک ہفتہ پیشتر روزنامہ ”انقلاب“ لاہور نے مسلم لیگ کے سیکرٹری کا بیان شائع کیا۔

”دہلی - ۲۵ - جولائی - خان بہادر حافظ ہدایت حسین ایم - ایل سی دیو پی نے لاہور کی صورت حال پر مسلمانوں کے نام ایک پیغام میں کہا، کہ وہ ایسے اقدام سے باز رہیں جس سے خرابی ہو اور امن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ ساتھ ہی آپ نے سکھوں کے انہدام مسجد کی مذمت کی۔ نیز آپ نے کہا کہ یہ واقعہ نئے دستور سازی کی کامیابی کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔ آخر میں آپ نے کہا کہ میں حکومت سے استدعا کروں گا کہ وہ جلد کوئی اقدام کرے جس سے مسلمانوں کی تسلی ہو۔“

**مشترک اجلاس** | دعوت نامے کی بنیاد پر جو ۱۹ - جولائی کو جاری کیے گئے تھے۔ ۲۸ جولائی کو پنجاب اور سرحد کے مختلف خیال مسلم رہنماؤں کا ایک مشترک

اجلاس لاہور میں ہوا۔

اس مشترک اجلاس کی تجویز پر مجلس احوار کے نمائندوں نے اپنی پوزیشن واضح کی کہ مسجد کو حاصل کرنے کی ہم نے کبھی مخالفت نہیں کی۔ لیکن سول نافرمانی یا تشدد کے ذریعے مسجد کے حصول کو ناممکن ضرور سمجھا اور دو ہی راستے مسجد کے حصول کے متعلق ہمارے ذہن میں ہیں۔ اول یہ کہ عدالت کے ذریعے۔ دوسرا سکھوں سے باہمی افہام و تفہیم سے یا کسی باعزت سمجھوتے کے ذریعے۔ بحیثیت مسلمان کے مسجد کے تحفظ کا سوال ہمارے پیش نظر تھا۔ اور ہمارے خیال میں ہر فرقے کے مسلمان ہمارے اس خیال سے متفق تھے۔ ہمارے سامنے شروع سے سوال تھا کلاس معقد کو کس طرح حاصل کیا جائے۔ الحمد للہ کہ مجلس مشاورت نے سکھوں سے افہام و تفہیم کے لیے ایک کمیٹی بنا دی۔ جو مسجد شہید گنج کے متعلق سکھوں سے کوئی باعزت مفاہمت کرنے کی کوشش کرے گی۔

باقی چار شقوں کے متعلق ہمیں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ شق اول کے متعلق پنجاب کونسل میں احوار نمائندوں نے بہت بڑی حد تک کامیابی حاصل کی کہ سوائے پانچ اضلاع باقی تمام اضلاع میں تلوار پر سے پابندی اٹھ گئی ہے۔ باقی تین چیزوں کے حصول کیلئے ہر جائز تدبیر اختیار کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔

کانفرنس کی مشترک قرارداد | مجلس احرار کے اس واضح بیان کے بعد مشترک کمیٹی نے حسب ذیل قراردادوں کو پاس کیا۔

۱۔ پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلم مندوبین کا یہ اجلاس مسجد شہید گنج لاہور کے انہدام پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور سکھوں کے اس غیر تہذیبی اور غیر روادارانه فعل کی پرزور مذمت کرتا ہے۔

۲۔ نیز مسلم شہداء کے لیے جو تحفظ مسجد شہید گنج کے سلسلے میں شہید ہونے والے ہیں دعائے مغفرت کرتے ہوئے زخمیوں اقد شدہ اور زیر حواست کو مبارک باد پیش کرتا ہے اور ان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

۳۔ نیز مسلم مندوبین کا یہ اجلاس اپنے اس غم کے اعلان کے بعد کہ مسلمان کسی حالت میں تحفظ مسجد شہید گنج کے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ذیل کے اراکین پر مشتمل ایک سب کمیٹی بدیں غرض مقرر کرتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں تمام پنجاب اور سرحد کے چیدہ چیدہ افراد کے پورے طبع شدہ مشورہ کے بعد کوئی پروگرام بنائیں جس میں ذیل کے امور کا خاص خیال رکھا جائے۔

و۔ مسلمانوں کو غیر مشروط طور پر تلوار رکھنے کی اجازت۔

ب۔ مساجد اوقاف کے تحفظ کے لیے ایکٹ کا نفاذ۔

ج۔ مسجد شہید گنج کے سسہ میں گرفتار شدگان کی رہائی اور شہداء کے خون کا

معاوضہ دلایا جائے۔

د۔ نیز یہی سب کمیٹی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس کی تفصیل ذیل میں درج

ہے کہ سکھوں سے مسجد کے متعلق گفتگو کر کے باعزت منہاجت کرنے کی کوشش

کے۔

اراکین کمیٹی | مولانا محمد داؤد غزنوی۔ خواجہ عبدالرحمن غازی۔ چودھری افضل حق۔ مولانا منظر علی اظہر  
ملک لال دین قیصر۔ مولانا اختر علیخان۔ مولانا عبدالقادر قصوری۔ سید غنایت شاہ  
خواجہ محمد حسین امرتسری۔ مولانا بشیر نواب قصوری۔ پروفیسر ملک غنایت اللہ۔ ملک محمد دین صدر

بلدیہ لاہور۔ میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ۔ شیخ محمد صادق امرتسری۔ میر مقبول محمود امرتسر۔ میاں محمد شریف پراچہ لاہور۔ بعد میں مولانا عبدالحمید سالک اور مصطفیٰ شاہ گیلانی کو بھی اس کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔

نام میں تبدیلی | ۲۰۔ جولائی کو اس جماعت کا نام مجلس اتحاد ملی قرار پایا۔ اس کے صدر ملک محمد دین دھند بلدیہ لاہور، نائب صدر ملک لال دین قیصر۔ جنرل سیکرٹری مولانا محمد داؤد غزنوی خزانچی مسلم بنک کو قرار دیا گیا۔

سکھوں سے گفتگو کے لیے جو سب کمیٹی مقرر ہوئی، ان میں چودھری افضل حق ایم ایل سی مولانا منظر علی اظہر ایم ایل سی۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر میر مقبول محمود۔ شیخ محمد صادق مولوی شیر نواب قصوری۔

اس مشترک اور واضح بیان کے بعد احوار نے تحریک شہید گنج کو ثانوی حیثیت قرار دے کر اپنے رکے ہوئے کاروان کو منزل کی جانب روانگی کا حکم دیا۔ البتہ مذکورہ کارروائی پر نظر رکھی۔

میدان جنگ ہو کہ اندرون خانہ سازش، دونوں کی منزل میں بعد نہیں ہوتا۔

کون کیا تھا | فریق زندہ رہے کہ مرے پس منظر میں کام کرنے والے ہاتھ تاج سے ماورمی رہ کر نقتیے لکیرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار دل و دماغ متصادم بھی ہوتے ہیں۔ لیکن نیتوں کا فتور بدستور کارزار میں رہتا ہے۔ آخر وقت آتا ہے، کبھی ملک تباہ ہو جاتے ہیں اور کبھی افراد یا پارٹیوں کا وجود نہیں رہتا۔

شہید گنج تحریک تین مختلف ذہنوں کی پیداوار تھی۔ ہر سہ ذہن اپنی اپنی سوچ میں منفرد تھا۔ لیکن ہدف ایک اور وہ مجلس احوار تھی۔

۱۔ گذشتہ سال خالد لطیف گابا کے الیکشن کے دنوں احوار رہنما شیخ محام الدین نے عوام میں تقریر کرتے ہوئے ایک موقع پر کہا:-

”یہ انتخاب ہمارا امتحان ہے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو مجلس احوار آئندہ کے لیے انتخاب میں بھرپور حصہ لے گی“

سرفضل حسین انہی دنوں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے فارغ ہو کر لاہور آئے تھے۔

وہ ایکٹ، ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے الیکشن میں کامیاب ہو کر پنجاب کی وزارت عظمیٰ کے ممتنی تھے۔ اس غرض سے انہوں نے پہلے تو سر مکندر جیات لوہاڑوں کا ڈپٹی گورنر بنوا کر بھی بھجوا دیا۔ اب ان کے راستے کی سب سے بڑی دیوار مجلس احرار تھی شیخ حسام الدین کے اشارے سے (مجلس احرار آئندہ الیکشن میں بھرپور حصہ لے گی) وہ سنبھلے۔ آدمی ذہین اور ڈپٹی ٹیک قسم کے تھے۔ گورنر پنجاب مسٹر ایمرسن سے مل کر مسجد شہید گنج کی دیوار کا ملبہ احرار پر گرا دیا۔

ایک ذہن یہ تھا۔

مولانا ظفر علی خاں کے اس ذہن میں شریک دوسرا ذہن تھا۔ ۱۹۳۴ء میں جب قادیان احرار کانفرنس کی صدارت کا سوال سامنے آیا تو ظفر علی خاں بھی اس کرسی کے امیدوار تھے۔ مگر جماعتی مضابطہ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ کیونکہ وہ احرار کے ابتدائی رکن بھی نہیں تھے۔ لہذا یہ قرعہ نام سید عطا اللہ شاہ بخاری نکلا۔ وہ دن جانے اور یہ آئے کہ مولانا ظفر علی خاں احرار کے خلاف صفت آزار ہو گئے۔

مرزا بشیر الدین محمود اس سازش کا تیسرا ذہن تھا۔ اس کی احرار سے کیا دشمنی تھی، یہ تعارف کی محتاج نہیں۔

متضاد عناصر کے اس اتحاد نے ہندوستان کی ایک فعال مسلم سیاسی جماعت کو کس قدر نقصان پہنچایا۔ اس کا جواب تاریخ دے گی۔

حکومت سعودیہ کا برطانوی کمپنی سے معاہدہ

انگریز بساط سیاست کا منجھا ہوا کھلاڑی اور اپنے لہرے پھلانے میں استاد مانا

گیا ہے! اپنے حریف کو مات دینے میں اس کی سوچ اس کے قدموں سے میلوں آگے ہے۔ یہ زمین کا سودا چکلانے سے پیشتر ضمیر کا سودا کرتا ہے۔ اس خرید سے فارغ ہو کر آباد بستیوں کو ویران کرنے کے ارادے باندھتا ہے۔ پھر آزاد، غلام ہو کر اپنی زنجیروں کو آپ گروہ دیتے ہیں۔ اور اس پر سے صدیاں گزر جاتی ہیں۔ تا آنکہ محکوم اپنے لہو کی آگ سے اس گروہ کو کھوتے ہیں۔

پرانی تہذیب جب نئے سانچوں میں ڈھلتی ہے تو قوموں کا حقیقی تمدن انہیں نفرت

سے دیکھتا ہے۔ لباس کی کتر بیونت، اطرز تکلم، غلام قوموں کے اخلاق میں کئی تغیر پیدا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ تدبیر اور شمشیر بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں ترکی کے زیر تلگین عربوں نے جو کردار ادا کیا انگریز اس سے غافل نہیں تھا۔ گو شریف مکہ کی غداری سے انگریزوں کا قرض اتر چکا تھا۔ تاہم فرنگی وسط ایشیا کی پھانس ہمیشہ کے لیے اپنے حلق سے نکال دینا چاہتا تھا۔ ویسے بھی عرب کے ریگزاروں میں بہاروں کے سینکڑوں خزانے پوشیدہ تھے، جنہیں نگاہ فرنگ نے دور سے تار لیا تھا۔ سونے کے ذخائر، تیل کے چھٹھے، اقوام یورپ کے اندھیروں میں اجالا کرنے کے لیے ضروری اور اہم تھے۔ چنانچہ معاشی اور سیاسی ضرورت کے لیے اقوام عرب کا ذہنی استحصال فرنگی دانشوروں کے نزدیک ضروری سمجھا گیا۔

یکم اگست ۱۹۳۵ء کے ہندوستانی اخبارات اور روزنامہ "الغلاب" لاہور میں خصوصیت سے شاہ ابن سعود فرمانروائے حجاز کا فرمان اور معاہدے کا متن اس کی منظوری سے شائع کر دیا گیا جو درج ذیل ہے۔

"ہمیں اس معاہدے کی اطلاع ملی جو جدہ میں، ۱۴۔ رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ مطابق ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو ہمارے وزیر مال اور مشرکے۔ سی۔ توشل نمائندہ کمپنی لندن عربیہ سعودیہ مستعینہ لندن میں ہوا۔ لہذا ہم مجلس وزراء کی تائید کرتے ہوئے حکم دیتے ہیں کہ

۱۔ کمپنی ہذا کو اس زمین سے جس کی حدود اس معاہدہ میں متعین ہے تمام مہینات نکلنے کی اجازت ہے۔ یہ زمین باری مملکت عربیہ سعودیہ کی ہے جس کی حدود اس معاہدہ میں مذکور ہیں۔ جس پر ہمارے وزیر مال اور نمائندہ کمپنی مذکور سے ۱۴۔ رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ مطابق ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو جدہ میں معاہدہ ہوا اور تصدیق ثبت کر دی گئی۔

۲۔ ہم اس معاہدہ کی تصدیق کرتے ہیں اور تاریخ اشاعت سے قابل نفاذ سمجھتے ہیں۔

۳۔ ہمارے وزیر مال پر اس کا نفاذ کرنا لازم ہے۔ اور یہ معاہدہ قصر ریاض میں



۸۔ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ مطابق ۴۔ فروری ۱۹۳۵ء کو پیش ہوا۔ اور ہم نے اس کی تصدیق کی۔“

”دستخط عبدالعزیز ملک حجاز“

یہ معاہدہ ۱۴۔ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو شیخ عبداللہ سلمان احمد نائب حکومت عربیہ سعودیہ فریق اول اور فریق ثانی مسٹر کارل رائنہن توشل کے مابین ہوا۔ جو نائب ہیں کمپنی این۔ این عربیہ سعودیہ کے۔ جو رجب پورٹ ہے۔ اور اس کا ہیڈ کوارٹر ۵۵/۶۱ ہارکیٹ شہر لندن (انگلستان) میں ہے۔ یہ معاہدہ حکومت اور کمپنی کے مابین مندرجہ ذیل شکل میں طے پایا۔

دفعہ اول۔ حکومت اس معاہدے کی رُو سے ان شرائط پر جو بیان کی گئی ہیں۔ اس کا حق صرف اسی کمپنی کو دیتی ہے کہ ادنیٰ واصلی ہر قسم کی معدنیات کو تلاش کرے۔ ان کو کھودے یا کھدائی کر کے نکال لے۔ وہ سطح زمین پر ہوں یا اس کے اندر۔ ان حدود کے مطابق جن کی تصریح دفعہ دوم میں کر دی گئی ہے اور اس غرض کے لیے کمپنی کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ چھوٹے بڑے گڑھے نیچے اور اونچی جگہ اور پہاڑوں وغیرہ کو بھی کھود سکتی ہے اور وہ سوراخ وغیرہ بھی کر سکتی ہے جو حکومت اس بارے میں تمام ممکن و ضروری آسامیاں کمپنی کے لیے اغراض بذاتی خاطر بہم پہنچائے گی، جن کی تصریح اس معاہدہ میں کر دی گئی ہے اور کام شروع ہونے سے دو سال تک یہ تمام آسامیاں بہم پہنچانے کی ذمہ داری ہوگی۔

دفعہ دوم: یہ حق تفتیش کان کنی جس کا تذکرہ دفعہ اول میں ہے اس تمام خطہ ارض میں دیا جاتا ہے جو سر پیر خلیفہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اور جس پر نمبر اکا نشان ہے۔ اس کی حدود شمال مشرق میں طولاً درجہ ۳۸ سے شروع ہوتے ہیں اور عرضاً ۲۹ درجہ اور ۳۵ درجہ متعین ہے اور یہاں سے غرباً یہ خطہ خود مختار ہوتا ہے اور اس بلاد کے نشان تک جو اس وقت حکومت عربیہ سعودیہ کے قبضہ میں ہیں۔ شمالاً جب تک شرق اردن ہے۔ سمیت غرباً خلیج عقبہ اور بحیرہ احمر تک اور یہاں

سے جنوباً لورالبرک تک و خطہ عرض و قاطب تک۔  
 اس کے بعد یہ مختلف معدنیات کی تصریح ہے جو نقشہ حجاز سے متعلق ہے۔  
 اور جس کا معاہدہ ہے کہ معاہدہ میں حسب ذیل دو مقامات مستثنیٰ کیے گئے ہیں  
 مدینہ منورہ ہر چہار جانب شہر نپاہ۔ تیس کلومیٹر تک۔ مکہ مکرمہ کی وہ حدود جو شرمی  
 طور پر حرم میں داخل ہے۔

دفعہ سوم: (ا) اس معاہدے کی تاریخ نفاذ سے تین ماہ کے اندر اندر اس تمام  
 رقبہ میں کان کنی اور تفتیش کا کام شروع ہو جائے گا۔ اور اس وقت تک یہ کمپنی  
 کام جاری رکھے گی۔ جب تک کہ قومی موانع پیش نہ آئیں۔ آلات کان کنی وغیرہ  
 کمپنی تیس دن کے اندر اندر تاریخ نفاذ سے منگاسکتی ہے۔

(ب)۔ اس معاہدے کے ہونے سے ایک سال کے ختم ہونے تک یا اس  
 سے پہلے کمپنی اس زمین و خطے کو منتخب کرے گی۔ جہاں تک معدنیات کے  
 نکلنے کا اغلب امکان ہو۔ نیز کمپنی کو چاہیے کہ معاہدے کے ایک سال گزرنے  
 کے بعد جبہ میں اپنی اقامت گاہ متعین کر لے۔

(ت) معاہدہ کے دو سال ختم ہونے تک یا اس سے پہلے کمپنی کو چاہیے کہ وہ  
 ان مقامات اور زمینوں کو پسند کرے جنہیں وہ کان کنی کے لیے اٹھاون برس کے  
 لیے ٹھیکہ پر لے رہی ہے تاکہ وہ خود کان کنی کرے یا اس غرض کے لیے کوئی اور  
 کمپنی یا چند کمپنیاں بنائے۔

دفعہ چہارم: (ا) پہلے سال کے دوران کمپنی حکومت کو زرِ مصارفہ نہ دے گی اور  
 اس کے لیے جس کا دفعہ سوم میں فقرہ و میں تذکرہ ہے۔

(ب) دوسرے سال کمپنی پر فدان (ایک فدان ۴۴۴ مربع میٹر کا ہوتا ہے اور  
 ایک میٹر قریباً ایک گز دو انچ کا ہوتا ہے) کا معاوضہ ۴۴۴ شلنگ اسٹرنگ کے  
 حساب سے سالانہ حکومت کو دے گی۔ اگر وہ کان کنی میں دفعہ سوم کے فقرہ ب  
 سے زیادہ کام کرے گی۔

د) کمپنی حکومت کو ہر فنڈ کے حوض میں اس زمین کے لیے جس پر وہ دفعہ سوم کے فقرہ ت کے مطابق منتخب کرے ایک گنی سالانہ دیا کرے گی۔

د) کمپنی حکومت کو کان کنی میں ان معادن کے قیمت کا جو برآمد ہوں پانچ فیصد ادا کرے گی۔ بشرطیکہ اس کا اوسط ہر فنڈ کے حوض میں ہم شنگ سے زیادہ ہوتا ہو۔ یعنی انوالڈ کے حساب سے لینے میں حکومت کا فائدہ پانچ فیصدی میں ہے تو لیا جائے گا۔ ورنہ ہم شنگ فی فنڈ کے اعتبار سے لیا جائے گا۔

ج) یہ تمام رقوم اس بینک اور اسی عملہ کی معرفت ادا کی جائیں۔ جس کو حکومت پسند کرے گی۔

د) قبل اس کے کہ کمپنی کسی اور کمپنی کو اپنے حقوق و منافع کسی خطہ زمین کے متعلق عطا کرے یہ ضروری ہے کہ وہ حکومت سے اہم تصویب کر کے اس کی منظوری حاصل کرے۔ حکومت کے لیے ضروری ہوگا کہ جب تک کافی اسباب کی بنا پر صریح نقصان اس میں نہ دیکھے تو اس کی اجازت دے دے۔

(روزنامہ انقلاب لاہور۔ یکم اگست ۱۹۳۵ء)

انڈیا بیل کی منظوری | کئی ماہ کی مسلسل بحث اور باہم گفتگو کے بعد ۲۔ اگست ۱۹۳۵ء کو گیارہ بجکر چالیس منٹ پر ملک معظم نے انڈیا بیل پر ہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس طرح برطانوی شہنشاہ نے اپنے نزدیک ہندوستان کو آزادی دے دی اور ایکٹ ۱۹۳۵ء کو آخری شکل میں منظور کر لیا۔

اس ایکٹ پر ۱۹۳۸ء سے برطانوی دستوری کمیشن نے اپنا کام شروع کیا تھا۔ روزنامہ "ٹیمپل ٹائمز" لندن نے اس پر تبصہ کرتے ہوئے کہا کہ "آج حکومت انگلستان نے موجودہ پارلیمنٹ کا سب سے اہم کام ختم کر دیا ہے۔"

ہندوستان کا نیا وائسرائے | ۶۔ اگست نو سرکاری اعلان کے مطابق لارڈ وننگٹن کی جگہ لارڈ ونسیٹھ گونے وائسرائے ہند کا عہدہ سنبھال لیا۔

**تحریک کانیا موٹر** | ۹۔ اگست کو حکومت پنجاب نے اخبارات پر سے سنسر کی تمام پانیدیاں ختم کر دیں اور شہید گنج تحریک کے نظر بندوں کے ذاتی الاؤنس میں اضافہ کر دیا۔ نیز ۱۳۔ اگست کو لاہور شہر میں متعین گورنمنٹ واپس بلا لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی گورنر پنجاب مسٹر ایمرسن اور ان کا عملہ شملہ روانہ ہو گیا۔ جبکہ پنجاب کے ریونیو ممبر خان بہادر مظفر خان اور فیروز خان فیروز خان نون دوزد پیشتر ہی شملہ جا چکے تھے۔

اس سے چار روز پیشتر ۹۔ اگست کے روزنامہ "انقلاب" میں حسب ذیل خبر شائع ہو چکی تھی۔

«جنرل سیکرٹری مجلس مرکزی تحفظ مساجد اوقات لاہور کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ شہدائے مسجد شہید گنج کی شاندار یادگار قائم کی جائے گی اور مجروحین کی امداد کے لیے ایک متحدہ اسلامی فنڈ کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس سارے پروگرام کی تفصیل کا اعلان ایک دو روز میں کر دیا جائے گا۔

ایک اور خبر: بلدیہ لاہور سے سکھوں نے درخواست کی کہ انہیں مسجد کی جگہ گوردوارہ تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے؟»

اس پر مرکزی مجلس تحفظ مساجد نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو مزار حضرت پیر کاوشاہ پر قبضہ کرنے کی اجازت دی جائے۔»

روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۵ء

مسلمانوں نے سکھوں کو مسجد پر گوردوارہ تعمیر کرنے سے روکنے کے لیے دیوانی عدالت

میں دعویٰ دائر کر دیا۔

تحریک مسجد شہید گنج کو بغیر کسی نتیجے کے چھوڑ کر مولانا مظفر علیاں کے ہمراہیوں نے نیلی پوش تحریک کو پنجاب میں جنم دیا اور انتخاب کی ہم شروع کر دی! اس پر بھی احوار کے خلاف پروپیگنڈہ ہوتا رہا۔

**روزنامہ "مجاہد" کا اجراء** | روزنامہ "زمیندار" کے آئے دن کے غلط طرز عمل اور جھوٹی سچی خبروں نے عوام اور احوار کے مابین ایسی دراڑ پیدا کر دی تھی کہ

۱۹۴۵ء کو رہا ہے۔ مگر یہ یادگار بھی تک قائم نہ ہو سکی اور نہ ہی مجروحین کے لیے کسی اسلامی فنڈ کا قیام عمل میں آیا۔

احرار اپنا اخبار نہ ہونے کے باعث اس کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ اس طرح ہر روز نیا سکیڈل تیار کیا جاتا۔ آخر ۹ اگست ۱۹۳۵ء کو مجلس احرار نے روزنامہ ”مجاہد“ کا اجراء کیا۔ یہ اخبار ابتداء میں ۴ صفحات پر مشتمل شائع ہونا شروع ہوا۔ ماسٹر تاج الدین انصاری اس کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اور جواب آں غزل کے طور پر روزنامہ ”زمیندار“ کا جواب الجواب شروع ہوا۔ اگر ”زمیندار“ ایک جھوٹ شائع کرتا تو ”مجاہد“ چار جھوٹ بنا کر شائع کرتا۔ عوام ہر صبح اس کے منتظر رہتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجاہد کی اشاعت دس ہزار کے قریب پہنچ گئی۔

”مجاہد“ کے اجراء کو سنوڑا ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ مالکان ”زمیندار“ نے مجاہد کے سامنے سپر ڈال دی۔ اور ۱۵ اگست کو روزنامہ ”زمیندار“ اور ”مجاہد“ کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔

” آئندہ دونوں اخبار ایک دوسرے کے خلاف کوئی مضمون یا ذاتی حملہ نہیں کریں گے“

اس معاہدے کے نیچے ماسٹر تاج الدین اور اختر علیخاں نے دستخط کیے۔

**تحریک التواؤ** | سیاسی ضرورت کے تحت مسجد کا انہدام حکومت پنجاب اور ٹوٹری مسلمانوں کی آشاؤں کو پورا نہ کر سکا۔ کیونکہ انتخاب میں ابھی ڈیڑھ دو سال کا عرصہ باقی تھا۔ ادھر اجراء رہنماؤں نے اپنی فراست سے اس سازش کو بے نقاب کر دیا۔ رہی سہی کسر ۲۸ جولائی کے مشترک اجلاس کی قرار داد سے پوری کر دی۔ دوسری طرف مجلس احرار کے رہنما ماسٹر خالد لطیف گابا نے (۲۰ اگست) کو مسجد کے متعلق سنٹرل اسمبلی میں اس تحریک پر بحث کا نوٹس دے دیا کہ حکومت جواب دے۔

۱۔ آبا شہید گنج کے تنازعہ کے سلسلے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور نے ۲ جولائی کو مندرجہ ذیل اعلان اخبارات میں درج کرایا تھا۔ جو ۳ جولائی کے مقامی اخبارات میں شائع ہوا تھا۔

تمام ذمی عقل انسانوں کو معلوم ہے کہ اگر ایسی صورت حال کا سدباب نہ کیا جائے تو اس صورت میں فرقہ وارانہ تعلقات خراب ہو جائیں گے اور شہر میں

نقص امن کا شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ میں اپیل کرتا ہوں کہ اقواموں کی تکذیب کے بارے میں اپنی تمام تر قوت کو صرف کریں اور فرقہ وارانہ تعلقات کو کشیدہ ہونے سے بچائیں۔ مسجد اور گوردوارہ بالکل محفوظ ہیں اور ارباب حل و عقد اس اقدام میں مصروف ہیں کہ ایک فیصلہ ہونے تک ان کی حفاظت کی جائے۔

(ب) مسجد اور گوردوارہ کی حفاظت کے بارے میں مندرجہ بالا اقدام سے کیا چیز مراد ہے؟ جس کی حفاظت کی جائے۔

(ج) اس کا کیا مطلب ہے؟ کہ مسجد کے بارے میں پر ممکن اقدام کے بعد ایسے حالات میں کہ حکومت اور لیڈروں کے درمیان گفت و شنید جاری تھی۔ سکھوں کی بڑی تعداد نے مسجد کو گرا دیا۔ آیا مقامی ارباب حل و عقد کے حفاظتی اقدامات ناکافی تھے۔ یا انہوں نے اس بارے میں بالکل آنکساری سے کام لیا ہے؟

(ح) آیا حکومت ہند مطمئن ہے کہ مقامی حکومت کے وسائل مسجد کے انہدام کے بعد اس باب میں ناکافی تھے؟

(د) آیا حکومت کی اب یہ منشا ہے کہ ہر فرقہ یا مذہب کو اختیار دے دیا جائے کہ اپنے قانونی حقوق کی آپ حفاظت کرے۔

۲۔ آیا حکومت مندرجہ ذیل سوالات کا جواب دے گی۔

حکومت ان افراد یا افسران کے نام ظاہر کرے گی؟ جنہوں نے مسجد کو حفاظتی انتظامات کے بعد جیسا کہ ڈپٹی کمشنر لاہور کے اعلان سے واضح ہے، سکھوں کے حوالے کر دیا۔ تاکہ وہ اسے مسمار کر دیں۔

۳۔ آیا حکومت جواب دے گی کہ:

(ا) آیا سکھ جتے جولاہور میں شورش کے دوران شہر میں داخل ہوئے اور تلواروں سے مسلح تھے؟ آیا قانونِ اسلحہ کے تحت سکھوں کو اجازت ہے کہ

وہ ایسا کریں۔؟

(ج)۔ آیا حکومت اس امر سے آگاہ ہے کہ یہ امر مسلمانوں کے مذہبی حقوق میں شامل ہے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے تلواریں رکھ سکیں؟۔ آیا حکومت آمادہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی ایسی سہولتیں دے؟

ایک اور مسجد کا انہدام | ادبا پھیلتی ہے تو ہوا کی طرح پھیلتی ہے۔ سارا علاقہ اس کی لپیٹ میں ہوتا ہے۔ اگر ماہر امراض سمیت اور تدبیر سے اسے

تروک لیں تو متعدی مرض کی طرح اس کا پھیلاؤ روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔  
سکھ اگر باشعور قوم ہوتی تو خیر ملکی سامراج کے ایجنٹوں کی اس سازش کی تکمیل کی بجائے مسلمانوں کا دل رکھنے کے لیے مسجد کو اسی حالت میں رہنے دیتی مگر غلاموں کا شعور اقتدار کے ہاں رہن ہوتا ہے۔

مسجد شہید گنج کے انہدام کی صدائے بازگشت صوبہ مدراس کے ایک قصبہ دیپائے (ضلع گنڈر) میں بھی سنائی گئی۔ جبکہ ۲۱۔ اگست کو علاقہ کے ہندوؤں نے اپنے کلکٹر سے شکایت کی کہ مسجد ہماری آبادی کے قریب ہے۔ لہذا اسے گرا دیا جائے۔ اس پر حکومت مدراس نے ضلعی مجسٹریٹ کو واقعہ کے متعلق رپورٹ کرنے کو کہا۔ آخر حکومت مدراس نے مسجد کو گرانے کا حکم دیا۔ لیکن گاؤں کے مسلمانوں نے جلدی سے ایک اجتماع میں صدائے احتجاج بلند کرنے کے ساتھ ساتھ آل انڈیا مجلس احوار اور پٹی میں جمعیتہ علمائے ہند کو برقی پیغام کے ذریعے اس حادثے کی اطلاع کر دی۔ اس پر ۲۲۔ اگست کو مولانا حبیب الرحمن صدر مرکزی مجلس احوار اور مفتی کفایت اللہ صدر جمعیتہ علمائے ہند نے حکومت مدراس کو مشترک برقی پیغام کے ذریعے مطلع کیا۔

”قصبہ دیپائے کی مسجد کو گرانے کا حکم فوراً واپس لے لیا جائے۔ شکریہ“

۲۲۔ اگست کو گورنر مدراس نے دونوں رہنماؤں کو حسب ذیل جواب دیا۔

”بعض غلط اطلاعات کی بنا پر علاقہ کے مسلمانوں میں اضطراب پھیل گیا تھا۔ مسجد کا انہدام روک دیا گیا ہے۔ یاد آوری کا شکریہ“

(روزنامہ ”مجاہد“۔ ۲۵۔ اگست ۱۹۲۵ء)

ڈاکٹر محمد عالم مسجد کی تحریک | موسم برہنگاں ہو تو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے بھی پھول اگتے ہیں۔ دیکھتی نظروں کو یہ پھول جھلے دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن ان میں حقیقت نہیں ہوتی۔ ان میں نہ خوبو ہوتی ہے نہ ان کی عمر کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ عوام میں مسجد کی تحریک کے برگ و بار پھیلنے لگے تو گورنر جنرل کے لوگ بھی جنازے کو کندھا دینے اہم ہو رہے۔ آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے نمبر ڈاکٹر محمد عالم ایڈووکیٹ رازہ سارا آدمی تھے۔ چلو تم ادھر کو ہوا ہو بدھری۔ کے مطابق کانگریس سے چھلانگ لگا کر تھپٹ سے مسجد شہید گنج کی تحریک میں قانون دان کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔ یہ اگست کے آخری دنوں کی بات ہے۔ حالانکہ اس سے پیشتر ۲۹۔ جون کو کانگریس کے منتخب صدر بابو راجندر پرنسداد لاہور آئے تو انہوں نے اس تحریک کو فرقہ وارانہ سمجھ کر اس میں مداخلت سے اجتناب کیا۔ جسے خود کانگریس کے کارکنوں نے بھی محسوس کیا۔ مگر جھوٹی شہرت کے خواہش مند اصول اور ضابطے کی تمام طنابیں توڑ کر اس راہ پر چلنے لگے جو بالآخر ان کی سیاسی موت پر جا کر ختم ہوئی۔

مجلس احرار کی مساعی پر پنجاب کے پانچ اضلاع کے ملازم سکھوں کی انوکھی تحریک | باقی ضلعوں میں بھی مسلمانوں کو تلوار رکھنے اور عام لے

کر چلنے کی اجازت تھی۔ اس پر سکھوں کا مذہبی طبقہ اس قدر برہم ہوا کہ ۲۰۔ اگست کو کالی دل نے سکھوں کو حکم دیا کہ وہ آئندہ سے اپنے پاس دوکر پائیں رکھیں۔ اگر اس پر گرفتار ہو جائیں تو پھر اس پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے۔ چنانچہ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ لیکن ایک ماہ کے بعد سکھوں نے یہ تحریک واپس لے لی۔

حکومت ہند کا اعلان | اقوام ہند کی حالیہ تلخی کا جب حکومت یہ تماشہ دیکھ چکی۔ تو ۲۰۔ اگست کے اخبارات کے ذریعہ دفعہ ۲۹۵ کے تحت

اعلان کیا کہ:

» جو شخص کسی کی عبادت گاہ یا ایسی چیز کو جو کسی فرقے کے نزدیک متبرک سمجھی جاتی ہو، اس نیت سے نقصان پہنچائے یا اس کی بے حرمتی کرے کہ جس سے کسی فرقے کی مذہبی توہین ہو۔ یا اسے علم ہو کہ اس کے انہدام سے



کسی فرقے کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ اسے دو برس قید کی سزا دی جائے گی یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔

**بساط شہید گنج پر نیا مہرہ** | پنجاب میں انگریز کی عملداری کے بعد دو طبقتوں کا یہاں کے عوام پر زیادہ اثر رہا۔ سیاسی طور پر امرار اور مذہب کے نام پر پیرانِ عظیم اپنا لوہا منواتے رہے۔

پہلی جنگِ عظیم میں انہوں نے اپنے سروؤں کے علاوہ تعزید گنڈوں سے بھی انگریزوں کو اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ آج بھی پنجاب کے جذبات پر یہی لوگ قابض ہیں۔ باشعور لوگوں نے کبھی ان کے جنگل سے رہائی چاہی تو انہیں انگریز کا باغی یا دہائی کہہ کر قابلِ تخریر قرار دے دیا گیا۔

شہید گنج تحریک کے سفلی جذبات ات پڑنے لگے، تو پرانے شکاری نئے جال لے کر آن دھمکے۔ یعنی یکم ستمبر کو راولپنڈی میں پیر جماعت علی شاہ علی پوری کی صدارت میں حصولِ مسجد کے لیے نیا پروگرام وضع کیا گیا اور انہیں امیر ملت کا خطاب دیا گیا اس اجتماع میں سول نافرمانی کی تجویز پاس کی گئی۔ رضا کاروں کی بھرتی اور فراہمی فنڈ کا بھی اعلان کیا گیا۔ لیکن احرار کو اس اجلاس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔ اس پر ۱۵ ستمبر کے روزنامہ "انقلاب" لاہور نے حسب ذیل ادارتی نوٹ لکھا:

"یہ معلوم کر کے ہمیں بہت رنج ہوا کہ راولپنڈی کانفرنس کے کارکنوں نے احرارِ سلام کو اپنے مشوروں میں شرکت کی دعوت نہیں دی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ ایک بہت بڑی فروگزاشت ہے۔

مجلس اتحادِ ملت کے کارکن تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے شروع مجلس کے وقت بھی بزرگانِ احرار کا تعاون طلب کیا اور اس کے بعد اپنے اجلاسوں میں اور علانیہ کے وقت انہیں اطلاع دیتے رہے۔ شریک ہونا نہ ہونا ان کا اپنا فعل ہے۔ لیکن راولپنڈی کانفرنس کے کارکنوں کی یہ عقلیت درحقیقت قابلِ ملامت اور چودھری افضل حق کا یہ قول صحیح ہے کہ مجلس احرارِ اخلاقی طور پر راولپنڈی

کانفرنس کی قرارداد کی پابند نہیں۔

کمزور عقیدے کا مسلمان سیاسی شعور سے ہمیشہ بیگانہ رہا۔ روسا کی اخلاقی کمزوریوں سے واقفیت کے باوجود غربت اور سیاسی دباؤ نے اسے چپ رہنے پر مجبور کیے رکھا۔ اس پر غیر ملکی خلائی کے بوجھ نے اس کے دائمی کل پڈزے بیکار کر دیے اس تہری خلائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شعبہ ہائے انہیں اپنی ضرورت کے سانچے میں ڈھال لیا۔ سید جماعت علی شاہ صوفی منس آدمی تھے اور اپنے حلقہ اثر میں محترم بھی۔ لیکن انہیں سیاسیات کی خارزار وادی میں گھسیٹ لانا ان پر ظلم کرنا تھا۔ مگر سیاسی طایفہ آزمادوں کے قربان جانیے کہ ایک درویش کو قمار بازوں میں لایٹھایا۔

راولپنڈی کے اجتماع میں دو روز تک یہ بحث رہی کہ حصول مسجد کے لیے سول نافرمانی فوراً کی جائے یا بدیر۔ آخر ہاؤس نے یہ اختیار پیر جماعت علی شاہ کو دے دیا کہ وہ جب مناسب سمجھیں۔ اس پر پیر صاحب نے بات ۲۰ ستمبر پر طال دی۔

اس پر تبصرو کرتے ہوئے روزنامہ "انقلاب" نے، ستمبر کی اشاعت میں ان رہنماؤں سے گزارش کی کہ وہ سول نافرمانی کی بجائے، باہم اتحاد کی کوشش کریں۔ کیونکہ قومیں جنگ سے کم اور اتحاد سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔

یہ مفادِ عامہ کے خلاف ہے | مسٹر خالد لطیف گابانے ۲۰ اگست کو اسمبلی میں جس تحریک التوا کا نوٹس دیا تھا۔ ۲۰ ستمبر کو اس پر بحث

کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن اس کے جواب میں دائرہ سرائے ہند نے کہا:

"اس پر بحث مفادِ عامہ کے خلاف ہے"

پنجاب میں مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی مکمل اجازت ملنی چاہیے | ستمبر کو مولانا مظہر علی اظہر

سیکرٹری آل انڈیا مجلس احرار اور خواجہ محمد یوسف ایم ہایل سی (دہلیانہ) نے پنجاب کونسل کے آئندہ اجلاس کے لیے حسب ذیل قرارداد کا نوٹس دیا۔

"یہ کونسل حکومت سے سفارش کرتی ہے کہ پنجاب کے باقی اضلاع میں جہاں

مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی تاحال اجازت نہیں دی گئی۔ تلوار کو قانونِ اسلحہ کے عمل سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔“

**یوم شہید گنج** ملک لال دین قیصر سیکرٹری تحفظِ مساجد نے اعلان کیا کہ ۲۰ ستمبر کو یوم شہید گنج منایا جائے۔ لیکن اس پروگرام میں سول نافرمانی کی تحریک شامل نہیں۔

اس روز کے اخبار انقلاب لاہور (۱۱- ستمبر ۱۹۳۵ء) میں پندرہ وکلاء کی طرف سے اعلان شائع ہوا کہ

”و عنقریب مسجد شہید گنج سے متعلق قانونی کارروائی شروع کر دی جائے گی۔“

**تلوار رکھنے کی اجازت** شملہ- ۱۱ ستمبر پنجاب حکومت کی طرف سے مندرجہ ذیل کمیونٹک شائع ہوا۔

”۱۹۳۲ء میں حکومت پنجاب نے یہ پالیسی اختیار کی تھی کہ قانونِ اسلحہ ہند کے تحت تلوار پر جو پابندیاں عائد ہیں ان کو رفتہ رفتہ کم کر دیا جائے۔ مثلاً بعض جاگیرداروں، پچاس روپے یا پچاس روپے سے زائد لگان ادا کرنے والوں، انکم ٹیکس افسروں کو تلوار رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس سال جولائی کے مہینے میں پنجاب کے نواضلاع میں قانونِ اسلحہ کی دفعہ ۱۳ اور ۱۵ کے تحت تدار کو مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔ نومبر ۱۹۲۸ء میں پانچ اضلاع - مئی ۱۹۳۰ء میں پانچ اور اضلاع کو اس فرسٹ میں شامل کر دیا گیا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ پنجاب کے ۲۹ اضلاع میں سے ۲۲ اضلاع ایسے ہیں جہاں تلوار کو قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ضلع فیروز پور لاہور امرتسر، گورکھاؤں، راولپنڈی میں ان خاص اضلاع کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ قانونِ اسلحہ کے تحت سکھوں کو کرپان رکھنے کی اجازت ہے۔ چند سال ہوئے ہائیکورٹ پنجاب نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس وقت تلوار کسی سکھ کے پاس ہوگی تو اسے کرپان ہی کہا جائے گا۔ چنانچہ متعدد چھ اضلاع میں بھی سکھوں کو وہ امتیاز حاصل رہا جس سے باقی قومیں محروم تھیں۔ یا جس طرح سکھ تلوار

رکھتے تھے۔

حکومت پنجاب نے حکومت ہند سے یہ درخواست کی تھی کہ اس امتیاز کو  
ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ ان چھ اضلاع میں تلوار کو قانون اسلحہ کی دفعات سے  
مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔

مولانا احمد علی لاہوری کا بیان | پنجاب میں جیسے ہی حکومت نے اسلحہ (تلوار) سے  
پابندی اٹھائی۔ غیر مسلموں کی طرف سے اچھی خاصی  
ہنگامہ آرائی ہوئی۔ چنانچہ سول اینڈ ملٹری گزٹ نے لکھا کہ اسلام نے مسلمانوں کو تلوار لے کر  
چلنے کی کہیں اجازت نہیں دی اور نہ ہی اس قسم کا کوئی دوسرا حکم دیا ہے۔

اس پر ۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کے روزنامہ انقلاب نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا:  
”سول اینڈ ملٹری گزٹ نے تلوار رکھنے کے ضمن میں عالم دین بننے کی کوشش  
کی ہے اور کہا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو تلوار باندھنے کا حکم نہیں دیا ہے۔  
ہمارے خیال میں سول اینڈ ملٹری گزٹ اور دوسرے غیر مسلم اخباروں کا شریعہ  
اسلامی کے متعلق اس قسم کی غلط بیانی کرنا صریحی خلاف ورزی اور مداخلت فی الدین  
ہے۔ علمائے اسلام کو چاہیے کہ تلوار کے متعلق تمام دینی احکام مسلمانوں، غیر مسلموں  
اور حکومت کے خداوندوں کی اطلاع کے لیے شائع کریں۔“

روزنامہ انقلاب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے  
۱۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو حسب ذیل بیان دیا۔

”ہمیں روزنامہ انقلاب کی رائے سے پورا اتفاق ہے کہ سول اینڈ  
ملٹری گزٹ کا یہ کہنا کہ اسلام میں مسلمانوں کو تلوار رکھنے کا کہیں حکم نہیں، اسلام  
کے متعلق افتراء ہے۔ اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کا تعلیم اسلام سے ناواقف  
ہونے کا بین ثبوت ہے۔ فقط تلوار نہیں بلکہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے وقت

۱۰ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کا انگریزی روزنامہ تھا جسے لندن کی ایک لیڈنگ فرم چلا رہی تھی البتہ اس میں کچھ  
ہندوستانی حصہ دار بھی تھے جن میں سردار بلدیو سنگھ جو بعد میں یونیورسٹی گورنمنٹ میں سکھوں کے نمائندے ہو کر وزیر بنے  
دوسرے دہلی کے ڈالیا تھے۔

کے تمام ہتھیاروں سے مسلح رہیں۔

جیسے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ

الْخَيْلِ تُرْمِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخِرِينَ

مَنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ

وَأَنْتُمْ لَا تظَلُمُونَ (قرآن مجید سورۃ الانفال رکوع ۴)

ترجمہ: دشمنوں (کے شر سے محفوظ رہنے) کے لیے جتنی تورت (یعنی ہتھیار)

ملن ہو سکے اور پلے ہوئے گھوڑے تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے

دشمنوں پر دھاک پڑے اور ان کے سوا دوسروں پر جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں

جانتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں دینی فراہمی سامان و اسلحہ جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ

تمہیں پورا ملے گا۔ اور تمہارا حق رہ نہیں جائے گا۔ انتہی۔

اس کی تائید مفتی کفایت اللہ صدر جمعیتہ علمائے ہند دہلی۔ مولانا احمد سعید ناظم جمعیتہ علمائے

ہند دہلی، مولانا حسین احمد مدنی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مولانا عزیز الدین خطیب شاہی مسجد لاہور، مولانا عبدالعزیز خطیب جامع مسجد گوبرا نوالہ،

مولانا محمد چنانچہ مدرسہ انوار العلوم گوبرا نوالہ، مولانا محمد شریف مدرس مسجد فتح پوری دہلی۔ مولانا

عبدالرحمان اور دوسرے علمائے حق نے کی۔

احرار کو مخالفین کے زعمے میں دیکھ کر مرزا بشیر الدین محمود کو گمان

ہوا کہ زخمی شیر برداگر فریاد جھلکا کر دیا جائے تو بہار راستہ صاف ہو

سکتا ہے۔ چنانچہ ۳ ستمبر ۱۹۳۵ء کے اخبار الفضل میں مجلس احرار کو قادیان میں مباہلہ کی دعوت

دے دی گئی۔ جسے احرار نے فوراً قبول کر لیا۔ اور ۱۳ ستمبر کو قادیان پہنچنے کا اعلان کر دیا اس

اعلان کا شائع ہونا تھا کہ قادیانیوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور گلے اپنے آباؤ اجداد کو پکارتے

کہ دیکھو جی! احرار والے پھر قادیان میں فساد کرنے آرہے ہیں۔ حالانکہ خود ہی آنے کی دعوت

دی اور خود ہی وادیا کرنے لگے۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ جس شہر کو مرہ یا گھائل سمجھ رہے تھے، وہ ان کے لیے زندہ ہے۔

مجلس احوار نے مولانا منظر علی اظہر کو قادیان پہنچ کر بشیر الدین محمود سے مباہلہ کے لیے نامزد کیا اور روزنامہ مجاہد کی ہر اشاعت میں اس تاریخ کو قادیان جانے کا اعلان ہونے لگا۔ پنجاب کے دیگر شہروں سے احرار رضا کار قادیان جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ۱۹۳۴ء کی طرح حکومت تماشائی بن کر خاموش رہی۔ کیونکہ اب تو مرزائی لیڈر نے خود ہی احرار کو قادیان آنے کی دعوت دی تھی۔

تاریخ مقررہ پر مولانا منظر علی اظہر مجہ اپنے رفقاء جن میں صاحبزادہ فیض الحسن سجان نشین آلوہارا مولانا محمد حیات احاجی عبدالرحمن میونسپل کمشنر ٹیالہ، اسٹریٹاج الدین انصاری، خواجہ عبدالرحیم عابز اور راقم شامل تھے۔ قادیان پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر مولانا عنایت اللہ نے سینکڑوں مسلمانوں کے ساتھ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ نماز جمعہ صاحبزادہ صاحب نے پڑھائی۔ اس سے پیشتر محترم عابز صاحب اور راقم کے کفر شکن کلام نے قصر قادیان میں دراز ڈال دی۔ دوسرا اجلاس نماز عصر کے بعد ہوا۔ جس میں مولانا منظر علی اظہر نے حسب ذیل تقریر کی:

”حضرات! آج میں آپ کے سامنے اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ قادیان کی سرزمین میں جہاں مرزا محمود کے ابا نے نبوت کا دعویٰ کیا اور جس جگہ قرآن مجید کے مقابلہ میں بقول مرزا محمود نیا قرآن نازل ہوا اس کے ابا پر۔ وہ پرانا ہو چکا ہے، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ وہی قرآن قادیان میں دوبارہ نازل ہوا۔ میں مرزا محمود کے اس چیلنج کا جواب دوں، جو اس نے اپنے ابا کی نبوت کو سچا ثابت کرنے کے لیے مجلس احوار کو کیا ہے۔“

میرے ہاتھ میں اس وقت ۳۔ ستمبر ۱۹۳۵ء کا ۱۰۰۰ ”الفضل“ موجود ہے جس میں مرزا محمود کا چیلنج مباہلہ مشائع ہوا ہے۔ اسے شروع سے آخر تک پڑھ جاتیے۔ اس میں کہیں بھی مرزا محمود نے یہ نہیں کہا کہ میں خود مباہلہ میں نکوں

گا۔ بلکہ کہا ہے کہ ہم میں سے پانچ سو یا ہزار مقابلے کے لیے آئیں گے۔ حالانکہ قرآن مجید میں کسی جگہ نہیں آیا کہ مباہلہ کے لیے پانچ سو یا ہزاروں کی تعداد ہونا ضروری ہے۔ اگر مرزا محمود کو احکام قرآنی کے منشاء سے آگاہی ہوتی تو یہ ہرگز نہ کہتا کہ پانچ سو یا ہزار مباہلہ کے لیے نکلیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نجران کے عیسائی وفد کو مباہلہ کے لیے بلایا تھا۔ اس وقت کسی مقررہ بڑی تعداد کی شرط نہیں لگائی تھی۔

یہ بات احرار کے حصے میں آئی ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پرانے عیسائیوں کو آئیہ مباہلہ کے ذریعے مباہلہ کا چیلنج دیا تھا اسی طرح ہم بھی آج ان نئے مسیحوں یعنی قادیانیوں کو یاد دلاتے ہیں کہ مباہلہ کے بارے میں حکم قرآنی یہ ہے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں، تم اپنی عورتوں کو بلاؤ۔ ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں، تم اپنے نفسوں کو بلاؤ۔ پھر ہم مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہم میں سے جس کو زیادہ سے زیادہ بد عقیدہ یا بد عمل خائن یا غدار سمجھے اس کو مباہلہ کے لیے بلا لے۔ وہ شیخہ ہو یا سنی۔ بریلوی ہو یا دیوبندی، حنفی ہو یا اہلحدیث وہ اسی طرح اپنے خاندان کو میدان مباہلہ میں لے کر نکلے گا۔ جس طرح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امام حسین کو گود میں لیے ہوئے اور حضرت حسن کو انگلی سے لگائے ہوئے اور جناب فاطمہ الزہراء اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو پیچھے پیچھے ہمراہ لیے ہوئے وفد بنو نجران کے مقابلے میں مباہلہ کے لیے نکلے۔

ہم یہ جانتے ہیں اور ہم کو معلوم ہے کہ عام قادیانی تمہارے فریب میں آئے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر دانستہ جھوٹے دعوے کرنے کا الزام ہے تو تمہارے ابا مرزا غلام احمد پر ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول پر افترا کیا۔ یا تم پر ہے جو امام ودجی کو پیش گوئیوں کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہو۔ اس

یہاں اگر تم میں حوصلہ ہے کہ میدانِ مباہلہ میں اپنے اور اپنے آبا کے دعووں کی تائید کر سکو تو خود میدانِ مباہلہ میں آؤ اور اپنے خاندان کو ساتھ لاؤ۔ یہ مناسب نہیں کہ اپنے فریب خوردہ پیروؤں کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاؤ اور خود گوشہٴ حافیت میں بیٹھ کر دوسروں کا تماشہ دیکھو۔ ہم میں سے سید عطار اللہ شاہ بخاری کو، مولانا سید داؤد غزنوی کو، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کو، مجھ کو یا چودھری افضل حق، جس کسی کو تم چاہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک بلا تامل آیات قرآنی کی تکمیل کرتا ہوا، تمہارے مقابلہ میں میدانِ مباہلہ میں نکل آئے گا۔

لیکن اس امیر کو واضح کرنے کے لیے ہم کسی صورت میں بھی مباہلہ سے گریز نہیں چاہتے۔ اور مرزا محمود کو ہی گریز کا موقعہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ میں صاف اور صریح، بغیر مبہم الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر مرزا محمود پانچ سو اور ہزار تو کیا اگر وہ پانچ ہزار یا دس ہزار آدمیوں کو لانے کی شرط پر بھی اجازت کو منظور کرے تو ہم اس تعداد کو بھی پورا کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ آدمی میدانِ مباہلہ میں پیش کر دیں گے۔ ہم مرزا محمود احمد کو کوئی موقعہ دینا نہیں چاہتے کہ وہ مباہلہ سے پہلو تھی کر سکے۔

مرزا محمود نے اپنی تقریر میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔ لیکن میں فقط اس مضمون کے متعلق اظہارِ خیال کروں گا، جو مباہلہ کے متعلق ہیں یا جس کا تعلق مجلسِ احرار سے ہے۔ دوسرے امور کے متعلق میرے پاس نہ فرصت ہے نہ میں تبصرہ کروں گا۔ مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ میں باقی تمام خیالات میں مرزا محمود کا ہم خیال ہوں۔

(روزنامہ "مجاہد" لاہور۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء)

احرار کی اس جوأت پر مرزائی پریشان ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ احرار، تحریکِ شہید گنج میں اُبھے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے چیلنج کو قبول نہیں کریں گے۔ لیکن احرار نے بھی بڑے کو اس کے گھر تک پہنچانے کے چھوڑا۔



امیر ملت کا خطاب | تحریک شہید گنج کے امیر منتخب ہونے کے بعد پیر جماعت علی شاہ صاحب نے ۱۵ ستمبر کو پہلی مرتبہ لاہور میں ہزار ہا عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:-

”انگریزوں کو ہمارے ملک میں آئے ہوئے چھیالیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس عرصے میں مسلمانوں کی ایک درخواست بھی منظور نہیں کی گئی۔ ہم نے حکومت سے ہمیشہ و ناداری کی اور کسی قسم کی بغاوت نہیں کی اور نہ ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے حکومت کی خاطر اپنے ترک بھائیوں پر گولیاں چلائیں اور انگریزوں کو فتح دلائی، جس کا بدلہ ہمیں اس صورت میں دیا جا رہا ہے کہ ہماری مسجدوں کو گرایا جاتا ہے۔“

بارشاہ والد کی جگہ اور رعیت بجائے اولاد ہوتی ہے۔ آج تک کسی باپ نے بیٹے کا گلہ نہیں کاٹا۔ جو باپ ہو کر بیٹے کا گلہ کاٹے وہ بادشاہ نہیں ہوتا۔

درود نامہ ”انقلاب“ لاہور ۱۴ ستمبر ۱۹۳۵ء

امیر شریعت اور امیر ملت | تن آسان قومیں بہت اور ایمان کے ساتھ حافظہ بھی کھو بیٹھتی ہیں۔ آباؤ اجداد کی حقیقت ان کے لیے داستان پارینہ بن کے رہ جاتی ہے۔ یہیں سے قوموں کے زوال کی ابتدا ہوتی ہے۔ جنگجو قومیں مرع اور بٹیروں کی پالیا سمجھانے لگتی ہیں اور پھر ————— پھر غرقِ مئے نابِ آخر۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے  
شمشیر و سناں اول طاؤس و ربابِ آخر (اقبال)  
تختِ طاؤس کے وارث جب محفلِ ناؤ نوش سجا بیٹھے تو ہزاروں میل سے چل کر آنے والی فرنگی قوم نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔ پھر انہیں یاد نہ رہا کہ ہم کون تھے، صدیوں کی حقیقت افسانوں کے تول تیلنے لگی۔ اور یہی لوگ خواب میں بڑ بڑانے لگے۔ یہ سنے اُونچے اُونچے ہو کوٹ تھے اوہ ہیں اب زمیں سے طے ہوئے  
دہاں اُٹو آ کے ہیں بولتے، جہاں باز پر نہ ہلا سکے

۱۹۳۰ء انگریزی سامراج کے خلاف جہاد کا بھرپور سال تھا۔ غلامی سے نجات کے لیے جذبات کی بھٹیاں آگ آگ رہی تھیں۔ متحدہ ہندوستان کی سرزمین غیر ملکی قدم اکھاڑنے میں نولاہ کا دل ایسے بیٹھی تھی۔ اہل ایمان کے دل فرنگی ظلم و جور کے سامنے سینہ سپر تھے۔ جہاد کی اس صفت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تھے کہ انہیں لاہور میں جمع پانچ صد علمائے حق نے، جن میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت لاہوری اور مولانا ظفر علی خاں شریک تھے امیر شریعت کا اعزاز بخشا۔ ظفر علی خاں نے اسی خوشی میں کہا۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمرے

بلبل چمک رہا ہے ریاض رسول میں

پانچ برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اپنے مندرجہ بالا فیصلے کے خلاف بغاوت کر دی

اور امیر شریعت دہنوں نے ہمیشہ انگریزوں سے جہاد کیا، کا دامن چھوڑ کر پیر حاجت علی شاہ کو

امیر ملت منتخب کر لیا، جنہوں نے انگریزوں کی وفاداری کا یوں اظہار کیا:

”ہم نے اپنے ترک بھائیوں پر وقت کی حکومت کی خاطر گولیاں چلائیں اور

انگریزوں کو فتح دلائی۔“

پھر مولانا ظفر علی خاں کے حافظے کی موت کیسے یا تلون کی انتہا کہ اتنا بھی یاد نہ رہا کہ وہ

امیر شریعت کے متعلق کہہ چکے ہیں۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمرے

بلبل چمک رہا ہے ریاض رسول میں

امیر ملت کا دامن تھامتے ہی کہنا شروع کر دیا۔

پانچ لگوں کا ہے پابند شریعت کا امیر

اس میں طاقت ہے تو کرپان کی جھنکار سے ہے

”نگارستان“ ص ۱۷۶ مجموعہ کلام مولانا ظفر علی خاں

ایسے تلون مزاج لوگوں کے لیے غالب مضموم نے کہا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہراک راہرو کے ساتھ - پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مرکزی مجلس اصرار کی حاملہ کا اجلاس | ۱۶ ستمبر کو لاہور میں مرکزی مجلس اصرار کی مجلس عاملہ کی مشاورت کا اجلاس ہوا، جس میں مسجد شہید گنج

کے انہدام پر سکھوں کی مذمت کی گئی اور حکومت کی متشددانہ پالیسی کی بھی مذمت کی گئی۔ اور اس امر پر تالیپندی کی کا اظہار کیا گیا کہ تمام مسلم جماعتوں نے سول نافرمانی کا فیصلہ نہیں کیا۔

حکومت کو مشورہ دیا گیا کہ وہ تمام نظر بندوں اور قیدیوں کو فوراً رہا کر دے اور شہداء کے پس ماندگان کو معقول معاوضہ دے۔ نیز مجلس عاملہ اصرار کو ہدایت کی گئی کہ وہ مسجد شہید گنج کے متعلق سکھوں سے کسی باعزت سمجھوتے کے لیے گفت و شنید جلد سے جلد شروع کرے اور اس کے نتیجے سے مسلمانوں کو آگاہ کرے۔ تیر ماہ تحت مجلاس کو ۲۰ ستمبر کے یوم شہید گنج کے اجتماع میں پرامن شرکت کی اجازت دی گئی، اس کے ساتھ ہی مجلس مشاورت نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ مسجد شہید گنج کے سلسلے میں مرزائیوں کا کسی قسم کا تعاون قبول نہ کریں کیونکہ یہ مسلمانوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ غیر مسلموں کو اس میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔

سکھوں کے خلاف دعویٰ | ۱۸ ستمبر کو لاہور میں مسجد شہید کرنے کے سلسلے میں دفعہ ۲۹۵ کے تحت سکھوں پر ڈاکٹر محمد عام ایڈووکیٹ اور لہیانا

کے وکیل میاں عبدالحمید کی طرف سے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا گیا۔

یوم شہید گنج | ۲۰ ستمبر کو لاہور شاہی مسجد میں پیر جماعت علی شاہ کی صدارت میں یوم شہید گنج پر سیاہ سے بڑا اجتماع ہوا جس میں دو لاکھ کے قریب مسلمان شریک ہوئے۔

اس میں ہمدردیاں جماعتوں نے شرکت کی۔ اصرار رہا اور کلام اور صحافی بھی شریک ہوئے۔ مسجد پر ہزاروں پر سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ عوام کا تاثر تھا کہ اس جلسے میں حصول مسجد کیلئے ہرگز کوئی کامیابی نہیں چاہ گھنٹے کے اجلاس میں کسی ایک مقرر نے اس خیال کی تائید نہیں کی۔ جس نے کہا یہی کہا کہ مسجد مفاہمت سے یا قانونی پارہ جونی سے مل سکتی ہے۔

جیشہ کی جنگ | ان دنوں اٹلی اور اپنی بیٹیا کے درمیان جنگ کے امکان پر روز بڑھتے جا رہے تھے۔ اٹلی کے ڈکٹیٹر موسولینی نے سجاوڑ کو ٹھکرا

دیا تھا اور افواہ متحدہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

اس وقت یورپ نازک ترین دور سے گزر رہا تھا۔ اور نخطو تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے حالات پیدائ ہو جائیں۔ اطالوی کابینہ نے بھی تمام تجاویز کو ناقابل قبول قرار دیا۔

اس طرح برلن کے سرکاری حلقے اطالیہ کے فیصلے پر سخت شجب ہو رہے تھے۔ ۱۱۔ ستمبر کو ٹیلر نے اعلان کیا کہ میرے وزیر اس بات پر غور کریں گے کہ فرانس کا وزیر اعظم موسیو وال کب تک برطانیہ کی پشت پناہی کرتا رہے گا۔ تاہم اس بات کا آخری فیصلہ موسولینی کے جواب پر منحصر ہے۔

لیگ آف نیشنز کی تجاویز کو ابی سینیا نے منظور کر لیا تھا۔ لیکن اطالیہ نے اسے قبول نہ کیا۔ اطالیہ کے چار مطالبات تھے۔

۱۔ جلسہ کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ ۲۔ اور سمندر تک پہنچنے نہ دیا جائے۔

۳۔ ابی سینیا کی افواج کو غیر مسلح کر دیا جائے۔

۴۔ اطالیہ کو ابی سینیا کے علاقے کی ایک پٹی دے دی جائے۔

یہ ۲۶ ستمبر کے اخبارات کی خبر تھی۔

امیر ملت نے بحیثیت پنجاب کے ایک مقدر

پیر کے برطانوی حکومت کو اپنی دیرینہ خدمات کا

واسطہ دے کر منوانا چاہا۔ راولپنڈی کے اجلاس میں کوئی لائحہ عمل سامنے نہ آیا، تب حالات واضح ہو کر سامنے آگئے۔ گمراہی کے تمام بادل چھٹ گئے۔ حقیقت کا سورج دھوپ دینے لگا۔ اپنے اور پرانے یہ بات جان گئے کہ مسجد کا کوئی قضیہ نہیں، صرف احرار کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کمزور کرنا مقصود ہے تو احرار اپنی عسکری قوت سمیت سامنے آگئے۔

۲۲ ستمبر رات نوبے دہلی دروازہ کے باغ میں اپنا جلسہ کر کے صاف بات کہہ دینے کا

فیصلہ کیا۔ اس جلسہ میں عوام کی تعداد سچا سچ ہزار کے قریب تھی۔ احرار کے لٹھ بند رضا کار جلسہ کے ارد گرد موجود تھے۔ مسلح پولیس بھی کافی تعداد میں تھی۔ مخالفین بھی پوری طاقت سے موجود تھے۔ اسٹیج پر مولانا داؤد غزنوی، مولانا منظر علی اظہر، چودھری افضل حق اور دیگر متاعی احرار رہنما موجود تھے۔ لیکن اس جلسے میں صرف صدر مرکزیہ مولانا حبیب الرحمن لہیبانوی نے

اپنی زندگی اور احوار کی تاریخ کی مختصر تقریریں کہا:  
 ”میں مسجد شہید گنج گرانے کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ڈالتا ہوں۔ اگر حکومت  
 چاہے تو مسجد صبح نمودار ہونے سے پہلے مل سکتی ہے۔ اگر حکومت مجھے گرتار  
 کر لے تو میں قید ہونے کو تیار ہوں تاکہ بات صاف ہو جائے۔ مسجد کا ملنا نزلنا  
 حکومت کی مرضی پر منحصر ہے۔“

باقی بات میں عدالت میں کروں گا اور ثابت کروں گا کہ مسجد کے گرانے میں  
 حکومت کا کیونکر ہاتھ ہے۔ حکومت اگر مجھے گرتار کرنا چاہے تو میں اپنے  
 دفتر میں اس کا انتظار کروں گا۔“

یہ آخری فقرہ کہہ کر جلسہ برخاست کر دیا۔ مخالفین منہ تھکتے رہ گئے، جو جلسے کو خراب کرنے  
 کا منصوبہ لے کر آئے تھے۔

مولانا حبیب الرحمن رات دو بجے تک پولیس کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن کوئی نہ آیا۔

تلوار کے متعلق حکومت پنجاب کا اعلان | شملہ - ۲۸ ستمبر سرکاری اعلان منظر ہے۔  
 کہ:

”حکومت پنجاب کی سفارش پر حکومت ہند نے حال ہی میں ایک اعلان کیا  
 تھا کہ حدود پنجاب میں تلواریں قانون اسلحہ کی دفعات ۱۳ اور ۱۵ سے مستثنیٰ  
 ہوں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض حلقوں میں تلواریں بنانے اور فروخت کرنے  
 کے متعلق کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔“

قانون اسلحہ کی دفعات ۱۳ اور ۱۵ جن کا ذکر حکومت کے سابق اعلان میں  
 تھا۔ سامان حرب کو قبضہ میں رکھنے اور لے جانے کے متعلق ہیں۔ پنجاب کے  
 طول و عرض میں تلواریں اجازت نامہ حاصل کیے بغیر بھی لے جانی جاسکتی ہیں۔  
 تلواریں بنانے اور بیچنے کے متعلق جو قواعد ہیں، جدید اعلان سے ان پر کچھ اثر  
 نہیں پڑتا۔ جو قانون اسلحہ ۱۹۲۲ء کے قاعدہ ۱۳ اور دفعہ ۱۵ کے ماتحت ہیں۔  
 تلواریں بنانے اور بیچنے کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اجازت حاصل کرنا

ضروری ہے۔

حکومت کے اعلان کی توضیح: سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمائندے نے ان شکوک و شبہات کے ارتقاع کے لیے جو تلواروں کے متعلق حکومت کے اعلان کے بعد عوام میں پیدا ہو سکتے ہیں تحقیق کی۔ اس کے نتیجہ میں ایک ماہر قانون نے حسب ذیل رائے ظاہر کی۔

حدود پنجاب کے اندر تلواروں کو قبضہ میں رکھنا اور ان کو استعمال کے لیے لے جانا قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ لیکن شمشیر سازی اور شمشیر فروشی کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔

اعلان میں تھا کہ قانونِ اسلحہ کے ماتحت قواعد کے شیڈول میں بعض الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ درج کر دیے گئے ہیں۔ اس کا یہ منشا سمجھا جاتا ہے کہ تلواروں کو قانونِ اسلحہ کی بعض دفعات سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

پنجاب کے تمام اضلاع میں تلواں اور ان کے علاوہ گپتیاں ..... قانونِ اسلحہ کی دفعات ۵۱ اور ۵۱ا سے مستثنیٰ ہو رہی گی۔

دفعہ ۵۱: سرکاری اعلان سے قانونِ اسلحہ کی دفعہ ۵۱ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس دفعہ کا منشا یہ ہے کہ کوئی شخص اجازت نامہ کے بغیر اور طریقہ اور حد کے باہر جو مقرر کر دی گئی ہو۔ سامانِ حرب نہ بنائے نہ فروخت کرنے کے لیے رکھے نہ فروخت کرنے کے لیے پیش کرے۔ اس میں کوئی ایسی تصریح نہیں ہے جس سے ایسے سامانِ حرب کی فروخت ناجائز ٹھہرے جو ذاتی استعمال کے لیے جائز طور پر کسی کے قبضہ میں ہو۔ بشرطیکہ فروخت اس شخص کے ہاتھ کیا جائے جس کے لیے سامانِ حرب کو قبضہ میں رکھنا کسی قانون کی رو سے ممنوع قرار نہ دے دیا گیا ہو۔ لیکن فروخت کرنے والے کا فرض ہوگا کہ بلا تاخیر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا قریبی تھانہ کے انسپکچر کو فروخت کی اطلاع دے اور خریدار کے نام و نشان سے آگاہ کرے۔

سرکاری اعلان کی رو سے ایک شخص ذاتی استعمال کے لیے تلوار قبضہ میں

رکھ سکتا ہے۔ اور لے جا سکتا ہے۔ لیکن قانونِ اسلام کی دفعہ ۲۵ کی پابندی کیے بغیر تلواریں بنا اور بیچ نہیں سکتا۔

**امیر ملت کا منصب** پنجاب میں روحانیت کے مدعی اگر اپنے منصب پر فائز رہتے تو ہتھکی ہوئی انسانیت صراطِ مستقیم پر آجاتی۔ لیکن بجائے عاقبت کے انہوں نے دنیا کو اپنے لیے پسند کیا۔ وہ بھی غیر ملکی اقتدار کے مہارے کو ایسے لوگوں کے گھر بجلی کے چراغوں سے روشن رہے۔ مگر جن ستاروں کی نوکاشا نہ پیر کو رونق بخشی رہی وہ خود زندگی بھر اندھیرے میں رہے۔ اس پر اقبال جیخ اٹھا۔

مجھ کو تو بیسہ نہیں مٹی کا دیا بھی  
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے روشن

پیر حاجت علی شاہ کو مسلمانوں نے حصولِ مسجد کے لیے امیر ملت منتخب کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس منصب پر یہ آئے نہیں لائے گئے تھے۔ کیونکہ یہ سکیم ہنوز ادھوری تھی اور مرے چلانے والا ہاتھ پہچانا گیا تھا۔ لہذا پیر صاحب کو اس رخ پر موڑ دیا گیا انہوں نے ۲۔ اکتوبر کو حصولِ مسجد کے لیے دس لاکھ رضا کاروں کی بھرتی کا اعلان کیا۔ اب نو من تیل ہوگا تو رادھا ناچے گی۔

لاہور میں اچانک ہندوؤں سے کاروباری بائیکاٹ کی تحریک چل نکلی۔ اس وقت تک تمام منڈیوں پر غیر مسلم قابض تھے۔ انہوں نے جواب میں مسلمان کے ہاتھ سودا سلف بیچنے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواجہ فروش سے درمیانے درجے کا کاروباری مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ گیا۔ اس تحریک کا محرک کون تھا؟ اس کی ذمہ داری کسی نے قبول نہیں کی۔ یہاں تک کہ ۱۴۔ اکتوبر کو امیر ملت نے بھی کہہ دیا کہ:

”میں نے بائیکاٹ کے متعلق کوئی حکم نہیں دیا۔ البتہ مسلمانوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا مشورہ دیا ہے۔“

اس سے پیشتر ۱۲۔ اکتوبر کو مسلم اخبارات نے ہندوؤں سے درد مندانہ گزارش کے عنوان سے ادارتی نوٹ لکھے، کہ وہ مسلمانوں سے کاروباری بائیکاٹ ختم کر دیں۔ نیز مسلمانوں

کو بھی مشورہ دیا کہ وہ بھی اس قسم کے ارادوں سے باز رہیں۔

اس کا رو باری لڑائی میں مسلمان مسجد سے ہٹ کر معاشی مشکلات میں الجھ گیا۔ دوسری طرف امیر ملت نے مسلمانوں کو تلوار رکھنے پر زور دیا۔ لہذا وہ تلوار کی خرید و فروخت میں لگ گئے۔ اس طرح مسجد کی تحریک کمزور پڑ گئی اور امیر ملت ہندوستان کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ اس دوران احمد آباد پہنچ کر انہوں نے اپنی تقریر میں کہا:

”حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو لبشر کہنے والے کافر ہیں۔ وہ کافر ہے  
ہیں جو کسی پیر کے نام کی چیز کو حرام قرار دیتے ہیں“

(روزنامہ الجمعیتہ دہلی۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء)

اس پر روزنامہ ”انقلاب“ لاہور نے ۲۲ اکتوبر کے پرچے میں احتجاجی نوٹ لکھا۔  
”ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ رپورٹ کس حد تک درست ہے۔ لیکن ”الجمعیتہ“ دہلی بہ حال  
ایک ذمہ دار اخبار ہے۔ مسجد شہید گنج کے معاملے میں مسلمانوں کے مطالبے کا  
نہایت سرگرم جامی ہے۔ اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اس نے اپنے  
صفحات پر کسی غیر ذمہ دار تحریک کو شائع کرنا گوارا کیا ہو۔ اس طرح اجیر کی ایک  
اطلاع ہے کہ وہاں حضرت امیر ملت نے سلطان ابن سعود کے معاہدہ پر شدید  
ہتکتہ چینی کی ہے۔ بہاری رائے ہے کہ پیر صاحب نے یہ غیر متعلقہ اور نامناسب  
طرز گفتگو اختیار کیا ہے۔“

روزنامہ ”انقلاب“ اور مرزائی | مسجد کی تحریک میں مرزائی بدستور اپنے عقائد باطلہ اور  
ملت اسلامیہ میں تخریب کا باعث بنے رہے۔ وہ

شکل و صورت اور لباس سے مسلمان دکھائی دیتے لیکن اپنی حرکات سے مسلمانوں کے دماغ  
تخریب کی تخم ریزی کرنے میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً حواری کے خلاف پروپیگنڈا  
کرنے میں بہترین مصروف تھے۔ جہاں چار مسلمان دیکھتے ان میں شامل ہو کر حواری کو گایاں دے  
گتے۔ تاہم حواری بھی اس سے فائل نہیں تھے۔

روزنامہ ”انقلاب“ لاہور کے مدیر مولانا غلام رسول مہران دنوں آشوب چشم کے مرض



میں مبتلا تھے۔ لہذا اخبار مذکور کی ذمہ داری عبدالمجید سائیکس پر تھی۔ انہوں نے موقع کو غنیمت جان کر یکے بعد دیگرے تین اڈیٹوریل حرار کے خلاف اور مرزائیوں کے حق میں لکھ مارے۔ ۲۔ اور ۳۔ اکتوبر کے اڈیٹوریل خاص کر مرزائیوں کی حمایت میں تھے۔ اس کے جواب میں روزنامہ ”مجاہد“ نے بھی اڈیٹوریل لکھے۔ اس قلمی چیلنج کے باعث ”انقلاب“ کی عوامی حیثیت مشکوک ہو گئی۔

ڈاکٹر امیتکر کا بیان | بمبئی کے ضلع ناسک میں اچھوتوں کی ایک کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ۱۵۔ اکتوبر کو ڈاکٹر امیتکر نے کہا:

”اچھوتوں کو چاہیے کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ ہو جائیں اور کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیں، جو ان سے پوری طرح تعاون کرے اور ان کے ساتھ ملنے بیٹھنے میں کوئی امتیاز نہ برتے۔ میں اپنے اچھوت بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اپنے لیے کوئی دوسرا مذہب اختیار کریں اور ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی پہلی غلطی کی تلافی کریں۔“

گاندھی جی نے ڈاکٹر امیتکر کے مندرجہ بالا بیان پر سخت پریشانی کا اظہار کیا۔ اور وار دھا سے گاندھی جی نے کہا کہ اگر واقعی ڈاکٹر امیت کر کا یہی خیال ہے تب مجھے اس کا بہت افسوس ہوا ہے۔ لیکن مذہب کسی مکان یا لباس کی طرح نہیں جو اپنی مرضی کے مطابق فوراً تبدیل کر لیا جائے۔ یہ معاملہ جسم کا نہیں، روح کا ہے۔ مذہب ایسا ایسا رشتہ ہے۔ جو انسان کو خالق سے ملاتا ہے۔ مذہب انسان کی موت کے بعد بھی برقرار رہتا ہے۔ اگر ڈاکٹر امیت کر کو خدا پر بھروسہ ہے تو میں انہیں مشورہ دے گا کہ وہ غصے کو مٹھوگ دیں اور اپنے فیصلے پر اصرار نہ خور کریں۔

مجلس اصرار اور اچھوت | ڈاکٹر امیتکر کے بیان کے بعد مجلس اصرار نے ۲۰ اکتوبر کو مجلس مشاورت کا ایک عام اجلاس منعقد کیا۔ جس

کی صدارت چودھری افضل حق نے کی۔ اس میٹنگ کے ایجنڈے میں ڈاکٹر کے اس بیان کے متعلق جس میں اس نے اچھوت قوم کو تبدیلی مذہب کا مشورہ دیا ہے غور و خوض

کرنا ہے۔

صبح آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک اس پر بحث رہی۔ آخر مجلس نے حسب ذیل فیصلہ کیا۔

۱۔ مجلس مشاورت کا یہ اجلاس ڈاکٹر امیتکے اس اعلان کے سلسلے میں مجلس احوار نے جو کام اس وقت تک کیا ہے اسے نظر استحصان دیکھنا ہے اور دفتر کی اس تجویز کی تائید کرتا ہے کہ ڈاکٹر امیت کے پاس مجلس احوار کی طرف سے ایک مختصر وفد بھیجا جائے۔

۲۔ مجلس مشاورت کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ شعبہ تبلیغ مجلس احوار، اچھوتوں کو ہندوستان میں دوسرے ہندوستانیوں کے برابر درجہ دلانے کی سعی کرے نیز اس سلسلے میں دنیا پر واضح کر دے کہ صرف اسلام ہی ہر قسم کے امتیازات دھانے والا مذہب ہے۔

مجلس مشاورت کے فیصلے کے فوراً بعد مجلس احوار نے ڈاکٹر امیت کے خط و کتابت شروع کر دی اور مجلس احوار بمبئی کے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ دفتر کو تمام حالات سے مطلع کریں کہ بمبئی میں اس کام کو کس طرح سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ یا بمبئی مجلس احوار خود اس معاملے میں مرکز کی کیا امداد کر سکتی ہے۔

۲۱۔ اکتوبر کو مولانا منظر علی اظہر کی طرف سے ایک خط ڈاکٹر امیت کے نام لکھا گیا اور ملاقات کے لیے وقت مانگا گیا۔

اس دوران مجلس احوار نے پنجاب کے متعلق جو معلومات حاصل کیں وہ حسب ذیل ہیں۔ چودہ پندرہ لاکھ کے قریب اچھوت پنجاب بھر میں موجود ہیں۔ اور ان کا بیشتر حصہ مسلمانوں کے گاؤں میں آباد ہے، وہ بہت ہی آسانی سے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہاں کے زمیندار اپنی زبان سے ان کو مسلمان ہونے کے لیے کہیں۔

امید ہے کہ مجلس احوار کا شعبہ تبلیغ پنجاب میں اس ضمن میں بہترین خدمت انجام دے سکے گا۔

دفتر مجلس احوار مرکزیہ کا خیال تھا کہ ہم چھوٹوں میں کام کرتے رہیں اور اخبارات میں اس کا ذکر نہ آئے تاہم مجلس مشاورت نے ہدایت کی ہے کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کارروائی اخبارات میں آنی چاہیے۔ خصوصاً پنجاب کے کام کے متعلق جہاں جنوبی ہند سے زیادہ کامیابی کی امید ہے۔

مولانا داؤد غزنوی کا استعفیٰ | ۲۸۔ اکتوبر کو مجلس احوار کے ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے اپنے خانگی حالات کے پیش نظر جماعتی ذمہ داریوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور ان کی جگہ مولانا منظر علی نظر نے سنبھال لی۔

امریکن اور انگریز کمپنیوں کو ٹھیکہ دیا گیا | دسمبر ۱۹۳۲ء کے بعد حکومت سعودیہ کے وزیر مالیات شیخ عبداللہ سلیمان احمد نے جو

ان دنوں دمشق کے سرکاری دورے پر تھے۔ ۳۱۔ اکتوبر کو ایک بیان میں کہا: ”ہم نے ایک امریکن کمپنی کو پٹرول نکالنے کا ٹھیکہ دیا ہے۔ اس کمپنی نے اپنا کام شروع کیا تو اس کے دوران معلوم ہوا کہ تیل کے چشمے کافی ہیں۔ ایک اور امریکن کمپنی کو ٹھیکہ دیا گیا ہے کہ وہ حرمین شریف کی حد چھوڑ کر حجاز کے دیگر مقامات میں معدنیات کی تلاش کرے۔ اور اس دوران معلوم ہوا کہ سونے کی بڑی مقدار بہاری مملکت میں ہے اور یہاں سے سونا نکالنا آسان ہے۔“

(بیان کے آخری حصے میں وزیر مالیات نے کہا) کچھ عرصہ پیشتر بہاری حکومت کی مالی حالت بہتر نہ تھی۔ مگر اب حالات پر قابو پایا گیا ہے۔ گذشتہ جنگ کے باعث ہمارے مالیات پر بوجھ بڑھ گیا تھا۔ لیکن اب حالات بہتر ہیں۔“

مطلق العنان حکمران جب بزعم خویش اولی الامر بن جاتے تو وہ خاندانی وقار کو ملکی مفاد پر ترجیح دیتا ہے۔ اسلام نے اس طرز سلطنت کی نفی کر کے خلافت کے طریق نظام کو انسانوں کے لیے پسند کیا، اس لیے کہ قومی اور نسلی منافرت یہیں سے جنم لیتی ہے۔ طلوع اسلام کے پیشتر عرب میں قبائلی جنگیں اسی بنا پر رہیں تا آنکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ضابطہ حیات،

کے نفاذ سے اس فتنے کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی۔

آج بھی راعی اور رعایا کے مابین کہیں فساد ہے تو اس کی بنیادیں بھی شخصی آئین کا فرما ہے۔ یورپ کی پہلی بڑی رطائی کے دوران جب خلافتِ عثمانیہ کو شریفِ مکہ ایسے خدروں کی وساطت سے شکست ہو چکی تو ستمبر ۱۹۲۲ء میں آل سعود نے حجاز کی عنانِ اقتدار سنبھالی۔ اور امیر عبدالعزیز بن سعود اس کے پہلے فرمانروا ٹھہرے۔

بے آب و گیاہ سرزمین ہونے کے ساتھ اقوامِ عرب کی باہم سر پھٹول نے بھی اس خطہ کو معاشی پریشانیوں میں سمیٹ لیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ برطانوی اقتدار کے استحکام کو اقوامِ عرب کی ابتری مفید تھی اور وہ اس سنگلاخِ دادی کی ایک ایک پگڈنڈی پر یونین جیک دیکھنا چاہتی تھی۔ لہذا پہلی جنگِ عظیم سے فراغت کے بعد یورپین سیاست نے اس طرف کارخ کیا اور یہاں کی حکمران جماعت سے کاروباری عنوان سے تعلقات استوار کرنا شروع کیے۔ بقول حکومتِ سعودیہ کے وزیر مال کے کہ "کچھ عرصہ پیشتر ہماری حکومت کی مالی حالت بہتر نہ تھی" یہ درست ہے لیکن برطانیہ اور امریکین کو حجاز میں قدم رکھنے کی اجازت دینے سے پیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی سمجھ لیا جوتا۔

أَخْرِجُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَةَ مِنَ الْجَزِيرَةِ الْعَرَبِيَّةِ - ترجمہ: یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ (حدیثِ نبوی)

اس حدیث سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مکہ اور مدینہ میں یہودیوں اور نصاریوں کو داخل ہونے سے منع فرمایا ہو۔ بلکہ فرمایا۔ جزیرۃ العرب سے ان کو نکال باہر کرو۔ مگر آل سعود نے برطانیہ اور امریکہ کو حجاز سے معدنیات نکالنے کی اجازت دے کر سارے عرب کے تمدن پر یورپین تہذیب کی مرگادی۔

مجلسِ احوار نے حکومتِ سعودیہ کے اس فعل کو اسلام اور اقوامِ عرب کے لیے غیر مفید سمجھ کر اس پر سخت احتجاج کیا۔

سال روایا اگر ہندوستان میں اقوامِ ہند کے لیے | آل انڈیا پولیٹیکل احوار کانفرنس سیالکوٹ  
جدوجہد کا آخری سال تھا تو مجلسِ احوار کو بھی

اسی سال اپنے عوام کی غلط رائے سے ٹکراتا پڑ رہا تھا۔ دشمن سے لڑائی اس قدر دشوار نہیں جس قدر اپنی قوم سے برسرِ پیکار ہونا مشکل ہے۔ بگڑا ہوا ہجوم اور اکھڑے ہوئے قدم مشکل سے جھتتے ہیں۔ احرار رہنا سال رواں کے وسط تک مسلم عوام کے ہر دل عزیز رہنا تھے۔ لیکن اغراض کے بندوں نے بہتے پانی میں ایسا زہر گھولا کہ ہر قطرہ زہر بلا بل بن کر حلق میں اترنے لگا۔ مگر پیکرِ ایشیا و خلوصِ دلجمعی سے اپنی قوم کے پرکے برداشت کرتے رہے۔ جو تیر بھی کمان سے نکلا اسے مسکراہٹ سے سینے پر قبول کیا۔ کیا مجال کہ پیشانی شکن آلود ہوئی ہو یا دل پر کوئی میل آیا ہو۔

تم ہم کو مٹا کر رو تے ہو ہم تم پر مٹ کر سنتے ہیں۔  
اس دور میں بھی جاننا تھے ہم اس دور میں بھی جاننا ہیں ہم

(جاننا مرزا)

گھپ اندھیرے کے اس دور میں جب حق و باطل کے مابین امتیاز کی دیوار گر چکی تھی۔ گرم ہواؤں نے پھول پتیاں جلا کر خزاں کا دامن رکھ سے بھر دیا تھا۔ احرار رہنا سیالکوٹ پہنچے۔ یہاں آل انڈیا پولیٹیکل احرار کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں سرخ پوش مسلح احرار رضا کاروں نے رہنماؤں کا خیر مقدم کیا۔ شہری عوام نے مکانوں کی بھتوں اور دکانوں کے تھڑوں پر سے ان پر بھپولوں کی بارش کی۔ ۱۰۔ نومبر ۱۹۳۵ء کو کانفرنس کے منتخب صدر مولانا غلام غوث ہزاروی کا جلوس جب سیالکوٹ کے بازاروں سے گذر رہا تھا تو یوں لگتا کہ جیسے آج یومِ سعید ہے کہ ہر شہری لباس میں اُجلا اور دل سے مسرت کا پیکر دکھائی دیتا ہے۔

احرار کے سرخ پرچم کو چہرہ دہانہ میں لہرا رہے تھے۔ ان کی اڑانیں اپنے حریفوں پر خندہ زن تھیں۔

رات نمازِ عشا کے بعد کانفرنس کا پہلا اجلاس تالابِ شیخ مولانا بخش میں صدر کانفرنس کی صدارت میں کلامِ پاک سے شروع ہوا۔ ابتداء میں مولانا منظرِ علیٰ ظہر نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ جس کے چند اقتباس حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اس وقت ہندوستان کے باشندوں کی نگاہیں نئے آئین حکومت کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ جب تک ہم اپنی مصیبتوں کے علاج کا صحیح جائزہ نہیں اس وقت تک آئین کی تبدیلی فائدہ بخش نہیں ہو سکتی۔ نئے آئین میں صوبہ جاتی حکومتوں کا نظام بڑی حد تک منتخب شدہ ممبروں کے ہاتھ میں ہوگا جس سے وزراء چنے جائیں گے جو کاروبار حکومت کو چلائیں گے لیکن حقوق کامل جانا کچھ فائدہ مند نہیں، اگر ہم اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کریں۔ اگر ووٹ دیتے وقت ایسے نمائندے منتخب نہ کیے جائیں جو آزاد خیال اور قابل اعتماد ہوں۔ یہ لوگ ایک طرف گورنر سے خائف نہ ہوں اور اس کی تجاویز کے مقابلے میں ملک کی بہتری کے لیے تجاویز پیش کرنے کی قابلیت کے ساتھ جرأت بھی رکھتے ہوں۔ اور کوئی لالچ یا خوف ان کے عزم و ارادہ کو شکست نہ دے سکتا ہو۔ اور دوسری طرف اپنے ماتحت ملازمین حکومت سے جن میں مقتدرانگیز اور ہندوستانی افسر شامل ہیں، کام لینے کی اہلیت اور جرأت رکھتے ہوں۔ اس وقت تک ذرا برابر بہتری کی امید رکھنا بھی ایک خیال خام ہے۔ نمائندوں سے یہ توقع بھی ہونی چاہیے کہ وہ ذاتی اور یگانہ پروری کا خیال نہ رکھیں گے، اور بے لاگ ملک کی خدمت کا عزم صحیح رکھتے ہوئے اپنی تمام کوششوں کو وقف کر دیں گے۔ نیا آئین حکومت اخراجات کے لحاظ سے ہنکا پڑے گا۔ اگر اس کے مقابلے میں اس سے زیادہ فائدہ نہ ہو تو ملک کی مصیبتیں اور بھی بڑھ جائیں گی۔ اس لیے رائے دینے والوں کو اپنے فرائض کا احساس اور بھی ضروری ہے۔

ملک میں آزاد خیال جماعتوں کا ایک فریق نئے آئین کو ٹھکرانا چاہتا ہے۔ لیکن اسے سوچنا چاہیے کہ جب حکومت صوبہ جاتی نظام کی باگ ڈور نطاہر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دے رہی ہو اور کوئی آزاد خیال جماعت اپنی اکثریت کونسل میں لاسکتی ہو اور نہ لاسکے اور ملکی مجالس آئین ساز کی رائے کو ناستہ اپنے

خلافت کرتی ہوئی، میدان رحمت پسند اور خوشامد پسند دشمنانِ وطن کے ہاتھ میں  
دے دے، تو اس سے بھانوی اقتدار کو دھکانے لگے گا، بلکہ ہندوستانی،  
ہندوستانیوں کے ہاتھوں ہی نالاں ہوں گے اور آزاد خیال اکثریت غلامی پسند  
اقلیت کو خود اپنے لیے وجہ مصیبت بنائے گی۔

اگر کونسل میں منتخب ہو کر اور اکثریت حاصل کر کے وزارت مرتب  
کرنے سے انکار کر دیا جائے تو بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا، جو ملک کو  
آزادی کی منزل کی طرف لے جاسکے۔

گورنر کاریمت خود سنبھال لیں گے۔ اور ان کی تمام کوتاہیوں کی  
ذمہ داری اس اکثریت پر ہوگی جو دانستہ کاروبارِ سلطنت کو سنبھالنے سے  
انکار کرے۔ گورنر اور گورنروں کے ہمنوا ہندوستانی ترک ممالک کرنے والی  
اکثریت کے خلاف کامیاب پروپگنڈا کر سکیں گے۔ جس کا مؤثر جواب اکثریت  
کی طرف سے بن نہیں سکے گا۔

ہمیں حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ آزاد خیال جماعتیں اپنے  
آنے والے موقف سے نادمہ اٹھا کر ملک میں آزاد خیالی کی رو کو زیادہ وسیع  
اور پر زور بنادیں اور ان جھگڑوں کو چکانے کی کوشش کریں، جو آئے دن ملک  
کے خرمین امن کو آگ لگاتے رہے ہیں۔ اگر گورنروں کو خود پسندی اور  
ملک دشمنی آزاد خیال وزراء کو خدمتِ وطن کرنے سے روکے اور ان وزراء  
کو کام نہ کرنے دیا جائے تو گورنر اور ان کے ہمنوا حکام بالا جو شہنشاہ اور ان کے  
سفاد کی خاطر ہندوستانی مفاد کو کھپٹا چاہیں خود اس بات کے ذمہ دار ہوں گے  
کہ ہندوستانی اکثریت کی آواز دبا دیں۔ بلکہ اس کا گنا گھونٹ دیں۔ اس صورت  
میں ملک کی آواز انگلستان کے وسیع اقتدار کے خلاف بلند ہونے کی صورت  
آزادی ملک کی جدوجہد زیادہ قوت اختیار کرے گی۔

ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ وزارت کی خواہش آزاد خیال الیہ

کو متفرق کر دے گی۔ کیونکہ جاہ پسند لوگ آگے آئیں گے۔ اگر آزاد خیال جماعتیں اس قدر تنظیم پیدا نہیں کر سکتیں کہ قابل اور ایثار پسند لوگوں کو پیش کر سکیں تو آزادی کی جنگ میں خود غرض لوگوں کا پیش پیش ہونا کسی حالت میں بھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔

۲۔ ریاستیں۔ جو مسائل اقتصادی و سیاسی برطانوی ہند کو پریشان کر رہے ہیں۔ وہ ہندوستانی ریاستوں کے باشندوں کے لیے موہان روح ہیں۔ لیکن ریاستوں کے باشندوں کا بہت بڑا مطالبہ یہ ہے کہ ہمیں ویسی حکومت دی جائے جیسی برطانوی ہند میں ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریاستوں کے باشندے کس افلاس، غربت اور ہلاکت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر برطانوی ہند میں نمائندہ حکومت کے بغیر گزارہ چلنا مشکل ہے تو ریاستوں میں مطلق العنانی کا دور دورہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ریاستی باشندوں سے ہمیں پوری پوری ہمدردی ہے اور ان کے مصائب کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے جہاں تک ہو سکے۔ ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ جب تک ریاستوں کے باشندے اور برطانوی ہند کے لوگ آزادانہ فارغ البالی میں زندگی بسر نہ کرنے لگ جائیں اس وقت تک ملکی جدوجہد اختتام کو نہیں پہنچ سکتی۔

۳۔ مسئلہ حجاز: ہندوستانی سیاسیات کے علاوہ آجکل مسئلہ تحفظ حجاز و حرمین شریفین ایک نئی صورت اختیار کر رہا ہے۔ حال ہی میں سلطان ابن سعود والی حجاز نے ایک انگریز کمپنی کے ساتھ ملک حجاز میں کان کنی کے لیے ایک معاہدہ کیا ہے جس سے مقدس ارض حجاز میں انگریزی اثر و رسوخ اور اقتدار کا بڑھ جانا لازمی ہے۔ تاریخ آج سے پہلے ہندوستانیوں کے سامنے یہ حقیقت پیش کر رہی ہے کہ الیٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے بہانے ہندوستان کی سیاست پر قبضہ کیا اور ایک عرصہ تک خود ہندوستان پر حکومت کی۔ آج شہنشاہ جارج پنجم کی حکومت ہندوستان میں الیٹ انڈیا کمپنی کی



وارث اور قائم مقام ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دلائل شے یہ سمجھانے کی کوشش کرنا کہ نئے معاہدہ میں خطرات نہیں، سعی لا حاصل ہے۔ اس لیے ہمیں ایک طرف تو سلطان ابن سعود کو یقین دلانا ہے کہ ہم اس کے بدخواہ نہیں۔ لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس رجحانِ سیاسیات و اقتصادیات کو برداشت نہیں کر سکتے، جس سے ایک دن ارضِ حجاز کامل طور پر غیر مسلم اقتدار کا شکار ہو جائے۔ اور اگر وہ جائے تو محض اس حیثیت میں جس حیثیت میں قومی اور اسلامی جھنڈے سے ہندوستان میں لہرائے جاتے ہیں سو دوسری طرف ہم نے حکومتِ برطانیہ کو بھی بتانا ہے کہ اسے خواہ مخواہ مسلمانوں میں بد اعتمادی پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر حقیقتاً انگریزی سیاست کی نگاہیں ارضِ حجاز پر نہیں تو برطانوی کمپنی یا قوم کو معاہدہ حجاز سے ایسے منافع نہیں ہوں گے۔ جن کا نعم البدل دنیا کے کسی اور حصے میں نہ مل سکے۔ جس کے بغیر برطانوی قوم غربت و افلاس کی نذر ہو جائے۔ اس لیے سلطنتِ برطانیہ کے مفاد کے پیش نظر حکومتِ برطانیہ کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ سلطنتِ حجاز اور برطانوی کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے وہ کالعدم قرار دے دیا جائے۔ تاکہ مسلمانوں کے دل برطانیہ کی طرف سے مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں مطمئن ہو سکیں۔“

( « خطباتِ احرار » جلد اول ص ۱۴۳ تا ۱۴۴ )

خطبہ استقبالیہ کے بعد مولانا منظر علی اظہر نے احرار پولیٹیکل کانفرنس کے منتخب صدر مولانا غلام غوث ہزاروی کا تعارف کراتے ہوئے کہا :

« احرار کا یہ وصف رہا ہے کہ اس نے ہر مخلص اور معنی کارکنوں کو اپنے نزدیک لاکر اسے اونچے سے اونچا مقام عطا کیا۔ مولانا غلام غوث اپنے علاقہ (ہری پور ہزارہ) اور صوبہ سرحد میں اپنی قربانیوں اور گونا گوں مشکلات کے باعث مشہور ہیں۔ انہوں نے قید و بند کی معوبتیں برداشت کیں۔ لیکن اس پر بھی وہ گناہ سے اور وہ شہرت حاصل نہ کر سکے، جس کے وہ مستحق تھے۔

مجلس احرار نے اپنی روایات کے مطابق ان کی قدر کی اور انہیں آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس کی صدارت کا اعزاز بخشا۔ مولانا موصوف مدنی طوریہ پر دیوبند سے فارغ ہیں اور سیاسی طور شمالی صوبہ سرحد میں سرخپوش تحریک کے قائد رہ چکے ہیں۔ مولانا منظر علی اظہر کی تائید میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے ایک مختصر تقریر کی اور بعد میں مولانا غلام غوث نے کرسی صدارت سنبھالی۔ اپنے خطبہ صدارت کے بعد کانفرنس کی کارروائی شروع کی۔

۱۱۔ اکتوبر کو پنڈال میں پرچم احرار لانے کی رسم ادا کی گئی۔ یہ نظارہ دیدنی تھا۔ پنڈال کے چاروں طرف سرخ باوردی اور مسلح رضا کاروں کے چاق و چوبند دستے فوجی طریقہ پر قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ احرار بیٹھ قومی دھنیں بجا رہے تھے۔ مولانا غلام غوث نے پرچم کشائی کے بعد کہا: ”یہ جھنڈا آزادی ہند اور خدا کے نام کو بلند کرنے کا جھنڈا ہے۔ اس کو بلند کرنے سے ہم پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کی بلندی کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں کن قربانیوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس کا احساس کریں اور اس سرخ پرچم کے سائے میں آج وعدہ کریں کہ اگر کبھی اس کی سرخی کو قائم رکھنے کے لیے خون کا آخری قطرہ بھی دینا پڑا تو اس سے دریغ نہیں کریں گے۔“

رسم پرچم کشائی کے موقع پر ہندوستان بھر کے علما وادسیاسی شخصیتوں نے حصہ لیا۔ اس موقع پر ان تمام حضرات نے دلی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ آزادی وطن اور ہندوستان میں اسلام کی سر بلندی کے لیے اگر کبھی ضرورت پیش آئی تو وہ کسی قربانی سے دریغ کریں گے۔ اس کے بعد حرر رضاوں نے جھنڈے کو سلامی دی، اور منتشر ہو گئے۔

اس اجلاس کی صدارت سید محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ، آباد نے

کی۔ اجلاس میں دس ہزار سے زائد باوردی احرار رضا کار شریک

تھے۔

۱۲۔ نومبر کو احرار پولیٹیکل کانفرنس کا آخری اجلاس ہوا۔ جس میں دیگر کارروائی کے حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

۱۔ آل انڈیا احوار پولٹیکل کانفرنس سیکوٹ کا یہ اجلاس مجلس احوار کے نصب العین یعنی ملکی آزادی کو اہل وطن کے دکھوں کا واحد حل سمجھتا ہے۔ اور ہندوستان کی آزادی ہی میں تمام دنیا کی آزادی کا راز مضمردیکھتا ہے۔ لہذا ہندوستان کے مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ مجلس احوار کے ساتھ پورا پورا تعاون کر کے ہندوستان کو آزاد کرانے میں مدد دیں۔

(قرارداد کے محرک مولانا محمد اسماعیل مراد آبادی اور تائبید مولانا حبیب الرحمن نے کی۔)

۲۔ آل انڈیا مجلس احوار کا یہ اجلاس حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ زمینداروں کی مالی بد حالی کے پیش نظر مالیے میں کم از کم سچاس فیصد تخفیف کر دی جائے جس سے زمینداروں کی مالی مشکلات کا حل ہو سکے۔

(قرارداد کے محرک صاحبزادہ فیض الحسن اور تائبید چودھری عبدالعزیز بیگودالیر نے کی)

۳۔ آل انڈیا احوار کانفرنس کا یہ اجلاس آئین نو کے پیش نظر رحبت پسندوں کی سرگرمیوں کو تشویش کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ نیز مسلمانوں کی تمام آزادی پسند جماعتوں اور افراد سے اپیل کرتا ہے کہ کسی مناسب مقام پر جمع ہو کر ان رحبت پسند عناصر کی سرگرمیوں کا مدد ا سوجھیں۔ ورنہ یہ لوگ اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیاب ہو کر ملک کو بیش از بیش غلامی میں مبتلا کرنے کا باعث ہوں گے۔

(قرارداد کے محرک سید عطا اللہ شاہ بخاری اور تائبید مولانا اسماعیل ذیح کانپوری مدیر قومی دلیر کانپور نے کی)

۴۔ آل انڈیا احوار پولٹیکل کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت سعودیہ کا غیر ملکی کمپنیوں سے معاہدہ سرزمین حجاز میں غیر ملکی حکومت کی مکمل سیاسی مداخلت اور اثر و رسوخ کے مترادف سمجھتا ہے۔ از بس کوئی مسلمان از روئے شریعت اسلامی برداشت نہیں کر سکتا۔ لہذا یہ کانفرنس سلطان ابن سعود کو یقین دلاتی ہے کہ دنیا کے ہر فرقے اور عقیدے کا مسلمان حجاز کی آزادی اور تحفظ کے لیے ہر قسم کی قربانی اور حکومت حجاز کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہے۔

اس قرارداد کی دوسری شق میں ایک وفد سلطان ابن سعود کی خدمت میں بھیجنے کا فیصلہ

کیا گیا۔

(قرارداد کے محرک مولانا منظر علی اظہر اور تائید مولانا عبدالقیوم پوپلزنی (پشاورم نے کی)  
**مدعی نبوتہ کو سزا** | جرمن کی اس خبر کو پیرس کے ایک اخبار نے جو کہ روسی زبان میں شائع ہوتا ہے، نمایاں طور پر شائع کیا۔

”برلن میں ایک شخص نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور اس کے پاس ہزاروں افراد آئے لگے۔ جھوٹی نبوتہ کا دعویٰ مدارم لفظیوں کو دوا دیتا جس کے باعث ان میں سے اکثر صحت یاب ہو جاتے تھے۔ لیکن حکومت جرمنی نے اس شخص کو گرفتار کر لیا۔ حکومت کا موقف یہ ہے کہ یہ شخص دعویٰ نبوتہ کر کے اخلاقی اور مجلسی جرم کا مرتکب ہوا ہے۔“

اس کا مقدمہ بند کرے میں ہوا۔ سینتیس گواہان استغاثہ کے بیان ہوئے۔ انہیں جھوٹے بی کا بیان ہوا۔ جس میں اس نے کہا کہ اس نے مریض ہی صحت یاب نہیں کیے بلکہ اکثر مردے بھی زندہ کیے ہیں۔ انہیں عدالت نے مجرم کو ایک سال قید با مشقت کی سزا دی۔

(روزنامہ ”انقلاب“ لاہور ۱۴ نومبر ۱۹۳۵ء)

**”یورپ جنگ کا اٹھارہ“** | طاقت ور ہاتھ ہمیشہ کمزور پراٹھتا ہے۔ اور جب اسے مغلوب کر لیتا ہے تو فتح کا علم اٹھائے مفتوح پر اپنی مسکراہٹیں بکھیرتا ہے۔ جس میں ہزاروں طنز کے تیرد لشتہ ہوتے ہیں۔ کمزور کے وسائل بھی کمزور ہوتے ہیں اور فاتح اسی درجے سے داخل ہوتا ہے۔

یورپ کی مذہب قوموں نے اس سال اپنی تہذیب کے دامن میں جس بری طرح چھید کیا۔ مورخ اس سانحہ کو سیاہ حاشیہ میں تحریر کرے گا۔ جہشہ اور اٹلی کی جنگ شیر اور بکری کی لڑائی تھی۔ لیکن برطانیہ اور فرانس نے فاتی اغراض کے تحت اٹلی کو ڈھیل دی کہ وہ منگولوم حبشہ کو اپنی فتح کا نشان بنائے۔

۲۶۔ ستمبر کو جب فریقین میں بات طے نہ پاسکی تو ۳۔ اکتوبر (۱۹۳۵ء) کو اٹلی حبشہ پر چڑھ

دوڑا۔ یورپ کی سیاست ان دنوں عجیب مراحل سے گذر رہی تھی۔ برطانیہ اردس اور جرمن کے

اتحاد کو تشویش کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف فرانس اور سوویت روس کے تعلقات کو اس لیے بھی پسند کرتا تھا کہ شاید وہ برلن اور ماسکو کے درمیان کسی کشیدگی کا محرک ثابت ہوں۔ تاہم برطانیہ روس کی انقلابی تحریک سے بھی خائف تھا۔ اس اعتبار سے فرانس کی دوستی بھی اسے گوارا نہیں تھی۔ اس طرح انگلستان کے سیاستدان روس اور فرانس اور جرمنی کے اس تماشے کو خوف اور وحشیہ کے طے جلے جذبات سے دیکھ رہے تھے۔

حبشہ کی ساڑھے چار لاکھ کی مظلوم آبادی پراٹلی کے بمبارطیارے آگ برسا رہے تھے۔ شہنشاہ حبشہ نے یورپ کے مذہب لوگوں کو پکارا لیکن نقارخانے میں طوطی کی صدا کب سنائی دیتی ہے۔ ایک ہفتہ بعد جمعیتہ اقوام نے جینوا میں اپنا اجلاس بلایا کہ موسولینی نے حبشہ پر حملہ کر کے میثاق کی دفعہ ۱۱ کی خلاف ورزی کی ہے۔ لہذا جمعیتہ اقوام نے اپنے ارکان کو ہدایت کر دی کہ وہ اٹلی کے ہاتھ آئندہ کوئی سامان خریدت نہ کریں۔ نیز اپنے اپنے علاقوں سے آئے قرضوں کا انتظام بھی نہ ہونے دیں۔ اور اٹلی سے کوئی سامان بھی خرید نہ کریں۔

نظاہر یہ حبشہ کا اقتصادی تحفظ تھا۔ لیکن ضروری اور اہم چیز جس سے اٹلی مات کھا سکتا تھا اور بہت جلد گھٹنے ٹیک دینا زہ تیل کا معاملہ تھا۔ جسے مقاطع میں شامل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس سے فرانس اور برطانیہ کو نقصان پہنچتا تھا۔ امریکی صدر مسٹر روز ویلیٹ نے غیر جانبداری کا جو قانون پیشتر سے منظور کر لیا تھا۔ اس میں تیل، پھٹکل، لوہا اور فولاد ایسی اہم جنگی چیزیں شامل تھیں۔

ان حالات میں اٹلی کے ڈکٹیٹر موسولینی کو تیل بھی ملتا رہا اور جنگ کا دوسرا سامان بھی۔ اس وقت تک جنگ میں اٹلی کے دس ڈویژن (اڑھائی لاکھ) اور ڈیڑھ لاکھ انفری فوج انگ تھی۔ جو جدید سامان جنگ سے لیس تھی جبکہ اس کے مقابل حبشہ کی غیر تربیت یافتہ صرف پینس ہزار فوج تھی، جس کے پاس سامان جنگ بہت کم اور معمولی تھا۔

برطانیہ بڑی طاقت ہونے کے باعث حبشہ کے نتائج سے فائل نہیں تھا، تاہم وہ اس کے لیے کسی بڑی جنگ کو دعوت یا اس کے امکان پیدا کرنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ فرانس کا وزیر اعظم برٹریلاوال، موسولینی کی پیش قدمی کا اس وقت تک حافی تھا جب تک فرانس کا مفاد

تھا۔ بالآخر برطانیہ کے وزیر خارجہ جیمس سمرسٹ اور فرانس کے مسٹر لاوال نے ایک مشترک اور خفیہ مضمون ترتیب دیا جس کے تحت فیصلہ کیا گیا۔

”صوبالیہ اور ایرٹیریا کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ ساٹھ ہزار مربع میل کا علاقہ اٹلی کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے معاوضے میں تین ہزار مربع میل کی ایک گذرگاہ حبشہ کو دے دی جائے۔ تاکہ وہ اس سے اپنی اقتصادی توسیع اور آباد کاری کا حلقہ بنا سکے۔“

اس خفیہ معاہدے پر مسٹر لاوال اور مسٹر ہور نے حلف لیا کہ وہ اس معاہدہ کو صیغہ راز میں رکھیں گے، مگر ہنوز اس کی سیاہی خشک نہ ہونے پاتی تھی کہ فرانس نے یہ معاہدہ شائع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں سارا انگلستان ناراض ہو گیا کہ چاندی کی طشتری میں رکھ کر فتح کا تحفہ موسولینی کے حوالے کر دیا جائے حالانکہ جنگ ابھی جاری تھی۔ برطانوی اخبارات، برطانوی پارلیمنٹ اور عوام اس قدر سیخ پا ہوئے کہ مسٹر سمرسٹیل ہور کو اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا اور اس کی جگہ ایٹن برطانیہ کے وزیر خارجہ نامزد کیے گئے۔

”دنیا کی بساط سیاست“ مصنف مولانا منظر علی اعظمی ص ۸۹  
 [ دوسری جنگ عظیم - مصنف لوئیس ایل سائڈر ص ۱۹۹ ]

۱۸۸۳ء میں رمگانا کے پہاڑی علاقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں لوہار موسولینی کے ہاں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی اور فراغت کے بعد تھوڑی مدت کے لیے محلّی کا پیشہ اختیار کیا۔ ایک سال بعد اس پیشے کو چھوڑ گیا۔ اس دوران وہ سوشلزم سے متاثر ہو چکا تھا اور اس نے اٹلی کو خیر باد کہہ کر سویٹزرلینڈ میں مزدوروں کی ایک انجمن بنائی۔ مقامی حکومت نے ان سرگرمیوں کی بدولت اسے ملک سے نکل دیا۔ وہ پھر اٹلی آ پہنچا۔ انقلاب پسند تحریک یہاں بھی جاری رکھی اور یہاں وہ ایک کمیونسٹ اخبار کا ایڈیٹر بن گیا۔

۱۹۱۵ء میں برطانیہ اور اٹلی کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کی موسولینی نے حمایت کی۔ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی اس معاہدے کے خلاف تھی۔ لہذا اسے جماعت سے

خارج کر دیا گیا۔ حکومت بھی سوشلسٹوں کے خلاف تھی لہذا موسولینی کو اس کے نظریات کی بنا پر قید میں ڈال دیا گیا۔ رہائی کے بعد موسولینی آسٹریا آ گیا۔ یہاں اس نے ایک اخبار نکالا جس میں انقلابی سوشلسٹوں کے نام پیغام موجود تھا۔ آسٹروی حکومت کو اس کی یہ سرگرمیاں پسند نہیں اور اسے ملک سے باہر نکال دیا یہ پھر اٹلی واپس آ گیا۔

اٹلی نے جب ٹریوپولی کے بارے میں جنگ چھیڑی تو موسولینی نے اس کی زبردست مخالفت کی، جس کی بنا پر حکومت نے اسے پانچ ماہ کے لیے قید کر دیا۔ رہائی کے بعد اسے سوشلسٹ اخبار "اونٹی" کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔

پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو موسولینی حب الوطنی کی بنا پر فوج میں بھرتی ہو گیا اور میدان جنگ میں بری طرح زخمی ہوا۔ اسی بنا پر اسے فوج سے الگ کر دیا گیا۔ صحت یاب ہونے پر اس نے ایک اور اخبار نکالا اور اٹلی کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کو از سر نو جاندار بنانے پر زور دیا۔ ازاں بعد وہ قومی مفاد کی خاطر جدوجہد کرنے لگا۔ اس نے روسی کمیونزم کی سخت مخالفت کی۔ لہذا اب یہ سوشلسٹ نہیں تھا بلکہ سنڈیکلزم کا حامی بن گیا۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں اٹلی کے عام انتخاب ہوئے۔ اٹلی پارلیمنٹ کی کل ۵۴ نشستوں میں سے ایک سو پچھن بائیس سوشلسٹوں کے ہاتھ آئیں۔ تو انہوں نے رضا کار تنظیم قائم کر کے ملک میں چاروں طرف انتشار اور بلامنی پیدا کر دی۔ فسطائیوں نے ان کا مقابلہ کر کے ان کی تمام سرگرمیوں کا خاتمہ کر دیا۔ ملک میں موسولینی کی فسطائی جماعت کا زور تھا۔ موسولینی کی جماعت نے سیاہ قمیص کو اپنی درمی قرار دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے روم پر پیش قدمی کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس یغار کو سیاہ قمیص والوں کی یغار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شاہ اٹلی دکنماتیل سوم نے ملک کو تباہ کن جنگوں سے محفوظ رکھنے کے لیے فسطائیوں کے سربراہ بنیٹو موسولینی کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اس نے فوری طور پر کابینہ تشکیل کی، فسطائیت نے حکومت پر فتح حاصل کر لی اور بادشاہ محض کٹھ پتلی بن گیا۔ اس طرح موسولینی کو اٹلی میں اقتدار حاصل ہوا۔

۱۶ جولائی ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوا۔ اچھی تعلیم پائی۔ خاصا عقلمند اور باوقار

آدمی تھا۔ ۱۹۱۶ء سے نائب سلطنت رہا۔ ۱۹۲۸ء میں بادشاہ بنا۔

شہنشاہ پیل سلاسی

ملکہ زادتو کی وفات کے بعد ۱۹۳۰ء پر شہنشاہ بن گیا۔ اس کے سامنے بہرہ و گرام تھا۔ اول ملک کو متحد رکھنا۔ پھر حدود جو پیمانہ ملک کو عہدِ حاضرہ کے درجے پر لانا۔ نسلی اور مذہبی اختلاف بہت زیادہ تھے۔ مقامی رئیسوں کی روایات یہ تھی کہ الگ تھلگ رہیں۔ غلامی کے ساتھ ساتھ جہالت اور اہم کا دور دورہ تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ہیل سلاسی نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی مملکت میں بردہ فروشی روک دے گا اور غلامی ختم کر دے گا۔ اس کے بعد اسے جمعیۃ اقوام کارکن بنا لیا گیا۔ ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال پیشتر سے ابتر تھی۔ لیکن حبشہ اور اطالیہ کی جنگ نے اسے مزید متاثر کیا۔ مغربی ممالک سے مال کی درآمد قطعی محدود ہو گئی۔ جس سے اندرون ملک کی ہر شے گرانی کا شکار ہوئی۔ ہندوستان کی منڈیاں اور عوام اس کے متحمل نہیں تھے۔ سیاسی رہنما اور جماعتیں انتخاب میں مصروف تھیں۔ جس کے نتیجے میں یورپ کے دلاویں نے کافی فائدہ اٹھایا۔

پنجاب کو نسل میں شہید گنج پر بحث

۱۱۔ نومبر کو پنجاب کو نسل میں چودھری افضل حق نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا (بحث پولیس کے اخراجات کے متعلق تھی) پولیس کے اخراجات منظور کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اس سے صوبے کو بالکل فائدہ نہیں ہے۔ ابھی شہید گنج کا واقعہ پیش آیا۔ پولیس موجود تھی۔ اس کا سارا سامان موجود تھا، لیکن حالات نے اس پر بھی نازک صورت اختیار کر لی۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ پولیس کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے لیے بجٹ منظور کرنے کی۔ مسجد شہید گنج کے متعلق کافی عرصہ سے بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں کافی وفود نے گورنمنٹ سے ملاقات کی۔ اور گورنمنٹ نے بھی اس امر کا یقین دلایا کہ مسجد نہیں گرائی جائے گی۔

مسٹر بائیڈ: "یہ غلط ہے۔ حکومت نے کب اور کن الفاظ میں وعدہ کیا تھا؟"

چودھری افضل حق: حکومت نے ان الفاظ میں تو وعدہ نہیں کیا تھا کہ مسجد نہیں گرائی جائے گی۔ لیکن یہ ضرور کہا ہے کہ سکھوں کے ایک وفد نے گورنر پنجاب کے ساتھ ملاقات کی اور یقین دلایا کہ مسجد مسمار نہیں کی جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود ۸ جولائی کو جب مسلمانوں کی نمائندہ انجمن صورت حال پر غور کر رہی تھی کہ انہیں اطلاع ملی کہ مسجد مسمار کی جا رہی ہے۔ کیا



مسٹر بائیڈ: کیا آنریبل ممبر کو یہ معلوم ہے کہ وہ کن شرائط کے تحت وعدہ کیا گیا تھا؟  
 چودھری افضل حق: ”مجھے اس سے سروکار نہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت نے  
 اس معاملے میں مداخلت نہیں کی۔ اگرچہ میرے پاس اس بات کا ثبوت نہیں۔ لیکن میرے تجربے نے  
 مجھے بتایا تھا کہ رات دس بجے فوجی افسروں کو اس بات کا علم تھا کہ مسجد مسما کی جانے والی ہے  
 مسٹر بائیڈ: یہ سفید جھوٹ ہے۔ (اس لفظ کے خلاف ہاؤس میں احتجاج کیا گیا اور اس پر  
 صدر کونسل کے کہنے پر آنریبل ممبر نے الفاظ واپس لے لیے۔)  
 چودھری افضل حق نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

حکومت اس حیثیت میں اپنی پوزیشن واضح کرے کہ ریلوے کے اوزار مسجد گرانے  
 جانے سے پیشتر آئے یا بعد میں۔ لیکن مسجد گرانے میں سہولت بہم پہنچائی اور حکومت نے  
 اس کی امداد کی۔ کیونکہ اس موقع پر وہاں پولیس موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسے بروقت  
 علم نہ ہو سکا۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ پولیس نے اس وقت کوئی کام نہیں کیا۔  
 چودھری صاحب کی اس تقریر کے جواب میں چیف سیکرٹری حکومت پنجاب نے  
 حکومت کی پوزیشن واضح کی کہ ”یہ الزام غلط ہے۔ یہ درست ہے کہ سکھوں کے ایک  
 وفد نے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کے دوران کہا تھا کہ مسجد نہیں گرائی جائے گی۔ اس بنیاد  
 پر ڈپٹی کمشنر نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ مسجد نہیں گرائی جائے گی۔ اس کے باوجود سکھوں  
 نے مسجد کو گرانے شروع کر دیا۔ جس پر حکومت نے فساد کے پیش نظر پولیس اور فوج کو  
 وہاں متعین کر دیا تھا۔ باقی رہا سکھوں کے بیانات تو حکومت اس کی ذمہ دار نہیں۔“

مذاہمتوں کی درخواست | گذشتہ سال ۲۲- اکتوبر کو قادیان اجراء کانفرنس کے صدر  
 کی حیثیت سے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے جو

تقریر کی۔ اس پر مقدمہ چلا اور انہیں چھ ماہ قید کی سزا ہوئی تھی۔ اس کے خلاف سیشن جج  
 جی۔ ڈی کھوسلہ نے ۵- جون ۱۹۲۵ء کو اپنا تاریخی فیصلہ دیا تھا۔ مرزائیوں نے اس کے  
 خلاف لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ ۱۱- نومبر ۱۹۲۵ء کو لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس  
 کولڈ سٹریم نے مرزائیوں کی درخواست نگرانی کا فیصلہ سناتے ہوئے لکھا۔

”میشن جج گورداسپور نے اپنے فیصلے میں گورنمنٹ (برطانیہ) اور مرزا قادیان کے متعلق کچھ ریمارکس پاس کیے۔ جس پر گورنمنٹ اور خلیفہ صاحب دونوں نے اعتراض کیا۔ ہائی کورٹ میں دونوں نے درخواستیں دیں کہ ان ریمارکس کو فیصلہ سے حذف کر دیا جائے“

جسٹس کوڈلٹریم نے اس فیصلے میں سے گورنمنٹ کے خلاف ریمارکس نکالنے کی ضرورت نہ سمجھی لیکن اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فیصلہ میں لکھا:

”میشن جج کے روبرو شہادت ریکارڈ پر موجود تھی اس کی بنا پر جج حق بجانب نہ تھا کہ وہ ریمارکس پاس کرتا۔ جس میں مندرجہ ذیل الفاظ شامل تھے۔

قادیانیوں کے افعال کے خلاف پولیس کو اطلاع دی گئی۔ لیکن پولیس نے کوئی کارروائی نہ کی۔ وغیرہ، وغیرہ۔

قادیانیوں کے خلاف تین فقرے نکال دیے گئے۔ فاضل جج نے ان چودہ فقروں میں سے جس کے خلاف مرزا قادیان اور اس کے فرقی نے اعتراض کیا تھا۔ تین فقرے نکال دینے کا حکم دیا۔

۱۔ فاضل جج نے قادیانی مذہب نیونینگلڈ (NEW FANGLED) نکال دیا۔ دوسرا فقرہ یہ تھا۔ مرزا نے جہادِ اکبریم کی موت کی پیش گوئی کی۔ اس میں سے پیش گوئی کا لفظ نکال دیا گیا۔ تیسرا فقرہ مرزا نے کٹر مسلمانوں کو گالیاں نکالیں۔ اس فقرے کو اس لیے نکال دیا گیا کہ اس ریمارکس کے متعلق شہادت موجود نہیں ہے۔ یہ فقرہ بھی کہ مرزا صاحب پور کی ٹانک واٹن استعمال کرتے تھے۔ اس فقرے کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں۔ مرزائیوں کے اس مقدمے کی پیروی سر تیج بہادر نے کی۔

پنجاب کونسل میں بحث کا دو سہ روز | ۱۴۔ نومبر۔ پنجاب کونسل میں مسجد شہید گنج پر چودھری افضل حق کے بعد مولانا

منظر علی انظر نے اپنی تقریر کے دوران کہا

”مسجد کے انہدام کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر

حکومت چاہتی تو مسجد کو بچا سکتی تھی۔ لیکن حکومت کے ایک محکمہ ریویو نے مسجد کی مسامیہ کے لیے کرین دیا۔ ایک طرف سکھوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ مسجد کو گرا دیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کو کہا کہ وہ اس کے خلاف احتجاج کریں۔ اس طرح دونوں قوموں کو لڑا دیا۔

مولانا منظر علی انظر کے بعد پیر اکبر علی نے حکومت کے مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:

ہشید گنج کے واقعہ کے دوران پولیس بیکار اور نااہل ثابت ہوئی ہے۔ اس روپے کی مستحق نہیں، جس میں بجٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔

پنجاب میں تلوار پر سے پابندی ختم ہونے کے بعد شمالی صوبہ سرحد کے عوام نے بھی یہ مطالبہ کیا کہ انہیں بھی سر عام تلوار لے کر چلنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

### صوبہ سرحد میں تلوار کی اجازت

۴۔ نومبر کو سرحد کونسل کا اجلاس شروع ہوا تو آزیبل سرگنگم ہوم ممبر نے خان بہادر غلام حیدر خاں کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حکومت سرحد کے پاس اس مفہوم کی درخواستیں پہنچی ہیں کہ تلوار کو قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ کر کے اس کے رکھنے اور لے کر پھرنے کی عام اجازت دی جائے۔ لیکن حکومت نے ابھی تک اس سوال پر غور نہیں کیا۔

(اخبار ترجمان سرحد پشاور، ۴۔ نومبر ۱۹۳۵ء)

اس سے پیشتر ۲۲۔ اکتوبر کو حرار کانفرنس بم خییل (سرحد) میں منعقد ہوئی جس کی صدارت حضرت عبدالوارث پادشاہ نے کی، جس میں پشاور کے چیدہ چیدہ علماء نے شرکت کی اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں حکومت سرحد سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پنجاب کی طرح سرحد سے بھی قانونِ اسلحہ پر سے پابندی ختم کر دے۔

آخر ۱۲۔ نومبر کو صوبہ سرحد کی کونسل میں ملک خدا بخش کی قرارداد منظور ہو گئی۔ جس میں حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ تلوار کو اسلحہ ایکٹ سے مستثنیٰ قرار دے دے۔ اس قرارداد کے حق میں تمام مسلم ارکان نے ووٹ دیا۔ جبکہ غیر مسلم ممبران نے اس قرارداد

کی مخالفت کی۔

**پھر مہیا بلکہ کا چیلنج** | وسط ستمبر کی بات ہے کہ مرزائی مذہب کے لیڈر نے اجراء کو مہیا بل کا چیلنج دیا تھا۔ اور جب اجراء قادیان پہنچے تو وہاں شروع کر دیا۔ مگر اجراء ہنگاموں کو پہنچنا تھا، وہ جا پہنچے۔ حکومت بھی خاموش رہی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن نومبر کے وسط میں پھر بات چھڑ دی اور پہلی سخت کو مٹانے کے لیے مرزائیوں نے ایک دوسرا چیلنج دے دیا۔ اور ساتھ ہی انکار بھی کر دیا۔ مگر اجراء سے منظور کر چکے تھے اور ۱۸۔ نومبر کی تاریخ بھی مقرر کر دی کہ حکومت درمیان میں آن کھڑی ہوئی۔ اور اس نے قادیان اور اس کے ارد گرد نو میل تک دفعہ ۱۲۲ نافذ کر دی۔ اس ضمن میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا حکم حسب ذیل ہے۔

۱۸۔ نومبر۔ حکومت پنجاب کی ہدایت پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداسپور نے زیر دفعہ ۱۲۲ کے ضابطہ فوجداری کے تحت حکم امتناعی جاری کیا کہ اجراء کے ارکان ۱۸۔ نومبر ۱۹۳۵ء سے ۲۲۔ نومبر تک قادیان سے نو میل کے فاصلے تک کسی مقام پر جمع نہ ہوں۔“

(الیوسی ایٹڈ پریس)

**آل انڈیا اجراء کانفرنس کی صدرانے بازگشت** | ۱۸۔ نومبر کو چودھری اسد اللہ خاں ایم ایل سی (برادر چودھری ظفر اللہ

مرزائی) نے پنجاب کونسل میں سوال اٹھایا کہ تالاب چودھری مولابخش کو اجراء پولیٹیکل کانفرنس کے لیے سیکورٹی میونسپل کمیٹی نے کیوں صاف کیا اور اس پر وہ پھر کس نظر سے خرچ کیا۔ اگر کیا تو کیوں؟ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر گوگل چند نارنگ وزیر بلدیات نے کہا:

”میونسپل کمیٹی نے حفظانِ صحت کے طور پر یہ اقدام کیا ہے۔ جو ضروری اور اہم تھا۔ یہ جگہ بے مقصد اور بے کار تھی۔ جس کی صفائی نہ ہونے کے باعث حالات کے عوام کی صحت پر اثر پڑ رہا تھا۔“

**تمغہ خدمت** ۱۹۔ نومبر کو حکومت ہند نے کوئٹہ کے مصیبت زدگان کے امدادی کاموں کے سلسلہ میں خطابات اور سندیں دینے کا اعلان کیا۔ اس سلسلے میں مجلس احرار کو بھی دعوت دی گئی۔ وائسرائے کے اس بلاؤں پر غور کرنے کے لیے آئسٹر میں مجلس احرار کا فوری اجلاس طلب کیا گیا۔ اس پر احرار رہنماؤں کا موقف

اجلاس کے دوسرے روز ۲۱۔ نومبر کو احرار ورکنگ کمیٹی نے قادیان اور اس کے ارد گرد دفعہ ۱۲۲

پر غور کیا۔

چونکہ احرار ۱۸۔ نومبر کی تاریخ مقرر کر چکے تھے اور اس کی اطلاع ماتحت مجالس کو دی جا چکی تھی جس پر مختلف اضلاع سے احرار رضا کار دفتر مرکزیہ میں پہنچ رہے تھے۔ لیکن مرکز نے انہیں نا حکم ہمانی قادیان جانے سے منع کر دیا۔ اجلاس کی کارروائی شروع تھی کہ پولیس کی بھاری جمعیت نے تمام ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گھیرے میں لے لیا۔ جن میں سے حسب ذیل رہنماؤں اور کارکنوں سے نوٹس کی تعمیل کرائی گئی۔

شیخ حسام الدین، مولانا حبیب الرحمن، مولانا سید عطار اللہ شاہ بخاری، مولانا منظر علی انظر اور غلام نبی جانباڑ۔ نوٹس کی عبارت حسب ذیل تھی۔

”کریمیل لارامنڈ منٹ ایکٹ کے تحت ان حضرات کو نوٹس دیا جاتا ہے

کہ وہ قادیان میں نوٹس کے اندر داخل نہ ہوں۔ اور

دوسرا نوٹس تھا کہ:

”دفعہ ۱۲۲ کے مطابق حکم دیا جاتا ہے کہ ضلع گورداسپور میں ۲۲۔ نومبر یا اس

کے کسی قریبی دن میں قادیان اور تحصیل ٹہالہ و مضانات میں مباحثہ یا مناظرہ کے

یہ کسی قسم کی کوئی مجلس منعقد نہ کریں۔“

ان نوٹسوں کی تعمیل کے بعد احرار ورکنگ کمیٹی نے کیا فیصلہ کیا۔ یہ بات پریس لو بتانا

مناسب نہ سمجھی گئی۔ تاہم حکومت کو احرار کی اس خاموشی پر شبہ گذرا کہ مستقبل قریب میں کوئی

نئی آفت آنے والی ہے۔

ملک میں نئی اصلاحات کے پیش نظر حکومت اس وقت کسی نئی سیاسی تحریک کو مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ چنانچہ آنے والے کسی طوفان کے خوف سے اس نے تحریک شہید گنج کو سمیٹنا شروع کیا۔ اگرچہ حکومت اپنی دانست میں اپنا کام ختم کر چکی تھی۔ جو اس نے اس تحریک سے لینا تھا۔ مگر اب یہ آگ بجھانے بجھتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

**نظر بندوں کی رہائی** | ۲۲۔ نومبر کے اخبارات میں سرکاری حوالے سے اطلاع شائع ہوئی کہ تحریک مسجد شہید گنج کے چار اسیروں کو رہا کر دیا گیا۔ ان میں روزنامہ سیاست کے مدیر سید حبیب، میاں فیروز الدین احمد، ملک لال خاں، مولانا محمد شاہ شامل ہیں۔

ان حضرات کی رہائی پر (بقول روزنامہ انقلاب یکم دسمبر ۱۹۳۵ء) جو جلسہ ہوا۔ اس میں پانچ ہزار افراد جمع ہو سکے اور جب یہ رہنما گرفتار ہوئے تھے، تو ان کے احتجاجی جلسہ میں سچاس ہزار عوام شریک تھے۔

رہا شدگان نے اس جلسہ میں پھر اعلان کیا کہ حصول مسجد کے لیے دس لاکھ رضا کاروں کی ضرورت ہے۔

جیسے ہی حکومت کی منشا میں انقلاب آیا، اخبارات کی رائے بھی بدل گئی۔ تحریک مسجد شہید گنج کے دوران روزنامہ "انقلاب غیر مسلموں کے خلاف جس تیزی سے آگے بڑھا سرکاری پالیسی کیا تبدیل ہوئی کہ اخبار مذکور کا مزاج بھی بدل گیا۔ ۳۔ دسمبر کے شمارے میں مدیران انقلاب نے پنجاب کے ہندو مسلمان اور سکھ عوام سے اپیل شائع کی کہ وہ پنجاب کی فضا کو مکدر نہ کریں۔ اور پیار و محبت سے رہنے کی اپیل کی۔

یہ اپیل اخبار مذکور میں ایک چوکھٹے کی شکل میں کئی روز شائع ہوتی رہی۔

۶۔ دسمبر کو یوم شہید گنج منایا جانا تھا۔ مگر ۴۔ دسمبر کو امیر ملت کا اعلان آ گیا کہ یہ دن نہ منایا جائے۔

**ایک اور نوٹس** | ۵۔ دسمبر کو امرتسر کے احوار کارکنوں اور رہنماؤں کو حکومت پنجاب کا ایک نوٹس موصول ہوا کہ:

”حسب ذیل حضرات ۱۲۲ کے تحت غیر معینہ مدت کے لیے قادیان سے چار چار میل تک کسی اجتماع میں شریک نہ ہوں اور نہ ہی کوئی اجلاس منعقد کریں۔ مولانا عبدالغفار غزنوی۔ شیخ عبدالغفار اثر۔ کیپٹن محمد امیر خاں۔ غلام نبی جاننازا۔ مولانا بہاؤ الحق قاسمی، مولانا عبدالکریم مہا بلہ واسے اور مولانا محمد سلیمان ناروتی۔ اس نوٹس کی نقول شہر کے تمام احرار دفاتر میں تقسیم کر دی گئیں۔“

لاہور ۱۳۔ دسمبر ایک غیر معمولی سرکاری اعلان منظر ہے کہ نعلی گوند اسپور دفعہ ۱۸۸ اور ۱۲۲ میں دفعہ ۱۸۸ تعزیرات بند کے تمام جرائم پولیس کے قابل دست اندازی ہوں گے۔ دفعہ ۱۸۸ تعزیرات بند ایسے احکام کی خلاف ورزی کے متعلق ہیں جیسے حکام مجاز نے باقاعدہ طور پر نافذ کیا ہو۔

۱۳۔ دسمبر کو مولانا سید حبیب مدیر روزنامہ ”سیاست“ جو گذشتہ دنوں تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں نظر بندی کے بعد رہا ہو کر آئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر اور انسپکٹر جنرل پولیس لاہور نے انہیں امتیاء کیا اس کے جواب میں مدیر ”سیاست“ نے کہا:

”آج صبح آپ نے مجھے امتیاء کی تھی۔ ذیل کی چند سطریں جواب میں عرض کر رہا ہوں۔“

۱۔ میں آپ کو اور آپ کے ذریعے حکومت کو یقین دلاتا ہوں کہ اخبار سیاست کا دفتر یا اس کے دفتر کا عملہ شہید گنج تحریک کے کام میں استعمال نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ اگر اخبار سیاست جاری ہو گیا یا دوسرے الفاظ میں جب بھی جاری ہوا وہ بھی دوسرے اخباروں کی طرح معتدل انداز یا رویہ اختیار کرے گا

(روزنامہ ”انقلاب“ ۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۵ء)

شہنشاہ حبشہ نے مصالحتی فارمولہ مسترد کر دیا | ۱۴۔ دسمبر حبشہ اور اٹلی کے درمیان جنگ میں بڑی طاقتوں سے

داخلت کی اپیل کی گئی تھی۔ جس پر برطانیہ اور فرانس نے آگے بڑھ کر مصالحت کی جن شجادیز کو مناسب سمجھا تھا شہنشاہ حبشہ نے اس فارمولے کو مسترد کر دیا۔

**احرار کی قادیان میں سول تافرمانی** | حکومت کے اس فیصلے پر کہ احرار قادیان میں داخل نہ ہوں، احرار رہنماؤں نے اس حکم کو توڑنے کا

فیصلہ کیا کہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۶۔ دسمبر کو قادیان میں نماز جمعہ پڑھائیں گے اور واپس آجائیں گے۔ اگر حکومت نے داخلت کی تو نماز جمعہ پر پابندی سمجھی جائے گی لہذا احرار اس حکم کو داخلت فی الدین سمجھتے ہوئے اس کے خلاف تحریک چلائیں گے۔ نتیجہ خدا کے سپرد۔ اس فیصلے کے تحت حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۶۔ دسمبر صبح کو امرتسر سے روانہ ہو کر حبیب ٹھالا اسٹیشن پر پہنچے تو حکومت نے انہیں ایک نوٹس کے ذریعے قادیان میں داخل ہونے سے روکنا چاہا۔ لیکن وہ حسب حکم جماعت قادیان کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت حبالا اسٹیشن پر ہزاروں مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ جس نے حضرت شاہ صاحب کو محبت اور عقیدت کے پر ہوش نعروں کے ساتھ قادیان روانہ کیا۔ پولیس بھی ریل کے اسی ڈبے میں شاہ جی کے ساتھ آ بیٹھی۔ جیسے ہی گاڑی جینتی پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ پولیس انسپکٹر نے آگے بڑھ کر شاہ جی سے استدعا کی کہ اس سے آگے دفعہ ۱۳۲ کی خلاف ورزی ہوگی۔ لہذا آج یہیں اتر جائیں، لیکن شاہ جی نے پولیس کے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور سفر جاری رکھا۔ آخر پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔

**یوم حجاز** | ۱۶۔ دسمبر کو ہندوستان بھر میں مجلس احرار کے صدر مولانا حبیب الرحمن نے احرار کارکنوں اور دیگر مسلمانوں کو حکم دیا کہ ۲۰۔ دسمبر کو یوم حجاز منائیں اور ان ٹھیکوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں جو حکومت سعودیہ نے خیر ملکی کمپنیوں کو حجاز میں کان کنی کے لیے دیے ہیں۔

**کرفیو اٹھالیا گیا** | ۱۸۔ دسمبر کے اخبارات میں اعلان کر دیا گیا کہ اب لاہور کی فساد رست ہے۔ لہذا آج رات بارہ بجے کے بعد کرفیو ختم سمجھا جائے۔



**خاکسار لیڈر کا اعلان** | ۱۲۔ دسمبر ۱۹۳۵ء کو تحریک شہید گنج کے سلسلے میں گورنر پنجاب نے ایسی تمام جماعتوں کو انتباہ کیا جو فوجی قسم کی دروی یا پریڈ وغیرہ کرتی تھیں۔ اس پر خاکسار تحریک کے لیڈر علامہ عنایت اللہ المشرقی نے گورنر پنجاب کو حسب ذیل مراسلہ تحریر کیا۔

” ۱۲۔ دسمبر کو لاہور پہنچ کر میں نے ہذا کیسی لنسی کے اس اعلان کو بخور پڑھا ہے جو آپ نے لاہور کی فرقہ وارانہ کشیدگی کے متعلق ۱۰۔ دسمبر کو کیا۔ اور جس میں ان انجمنوں کی طرف بھی اشارہ تھا، جو سپاہیانہ طور پر متحرک ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کا انتباہ خاکسار جماعت کے متعلق نہیں، جس کا روز اول سے مقصد وحید حکومت سے الحجاز نہیں اور جس کے پیش نظر ہندوستان کی تمام قوموں میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنا ہے۔

خاکسار تحریک امن اور احترام قانون قائم رکھنے کے لیے حکومت کو ہر حیثیت میں امداد دینے کو تیار ہے۔ جیسے کہ کئی بار اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس وقت لاہور کے افسوسناک حالات کو پیش نظر رکھ کر میں نے خاکساروں کو ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے منع کر دیا ہے، جس کا غلط مفہوم لیا جاسکتا ہو۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے ان احکام کے بعد ہذا کیسی لنسی کو خاکسار تحریک کے متعلق کامل اطمینان ہو جائے گا۔

(روزنامہ انقلاب، ۲۱۔ دسمبر ۱۹۳۵ء)

**احرار کانگریس کی گولڈن جوبلی میں شامل نہ ہوں** | ۲۲۔ دسمبر۔ مولانا حبیب الرحمن صدر مجلس احرار ہند نے تمام

احرار کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ کانگریس کی گولڈن جوبلی میں شریک نہ ہوں۔

صدر مرکزیہ کے علاوہ اس اپیل پر ان رہنماؤں کے بھی دستخط تھے۔

مولانا منظر علی اظہر۔ چودھری افضل حق، سید محمد داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، ماسٹر

تاج الدین انصاری اور صاحبزادہ فیض الحسن۔

باوجودیکہ تحریک مسجد شہید گنج میں احرار کی مخالفت انتہا کو پہنچ چکی تھی، تاہم رجعت پسند گروہ کو احرار سے ابھی خطرہ تھا کہ یہ لوگ آئندہ انتخاب میں جس انداز سے سامنے آئے ہیں اور پنجاب میں جس جماعت سے ان کا ٹکراؤ ہوگا، وہ صرف مجلس احرار ہے۔ چنانچہ ان دنوں مخالفین احرار آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس کی اس قرارداد کو اچھال رہے تھے، جس میں کہا گیا تھا کہ رجعت پسندوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ نیز حجاز کی قرارداد پر بھی بحث جاری تھی۔ انہی دنوں لاہور کے انگریزی روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے مجلس احرار کی سیاست پر ایک ادارہ لکھا جسے ۲۷ دسمبر کے روزنامہ "انقلاب" نے نقل کیا۔

**اقبال کا استعفیٰ** کفر پر سے جو نہی ملمح کی چادر اتری حقیقت واضح ہو گئی کہ اسلام کے روپ میں قادیانی طبقہ اسلام نہیں بلکہ ایک باطل گروہ ہے۔ اس امر آئین کو کھینچنے کے لیے جو ہاتھ اٹھا اور جو قدم آگے بڑھے وراثتِ باطل نے وہ ہاتھ اور قدم نہ صرف روک دیے بلکہ انہیں طوقِ سلاسل میں جکڑ دیا۔ بالآخر وہ وقت آن پہنچا کہ سٹاس کو عریاں کر دیا گیا۔ اور اس پر بھری ہوئی کافذ کی پھول پتیاں بیکار کر دی گئیں۔ جو نہی یہ تعفن پھیلا۔ سید روہوں کے دم گھٹنے لگے۔

مرزا نیوں کے اخبار "الفضل" نے اپنی ۱۱ جولائی ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں جب اس وقت

کا اعلان کیا:

”یہ قادیان ہے انبی کی بستی، یہ تخت گاہِ رسولِ حق ہے۔ خدائے قادر کا یہ وعدہ ہے۔ یہ بلا دار اللہان رہے گا۔ ہزاروں عذاب آئیں دنیا میں۔ لاکھ شہر برباد ہوں مگر یہ شہر احمد نبی یقیناً بحفظ دار اللہان رہے گا۔“

قادیان مکہ ہے۔ فرق اس کی اینٹوں میں ہے۔“

کفر کے اس واضح چیلنج پر دانشور عقل و خرد کے ناخن لے کر سوچنے لگ پڑے کہ پتیل سونا کیسے ہو سکتا ہے۔ مسکرا زرگر کیسے بن بیٹھا۔ گندگی کا پھیل چنبیلی اور گلاب کی ہمسری کیوں کرتے لگا۔ اس سوچ میں ڈاکٹر اقبال نے کہا۔

پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت۔ کہتی ہے یہ مومن پارینہ ہے کافر  
(ضربِ کلیم مصنفہ ڈاکٹر اقبال)

ضربِ کلیم سے نکل کر اقبال جب پیغمبرِ اسلام کے ارشاد پر پہنچے  
 ”انا خاتم النبیین، لانی بعدی“

تو بے اختیار کہہ اٹھے:

”میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں یا وہ ”بہائیوں“ کی  
 تقلید کریں یا پھر وہ ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے  
 مفہوم کے ساتھ قبول کریں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان  
 کا شمار حلقہٴ اسلام میں ہو۔ تاکہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔“

”اقبال اور سیاست ملی“ مصنفہ رئیس الاحقری ص ۲۲۲

علامہ اقبال مرحوم نے مرزائیت کو سمجھنے میں گو بڑی دیر کی۔ تاہم دیر آید درست آید  
 وہ ۱۹۲۵ء میں اس راہ پر آنکے کہ مرزائیت ایک خوفناک اثر رہا ہے جو اسلام کی گل پوش وادیوں  
 میں زہر پھیلا رہا ہے۔ اس زہر کا تریاق اسی میں ہے کہ اس گروہ کو مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے  
 تاکہ کفر کے فریب میں گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ معروف انگریزی اخبار ”اسٹیش مین“ کے ۱۰ جون ۱۹۲۵ء  
 کے ایک مضمون کے جواب میں اقبال نے ایک طویل مضمون لکھا، جس میں نپڈت جو اہر لال نہرو سے  
 اقبال کی قلمی رطائی دیر تک جاری رہی۔

۲۲ نومبر ۱۹۲۵ء کو ڈاکٹر سر محمد اقبال انجمن حمایت اسلام دلاہور کی صدارت سے سبھی مستعفی  
 ہو گئے۔ کیونکہ اس ادارہ میں مرزائیوں کو بحیثیت مسلمان بلند مقام حاصل تھا۔ جو اقبال کی  
 نظر میں مسلمان نہیں تھے۔ لیکن انجمن نے انہیں پناہ دے رکھی تھی۔  
 استعفیٰ کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

”ڈیر شیخ عظیم اللہ!“

اسلام علیکم۔ میں نے آپ سے اور شیخ کلاب دین سے زبانی گفتگو میں عرض  
 کیا تھا کہ جو تحریر انجمن کی طرف سے میرے استعفیٰ کے متعلق اخباروں میں شائع  
 ہوئی ہے اس کا شائع ہونا ٹھیک نہ تھا۔ اگر میں اس کی تردید کرتا تو شاید اس  
 کے نتائج انجمن کے حق میں اچھے نہ ہوتے اس لیے میں خاموش ہی رہا۔

آپ نے میری رائے سے اتفاق کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے  
 علالت کی بنا پر استعفیٰ دیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اور بھی وجوہات تھے جن  
 کو میں نے محض اس وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا کہ ان کی اشاعت سے انجمن کو  
 نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ اس واسطے اس خط میں بھی ان کو بیان کرنے سے  
 احتراز کرتا ہوں۔ اور میں صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ انجمن کے موجودہ حالات  
 میں میں صدارت کا بار گراں نہیں اٹھا سکتا۔ آپ مہربانی کر کے جزل کونسل سے  
 میری طرف سے استدعا کریں کہ میرا استعفیٰ قبول کر کے مجھے ممنون فرمادیں۔  
 میں نہیں چاہتا کہ میری صدارت میں انجمن عام مسلمانوں میں اپنا وقار کھو دے  
 اور میں اس بے اعتمادی کا کوئی علاج نہ کر سکوں۔ والسلام

(دستخط) مہراقبال ۱۲۳۵ھ

علامہ اقبال کے اس خط اور استعفیٰ پر انجمن ہذا میں کافی دیر بحث رہی۔ بالآخر ۱۵ دسمبر ۱۹۲۰ء  
 کو علامہ اقبال کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔

دوسری اور تیسری گرفتاری | ۶۔ دسمبر کو مولانا سید عطار اللہ شاہ بخاری کی گرفتاری کے  
 بعد مجلس احوار نے تحریک سول نافرمانی کا آغاز کر دیا لیکن

اسے صرف جمعہ کی نماز تک محدود رکھا۔ چونکہ قادیان میں نماز جمعہ پر پابندی تھی۔ لہذا احوار  
 کے نزدیک یہ مداخلت فی الدین تھی۔ لہذا اس پابندی کو ختم کرنا احوار کے مذہبی مقاصد میں  
 تھا۔ دوسرے جمعہ یعنی ۱۲۔ دسمبر کو قادیان میں نماز جمعہ کے لیے مولانا ابوالوفا شاہجہان پوری کو  
 منتخب کیا گیا۔ چنانچہ حسب فیصلہ مولانا ابوالوفا شاہجہان پوری امرتسر سے قادیان جانے کے  
 لیے بذریعہ ریل روانہ ہوئے۔ مقامی جماعت نے راقم کو مولانا کے ساتھ جلا تک بھیجا۔

گذشتہ جمعہ شاہ جی کی گرفتاری کے بعد علالت نے انہیں تین ماہ قید سخت اور سچاس  
 روپے جواز کی سزا دی تھی۔ راقم اس وقت بھی شاہ جی کے ساتھ تھا اور پولیس کی آنکھ سچا کر  
 قادیان پہنچ کر نماز جمعہ پڑھادی۔ پولیس کو اس بات کا بظاہر علم تھا۔ چنانچہ جیسے راقم مولانا ابوالوفا  
 شاہجہان پوری کے ساتھ جلا رٹیشن پر پہنچا۔ مولانا کے ساتھ دوسرا نوٹس راقم کو بھی دے دیا

گیا کہ جانتا ہذا قادیان نہیں جاسکتے۔ لیکن راقم نے اس حکم کو غیر شرعی سمجھ کر جماعتی فیصلے کے مطابق ماننے سے انکار کر دیا اور نوٹس کو پولیس کے رو برو بھاڑ دیا۔ اس پر مولانا ابوالوفا شاہ بھانپوری اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ ساتھ ہی عدالت کے سامنے پیش کر دیا، جس نے تین ماہ قید اور پچاس روپے جرمانہ۔ عدم ادائیگی پر ان کی صورت میں ایک ایک ماہ مزید قید کا حکم سنایا۔ ساتھ ہی راقم کو بی کلاس میں رکھنے کا حکم دیا گیا۔ سزا کے بعد ہمیں گورداسپور ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں شاہ جی کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔

نمازِ جمعہ پر پابندی کے سلسلہ میں یہ تیسری گرفتاری تھی۔

صاحبزادہ فیض الحسن کا تقریریں سالانہ پنجاب | مجلس احرار ان دنوں دو طرفہ لڑائی  
| لڑ رہی تھی۔ ایک طرف تحریک

شہید گنج میں پنجاب کے رحمت پسندوں سے اور دوسری طرف قادیانیوں سے مدد بھیڑ ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس لڑائی میں حکومت پنجاب براہ راست دخل تھی۔ تاہم رطان کبارخ مرزائیوں کی



طرف تھا! ایسے میں مجلس احرار نے اپنی عسکری تنظیم کو نئے انداز سے ترتیب دینا شروع کیا اور اس کے لیے خانقاہ آوہمارہ ضلع سیالکوٹ، کے سجان نشین سید فیض الحسن شاہ صاحب کو سالانہ پنجاب منتخب کیا۔ جبکہ مرکز کے سالانہ شیخ حامد الدین تھے۔

صاحبزادہ فیض الحسن

۱۹۲۲ء میں مجلس احرار میں

داخل ہوئے تھے۔ ان

صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ

کی قابلیت، سوچ اور فکر کے مطابق انہیں اور اورکنگ کمیٹی میں لے لیا گیا تھا۔ اور ان کے مفید مشورے جماعت کے لیے معاون ثابت ہوئے۔

صاحبزادہ فیض الحسن مارچ ۱۹۱۱ء میں سید غلام حسین شاہ صاحب سجادہ نشین آلومہار کے ہاں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم سیالکوٹ مرے کالج میں حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں فارغ ہوئے۔ تعلیم کے دوران تحریک کشمیر زدوں پر تھی اور اس کا مرکز سیالکوٹ تھا۔ صاحبزادہ فیض الحسن ان دنوں اکثر احرار رہنماؤں سے ملتے رہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے باقاعدہ احوال میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

صاحبزادہ صاحب کردار اور گفتار کے فاری تھے۔ وہ جب تک احوال سے وابستہ رہے برطانوی سامراج ان کے خلاف کئی بہانے تلاش کرتا رہا۔ لیکن ان کی جرات ایمانی نے دشمن کو ہر موڑ پر شکست دی۔ اس دوران ان کی منزل کے راستے میں علاوہ دیگر مصائب کے جیل خانہ بھی آیا۔ لیکن قفس کی تیلیاں منزل کو اوجھل نہ کر سکیں۔

پنجاب کے روایتی پیروں سے الگ تھنک انہوں نے اپنے لیے انفرادی مقام حاصل کیا۔ حالانکہ مشاطہ فطرت نے ان کے بناؤ سنگھار میں کہیں بجلی سے کام نہیں لیا۔ مضبوط جسم، سر و قد، کھلے گندمی رنگ کے پھرے پر چشم آہونے ایسی بہار یا زہر کھی تھی کہ الامان الحفیظ۔

اکھاں یار دیاں توبہ معاذ اللہ

جنویں بھریاں پھرن دیوانیاں نی

اس پر کردار کا یہ عالم کہ جس راہ سے گذر جاتے آہٹ تک نہ ہوتی تھی! انہی اوصاف کی بنا پر جماعت نے انہیں عسکری ذمہ داریاں سونپ دیں۔ جسے انہوں نے خوب نبھایا۔ مگر یہ ان دنوں کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔ گوا آج بھی کھنڈرتا رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی۔ بہر طور جب تک مجلس احوال میں رہے انہیں خوب رہے۔

مجلس احوال کی یہ انفرادی اور محدود سول تافرمانی کی تحریک اجتماعی یا

چوتھی گرفتاری

ہنگامی تحریک نہیں تھی۔ اس کی نوعیت انگریز کسٹس قانون کی

خلاف ورزی تھی، جو شرعی فرائض کے راستے میں دیوار بن گیا تھا۔ درنہ قادیانی گروہ کی کیا حیثیت تھی

جیسے جیسے مجمع کا دن قریب آتا لوگ اپنی جگہ تیار ہو کر امرتسر ریوے اسٹیشن اور ٹالہ ریوے اسٹیشن پر ہجوم در ہجوم جمع ہو جاتے۔ اس طرح تحریک آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ ۲۰ دسمبر کو لاہور کے ایک کارکن محمد حسین سلغی کا نام سامنے آیا کہ وہ لاہور سے امرتسر پھر پھوگرا م کے تحت قادیان پہنچ کر نماز جمعہ پڑھائیں۔ لیکن انہیں ٹالہ سے آگے جیننی پور ریوے اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔

تحریک ہذا کے قیدی اگورڈا سپورڈ سٹرٹ جیل میں رکھے جاتے۔ لیکن حضرت امیر شریعت کو یہاں سے تبدیل کر کے لاہور سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا۔

حریف کومات دینے کے لیے سیاسیات کی سوچ میں بعض اصرار کی اٹوٹی جہارت

لیکن ضمیر غیر مطمئن رہتا ہے۔ ویسے بھی عشق اور جنگ کے میدان میں تخریب کی ہر تدبیر کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ حریف اور رقیب کو جن اطوار سے بھی شکست دی جائے برا نہیں پھر قادیان تو ایسی بستی تھی جہاں کے چھوٹے فقار نے وہاں کی مظلوم آبادی کو ہراساں کیے ہوا تھا۔ مذہب اور سیاست ان کی جیبی گھڑی تھی۔ برسرِ اقتدار مرزا کی خاندان کا کوئی فرد اگر بازار سے گزرتا تو اس کی پذیرائی میں سارا بازار سر و قامت کھڑا ہو جاتا۔ مرزا غلام احمد کلنا ندان نہیں بلکہ چارج پنجم کی اولاد ہے۔ جس کی سواری قادیان کے کوچہ و بازار سے گزرے تو آبادی کے ہر فرد پر لازم تھا کہ اس کے احترام میں اپنی جگہ کھڑا ہو جائے۔ خواہ وہ غیر قادیانی ہی کیوں نہ ہو۔ اس ڈرامے کے ایکٹروں کا یہ مصنوعی لباس اتار کر انہیں نہر عام ننکا کرنا بھی احرار کے نزدیک اسلام اور انسانیت کی بڑی خدمت تھی۔

ان دنوں ماسٹر تاج الدین انصاری قادیان میں دفتر احرار کے انچارج تھے۔ ملمح سابقین کی اس دوکان کو اجاڑنے اور پتیل کو سونے کے بھاؤ بیچنے والے ان سٹی بازوں کو بے نقاب کرنے کے لیے اس طرحی نے ایک مضمون بنایا۔ جس کے تحت قادیان کے ایک نوجوان محمد حنیف کو جو بھیک منگوں کا لڑکا تھا، تیار کیا۔ اس کے ذمہ یہ لگایا کہ وہ مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان کے مہائی شریف احمد کو جب وہ بازار میں لکلے تو سر عام پیٹا ڈالے۔ اور

موقعہ واردات سے فرار ہو جائے۔ باقی دیکھا جائے گا۔ چنانچہ اس سکیم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے محمد حنیف نے وقت کا جائزہ لیا کہ مذکورہ آدمی کب بازار میں نکلتا ہے۔ جب اسے گرد و پیش کا اندازہ ہو گیا تو ایک دن حنیف ہاکی سے مسلح مرزائیوں کی مسجد اقصیٰ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں شریف احمد سیاہ اچکن پہنے سنہری کلاہ پر سفید پگڑی باندھے، سفید شلوار، پینٹ کی سیاہ گرگابی اور ہاتھ میں چھڑی لے کر قادیاں کے مین بازار میں تفریح کے لیے نکلا۔ ابھی وہ اپنی شاہی رفتار سنبھال ہی رہا تھا کہ ڈیوٹی پر کھڑے محمد حنیف نے ہاکی شریف احمد کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اڑا کر اسے ایسی شکنجی دی کہ وہ مزہ کے بل گرا۔ اور پھر اوپر سے تین چار ہاکیاں اس کے چوتھوں پر رسید کر دیں اور بھاگ نکلا۔

یہ سارا کچھ اس قدر عاجلانہ طور پر ہوا کہ بازار کے لوگ اس انہونی کارروائی پر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ آن کی آن میں یہ خبر خلافت سے ہو کر قادیاں میں پھیل گئی کہ احوار والوں نے شہنشاہ اللہ کی توہین کر دی۔ گویا شریف احمد کے چوڑے شہنشاہ اللہ تھے۔ (اللہ کی نشانی) نعوذ باللہ۔ سارے شہر میں کراہ مچ گیا۔ مرزائیوں کے گھر میں صاف ماتم سمجھ گئی۔ قریباً ایک صدی کا دام فریب جس کی طنابیں ابلیس نے تھام رکھی تھیں۔ تار تار ہو کر کبھر گیا۔ عزت و احترام کا کاغذی پھول پاؤں تلے مسل دیا گیا۔ جھوٹی نبوت کے قصر خلافت کو ایک فقیر نے ایسا پتھر مارا کہ لات و بیل کی بنیادیں بل گئیں۔

اب ملزم کی تلاش شروع ہوئی۔ پولیس نے دفتر احرار کو اپنی تفتیش کا مرکز بنا کر اسٹر تاج الدین کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر ملزم کو ڈھونڈنا چاہا۔ مگر یہ تو سب قلمزم تھا۔ یہاں ان چھوٹی موٹی چیزوں کا اتہ پتہ کہاں مل سکتا تھا۔ قادیاں سے باہر جانے والے تمام راستے مسدود کر دیے گئے لیکن ہوائیں بھی ملزم کی بوسونگھنے میں ناکام رہیں۔ مرزائیوں کی اپنی سی۔ آئی۔ ڈی اور ضلعی انتظامیہ مسلسل تلاش کے بعد جب ایوس ہو چکیں تو رات کے پچھلے پہر محمد حنیف کو قادیاں سے نکال کر صبح ہونے تک پٹھانکوٹ پہنچا دیا گیا اور عدالت سے اس کی ضمانت کرائی گئی۔

اب محمد حنیف قانون کے حصار میں تھا۔ مرزائی اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر دل ہی دل میں زہر کے گھونٹ پی رہے تھے۔ قادیاں پہنچ کر حنیف کو کچھ رقم دے دی گئی جس سے وہ منڈی سے آموں کا ٹوکرا خرید لانا اور مرزائی محلوں میں فروخت کرتا۔ مرزائی عورتیں آم



خویدنے کے بہانے حنیف کو دیکھتیں اور اس طرح آدھ گھنٹے کے اندر وہ آموں کا ٹوکرا فروخت کر کے دوسرے آتا تمام دن یہی شغل رہتا۔ حنیف دن بھر بھیک مانگ کر مشکل سے پیٹ پالتا تھا۔ مگر اب وہ اچھا خاصا نچہ فروش بن گیا اور مزے سے روزی کمانے لگا۔ کچھ دنوں تو یہ سلسلہ رہا۔ آخر جمعہ کے روز بشیر الدین محمود نے اپنی تقریر میں کہا:

”مرزائیو! تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم لوگ اس آدمی سے سودا خریدتے ہو۔

جس نے کل سہر عام شاعر اللہ کی توہین کی تھی۔“

اس پر مرزائی عورتیں حنیف سے آم تو نہ خریدیں مگر چپکے سے دروازے کی درازوں سے حنیف کو دیکھ ضرور لیتیں۔ آخر دو ماہ مقدر چلنے کے بعد محمد حنیف کو چھ ماہ قید کی سزا ہو گئی۔ اس دوران مقامی جماعت اس کے اہل خانہ کی مالی امداد کرتی رہی۔

تحریک جمعہ کے دوران راقم جب ۱۹۲۲ کی خلاف ورزی کے جرم میں سزا پا کر گورداسپور جیل پہنچا تو یہاں محمد حنیف سے ملاقات ہو گئی۔ تب اس سے دریافت کیا کہ تم شریف احمد پر حملہ کرنے کے بعد کہاں جا چھپے تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ”قادیانیوں کی مسجد اقصیٰ کے باروالے مکان میں تھا۔ یہ ایک معروف مرزائی کا مکان تھا۔ سو دن اور تین راتیں اسی جگہ رہا۔ ان دنوں مجھے کھانا بھی اچھا ملا اور آرام بھی۔ پولیس اور خود مرزائیوں کو اس پر شبہ تک نہ ہو سکا۔ میری رات کے آخری حصے میں مولوی رحمت اللہ (مہاجر) اور ان کا ایک ہمراہی مجھے قادیان سے پیدل بٹالہ لے کر پہنچے۔ یہاں ہم حاجی عبدالرحمن رئیس بٹالہ کے گھر رہے۔ شام ہونے سے ذرا پہلے یہاں سے چار نوجوان مجھ لاری کے ذریعے پٹھانکوٹ لے گئے اور ایک وکیل نے میری ضمانت کرادی۔

دوامِ تبلیغ میں آنے سے پیشتر مرزا غلام احمد اور اس کا دست راست  
**دوسری جسارت** حکیم نور الدین بھروی عقیدتاً غیر مقلد تھے۔ اسلام سے ہٹ کر اپنے باطل مذہب (مرزائیت) کی نیواٹھانے کے بعد تک موصوف اسی عقیدے پر جمے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ قادیان میں کوئی تہوار، یہاں تک کہ عید میلاد النبی بھی منانا جرم تھا۔ اشنا عسری

۱۔ تاریخ میں اس کا کافی ثبوت ہے لیکن میں اسے غیر متعلقہ سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہوں۔ مصنف

قرقہ کے لوگ سال ہا سال کی جدوجہد کے باوجود یہاں تخریب نکالنے میں ناکام رہے۔  
گو مجلس احرار میں انگریز اور مرزائی دشمنی کے باعث ہم عقائد لوگ جمع تھے۔ مگر اکثریت  
اہل سنت کی رہی، جن کے نزدیک حوزہ داری جائز نہیں۔ لیکن عشاق جب صحراوردی کے لیے  
نکلے ہیں تو انہیں پھول اور کانٹوں دونوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جگر مراد آبادی نے اسے یوں  
کہا ہے۔

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز  
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں  
پنجاب کے معروف صوفی شاعر سید بلھے شاہؒ نے اسی مفہوم کو اپنے انداز میں کہا ہے۔  
سانوں نیچ نیچ یار نون مناؤ تا لپے گیا  
بہر طور عشق اور محبت میں گاہ ہے ایسی راہیں آتی ہیں کہ قدم اٹھتے نہیں اٹھائے جلتے  
ہیں۔ جیسے کہ غالب کہتے ہیں۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل  
ہم کو چہر قیب میں بھی سر کے بل گئے  
حقیقہ منعم نبوت کی حفاظت میں قادیانی حصار کو توڑنا اسلام کا بنیادی حصہ تھا۔ کفر کا  
یہ قلعہ برطانوی پناہ میں تھا۔ اس میں درار ڈالتا، بوتے شیر لاتے کے مترادف تھا۔ احرار نے  
ہر سخ سے اس پر بیچار اور جملہ مناسب سمجھا، تاکہ یہ بت ٹوٹ جائے اور اس کی پرستش  
سے لوگوں کے ایمانوں کی حفاظت ہو سکے۔

سال رواں کے دم توڑتے دنوں کی بات ہے کہ ماسٹر تاج الدین انصاری کی تجویز  
پر دینا نگر، دضلع گورداسپور سے شیوہ رہنما مظفر علی شمسی کو قادیان بلوایا گیا تاکہ محرم کے  
دنوں قادیان میں گھوڑا نکلانے کا اہتمام کیا جاسکے۔ چنانچہ اندر خانہ اس کی تیاریاں شروع  
کردی گئیں۔ اس کے لیے آسمان کے کون کون سے تارے توڑنے پڑے۔ سمندر کی  
کن گہرائیوں سے موتی نکالنے پڑے اور پہاڑوں کا سینہ پیر کر کیونکر راستہ ہموار کیا گیا۔ یہ  
راز مرستہ ہے لیکن دسویں محرم کو قادیان کی تاریخ میں پہلا دن تھا، جب اس کے بازاروں

سے گھوڑے کا جلوس گذر رہا تھا۔ اس کی رہنمائی منظرِ حلی شمسی کر رہے تھے۔  
 ماتم گساہوں کے گرد پولیس کے ہمراہ اجوار سرخپوش بھی جلوس کے ساتھ تھے۔ شہر کے  
 ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے محلوں میں پانی کی بسلیں لگائیں۔ قادیان کے مسلمانوں نے  
 اہل جلوس کی تواضع مٹھائی اور ٹھنڈے پانی سے کی۔ دن بھر شہر میں گھوم پھر کر گھوڑے کا  
 جلوس نمازِ مغرب کے قریب نہایت امن اور سکون سے ختم ہوا۔  
 قصہِ خلافت کے کنگرے اور قادیانیوں کے دل اس واقعہ کو کس طرح برداشت کر  
 سکے یہ بحث کا دوسرا رخ ہے۔ لیکن شریف احمد پر حملہ اور قادیان میں گھوڑے کے جلوس نے  
 نبوہ باطلہ کے تمام وقار کو مٹی میں ملا دیا۔ اور قادیان کی رسی سہی ساکھ تحریک جمعہ پر پابندی  
 نے اڑادی۔

پانچویں گرفتاری | حسب دستور نماز جمعہ پر پابندی کے سلسلے میں، ۲۰ دسمبر کو نو مسلم  
 مولوی بشیر احمد دیر مزائیت سے تائب ہو کر مشرف باسلام ہوا تھا  
 اور ضلع منظرِ گڑھ کا باشندہ تھا۔ نے جلالہ سے قادیان جا کر نماز جمعہ پڑھانے کے لیے روانہ  
 ہونا تھا۔ مگر اسے جلالہ ٹیلیشن پر ہی گرفتار کر لیا گیا اور تین ماہ قید سخت بمعہ جرمانہ کی مسز  
 سنائی گئی۔

گنوار اسلام کے بائین یہ ہاتھ پائی جاری تھی کہ ۱۹۲۵ء کا سال اپنی پیشانی پر نشیب و نواز  
 کے سینکڑوں بل لیے ہوا بھرا کابل میں ڈوب گیا۔



جنوب مشرقی ایشیا سے اُبھر لے والا سال نو کا آفتاب لوہیں نہایا ہوا ہے۔ آسمان دور تک سر جھکانے خونِ آدمیت میں ماتم کناں ہے۔ خونِ آلود فضاؤں میں ریت کا ہر گولہ سرخ آندھی اڑانے چلا آ رہا ہے۔ تہذیبِ گمراہ سے گھبرایا ہوا انسان اپنے حقوق کے حصول میں راستے کی ہر دیوار توڑتا، پہاڑوں سے رطنا، سمندر وں کو چیرتا اور آسمانوں میں شگاف ڈالتا ہوا، اپنی آزادی کی طرف دوڑتا چلا جا رہا ہے۔

چین دیوتاؤں کی سرزمین، توہمات کے گرد و غبار میں لپٹے انسانوں کا جہوم، حقیقت سے دور انسانوں کی مھجول بھلیوں میں اُلجھے ہوئے لوگ اپنے آپ سے نا آشنا، وقت اور زمانے کی ضرورت سے کوسوں دور، انسانیت کی منزل سے بیگانہ۔ جب ذرا بیدار ہوئے تو غلامی کی زنجیریں ان پر ٹسکا رہی تھیں۔

بدھ مت کے پیاروں نے اپنے عقیدے میں ایسی اینوں گھولی کہ بر چینی اپنے حکمران ٹولے کی خزمستیوں سے غافل اپنی ترنگ میں ایسا مست ہوا کہ غلامی کی زنجیروں نے ان کا مذاق ہی نہیں اڑایا، بلکہ یورپ اور ایشیا بھی ان پر بسنے لگے۔ وہ کائنات کے لیے ایک کھلوتا بن گئے تھے کہ ۱۹۱۱ء میں ہالہ کی چوٹیوں نے انہیں جھنجھوڑا۔ تبت کی تیرائیوں سے انقلاب کی آگ سلگنے لگی۔

گراں خواب چینی سمجھنے لگے

ہمارے چشمے اُبلنے لگے

(اقبال)

پودھری افضل حق کی معروف کتاب "آزادی ہند" اس موضوع پر انہی دنوں کی تصنیف ہے۔

جس کا پس منظر چین کی موجودہ بیداری سے ہے۔

لیکن یہ انقلاب چینی عوام کو اس نہ آیا۔ کہ ڈاکٹر سن یات سین چینی عوام کو یورپین سیاستدانوں کے دامن سے وابستہ کر دینا چاہتا تھا۔ ان کی موت کے بعد ان کا ہم زلف چینی کائی شیک چینیوں کی قسمت کا مالک بنا، توروس کے دانشور آگے بڑھے۔ انہوں نے اس خام مال کو اپنی جھولی میں ڈال لینا چاہا۔

قومیں جب بیدار ہوتی ہیں، پھر نہ انہیں حکمران کی ساڑھی نینا کے جھولے میں سلا سکتی ہیں نہ ظلم و جور انہیں اپنے ساروں سے باز رکھ سکتا ہے۔ صدیوں کا سویا ہوا چین اپنے محکوم تعلق کو بیدار دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی حقیقت معلوم ہو چکی تھی۔ وہ اپنی آزادی کے لیے اب وقت کا محتاج نہیں تھا۔ اس کے قدم منزل کی جانب رواں دواں تھے۔

طوفان آتا ہے تو ساحل بھی موجوں سے کھینا چھوڑ دیتا ہے۔ منجھار میں لہجی ہوئی کشتی کے پتوار ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایسے میں ملاح کے حواس اگر درست رہیں، تو کنارے پر پہنچ جانا دشوار نہیں ہوتا۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء کا دن چینی عوام کی تاریخ میں ہمیشہ سنگ میل رہے گا، جب ایک غریب کسان کے بیٹے نے ہل اور پنجالی چھوڑ کر اپنی دھرتی کی کوکھ سے ان جیالے نوجوانوں کو جنم دیا، جنہوں نے مشرقی ایشیا کی تاریخ کو اپنے خون سے لکھا۔ ۱۹۳۶ء کا سورج ابھرا تو کامریڈ ماؤزے تنگ اپنے لانگ مارچ میں فرسودہ چین کی تمام شاہراہوں پر نیا چین تعمیر کر رہا تھا۔ دس ہن کیونسٹ انقلاب کے بعد جنوب مشرقی ایشیا سے سرخ آندھی کے بادل سرزمین یورپ کے لیے سازگار نہیں تھے۔ جہتہ اوسٹری کی لڑائی برطانوی سیاستدانوں کے لیے سوہان روح تھی۔ ہندوستان کے حالات بھی انگریزوں کے حق میں نہیں تھے۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ جسے برطانیہ نے اپنی تقاریر کا ذریعہ سمجھا تھا، اس کی موت کا باعث بن رہا تھا۔ ایسے میں جنوب مشرقی ایشیا سے نئی ابھرتی ہوئی تحریک یورپین سامراج کے لیے ایک نیا الجھاؤ پیدا کر رہی تھی۔ مہر حال ۱۹۳۶ء کے چہرے پر سکون کے آثار نہیں تھے۔

نئے چین کا خالق کامریڈ ماؤزے تنگ دچینی زبان کے تلفظ میں اسے ماؤزے وونگ کہا جاتا ہے، ۲۶۔ دسمبر ۱۸۹۳ء کو چین کے صوبہ ہونان کے ایک گاؤں شاؤشان میں ایک غریب

کسان کے ہاں پیدا ہوا چین میں ان دنوں علم برائے حساب و کتاب تک محدود تھا۔ اپنے گاؤں کے پرائمری سکول سے فارغ ہو کر ماؤ گھر یلو زندگی کی کفالت کے ذرائع تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ بغیر اطلاع دیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دوسرے گاؤں کے سکول میں تعلیم مکمل کرنے لگا۔ جہاں اسے حالات کی خبر ہوئی اور اس کے سیاسیات کا مطالعہ شروع کیا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو چین کے حکمران مانچو خاندان کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ یہ آگ دیکھتے دیکھتے ہمارے چین میں پھیل گئی۔ ماؤزے تنگ ان دنوں انقلابی فوج میں بھرتی ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں چین کے نظام کومتیہ میں بنیادی تبدیلی آئی۔ اس انقلاب کے لیڈر ڈاکٹر سن یات سین تھے۔ اس کی نظریں دیوار چین سے پرے یورپ کی طرف دیکھنے لگیں، جسے ماؤزے تنگ نے پسند نہ کیا اور وہ ملازمت سے الگ ہو کر وقت گزارتا رہا۔ اس دوران سکول میں داخلہ بھی لیا۔ صابن سازی کا کام بھی کیا۔ اس نے طلباء کی تنظیم بھی کی۔ ۱۹۲۱ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی وجود میں آئی۔ لیکن ہنوز یہ تحریک خفیہ تقریروں تک محدود تھی۔ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن یات سین کا انتقال ہوا۔ ان کی جگہ چنگیا تی شیک نے لی۔ مگر اس کا ذہن لینن ازم کی طرف تھا، جسے ماؤ نے قبول نہ کیا اور میں سے ماؤ نے اپنی انفرادی سرگرمیاں شروع کیں۔ جسے چنگیا تی شیک نے چین میں نئی بغاوت کا پیش خیمہ قرار دے کر ماؤزے تنگ کا گھیراؤ شروع کیا۔ لیکن ماؤ بچتا بچتا اپنی مختصر طاقت سمیٹ کر پہاڑوں میں جا چھپا۔ جہاں بیٹھ کر اس نے اپنی انقلابی تحریک کو منظم کیا۔ آخر ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء کا دن آیا کہ ماؤزے تنگ پہاڑوں کے دامن سے مختصر ساتھی لے کر لانگ مارچ (لمبا سفر) کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ جس گاؤں پہنچا لوگ اس کے لیے فرش راہ ہوتے۔ وہ جس شہر گیا اپنا مقام پیدا کرتا چلا گیا۔ لوگ اس کی پذیرائی کے لیے گھروں سے نکل آئے۔ ماؤ نے نظام کی بنیاد ڈالتا آگے بڑھتا گیا۔

ماؤزے تنگ ابھی پہاڑوں کا سینہ چیر کر دریاؤں کے پانی روندھ کر چنگیا تی شیک کی فوج سے نبرد آزمائی سے تھک ہار کر ذرا سی دیر کے لیے سستیا ہی تھا کہ شمال مغربی چین سے ۱۹۳۶ء کا سورج ابھرا۔

حکومت کی شکست | قادیان میں نماز جمعہ پر پابندی کے سلسلہ میں ۳۔ جنوری (۱۹۳۶ء) کو قاضی اجمان احمد شجاع آبادی قادیان جا رہے تھے کہ ٹنڈو یلو

اسٹیشن پر نہیں ایک نوٹس کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ قادیان میں آپ کے واسطے پر قدغن ہے۔ قاضی صاحب نے یہ پابندی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جیسے ہی وہ متعینہ حدود سے آگے بڑھے پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اسی وقت ڈیوٹی مجسٹریٹ نے انہیں چھ ماہ قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی۔

قاضی صاحب کی گرفتاری اس تحریک کی آخری گرفتاری ثابت ہوئی۔ ۵۔ جنوری کو حکومت پنجاب نے قادیان میں نماز جمعہ پر سے پابندی اٹھالی۔

۵۔ دسمبر ۱۹۳۵ء کو حکومت پنجاب نے قادیان میں نماز جمعہ پر پابندی عائد کر دی تھی۔ جسے مجلس اہل حق نے مداخلت فی الدین سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ۶۔ دسمبر کو اس کی خلاف دوزی کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے قانون شکنی کے لیے امیر شریعت قادیان گئے۔ یہ سلسلہ تحریک کی صورت میں شروع رہا۔ آخر حکومت کو سپر انداز ہونا پڑا۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے پیشتر حکومت ہند پنجاب کو ہر طرح کی سیاسی آلائشوں سے پاک و صاف دیکھنا چاہتی تھی تاکہ برطانیہ کا یہ بازو نئے شمیر زن رحبت پسندوں سے نکل کر آزادی پسند گروہ کے اقتدار میں نہ آجائے۔

یکم جنوری کو حکومت پنجاب نے اعلان کیا کہ لاہور میں تاحکم ثانی دفعہ ۱۲۲ کے تحت کوئی شخص کرپان دتلوار کو بطور ہتھیار استعمال نہیں کر سکے گا۔ اور یہ حکم ۳۱۔ جنوری تک نافذ رہے گا۔ اس پر گوردوارہ پر بندھک کمیٹی نے اعلان کیا کہ سکھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کی خلاف دوزی کریں گے۔ چنانچہ ۲۔ جنوری کو سردار بوٹا سنگھ ڈپٹی پریزیڈنٹ پنجاب کونسل کی رہنمائی میں پانچ سکھوں کا ایک جتھہ گوردوارہ باولی صاحب (لاہور) سے ننگی کرپانیں لے کر نکلا جسے پولیس نے گرفتار کر لیا۔

اسی روز راولپنڈی میں سکھ اور مسلمانوں کے درمیان ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ۴۔ جنوری کو حکومت ہند نے اعلان کیا۔

» حالات کے پیش نظر کرپان پر پابندی میں ۳۱۔ جنوری کے بعد توسیع نہیں کی جائے گی۔ تاہم اس دوران قانون شکنی کرنے والوں کو نیز اسی طریق سے

گی، جیسے کہ دی جا رہی ہے۔

گو حکومت ہند کا براہ راست اس سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس دوران عمل کی

وہی شکل ہوگی جو حکومت پنجاب پسند کرے گی۔“

۹۔ جنوری کو لاہور میں شہید گنج کانفرنس ہونے والی تھی۔ حکومت نے ایک نوٹس کے

ذریعے اس کانفرنس کو روک دیا۔

ان حالات میں حکومت پنجاب نے اوار سے گلو خلاصی کے لیے قادیان سے ۱۲۲

واپس لے لی۔ لیکن اس تحریک کے قیدیوں کو رہا نہیں کیا گیا۔ بلکہ وہ اپنی میعاد امیری گزار کر رہے۔

حکومت کے ۹۔ جنوری کے اعلان کے باوجود ۱۰۔ جنوری کو لاہور کی دیاروں پر متذکرہ

کانفرنس کے اشتہار چسپاں پائے گئے۔ کہ آل انڈیا اتحاد ملت شہید گنج کانفرنس مقررہ تاریخوں

پر (۱۰-۱۱-۱۲ جنوری) ہوگی۔ اس پر میاں فیروز الدین صاحب اور مولانا سید حبیب نے مندرجہ ذیل بیان دیا۔

”حضرت امیر ملت نے گذشتہ دنوں اعلان کیا تھا کہ تحریک مسجد شہید گنج کانفرنس

کو علماء اپنے دل سے نکال دیں۔ لیکن اس کے باوجود پھر کسی غیر ذمہ دار شخص نے

اس کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ لہذا ہم پھر اعلان کرتے ہیں کہ ایسی کوئی

کانفرنس منعقد نہیں ہو رہی اور نہ ہوگی۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے، اس تحریک کے

سلسلے میں ابھی خاموشی اختیار کی جائے۔ نیز اس سلسلے میں کسی کو کوئی پختہ وغیرہ

بھی نہ دیا جائے۔ ۱۱۔ جنوری۔ ہفت روزہ ”الحقیقۃ“ دہلی۔

اس اعلان کے باوجود ۱۰۔ جنوری کو شاہی مسجد لاہور میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ پہنچ

گئے۔ جب کانفرنس شروع ہونے لگی تو دوسرے گروہ نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا، کہ

”ہمیں محض مسلمانوں کو سہل نافرمانی کی دعوت دے کر ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہیے۔“

اس سے پہلے کافی نقصان ہو چکا ہے۔“

۱۰۔ جنوری کو لندن سے بمبئی پہنچنے پر سر آغا خاں نے ایسوی ایڈریس

سر آغا خاں کا بیان | کو اپنے ایک بیان میں کہا:

”ہندو مسلم اتحاد ہندوستان کے لیے اہم اور ضروری ہے۔ دوسری گولڈن



کافر نس میں اپنی اس مساعی جمیلہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں نے اتحاد کرانے کی کافر نسوں میں حصہ لیا ہے اور لقیار ہوں گا۔ میرا ایمان ہے کہ دونوں قوموں کے لیڈر آپس میں بیٹھ کر تمام تنازعات طے کر سکتے ہیں۔ میں عنقریب دہلی جاؤں گا تو اپنے دوستوں سے گفت و شنید کروں گا۔ میں ہر ماہ گاندھی کی صحت کے لیے بھی دعا کرتا ہوں کہ وہ جلد صحت یاب ہوں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم مصالحت کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

نئے آئین کے متعلق سر آغا خاں نے کہا،

ہمیں اس آئین کو قبول کر لینا چاہیے۔ کیونکہ اب یہ ملک کا قانون بن

چکا ہے۔ (ہفت روزہ "الجمیۃ" دہلی ۱۶۔ جنوری ۱۹۳۶ء)

قادیان میں نماز جمعہ | منہائیموں کی مسلسل اشتعال انگیزی اور حکومت کی جانبداری کے باعث گذشتہ سال دسمبر کے شروع میں قادیان کے گرد و نواح

میں دفعہ ۱۳۲ نافذ کر دی گئی تھی۔ جس پر مجلس احوار نے انفرادی سول نافرمانی کی تحریک چلائی۔ ایک ماہ کے بعد حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے یہ پابندی اٹھالی تو مجلس احوار نے مولانا لال حسین اختر کو قادیان جا کر نماز جمعہ پڑھانے کی ہدایت کی۔

مولانا لال حسین اختر ۱۹۳۲ء میں مرزا نیت سے تائب ہوئے تو انہیں قادیان چھوڑنا

پڑا۔ ۱۹۳۶ء میں جب وہ قادیان میں داخل ہوئے تو باطل اپنے ارادوں میں شکست کھا چکا تھا۔ امرتسر، بٹالہ اور ضلع گورداسپور کے ہزاروں مسلمان نماز جمعہ کے لیے قادیان

پہنچے۔ نماز سے پہلے مولانا لال حسین اختر نے اپنے حالات و واقعات کی تمام کڑیاں اس

انداز سے ملائیں کہ تاریخ ماضی اپنے ادراک پلٹنے لگی۔ باطل مذہب کے چھوڑنے کی کہانی سناتے ہوئے مولانا نے کہا:

میں ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اپنے والد محترم شیخ حسین بخش کے ہاں دھرم کوٹ

ضلع گورداسپور میں پیدا ہوا۔ والد صاحب حضرت پیرام علی شاہ مکان ٹریف

تحصیل بٹالہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں اور نویں جماعت تک مانسہرہ ضلع ہزارہ میں پڑھنے کے بعد میں نے لاہور اور ٹیلی کالج میں داخلہ لیا اور یہاں انٹی فاضل تک پڑھا۔ یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ خلافت تحریک زور پا رہی تھی۔ میں مولانا منظر علی اظہر کے ساتھ ضلع گورداسپور کی خلافت کمیٹی میں کام کرنے لگا۔ اور انہی کے ساتھ گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں رہا ہوا تو آریہ سماج نے قندھی کی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ ان سے ڈھ بھڑ ہوئی، مناظرے ہوتے رہے۔ ان ہنگامی دنوں میں میری ملاقات مرزائی مبلغین سے ہوئی۔ چونکہ میری مذہبی تعلیم ادھوری تھی، لہذا میں مرزائیت کا فریب کھا گیا۔ مرزائیوں نے میری تعلیم پر قریباً پچاس ہزار روپیہ صرف کیا تھا۔

پھر میں نے اسلام کے خلاف علماء سے مناظرے کیے اور خوب کیے اخبار پنچام صلح کا ایڈیٹر بھی رہا اور احمدیہ ایسوسی ایشن کا جنرل سیکرٹری بھی۔ مرزائیت کو قریب سے دیکھنے، اس تحریک کو سمجھنے کے بعد جب مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہ کوئی مذہب نہیں، بلکہ سنی بازوں کا ایک ٹور ہے تو میں نے اس پر سوچنا شروع کیا۔ اسی دوران ایک رات میں نے خواب میں مرزا غلام احمد کو آگ میں جلتے دیکھا۔ ان حالات میں جنوری ۱۹۲۲ء کو میں نے مرزائیت سے توبہ کر لی اور مسلمان ہو گیا۔ علماء کے ساتھ مل کر تردید مرزائیت میں جو مجھ سے ہو سکا کر رہا ہوں۔ مجلس احرار نے شعبہ تبلیغ میرے ذمہ لگا رکھا ہے اور میں یہ ذمہ داری نبھاتا رہوں۔ آپ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے استقامت عطا فرمائیں آمین۔ تم آمین۔“

نماز جمعہ آپ نے پڑھائی۔ اس وقت مسلمانوں میں مرزائیت کے خلاف خاصا جوش تھا۔ ماسٹر تاج الدین انصاری، حاجی عبدالرحمن رئیس بٹالہ نے بھی تقریریں کیں اور آخر میں حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

”مسلمانان تادیان کا یہ عام جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایمر شریعت

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے ساتھیوں کو جنہیں نماز جمعہ کے لیے قادیان آتے ہوئے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا ہے، غیر مشروط طور پر رہا کر کے مسلمان ہند کی بڑھتی ہوئی بدظنی کو دور کر دے، تاکہ عوام یہ سمجھ سکیں کہ حکومت مرزائیت کی امداد کرتے ہوئے مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت بے جا نہیں کرتی۔ نیز یہ جلسہ حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ قادیان میں احرار تبلیغ کانفرنس پر عائد کردہ پابندیاں دور کر کے انصاف پسندی کا ثبوت دے۔

(روزنامہ "مجاہد" لاہور۔ ۱۸۔ جنوری ۱۹۳۶ء)

کشمیری بھائیوں کے نام | انہی دنوں روزنامہ "احسان" لاہور میں کشمیر کے چند مسلمانوں کا ایک پیغام شائع ہوا، جس میں شیخ عبداللہ پر عجیب و غریب

الزام تھے۔ اور مجلس احرار کو اپنی مظلومیت کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ اس لیے جواب میں چودھری افضل حق نائب صدر مجلس احرار اسلام ہند نے "کشمیری مسلمانوں" کے عنوان سے روزنامہ "احسان" میں ایک خط شائع کیا جو حسب ذیل ہے۔

"چند دنوں سے مرزائیوں کی کشمیر میں فتنہ انگیزیوں کی خبریں زیادہ گرم ہو رہی ہیں۔ دفتر مجلس احرار اسلام ہند میں متعدد تاریخیں اور خطوط اس مہینے میں آئے ہیں۔ بعض دوست کشمیر میں بھیجے گئے ہیں۔ ان کا تعلق ہے کہ مجلس احرار نے اتنی کثیر اور بے نظیر قربانیاں کر کے اپنے کشمیری بھائیوں کو بھلا دیا ہے، انہیں یقین کرنا چاہیے کہ مجلس احرار کشمیر کی حالت سے کبھی بھی بے خبر نہیں ہوئی۔ لیکن وہ بھی انسانوں کی جماعت ہے۔ اپنے مخالفین کی رخنہ اندازیوں سے جو کام کرنا ضروری ہوتا ہے، وہ بھی ملتوی کر دینا پڑتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر آج سے چار برس پہلے ان تدابیر پر عمل کیا جاتا اور ان خطرات سے پوری طرح آگاہی حاصل کر لی جاتی جو مجلس احرار اسلام کشمیری زعماء کے سامنے پیش کرتی رہی۔ تو آج کشمیر میں اصلاحات کے ناکافی ہونے کا شکوہ ہوتا اور نہ مرزائیوں کے فریب و جال بچھ سکتا۔ لیکن

اللہ کو یہی منظور تھا جو ہوا اور یہ فائدہ بخش بھی ہے۔ کیونکہ اب تمام جماعتوں نے جو کشمیر کی حقیقی مصلحتی کے لیے کام کرنا چاہتی ہیں۔ محسوس کر لیا ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود نے اہل کشمیر کو مزید مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے اور اس کا مقصد کشمیر کمیٹی میں شمولیت سے اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ مرزائیت کی تبلیغ کے لیے راہیں کھولے۔ انشاء اللہ وہ اس کام میں بھی ناکام رہے گا۔ کیونکہ سوائے عقل کے اندھوں کے کسی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ قرآن حکیم نے جو انوی شریعت دی ہے اس کے لانے والا آخری نبی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے اور اگر مرزائیوں کے عقیدہ کے مطابق نبی آتے رہے تو مسلمان گروہوں میں تقسیم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

مجلس احرار کو یہ دیکھ کر بے حلاطمینان ہوتا ہے کہ کشمیر میں اب خود ایسے صاحبِ مہم نوجوان پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے اپنا سیاسی نصب العین وہی بنایا ہے جو مجلس احرار السلام ہند کشمیر کے لیے پیش کرتی تھی۔ یہ لوگ خدا کے فضل سے اتنے ایشار پیشہ ہیں کہ ان پر آئندہ کام کا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ باقی رہا قادیانی فتنے کا سدباب تو اس کے متعلق بھی دیکھتا ہوں کہ کشمیری بھائیوں میں بے حد بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ یہ بیداری اس امر کی ضامن ہے کہ یہ فتنہ کشمیر میں اب سر نہیں اٹھا سکتا۔

یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مجلس احرار کشمیر کے کاموں میں دلچسپی نہیں لے گی ایسا بگڑ نہیں ہوگا۔ بلکہ ہم اپنی سرگرمیوں کو انیز اپنے براہِ راست تعلقات کو زیادہ استوار کریں گے۔ ہماری ابتدائی مشکلات ختم ہو گئی ہیں اور کشمیری بھائی خود بخود ہماری ناچیز خدمات کو عزت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ تمام غلط فہمیاں پورے طور پر دور ہو چکی ہیں۔ اب کشمیر میں اطمینان سے کام کرنے کے مواقع پیدا ہو گئے ہیں ہم صرف اس وقت کے منتظر ہیں، جب کشمیر کے وہ بہادر بھائی تک جیل میں بند ہیں، رہا ہو جائیں، ان کے مشورے سے کسی حقیقی سیاسی اور تبلیغی کام کو

جاری کریں۔ اس مدد ان بہترین رہنماؤں کے جو بھائی پر امن اور بہتر طریقہ سے مسلمانوں کی حقیقی فلاح کا کام کرنا چاہتے ہوں، وہ مجلس احوار کے ساتھ اپنا رابطہ برہا رکھیں اور خصوصیت سے شعبہ تبلیغ احوار کو کشمیر میں بھی قائم کریں، تاکہ اللہ کے دین کی پوری پوری نشر و اشاعت کر سکیں۔ دشمنی کے طور سے مرزائیت کا قلع قمع بھی ہونا چاہئے گا اور مرزائیت کے حامی حکام کو بھی پتہ چل جائے گا کہ مرزائیوں کی حمایت سے وہ مسلمانوں کے قیمتی تعاون سے بالکل محروم ہو جائیں گے۔ کیونکہ مذہبی امور میں جانبداری سلطنتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ جب تک مسلمان سوتے رہے اور مرزائیوں کا کام بنتا گیا، اب مسلمان بھی مرزائیت کے سید باب کے لیے ہوشیار ہیں۔ کوئی حکومت مرزائیوں کی نوا جب امداد کی غلطی نہیں کرے گی۔

کشمیر کے مسلمان بھائیوں سے میری درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اپنے معاملات کو اپنی سمجھتوں سے درست کریں۔ نہ صرف مرزائیت کا سید باب منظور ہے بلکہ ہمارے سامنے تو تمام دنیا کو مسلمان کرنے کا نصب العین بننا چاہیے۔ اگر اسلام سچا مذہب ہے تو یہ تحفہ ہر ایک انسان کے سامنے پیش کرنے کا کوشش کرنی چاہیے۔

شعبہ تبلیغ مجلس احوار اسلام ہند اسی کام کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اس کا ملکی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ سیاسی کام کے لیے مجلس احوار موجود ہے۔ امید ہے کہ کشمیر کے بہادر اور غیرت مند بھائی ہمارے ساتھ ان کاموں میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق ضرور شامل ہوں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارے کاموں میں مددگار ہوں۔

آپ کا افضل حق

پنجاب کے حالات میں بروز نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ کانگریس مسلم لیگ اور مجلس احوار مبعہ جمعیتہ علمائے ہند اپنے اپنے رخ پر سوچ رہی تھیں۔ وطن کی آزادی کے لیے خواہ اور غیر ملک حکومت سے وابستہ لوگ وقت کے نازک ترین موڑ پر کھڑے تھے۔ دونوں کی دیانت اور سوچ اپنی اپنی جگہ درست تھیں۔ ان کے مابین ایک تعمیر کردہ تھی۔ جس کی

رہنمائی ماڈریٹ (MODERATE) قسم کے لوگ کر رہے تھے۔ مسلمانوں میں مسٹر محمد علی جناح اس طبقہ میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

مسلم لیگ پر ان دنوں ٹوڑی مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ لیکن مسٹر محمد علی جناح جو ذہنی طور پر تیار کم کے خلاف تھے۔ اپنی دانست میں مسلم لیگ کو فعال بنانے میں مصروف تھے۔ وہ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے ملنے والی صوبائی خود مختاری میں مسلم حقوق کی لڑائی جداگانہ طریق پر اڑنے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ اس غرض سے انہوں نے ۵ جنوری ۱۹۳۶ء کو ایک خط سرفضل حسین کے نام تحریر کیا۔

”مسلم لیگ کونسل کے ممبروں کی یہ عام خواہش ہے کہ آپ سے لیگ کے آئندہ سیشن کی صدارت کرنے کی درخواست کی جائے۔

جونہی میں نے آپ کا نام صدارت کے لیے تجویز کیا۔ اس کا پرتپاک نیر مقدم کیا گیا۔ میں اور میرے کئی ساتھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مرحلے پر ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے آپ سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی نہیں۔

آپ اس وقت بہت بڑی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں، جو آپ کے کارناموں میں اضافہ کرے گی۔ ہمیں آپ کی قابلیت اور تجربے کی ضرورت ہے۔ شاید میں پوری طرح ظاہر نہیں کر سکا کہ مجھے اس بات کا کتنا احساس ہے کہ مسلمانوں کے مفاد میں آپ کا ہمارے ساتھ تعاون بہت اہم ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس خواہش کا اندازہ لگائیں گے اور مجھے جواب میں صرف دو نقطی تار قبول ہے۔ آپ کا انکار فاتی طور پر میرے لیے سخت مایوسی کا باعث ہوگا۔“

(مارشل لا سے مارشل لا تک مصنف سید نور احمد ص ۱۴۳)

جواب میں سرفضل حسین نے معذرت لکھ بھیجی۔

اس کے بعد مسلم لیگ کونسل نے سر وزیر حسن کو لیگ کے آئندہ اجلاس کا صدر چنا۔ اس موقع پر راجہ غضنفر علی خاں جو اس اجلاس میں موجود تھے کا بیان ہے کہ جیسے ہی سر وزیر حسن کا نام چنایا تو مولانا شوکت علی نے اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

سے (مارشل لا سے مارشل لا تک ص ۱۴۳، ۱۴۴)

”سرفزیر حسن نے اپنی زندگی میں مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کی، لہذا وہ اس اعزاز کے مستحق نہیں۔“

اس کے جواب میں مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) نے راجہ فضل محمد علی سے کہا کہ ”وزیر حسن شاید ایک لحاظ سے موزوں ثابت ہوں۔ کیونکہ آئندہ سال کے لیے کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو ہیں، جن کے ساتھ وزیر حسن کے ذاتی تعلقات اچھے ہیں۔ شاید یہ بات کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تعاون کے نقطہ نگاہ سے مفید رہے۔“

(مارشل لار سے مارشل لار تک ص ۱۰۴-۱۰۲)

سرفضل حسین اور قائد اعظم محمد علی جناح کے درمیان بنیادی اختلاف تھا اور یہ اختلاف ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے شروع ہوا۔ اختلاف کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ مسٹر جناح کے نزدیک اصل اور اہم سوال ملک کی آزادی کا تھا۔ اور سرفضل حسین کی توجہ صوبائی خود مختاری کے مواقع پر مرکوز تھی۔

تصویر کا دوسرا رخ سرفضل حسین پیش کرتے، وہ بھی اپنی جگہ دلچسپ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ فرض کیجئے مسٹر جناح کے پروگرام کے مطابق پنجاب میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میں انتخابی مہم شروع کروں۔ اس کے دو لازمی نتائج ہوں گے۔

- ۱۔ میں اپنے امیدوار زیادہ سے زیادہ چھپاسی مسلم حلقوں میں نامزد کرا سکوں گا۔
- ۲۔ فرقہ وارانہ نعرے پر میری انتخابی مہم کا لازمی رد عمل یہ ہوگا کہ ہندو اور سکھوں میں بھی فرقہ وارانہ پارٹیوں کو تقویت حاصل ہوگی، اور ریسٹے بہادر چھوٹو اور ام گروپ کے لیے اپنے حلقوں میں سخت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ گویا خود اپنے عمل سے میں اس غیر مسلم گروپ کی شکست کے اسباب مہیا کروں گا جو باہ سال سے مضبوطی کے ساتھ مسلم لیگ کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ چھپاسی نشستیں صوبائی اسمبلی کے کل ایک سو پچھتر کے ایوان میں پہلے ہی اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن عملی بات یہ ہے کہ انتہائی کامیابی کی صورت میں بھی مجھے پانچ، دس فیصد حلقوں میں شکست

کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ لہذا میری پارٹی انتخابات سے لازماً ایک اقلیت کی صورت میں برآمد ہوگی۔ اس کے بعد میں ایسے گروپ تلاش کروں گا جو میرے ساتھ کولیشن کرنے کو تیار ہوں۔ اور دوسری پارٹیاں میری پارٹی کے مقابل کولیشن قائم کرنے کی کوشش کریں گی۔ میں، چند ہندو، سکھ نمبروں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا سکوں گا یا دوسری پارٹیاں چند مسلمانوں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا لیں گی۔ ایسے غیر یقینی حالات میں گورنر اگر چاہے گا تو مسلمان لیڈر کی وزارت بنوادے گا اور اگر چاہے گا تو ہندو اور سکھوں کی وزارت بنوادے گا۔ دونوں صورتوں میں وزارت اس کے ہاتھ میں کھلونا بنی رہے گی۔ بعینہ یہی صورت بنگال میں پیش آئے گی۔ مسلم اکثریت والے یہی دو صوبے ہیں۔ لہذا اگر مقصد یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں نئے آئین کے تحت مسلمانوں کو سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے جو مواقع ملے ہیں ان سے ناڈہ اٹھایا جائے تو یہ طریقہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا نہیں بلکہ ضائع کرنے کا ہے۔

اس کے مقابل سرفضل حسین یونینسٹ پارٹی کے نام سے ایک ایسے پروگرام کی بنیاد پر جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے ایک پس ماندہ طبقہ کے لیے بھی اقتصادی کشش رکھتا ہو۔ تمام مسلم حلقوں اور کم از کم نصف غیر مسلم حلقوں میں انتخاب لڑنا چاہتے تھے۔ پنجاب کی دیہاتی آبادی کو سود خور سماج کے قرف سے نجات دلانا اس انتخابی مہم کا بنیادی نعرہ تھا۔ سرفضل حسین کی رائے تھی، کہ اس طرح کم از کم مجھے یہ موقع ملتا ہے کہ میں ایک قطعاً اکثریت رکھنے والی پارٹی لے کر اسمبلی میں جاؤں گا، جس میں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہو۔ اور ایک مضبوط اور فعال وزارت بناؤں گا۔ اس طرح سرفضل حسین کے خیال میں بنگال میں مسلمانوں کے لیے ایک غیر مسلم عنصر کو ساتھ لانے کے لیے مٹھوس اقتصادی بنیاد موجود تھی۔ یعنی دوامی بندوبست کے تحت قائم شدہ جاگیر داروں کی تہنخ اور کسانوں کو ان کی زیر کاشت زمینوں کی ملکیت دلانے کا پروگرام۔ ان جاگیر داروں پر بندوبست لے ایک طبقہ کی تقریباً مکمل لجاورداری تھی۔ جس کے بوجھ کے نیچے اس صوبے کے مسلمان اور ان کے ساتھ ہندو کسان بری طرح پس رہے تھے۔



سرفضل حسین کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مضبوط اکثریت حاصل کرنے اور مضبوط وزارت قائم کرنے کا موقع مل سکتا تھا، جو اسمبلی کو فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم کرنے سے نہ ملتا۔ صوبہ سرحد اور سندھ کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کو قطعی اکثریت حاصل تھی۔ لیکن سرفضل حسین کے خیال میں وہاں بھی مسلمانوں کے لیے فرقہ وارانہ پارٹیاں بنا کر اسمبلیوں میں جانے سے کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ گورنروں کو اقلیتوں کی حفاظت کے نام پر وزارت سازی میں دخل اندازی کا موقع ملے۔

ان دلائل کے پیش نظر سرفضل حسین کی رائے یہ تھی کہ مسلم لیگ کو صوبائی انتخاب میں دخل ہی نہ دینا چاہیے۔ صرف مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنانی چاہیے۔  
(مارشل لاء سے مارشل لاء تک ص ۱۴۳-۱۴۵)

۱۴۔ جنوری ۱۹۳۶ء کے روزنامہ "مجاہد" میں مولانا منظر علی اظہر کا ایک مختصر اصرار کا پیج | بیان شائع ہوا جس میں انہوں نے سرفضل حسین اور سرفیروز خاں نون کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ

» اگر سرفضل حسین اور سرفیروز خاں نون یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد شہید گنج مل سکتی ہے جیسے کہ سرفیروز خاں نون حقیقہ طور پر مسلمانوں سے کہتے رہے ہیں کہ رسول نافرمانی ہو تو مسجد مل سکتی ہے اور اس طرح احوار بولنا کیا جا رہا ہے۔ تو میں دونوں حضرات کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ بادشاہی مسجد یا کسی اور مسجد میں آکر مسلمانوں کے سامنے اس خیال کا اظہار کریں اور رسول نافرمانی کے بعد مسجد کے حاصل سب سے کا یقین دلائیں۔ پھر اگر وہ کہیں کہ سچا س ہزار مسلمانوں نے جیل جانے سے مسجد مل سکتی ہے، تو میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ میں خود سب سے پہلے جیل کی طرف قدم اٹھاؤں گا اور سچا س ہزار نہیں بلکہ ایک لاکھ آدمی جس مقام سے اور جس عرصہ میں سرفضل حسین اور سرفیروز خاں نون چاہیں گزرتا کر اڑیں گا۔ اور اگر یہ دونوں حضرات فرمائیں کہ پانچ صد آدمیوں کے گولی کھا کر جان دینے سے مسجد مل سکتی ہے تو سب سے پہلی گولی میں کھاؤں گا۔ اور پانچ صد نہیں

ایک ہزار نوجوان گولی کھالے والے میدان میں آجائیں گے، جو اپنی جانیں نذا  
 کر دیں گے۔ ہم اپنا حساب ذات باری تعالیٰ کے سپرد کر چکے ہوں گے۔ پھر  
 وہ مسلمان جو زندہ ہوں گے۔ سرفضل حسین اور سرفیروز خاں نون کی گردن میں کپڑا  
 ڈال کر پوچھ لیں گے کہ لاؤ مسجد کہاں ہے، جس کے لیے ایک لاکھ مسلمانوں  
 کو جیل بھیجا تھا۔“

۳۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اٹلی نے حبشہ کی کمزور اور منظلوم آبادی پر  
 پڑائی کر دی تھی۔ یورپ کی طاقتور سلطنتیں دوسری جنگ عظیم

کے خوف سے اپنا پہلو بچاتی رہیں۔ یہاں تک کہ اقوام متحدہ خاموش تماشائی بنی رہی۔ آخر  
 جنوری ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتے اٹلی نے حبشہ پر زہریلی گیس کے ایسے بم پھینکے کہ ان کے اثرات  
 سے وہاں کی تمام آبادی مختلف امراض کا شکار ہو گئی۔ جس سے افواج حبشہ شکست کھا  
 گئی اور شہنشاہ حبشہ بھاگ کر انگلستان پہنچ گئے۔ اس طرح حبشہ کے دار الحکومت اولس بابا  
 پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا اور اسے اٹلی میں شامل کر لیا گیا۔ گوروس نے اٹلی کے خلاف احتجاج کرنے  
 کو کہا لیکن ہٹلر نے اس آواز کو ناکام بنا دیا۔ اس ہٹلر کی سی امداد نے موسولینی کو ہٹلر کا طفیلی بنا دیا  
 یہی وہ تاریخی واقعہ ہے کہ جس سے موسولینی اور ہٹلر کے تعلقات استوار ہوئے جو دوسری  
 جنگ عظیم کے اختتام تک قائم رہے۔

۱۶۔ جنوری کو شہنشاہ جاپان نے حبشہ کی فوجی امداد کا اعلان کیا۔ لیکن آگے چل کر جاپان  
 بھی جرمن اور اٹلی کا اتحادی بن گیا۔

۳۱۔ جنوری کو مجلس احوار کی طرف سے ہندوستان بھر کی مسلم انجمنوں  
 مجلس احوار کا مطالبہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے اداروں سے مرزائیوں کو خارج کر دیں

اس کی سب سے بڑی زد لاہور کی انجمن حمایت اسلام پر پڑی۔ علامہ اقبال کے مستعفی ہونے  
 کے باوجود جو مرزائی اس انجمن کے ممبر تھے، انجمن ہذا انہیں اپنے سے علیحدہ نہ کر سکی۔ انجمن  
 کی اس حرکت سے تنگ آکر مجلس احوار نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر  
 عوام کی طرف سے ایک قرارداد پیش کر دی کہ مرزائیوں کو انجمن حمایت اسلام سے فوراً خارج

کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ غیر مسلم ہیں اور غیر مسلم انجمن حمایت اسلام کا ممبر نہیں ہو سکتا۔  
اس قرارداد پر مختصر مہنگامہ ہوا۔ بالآخر قرارداد منظور ہو گئی۔

سکھ تحریک ختم ہو گئی | یکم فروری کو حکومت پنجاب نے جس حکم کے تحت کرپان پر  
۳۱۔ جنوری تک پابندی حائد کی تھی۔ جیسے ہی وہ متعینہ تاریخ

پر حکم نامہ ختم ہوا سبھوں نے اسے اپنی فتح قرار دیا۔ اور تمام دن سکھ لاہور کے بازاروں میں  
کرپانیں باندھے پھرتے رہے۔ مسلمان بھی اس روز کم سے تلواریں لٹکاتے بازاروں میں پھرتے  
دکھائی دیے۔ اس طرح یہ واقعہ ایک مضحکہ بن گیا۔

انہی دنوں پنجاب کے دیگر اضلاع سے مسلمانوں کے قافلے شہید گنج کے سلسلہ میں  
لاہور آنے شروع ہو گئے۔ راولپنڈی، امرتسر اور جالندھر کے اکثر جتھے لاہور پہنچ چکے تھے  
چودھری مولا بخش نامی ایک نوجوان ان دنوں شہید گنج کا لیڈر تھا۔ اس نے اپنا دفتر شاہی مسجد  
میں قائم کر لیا تھا۔ یہیں سے قافلے شہید گنج کی طرف جاتے ہوئے گرفتار ہو جاتے۔

جارج جیمز انتقال | ۲۰۔ جنوری کو رات بارہ بجے برطانیہ کا شاہ جارج طویل علالت کے  
ڈھیلی نہ ہونی، تاہم برطانوی تاریخ میں ایک ایسا موڑ آیا، جس کی مثال اس شاہی خاندان میں  
پیشتر سے دکھائی نہیں دیتی۔

امیر ملت کی حج کو روانگی | بے نماز غازی اور بے عمل صوفی دونوں قوم کو لے ڈرتے  
ہیں پنجاب کے صوفی منس لوگوں نے کہیں پیر کے لباس میں

کہیں لیڈر اور بنیان کرتن آسان افراد کی تعداد میں اس قدر اضافہ کیا کہ مال کار مسلمان قوم ایک  
بھیٹر معلوم ہونے لگی اور کہیں جہاد کی ضرورت پڑی تو میدان کارزار بے عمل مجاہدوں کا منہ  
تکٹے لگا کہ سالار کارواں کو کلو و شوابو کے صوا قران حکیم یاد ہی نہیں رہا۔ جب تو میں  
انخطاط کے اس موڑ پر پہنچتی ہیں۔ تو راستے کی ہلکی سی رکاوٹ پہاڑ دکھائی دینے لگتی ہے۔  
پھر محض تسبیح و مصلیٰ کو خدا کی عبادت قرار دینے والے سبب اور کابل امیر قوم بن جاتے ہیں  
تحریک مسجد شہید گنج میں مسلمانوں نے پیر جاحلت علی شاہ کو اپنا امیر منتخب کر لیا۔

۷۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں دیکھیں۔

گوشہ نشین فقیر کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں بندوق دے کر جہاد کی راہ میں لاکھڑا کیا۔  
تسلح کی نوگرائلیاں نہ ہی تلوار مستحال سکیں اور نہ ان انگلیوں سے بندوق کی لب لپی دب سکتی  
جرات ایمانی لٹکار بن کر سامنے آئی مگر تعویذوں کے سہارے قوم کو دشمن پر فتح دلانے اور  
پھونکوں سے کفر کے چراغ گل کرنے والے آخر کو خدا کے گھر کی حفاظت سے دست بردار  
ہو کر بیت اللہ کی زیارت کو چل دیے۔

وہ چلے جھٹک کے دامن میرے دستِ نالوں سے

اسی دن کا آسرا تھا مجھے مرگِ ناگساں سے

۲۔ فروری کو امرتسر خیر الدین کی مسجد میں اتحادِ ملت کی کانفرنس ہو رہی تھی کہ حضرت

پیر جماعت علی شاہ نے اعلان کیا کہ

”چونکہ میں حج کے لیے جا رہا ہوں لہذا اپنے تمام اختیارات اتحادِ ملت کے

سپرد کرتا ہوں۔“

اس پر نوجوان طبقہ میں بے چینی مچیل گئی اور کانفرنس میں شریک لوگ ایک دوسرے کا

گریباں نوچنے لگے۔ اس افراتفری میں کانفرنس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

ان دنوں تحریکِ شہید گنج عجیب حالات سے گذر رہی تھی۔ ایک گروہ سول نافرمانی

کر رہا تھا۔ دوسرا آئین شکنی کے خلاف تھا۔ تیسرا لیڈروں کا گروہ تھا جو اس تحریک کو بیڑھی بنا

کر کونسل اور اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انتشار کے دنوں امیر ملت

پریشان حال مسلمانوں کے کام آتے مگر۔

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

دین دار اور حریت پسند طبقہ نے حکومتِ حجاز کے

یورپین کمپنیوں کے ساتھ کان کنی کے معاہدے کو

اس قدر ناپسند کیا کہ پنجاب اہلحدیث تنظیم کو بھی اپنے ۵۔ فروری کے اجلاس میں حسب ذیل

قرارداد منظور کرنا پڑی۔

”جمعیتہ تنظیم اہل حدیث پنجاب کا یہ نمائندہ اجلاس حکومتِ حجاز سے

برطانوی کمپنی کے معاہدہ کان کنی کی شرائط کو ختم و استیاط پر مبنی سمجھنے کے باوجود برطانوی کمپنیوں کے سابق اعمال کی بنا پر نتائج و عواقب کے خطرات سے خالی نہیں سمجھتا۔ برطانوی عمال کی آمد و رفت اور ان کے طریقہ معاشرت کے تاثرات سے عرب مزدوروں کا متاثر ہو جانا بھی خطرات سے خالی نہیں۔ اس لیے وہ حکومت حجاز کو قیمتی مشورہ دیتا ہے کہ کمپنی کے عمال پر پورا کنٹرول رکھے تاکہ وہ خطرات پیدا نہ ہو سکیں جن کے متعلق عالم اسلام بیزاری کا اظہار کر رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ اجلاس برطانوی ایمپائر اور کمپنی کے انگریز عمال کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ جزیرہ عراق و عرب میں کوئی ایسی حرکت اور لیشہ دو انیاں نہ کریں جس سے برطانوی ایمپائر مثل سابق بدنام ہو۔ اور عالم اسلام میں اضطراب کی لہر دوڑ جائے۔

حرک مولانا اسماعیل (گوجرانوالہ) [الجمعیۃ دہلی  
مؤند۔ مولوی عطاء اللہ (کوٹ کپڑا)]

جمعیۃ علمائے ہند کی قرارداد | یکم، دو، تین فروری ۱۹۳۶ء کو جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس  
عائدہ کا اجلاس مراد آباد میں ہوا۔ جس میں حسب ذیل

قرارداد منظور کی گئی۔

» جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عائدہ کا یہ جلسہ اس معاہدے کو جو حکومت سعودیہ اور ایک انگلش کمپنی کے درمیان حجاز میں کان کنی کے متعلق ہوا ہے سخت خطرہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔

یورپین طاقتوں کی استعماری پالیسی کے خطرناک اور تباہ کن اثرات جمعیۃ علماء کے سامنے ہیں۔ جن کی بنا پر جمعیۃ جزیرۃ العرب میں ان طاقتوں کے دخل کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو اطمینان کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔

جزیرۃ العرب کا تقدس اور بالخصوص حجاز کی غیر مسلم اثرات سے حفاظت مسلمانان عالم کے نزدیک اہم ترین مسئلہ ہے اور اس کو کسی حال میں نظر انداز

نہیں کیا جاسکتا۔ جمعیتہ حکومت عربیہ سعودیہ کی مالی حالت اور وسائل و ذرائع کی بہم رسانی کی اہمیت سے غافل نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ جزیرۃ العرب پر غیر مسلم اقتدار کے قیام کے تصور سے بھی لرزہ برانداز ہے۔ جمعیتہ کو یہ بھی یقین ہے کہ جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز بن فیصل السعود بھی اہل یورپ کی استعماری ہوس سے خوب واقف ہیں اور یہ کہ جزیرۃ العرب کا تقدس اور ممالک عربیہ کی حفاظت بھی ان کے نزدیک عزیز متاع ہے۔ باوجود اس کے وہ اپنی طرف سے اور مسلمانان ہند کی طرف سے جلالۃ الملک کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ جزیرۃ العرب کی غیر مسلم اثرات سے حفاظت ان تمام فوائد و منافع سے جو معاہدہ کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں زیادہ قیمتی اور اہم و مقدم ہے۔

”جمعیتہ علماء کیا ہے“۔ حصہ دوم ص ۱۹۶-۱۹۸

جیسے ہی اگست ۱۹۲۵ء کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت شاہ حجاز کا اعلان سعودی عرب کا کان کنی کا ایک معاہدہ انگریز کمپنیوں سے ہوا ہے تو احرار رہنماؤں کی دور رس نگاہوں نے اس معاہدے کو نہ صرف جزیرۃ العرب کے لیے بلکہ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے اسلامی اصولوں کے منافی جان کر سارے ہندوستان میں اس کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے کہ یہ معاہدہ بھر طور منسوخ ہونا چاہیے۔ اس پر ملک کی ذمہ دار سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں نے بھی احرار کی ہم نوائی کی۔ آل انڈیا احرار کانفرنس سیکورٹ کے آخری اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے شاہ حجاز سے درخواست کی گئی کہ وہ اس معاہدے پر نظر ثانی فرمائیں۔ اس پر ۱۱- فروری ۱۹۲۶ء کے سہ روزہ الجمعیتہ دہلی میں سلطان حجاز کا سید امین المدنی الحسینی سیاح ہند کی معرفت ایک اعلان شائع ہوا۔

”ہمارا مقصد انسانیت اور قوانین شریعت کی ترویج ہے۔ ہمارے کسی فعل پر اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ بلا تکلف پیش کرے۔ ہم اس کے قول کا پورا احترام کرتے ہوئے غلطی کی اصلاح کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور معتزضین کو ہر طرح مطمئن کریں گے۔“

اہرار وفد کی حجاز کو روانگی | سلطان عبدالعزیز بن سعود والہی حجاز کے اعلان سے پیشتر ۲ فروری کو آل انڈیا اور ورکنگ کمیٹی نے اپنی گذشتہ نومبر کی قرارداد کے مطابق

فیصلہ کیا کہ حجاز کے لیے ایک وفد کی تشکیل کی جائے۔ چنانچہ اس اجلاس میں اعلان کر دیا گیا کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا منظر علی اظہر اور مولانا ظہور احمد بگوتی پر مشتمل ایک وفد حجاز روانہ کیا جائے گا۔ مولانا داؤد غزنوی وفد کے قائد اور مولانا منظر علی اظہر سیکرٹری ہوں گے اس اعلان کے بعد اوار وفد کو پاسپورٹ کے حصول میں کافی پریشانی اٹھانی پڑی۔ تاہم وفد ۶ فروری کو لاہور سے کراچی کے لیے روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر بے پناہ ہجوم تھا جو وفد کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہو چکا تھا۔ ۱۱ فروری کے روزنامہ مجاہد میں چودھری افضل حق نے حجاز وفد کی روانگی پر حسب ذیل ادارہ یہ تحریر کیا۔

”مسلمانوں کا شکستہ عزم محتاج دلیل نہیں۔ کیونکہ اس سرزمین کی آزادی محل بحث ہے جو ہماری قوت کا مرکز اور برکتوں کا سرچشمہ ہونی چاہیے تھی۔ اہرار کے رئیس وفد مولانا محمد داؤد غزنوی کو الوداع کہنے کے لیے اجاب اسٹیشن پر اکٹھے ہوئے وفد اہرار اس لیے جا رہے ہیں تاکہ جلالت الملک کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں فریب فرنگ سے آگاہ کرے۔ غلام آباد منہد کے مسلمان وفد سے بہتر کوئی استعمار مغرب کی پرہیزچانوں کو کیا بیان کر سکتا ہے۔ یہ دردناک داستان اس کی آب پتی ہوگی۔ آپ بیٹی، جگ بیٹی سے اکثر مؤثر ہوتی ہے۔“

دور حاضر کے فرزندان توحید پر زمانہ نے ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔ جدھر نظر اٹھتی ہے عالیشان محلات اور شاہی عمارتوں کے شکستہ بام و در عظمت گذشتہ کو زبان حال سے بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ غلامی کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے۔ ہندوستان احساس آزادی کھو چکا ہے عراق و فلسطین مخربوں کے حکم بردار ہیں۔ ترکی اور ایران ابھی خطرات میں گھرے کھڑے ہیں۔ افغانستان کا اللہ مالک ہے۔ جلالت الملک سلطان ابن سعود کے گرد ڈورے ڈالے جا رہے ہیں۔ اگر اسلام کی یہ آخری متاع بھی ہتھی گئی پھر مسلمانوں

کی زندگی میں کیا دلچسپی رہ جائے گی۔ خدا مسلمانوں کو وہ روز بد نہ دکھائے۔  
 یاس انگیز حالات میں ہی اللہ فضل کی بارش شروع کرتا ہے، جس سے  
 کشت امید بری ہو جاتی ہے۔ خدا ایسے مرد مجاہد پیدا کرتا ہے جو قوموں کی  
 قسمت کو لپٹ دیتے ہیں۔ احرار کا وفد خدا کے مہر و سر پر جا رہا ہے۔ فاتی  
 نفتح و نقصان سے بے نیاز ہے۔ اس کے پیش نظر وہ کام ہے جس سے  
 دنیا تے اسلام کو یکساں دلچسپی ہے۔ اگرچہ بعض سرکاری آدمی بارے خلافت  
 مصروف تک و دو ہیں۔ لیکن ان کی مخالفت سرگرمیاں جاری سچائی کی دلیل ہیں۔  
 معلوم ہوا ہے کہ جہاز میں ہمارے خلافت زبر اگلنے اور معاندانہ پروپیگنڈے کے وسیع  
 انتظامات ہو رہے ہیں۔ جو لوگ پریشان حالی میں کسی نیک کام کے لیے کمر ہمت  
 باندھ کر نکلتے ہیں وہ جھوٹے پروپیگنڈا کی کیا پرواہ کرتے ہیں۔ مجلس احرار کے نزدیک  
 استقلال عرب و قوت کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اسلامی تاجدار کی خدمت میں مسلمانان عالم  
 کے خیالات کا اظہار نہایت ضروری ہے۔ اس وقت تساہل سے کام لینا بدترین  
 گناہ ہے۔ سرزمین عرب میں غیر مسلم کا اثر و اقتدار ناقابل برداشت ہے۔  
 انگریزی حکومت احرار کے وفد کی اہمیت کو خوب سمجھتی ہے۔ وہ بغور معائنہ  
 کر رہی ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھا ہے۔ ہماری مخالفت میں جو شور مٹھاتا  
 وہ دب چکا ہے۔ اسلامی ہند میں پورا اتحاد خیال ہے۔ انگریزی حکومت اب پیدائش  
 حالات کو نظر انداز نہ کر سکے گی۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر مسلمانوں نے مولانا محمد داؤد کو الوداع کمی اور وفد کی کامیابی  
 کے لیے دعا مانگی۔ مخلص مسلمانوں کی دعائیں انشاء اللہ قبول ہوں گی۔ گو مجلس احرار مخالفت  
 کے اور بھی مہبت سے طوفانوں میں سے گزنا پڑے گا۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے  
 یقین ہے کہ بالآخر احرار کو کامیابی ہوگی۔ تشویش کا کچھ وقت گزرنے کے بعد مسلمان  
 اطمینان حاصل کر سکیں گے۔ ہمیں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی کے خلوص پر کامل  
 اعتماد ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی خوشنودی کو مدنظر رکھیں گے۔



صعوبت سفر پر داشت کر کے دیار حبیب کو جانے والو! غلافِ کعبہ تمام کر  
 رب کعبہ سے دعا کرنا کہ مسلمانوں کی ہمتوں میں برکت دے۔ ہمارے نوجوان آہنی خرم  
 لے کر دنیا میں نکلیں۔ نہ صرف خود آزادی حاصل کریں بلکہ غلام قوموں میں روح آزادی  
 پھونک دیں۔ جلبِ منفعت اور ترقی درجات کے شخصی خواب نہ دیکھیں بلکہ دنیا  
 کی نجات کے ارادوں کو جامتہ عمل چننے کے لیے زندگی وقف کر دیں۔ مخالف ہمالک  
 اسلامی کے گرد تیندوے کی طرح جاں پھیلا رہا ہے۔ خلاہم میں ایسے صاحبِ عزم  
 پیدا کرے جو دشمن کا تار پود بکھیر دیں اور یوسیوں میں کرن امید بن جائیں۔

حجاز کی موجودہ گتھیاں بجز فضل ایزدی سلجھانا آسان کام نہیں۔ دشمن کے پاس  
 اژدہام تو ہیں۔ تباہ کن جہاز، منوں بم پھینکنے والے ہزاروں طیارے ہیں۔ ادھر دنیا کا  
 بے دست و پا غلام مسلمان ہے۔ ہو تو کیا ہو۔ ہمارے دند کے ساتھ سلطان خواہ برا  
 سلوک بھی کرے تو بھی ہمیں ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ زمانہ حال میں مسلمان سلاطین  
 کی مجبوریاں اہندوستان کا غلام مسلمان بہتر سمجھ سکتا ہے۔ آج اسلامی سلطنتوں کے تاجداروں  
 کی حالت نیم غلام لوگوں کی سی ہے۔ سلطان ابن سعود کی حالت تو کچھ دیر سے غیر مسلموں  
 کی ریشہ و دواہیوں کے باعث بہت ہی ناقابلِ رشک کر دی گئی ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ نسل کے لیے کیا اضطراب انگیز دور آ گیا ہے۔ صید اٹلنوں  
 نے حرم کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا ہے۔ عرب ان کی سرگرمیوں کا میدان ہے۔ مسلمانان  
 عالم میں سے جو بیدار ہیں وہ اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہیں اور باقی خواب گراں میں  
 دنیا و دنیائے سے بے بھر حالت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و مددگار ہو۔

”افضل حق“

کراچی سے روانگی | انگریز جس انداز سے اقوام عرب پر کمندیں پھینک رہا تھا۔ احرار اس سے  
 غافل نہیں تھے۔ والئی حجاز کو برطانوی ہتھکنڈوں سے آگاہ کرنا احرار  
 نے اپنا فرض سمجھا۔ چنانچہ احرار کا یہ قدم حکومت کے لیے نیا چیلنج تھا۔ لیکن آئینی طور پر حج کے  
 لیے جانے پر بظاہر روک ٹوک نہیں تھی۔ اس پر بھی کئی چیلے بہانوں سے ٹال مٹول ہوتا رہا۔

آخر زادراہ اور پاپورٹ کے لیے قریباً ایک ہفتہ کراچی ٹھہرنا پڑا۔ اس طرح احوار کا یہ وفد ۱۸ فروری کو سفینہ اکبر کے ذریعے کراچی سے روانہ ہوا۔

کراچی سے خاں فقیر خاں کو وفد میں شامل کر لیا گیا۔ اب یہ وفد چار افراد پر مشتمل تھا۔ دوستے ارکان میں مولانا ظہور احمد بگویی اور حاجی خاں فقیر خاں ایم۔ ایل۔ ۱۰ سے ۱۹۳۵ء میں مجلس احوار میں شامل ہوئے تھے۔ اول الذکر بھیرہ ضلع سرگودھا کے معروف دینی اور علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولانا عبدالعزیز بگویی تھا۔ خلافت تحریک میں یہ قومی کاموں میں شامل ہوئے۔ قید و بند کے مصائب بھی بھیلے۔ مرزائیت پر انہیں خاصہ عبور حاصل تھا۔ اپنے علاقہ سے باہر بھی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان کا ذکر ضلع بری پور بہارہ تحصیل مانسہرہ کے قومی کارکن تھے۔ آزادی وطن کے لیے ان کے عزائم خیر ملکی حکومت سے ہمیشہ ٹکراتے اور اس جرم کی پاداش میں انہیں اکثر جیل خانوں کے مصائب برداشت کرنا پڑے۔

کبھی کبھار بادِ سموم اچھے بھلے موسم کا مزاج بگاڑ دیتی ہے۔ کانٹے اچھول ایک اور وفد | پتیوں سے دست و گریبان ہوتے ہیں۔ لالہ گل مولانا ہو جاتے ہیں۔ باغبان لاکھ سرچنے، شبنم آنسوؤں کا دریا بہا دے۔ لیکن موسم کی تو ظلمونیاں بہار کا مزہ کر کے کیے بغیر نہیں رہتیں۔

مجلس احوار کا وفد جس بحری جہاز میں حجاز جا رہا تھا، اسی میں ایک اور وفد بھی حجاز جا رہا تھا، جس کی رہنمائی مولوی اسماعیل غزنوی کر رہے تھے۔ یہ وفد حرار کے خلاف موقوفہ لیے ہوئے تھا۔

اسماعیل غزنوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی کا عم زاد بھائی تھا۔ اس کی والدہ مرزا غلام احمد قادریانی کے خلیفہ اول حکیم نور الدین کی حقیقی بیٹی تھی۔ اس رشتہ سے اسماعیل غزنوی حکیم نور الدین (مرزائی) کے نواسے ٹھہرے۔ شاہ حجاز سے ان کے خاندانی مراسم کیا تھے، یہ تاریخ کا اس سے کوئی تعلق نہیں، لیکن نہال کے نانتے سے انہیں مجلس احوار سے خاصی صداقت تھی۔ اسی بنا پر تحریک مسجد شہید گنج میں انہی کے مکان پر حرار کے خلاف جعلی چٹھیاں بھی مرتب کی گئیں۔

اسماعیل غزنوی ۱۸۹۰ء کو امرتسر میں مولانا عبد الواحد کے ہاں پیدا ہوئے۔ اور ۱۳۔ جون

۱۹۶۱ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

احرار کے خلاف جو لوگ اسماعیل غزنوی کے دق میں شامل تھے ان میں غلام حسین میر  
کاشمیری، مولانا عبداللہ روپڑی (الجمعیہ) صوفی عبدالعزیز تنظیم اہلحدیث امرتسر، حکیم مولوی  
محمد اشرف پتوکی، مولوی عبدالجبار اہلحدیث کنڈیال، مولوی عبدالخالق (پتوکی ضلع لاہور)  
قابل ذکر ہیں۔

۲۶۔ فروری کو سفینہ اکبر جدہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ مولوی اسماعیل اور ان کے ہمراہی

سرمکاری انتظام کی سپرد داری میں چلے گئے۔ اور احرار وفد عام جھج کی طرح لاری کے ذریعے  
مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچنے پر اپنی آمد کی اطلاع سلطان عبدالعزیز بن سعود والئی حجاز  
کو کر دی۔

۱۴۔ فروری کو سرآقا دہلی پہنچے تو ریوے اسٹیشن پر ان کا استقبال  
**سرآقا خاں کی آمد** کرنے والوں میں سر ظفر اللہ شامل تھا۔ مخالفین کے مظاہرے کے  
خوف سے اسٹیشن کے ارد گرد پولیس کا خاصہ انتظام تھا۔ آپ نے وائسرائے کالج میں  
قیام کیا۔

سرآقا خاں نے ۱۶۔ فروری کو مسلم کانفرنس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا  
۱۵۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں ہندوستان کی سیادت مسلمانوں کے  
ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔

۱۸۵۷ء کے واقعات کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے اور اس  
واقعہ نے مسلمانوں کو اس امر کی طرف مائل کیا کہ وہ ہندوستان میں اپنے مستقبل پر  
خود کریں۔ آخر ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ پھر کانگریس اور مسلم لیگ  
کے معاہدے ہوئے۔ اس طرح بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں میں مسلمانان ہند  
نے اپنی پالیسی پر دوبارہ غور کیا۔ اگر اس سال جنگ عظیم شروع نہ ہوتی تو ۱۹۲۰ء کے  
بعد دوسرے دس سال مزید بہتر ہوتے۔

آخر میں آپ نے کہا،

اگر صوبہ بھارتی آزادی، فرقہ وارانہ سپرٹ پر مبنی رہی تو سی۔ پی، یو پی، بہار، اتر پردیش، مدراس  
بمبئی اور آسام میں ہیں انتہائی بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بایں ہمہ مسلمان ان بہتر  
حالات کی توقع رکھتے ہیں، جن کے مطابق تمام فرقے وطن کی بہبودی کے طلبکار ہوں۔

مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بنگال میں ان کی اکثریت

کو تسلیم کیا جائے۔ مسلمانوں پر واضح ہو چکا ہے کہ پنجاب اور بنگال میں ان کی  
اکثریت محض برائے نام ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ صوبہ سرحد پر بھارتی  
حیثیت اور اقتصادی پوزیشن کی بنا پر صوبہ بھارتی آزادی سے کما حقہ استفادہ نہ کر سکے گا۔

ان حالات و کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت میں کوئی تبدیلیاں

تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ چار صوبوں کی مجالس آئین سازی میں انہیں اکثریت  
دی جائے۔ اگرچہ بعض صوبوں میں اکثریت مل گئی ہے مگر بنگال میں انہیں اکثریت  
سے محروم کر دیا گیا ہے۔

ان تمام واقعات کے پیش نظر ہندوستان کی تمام قوموں کے فرقہ وارانہ

تعلقات بہتر ہونے چاہیں۔ اور تمام فرقوں کو ملک کی بہبودی کی طرف مائل ہو  
کر اپنے اختلاف دور کر دینے چاہیں۔

اس تقریر کے بعد ۱۸ فروری کو نیودہلی میں مسٹر محمد علی جناح اسر آغا خاں سے ملے اور ہندوستان

کے سیاسی حالات اور مسلم لیگ کی پالیسی پر بحث ہوتی رہی۔

مسٹر جناح لاہور پہنچ گئے | ۲۲ فروری کو قائد اعظم محمد علی جناح لاہور پہنچ کر گورنر پنجاب  
سر ہربرٹ ایمرسن سے ملے۔ اس ملاقات کے بعد گورنر پنجاب

نے اعلان کیا:

تصفیہ شہید گنج کے سلسلے کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر کوئی فوری

تصفیہ نہ ہو سکے تو صوبے میں ایسی فضا پیدا کی جائے، جس سے دونوں فرقوں

کے درمیان تصفیہ ہو سکے۔ حکومت پنجاب کئی بار اس امر کی وضاحت کر چکی

ہے کہ حکومت کی کوشش ہے کہ دونوں قوموں کے درمیان باعزت اور عملی طور پر کوئی سمجھوتہ ہو سکے۔ لہذا گورنمنٹ نے فیصلہ کیا ہے کہ زیر دفعہ ۵۷ پنجاب کیمینل اینڈ منٹ ایکٹ مجربہ ۱۹۳۳ء کے تحت اس ایچی ٹیشن کے سسٹن میں جو نظر بند کیے گئے تھے ان پر سے قیود ہٹالی جائیں۔ اور اس ضمن میں احکام جاری کر دیے گئے ہیں۔“

گورنر کے مندرجہ بالا اعلان کے بعد مسٹر محمد علی جناح نے اپنے پریس بیان قائد اعظم کا بیان میں کہا:

”میں حکومت پنجاب کے اس اقدام پر خوش ہوں۔ نظر بندوں کی رہائی کے بعد میرا بہت سا کام آسان ہو جائے گا۔ میں مسلمانوں کے تمام طبقوں کی آراء سے واقف ہوں۔ میں مسلمان بھائیوں کو اس پر راضی کر لوں گا کہ وہ باعزت تصفیہ کے لیے میرے ساتھ تعاون کریں۔ میں ہندو اور سکھوں کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے متعلق خیر سگالی کا اظہار کیا۔“

اس بیان کے دوسرے روز ملک عنایت اللہ نے شاہی مسجد میں اعلان کیا کہ مسٹر جناح کے ارشاد کے مطابق جدید تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلے میں سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی ہے۔

۵۔ مئی ۱۹۳۴ء کے ”نوائے وقت“ لاہور میں ایک مضمون کے دوران لکھا گیا۔

”فروری ۱۹۳۶ء کو جب مسٹر محمد علی جناح تحریک مسجد شہید گنج کے

سلسلے میں لاہور تشریف لائے تو ان کی قیام گاہ پر چند طلباء نے ان سے سوال کیا کہ ”اگر منتشر مسلم قوم کو پاکستان کے نام پر ایک جگہ جمع کیا جائے تو؟“

اس کے جواب میں مسٹر جناح نے سوال کیا۔ پاکستان کس طرح بنے گا؟ اور کون بنائے گا؟

ٹیفیس کمیٹی کا فیصلہ | مسٹر جناح کی آمد اور گورنر پنجاب کے اعلان کے بعد تحریک مسجد شہید گنج کے رہنماؤں نے مسجد کے بارے میں ایک اور مقدمہ تیار کیا اور اسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں دائر کر دیا۔ نیز اعلان کیا کہ آج کے بعد ہمیں اپنی تمام تر قوت

فی الحال تنظیم اور مقدمہ کو کامیاب کرنے پر صرف کرنی چاہیے۔ اور دوسری تمام تر جدوجہد ملتوی کر دی جائے۔

اس ڈیفنس کمیٹی کے ذمہ دار ارکان یہ تھے۔

۱۔ خان بہادر مرزا ظفر علی ریٹائرڈ جج ہائیکورٹ۔ صدر ڈیفنس کمیٹی۔ ۲۔ نواب شاہنواز آف ممدوٹ۔ ۳۔ ڈاکٹر عبدالرحیم بی۔ ۴۔ سابق سول سرجن افغانستان۔ ۵۔ سید محسن شاہ بی۔ اے ایل بایل۔ بی ہائیکورٹ لاہور۔

(روزنامہ "الجمعیۃ دہلی" ۳۰ فروری ۱۹۳۶)

۲۵ فروری کو آل مسلم پارٹیز کانفرنس کا ایک اجلاس زیر صدارت سرافاخاں کا مشورہ سرافاخاں ہوا جس میں سرافاخاں نے زور دیا کہ

"ہندوستان، مسلمانوں کا بھی ویسے ہی ملک ہے۔ جیسا ہندوؤں کا۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اور قوموں سے مل کر نئے آئین کو چلائیں۔ اور ڈومینین کا درجہ حاصل کریں یہ جلسہ میاں سرفضل حسین نے بلوایا تھا۔"

(نامہ "عمال" حصہ اول مصنفہ سر محمد یامین ص ۶۱)

۴۔ مارچ کو مسٹر محمد علی جناح لاہور سے تحریک شہید گنج اور دوسرے مسٹر جناح کی دہلی روانگی امور سے فارغ ہو کر دہلی روانہ ہوئے۔ انہیں اسٹیشن پر الوداع کہنے

والوں میں احوار رہنما چودھری افضل حق اور مولانا منظر علی کے علاوہ مقرر تھے۔ فضل الہی قربان اور روزنامہ "احسان" کے مالک ملک نور الہی بھی شامل تھے۔

مسٹر جناح نے روانگی سے قبل حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی جو تحریک شہید گنج کے سلسلے میں کام کو آگے بڑھائے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ مولانا عبدالقادر قصوری۔ میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ راجہ زبیر اناتھ۔ پنڈت نانک چند۔ سر بہادر بوطا سنگھ۔ سردار اجل سنگھ۔ سردار سپورن سنگھ۔

جلسہ اور اٹلی کی جنگ نے یورپین سیاستدانوں کو دوسری جنگ عالمی حالات اور ہٹلر کے قریب تر کر دیا تھا۔ ہر گھڑی ان کے دل و دماغ آنے والے

بھیانک قسم کے واقعات پر سوچنے لگے۔ اس دوران مظلوم اور غلام قوموں کا تصور تک ان کے ذہنوں سے محو ہو چکا تھا۔ البتہ ہندوستان کا رد عمل انہیں پریشان کیے ہوئے تھا۔ یا پھر جنوب مشرقی ایشیا کی سرخ ہوائیں ان کے نقشوں پر مٹی ڈال رہی تھیں۔

فرانس، جرمن کے خوف سے برطانیہ کی پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ روس اپنی ضرورت کے لیے فرانس کی قربتداری چاہتا تھا۔ اٹلی حبشہ پر فتح پانے کے باوجود غیر مطمئن تھا حالانکہ لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) اس کی جمنوا تھیں۔ جرمن اس تماشے میں شامل نہیں تھا۔ لیکن جیسے ہی ۵ مارچ (۱۹۳۶) کو یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی کہ جینوا میں فرانس اور برطانوی باشندوں کی ایک کانفرنس میں فرانسیسی مسودہ منظور کر لیا گیا ہے، جس میں حبشہ اور اطالیہ سے پہلے کی گئی ہے کہ دنیا کے امن کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی لڑائی ملتوی کر دیں اور باہم مل کر صلح کی گفتگو کریں۔ نیز حبشہ اور اطالیہ کے معاملات کو ۱۳ ارکان کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ مندرجہ بالا خبر پر ہٹلر نے ۸ مارچ کو اپنے پروپیگنڈا وزیر کو ہدایت کی کہ وہ پارلیمنٹ کا فوری اجلاس بلائیں، جس میں تقریر کرتے ہوئے ہٹلر نے کہا:

”میرے ملک کے لوگ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ اجلاس ابم امور پر مفید کرنے والا

ہے۔

اس وقت عالم میں ایسی کشیدگی پیدا ہو چکی ہے کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جنگ کے دیوتا نے اپنے جنگی ہتھیاروں کو اپنے ہاتھوں سے ہر چیز کو مسلح کر دیا ہے۔ دنیا ان حرکات کی ذمہ داری جرمن پر عائد نہیں کر سکتی۔ گذشتہ سال کے دوران جرمن کی حالت ایک حکمران قوم کی نہ تھی۔ بلکہ وہ غلام قوموں میں شمار ہوتا تھا۔ معاہدہ وارسا کی اصول پر مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اسے منافرت کی فضا میں ترتیب دیا گیا اس معاہدے میں کوئی دفعہ ایسی موجود نہیں، جس سے امید کی جاسکے کہ جرمن ممالک کے تعلقات کو دائمی طور پر خوشگوار رکھنے میں کامیاب ہوگا۔ جرمن کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ یورپ کے امن کو خراب کرے۔ لیکن اگر یورپ کے سیاستدانوں نے پھر اور نسلی امور کو نظر انداز

کر کے یورپ کے تصفیہ کی کوشش کی تو اس صورت میں فضا زیادہ خراب ہو جائیگی۔  
 اس وقت جرمن پریسٹ کی جارہی ہے۔ یہ موضوع نہ صرف ہماری طرز حکومت  
 سے متعلق ہے۔ بلکہ اس کا تعلق براہ راست چھ کروڑ جرمن باشندوں سے ہے جن  
 کی ضرورت ویسی ہی ہے جیسی کہ فرانسیسیوں کی ہے۔ جس کے لیے وہ جدوجہد کرنے  
 کا حق رکھتے ہیں۔“

اسی شام کو ہٹلر نے اپنے فوجی مشیروں کو طلب کیا اور رہائن لینڈ پر قبضہ کرنے کی تجویز ان  
 کے سامنے رکھی۔ مارشل بلومبرگ جو ان دنوں چھیت آف سٹاف تھا۔ وہ اپنی فوج کو جنگ کے  
 قابل نہ سمجھتا تھا۔ اس نے رہائن لینڈ میں اقدام کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ فرانس اور برطانیہ  
 سے جنگ ہو جائے گی اور ہم عمدہ برآئے ہو سکیں گے۔

مگر ہٹلر کے باسوس اپنا کام کر چکے تھے۔ اور ان کا پروپیگنڈہ بہر طور کامیاب تھا۔ اس  
 بنیاد پر ہٹلر نے کہا کہ فوجی کارروائی کی کوئی ضرورت نہ ہوگی، نہ فرانس اور نہ ہی کوئی اور جنگ کرے  
 گا۔ ہمیں ایک گولی چلانے بغیر قبضہ مل جائے گا۔

مارشل فریش نے جو سالار اعظم تھا۔ ہٹلر سے کہا کہ اس وقت ہماری فوج تو تنہا فرانس کی  
 فوج کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی۔ میں اس اقدام کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا۔  
 ہٹلر فوجی افسران کی گفتگو سے پریشان تو ہوا، لیکن اس کی فطرت اس کو سہارا دے گئی۔  
 اس نے کہا کہ

”اگر فرانس کی فوج مقابلہ کرے گی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ اور تم میرے مرنے  
 کے بعد فوجوں کو واپسی کا حکم دے کر جھگڑے کو ختم کر دینا اور فساد سے بچنے  
 کے لیے فوجوں میں کوئی سااان جنگ تقسیم نہ کرنا۔“

۴۔ مارچ صبح کے وقت جرمن سفیر نے پیرس میں فرانس کے وزیر خارجہ کو ایک یادداشت  
 جو جرمن زبان میں تھی، حوالے کی۔ پیشتر اس کے کہ وزارت اس پر غور کر سکے دس اور ساڑھے  
 دس بجے صبح کے درمیان فرانس اور برطانیہ کے سفیروں اور بلجیم کے نمائندے کو جرمن کے وزیر  
 نے یکے بعد دیگرے برلن میں ملاقات کر کے ایک یادداشت حوالے کی۔ ان یادداشتوں میں کہا



تھا۔ کہ جرمنی میثاق لوکارنو سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ اور رہائش لینڈ پر فوراً قبضہ کر رہا ہے۔  
دوپہر کے وقت جرمن فوجیں رہائش لینڈ میں بڑھیں اور سارے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں معلوم  
ہوا کہ جرمن فوجوں کو کوئی کار توں یا سامان جنگ نہیں دیا گیا تھا۔ اس طرح جرمنی نے ایک گولی  
چلائے بغیر معاہدہ دار سائی کی ایک اور پابندی ختم کر دی۔

( "دنیا کی بساط سیاست" مصنفہ مولانا منظر علی انظر ص ۹۰-۹۱ )

گذشتہ دنوں کی اس خبر کی حبشہ نے تردید کر دی کہ حبشہ اور اٹلی کے درمیان عارضی صلح ہو  
چکی ہے۔ حبشہ آخری وقت تک جنگ کرے گا۔ اور اس میدان میں اٹلی نے پانچ ہزار جیشیوں  
کو روپیہ اور اسلحہ دے کر بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن انہوں نے شہنشاہ حبشہ کے روبرو روپیہ  
اور ہتھیار ڈال کر اپنی وفاداری کا حلف اٹھایا۔

لندن ۱۶۔ مارچ یہ افواہ گرم تھی کہ جرمن نے لیگ کونسل کی  
جمعیت اقوام کو جرمن کا جواب

دعوت کو مشروط طور پر قبول کر لیا ہے۔ یعنی

جرمن لیگ کونسل کے اجلاس میں مساوی حیثیت اور خود مختار حکومت کی  
حیثیت سے شامل ہوگا۔

۱۱ سال ۲۰۔ جنوری کو برطانوی شہنشاہ جارج پنجم کا انتقال ہو گیا تھا۔  
جارج پنجم کا سوگ | ان کی جگہ ایڈورڈ وڈسرنے بطور بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کے نام سے  
اختیارات سنبھال لیے تھے۔ لیکن بین الاقوامی صورت حال کے پیش نظر ہندوستان میں  
سرکاری طور پر ان کا سوگ، مارچ کو منایا گیا۔ چنانچہ اس روز سنٹرل اسمبلی کا اجلاس جس میں  
وائسرائے ہند خود شامل ہو کر تقریر کرنے والے تھے ملتوی کر دیا گیا۔

سرفضل حسین کی کامیابی | سیاسی میدان میں اگر باپ اور بیٹا آمنے سامنے ہوں تو اس  
راہ میں یہ رشتہ بھی ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ دونوں اقتدار کے  
حصول میں ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں۔ رفاقت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مقام  
اس بوجھ کا متحمل نہیں ہوتا۔

سرفضل حسین، سر سکندر حیات خاں اور سرفیروز خاں نون، برطانوی راج کی پائیداری

میں ان سب کا خون برابر وزن میں شامل رہا۔ اگر ایک نئے اسلامی اصولوں سے بغاوت کرتے ہوئے یونین جیک تمام رکھا تھا تو دوسروں نے افواج فرنگی میں شامل رہ کر بلا واسطہ کو تاخت و تاراج کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس ہم آہنگی اور ہمراہی کے باوجود جیسے انہیں راستے کی ناہمواری پر شبہ ہوا تو اپنے آنگن کے پھول بھی کانٹے نظر آنے لگے۔

سرفضل حسین نئے آئین کے تحت پنجاب کے وزیر اعظم بننے کی خواہش میں واکسرا کی ایگزیکٹو کونسل سے مستعفی ہو کر پنجاب پہنچے تو سر سکندر حیات کو اپنے راستے کا دررا سمجھ کر انہیں ریزرو بینک کا ڈپٹی گورنر بنا کر بھیجوا دیا۔ حالانکہ یونینسٹ پارٹی میں بجائے خود اس وقت تک کوئی جان نہیں تھی اور نہ ہی سکندر حیات پنجاب کی عوامی سیاست میں کوئی شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ یہی حال سرفیروز خاں نون کا تھا۔ وہ پنجاب کے وزیر تعلیم ہوتے ہوئے بھی کوئی شخصیت نہیں تھے۔

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر

ناخدا نے مجھے ساحل پر ڈبونا چاہا

آخر سرفضل حسین نے سرفیروز خاں نون کو اپنے راستے سے کیسے ہٹایا یہ کہانی

سر محمد یامین کی زبانی سنئے۔

۱۰ مہیاں سرفضل حسین کی ایک بڑی سیاسی کامیابی یہ ہوتی کہ فیروز خاں نون

کو ہائی کمشنر انگلستان مقرر کر دیا۔

اب تک یہ چلا آتا تھا کہ جو ایگزیکٹو کونسلر ایڈسٹریٹو لیبر کا ہوتا تھا

وہ میعاد ختم ہونے پر انگلینڈ میں بندوستان کا ہائی کمشنر ہوتا تھا۔ سربانی این ہترہ

کی میعاد ختم ہونے پر یہ طے تھا کہ سر جوزف مجور مقرر ہوں گے جو گذشتہ

سال ریٹائر ہوئے۔ معاملہ بالکل طے ہو گیا تھا اور اعلان ہونے والا تھا

کہ سر ایچ ایمرسن گورنر پنجاب نے مہیاں سرفضل حسین سے کہا آپ پنجاب میں

ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہو جائیں۔ انہوں نے کہا میں وزارت پسند کرتا ہوں

گورنر نے کہا آپ کے رشتہ دار ملک فیروز خاں نون وزیر ہیں۔ تو ایک ہی

خاندان میں تو سب وزارتیں نہیں ہو سکتیں۔ اس پر میاں سرفضل حسین نے کہا اچھا میں مخالف بنچوں پر بیٹھ جاؤں گا۔ گورنر بولا اگر آپ مخالف بنچوں پر جا بیٹھیں گے تو گورنمنٹ بنچوں پر کون رہ جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو آپ سوچیں۔

گورنر نے کہا کہ اچھا میں فیروز خاں نون کو برخواست کر کے آپ کو (وزیر) کیے دیتا ہوں۔ سرفضل حسین نے کہا کہ برخواست کر کے میں آنا نہیں چاہتا لہذا فیروز خاں نون کو ہائی کمشنر بنوادو۔ گورنر نے کہا، وقت فیصلہ ہو چکا ہے۔ سرفضل حسین نے کہا کہ ابھی ٹیلیفون کرو اور وائسرائے سے جا کر ملو۔ اور مسلمانوں کے حق کا سوال پیش کرو۔ گورنر نے ٹیلیفون وائسرائے کو کیا کہ کل جو اعلان ہونے والا ہے، اس کو لندن اور دہلی میں روک دیا جائے۔ میں دہلی کے لیے روانہ ہوتا ہوں۔

گورنر نے دہلی میں وائسرائے سے کہا، میں پنجاب میں حکومت نہیں چلا سکتا اگر فیروز خاں نون کو ہائی کمشنر نہ کیا گیا۔ وائسرائے مشکل سے راضی ہو گیا اور سیکرٹری آف سٹیٹ سے اس کو منظور کرادیا، کہ فیروز خاں نون ہائی کمشنر ہو جائیں۔

اس میں کئی باتوں کی جیت ہوئی۔ اول تو یہ کہ مسلمان کو ہائی کمشنر کرادیا دوم یہ کہ سر جوزف بھور کو جو مسلمانوں سے سخت تعصب رکھتا تھا، نچا دکھایا اور ہائی کمشنر کے جو خواب دیکھ رہا تھا وہ ختم کرادیے۔ خود پنجاب کے وزیر اعظم ہو گئے اور سر سکندر حیات کو ریزورنٹس کا ڈپٹی گورنر بنوادیا۔ جس کے ہاتھ میں تمام عملہ کا تقرر ہوا۔

(نامہ اعمال ص ۶۲۶-۶۲۷)

مدینہ منورہ میں مرزاٹیوں کو شکست  
گورنر نے نظر تاریخ اس سے لا تعلق ہے۔ کہ  
غیر مقلد لوگوں نے نہ اعلان احمد کے کفر یہ عقائد

ابتدا کیوں کر اپنے تھے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ مرزا غلام احمد اور اس کا خلیفہ اول (حکیم نور الدین) باطل عقاید اختیار کرنے سے پیشتر یہی ذہن اور عقائد رکھتے تھے۔ شاید اسی لیے مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اپنی تحریروں اور مناظروں میں مرزائیوں کو منافق تو کہا لیکن غیر مسلم کہنے سے احتراز کرتے رہے۔

جب غزنوی خاندان کا ایک فرد (مولوی اسماعیل غزنوی) عزیزداری میں مرزائیوں کے قریب تر پہنچا تو اسلام کے واضح اصول بھی مجروح ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔  
مرزائی غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن مولوی اسماعیل غزنوی کی چونکہ سعودی حکومت سے قریبی رسم و راہ تھی اس اعتماد پر اسماعیل غزنوی کی وساطت سے مولوی احمد نامی ایک غیر مقلد نے مدینہ منورہ میں مدرسہ دارالحدیث قائم کر رکھا تھا۔ یہ شخص حکومت حجاز کا وظیفہ خوار بھی تھا۔ اس تعلق کی بنا پر اکثر مرزائی حج کے بہانے حجاز پہنچ کر سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان خراب کرتے رہتے۔ حکومت حجاز اس راز سے نا آشنا تھی۔

ویسے بھی ۱۹۳۶ء تک مرزائیت اس قدر واضح نہیں تھی کہ مسلمان اس سے نفرت کرنے لگتے۔ ۲۰۔ مارچ ۱۹۳۶ء کو اجازت کا وفد مناسک حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ پہنچا تو نہ جانے اسے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ مدرسہ دارالحدیث میں ہندی اور مصری حجاج کا اجتماع ہو رہا ہے۔ جس میں مدرسہ ہذا کی مالی امداد کے لیے اپیل کی جائے گی۔ جب اجازت وفد مدرسہ دارالحدیث میں داخل ہوا تو مدرسہ کے مہتمم مولوی احمد نے مختصر الفاظ میں مدرسہ کی روئداد سنائی۔ مدرسہ کے مختلف طلباء نے مختلف مضامین پڑھے۔ اس دوران لائپزور کے ایک مرزائی نے مدرسہ کی امداد کے لیے ایک سو روپیہ نقد پیش کیا۔ اور سورۃ العصر کی مرزائی تفسیر سنا کر انگریزی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ تاکہ یورپ میں تبلیغ اسلام کی جائے۔ اس دوران مرزائی نے اپنے فرقے کی خوبیوں کا تذکرہ بھی کیا۔ اس کے بعد ایک اور مرزائی اٹھا، اس نے پادریوں کے انداز میں دعا مانگی۔ حاضرین آمین کہتے رہے۔ مرزائی گرجا کے پادریوں کی طرح ہاتھ اٹھائے بغیر کہہ رہا تھا۔

اُسے خدا بکفر کا زور ہے۔ کفر دنیا کے کناروں تک پہنچ گیا ہے۔ اسلام بکس اور بے چارہ رہ گیا ہے۔ تو نے اس زمانے میں اپنے لطف و کرم سے کفر کے احوال کے لیے ایک مقدس وجود ظاہر کیا ہے۔ جس کی طفیل ایک پاک گروہ تیرے دین کی خدمت میں مصروف ہے۔ وہ دنیا کے کناروں تک تیرا نور پھیلا رہا ہے۔ اے اللہ! اس گروہ کو ترقی دے اور اس گروہ کے ہر فرد کو محمد رسول اللہ اور اس کے صحابہ جیسا بنا دے۔“

اس تقریر سے صاف واضح ہو رہا تھا کہ یہ مرزائی ہے۔ چنانچہ ارکان وفد میں سے مولانا ظہور احمد بگوتی نے فوراً اٹھ کر صدر جلسہ سے تقریر کی اجازت چاہی اور پھر اس مرزائی کی تمام تقریر اور اصلیت عوام پر واضح کی۔ جب لوگوں پر حقیقت واضح ہوئی تو مجمع میں سخت اشتعال پھیل گیا۔ اس موقع پر مولوی احمد نے مرزائیوں کو بچانا چاہا لیکن دارالحدیث کے مصری صدر مدرس نے کہا یہ لوگ (مرزائی) واجب القتل ہیں۔ اس پر کافی ہنگامہ ہوا اور مجلس درہم برہم ہو گئی۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ مرزائی جدہ پہنچ کر ہندوستان روانہ ہو گئے ہیں۔

(ماہنامہ شمس الاسلام ختم نبوة نمبر بابت شمارہ مارچ اپریل ۱۹۷۵ء ص ۱۱ تا ۱۵)

تقریبات حج کی سرکاری ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد سلطان عبدالعزیز والی حجاز

سلطان حجاز سے احرار وفد کی ملاقات

نے ۲۲۔۱۰۔۱۹۲۶ء کو احرار وفد کو شرف ملاقات بخشا۔ اس سے پیشتر مولوی اسماعیل غزنوی بعد اپنے رفقاء کے شاہ حجاز سے ملاقات کر چکا تھا۔ اور احرار کے خلاف اپنے تاثرات سے والی حجاز کے مزاج پر اثر انداز ہو چکا تھا۔ اس بناء پر جیسے ہی احرار وفد والی حجاز کے روبرو پیش ہوا۔ شاہ کے تیور بدل گئے۔ اور وہ سب سے زیادہ مولانا داؤد غزنوی پر ناراض ہوئے کہ وہ اس وفد کے ساتھ کیوں آئے ہیں۔ والی حجاز کا یہ کلمہ غزنوی خاندان پر چند ذاتی احسانات کی بنا پر تھا۔ اس کے بعد سلطان عبدالعزیز بن سعود نے فرمایا:

”میرا ملک زرخیز نہیں۔ ہمیں صرف حاجیوں کی آمدن پر گذر بسر کرنی پڑتی ہے۔“

اور حاجیوں کی تعداد ہر سال غیر ملکی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے کم ہوتی رہتی ہے۔“

جس کی بناء پر میرا ملک مالی مشکلات میں الجھا ہوا ہے۔ جب مجھے تحقیقات پر معلوم ہوا کہ میرے ملک میں خدائے تعالیٰ کا دیا ہوا خزانہ موجود ہے تو میں کیوں نہ اس سے استفادہ کروں اور اس طرح میرا ملک مالی مشکلات سے نجات حاصل کرنے والی جاز سے اس گفتگو کے علاوہ اور کیا باتیں ہوتیں، اس کی تحقیق نہیں ہو سکی تاہم مولانا منظر علی انور نے جاز سے واپسی پر اس قدر بتایا:

”ہم نے شاہ عبدالعزیز بن سعود سے ملاقات کی اور عرب کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔ جس سے حالات کا بہترین نقشہ فریقین کے ذہنوں میں آ گیا۔ اندر کی باتیں کچھ اس انداز کی ہیں کہ ان کا اظہار مناسب نہیں اور نہ ہی ان کا ڈھنڈورا پیٹنا درست ہوگا۔ لیکن آنے والا وقت بتائے گا کہ ہمارے خدشات درست تھے“

۲۲۔ مارچ کو ہندوستان کے مفتی اعظم اور مجتہد علمائے ہند کے صدر مولانا مفتی کفایت اللہ نے لاہور کی ایک عدالت میں مسجد شہید گنج

کے مقدمہ میں شہادت دیتے ہوئے کہا:

”مسجد کی شرعی حیثیت واضح ہے۔ اگر ایک دفعہ کسی جگہ پر مسجد تعمیر ہو جائے تو پھر قیامت تک وہ مسجد ہی رہتی ہے۔ اس پر نہ تو کوئی دوسری عمارت تخلیق ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کی ہیئت بدلی جاسکتی ہے“

۲۴۔ مارچ کو دہلی ہری جن کالونی میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کانگریس نے بجٹ ختم کر دی | کیٹی کا اجلاس شروع ہوا، جس میں کمیونل ایوارڈز پر بحث تھا۔ لیکن شروع اجلاس میں تمام ممبران نے بغیر کسی گفتگو کے اس پر ہمیشہ کے لیے بجٹ ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ہندوستان میں ہٹلر کے خلاف پروپیگنڈہ | جرمن قوم کو جس عاجلانہ طریق پر ہٹلر نے زندہ قوموں کی صف میں لاکھڑا کیا تھا، اقوام یورپ اور خاص کر برطانیہ اس سے زیادہ پریشان تھا۔ یورپ کے بعد ہندوستان کے اخبارات نے سرکاری سطح پر ہٹلر کے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ اس نے تحریک آزادی ہند اور ہندوستانیوں کے

خلاف زہرا گلاب سے اس پر ٹبلر کے خلاف ہندوستانیوں میں ہوا پھیلنے لگی۔ لیکن سیکرٹری جماعت اسلامیہ برمنسٹر جلیب الرحمن قریشی نے فوراً اس کی سختی سے تردید کر دی اور ساتھ ہی جرمن کے پروسیگنڈہ سیکرٹری ڈاکٹر گو بلز نے بھی ۲۱ مارچ کے ایک بیان کے ذریعے اس کو غلط قرار دیا۔

انتخابات کی سرگرمیاں | اپریل کا مہینہ ہندوستان میں انتخابی مہنگامہ آرائی کا اہم اور سرگرم مہینہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے علاوہ دیگر

سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے گفتگو، معاہدات یا گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف تھیں۔ ۱۹۳۵ء ایکٹ کے ذریعے جو صوبائی خود مختاری ہندوستان کو ملی، ہر فرد کسی نہ کسی طریق پر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا خواہ انفرادی یا اجتماعی۔ ہندوستان کی معروف سیاسی پارٹیاں اپنا اپنا منشور اور مستقبل کے لیے طرز حکومت کا نقشہ لیے پھر رہی تھیں۔

کانگریس، مسلم لیگ، جمعیتہ علمائے ہند اور مجلس احرار ان دنوں عام کے ذہنوں پر قابض تھیں۔ رحمت پسند اور سرکار پرست طبقہ بھی کسی نہ کسی انداز میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ غیور علی اقتدار اپنے استحکام کی سوچ میں تھا۔ ایسے میں والیان ریاست دہریہ شکایات میں تھے۔ اپنی رعایا سے ان کا برتاؤ حاکمانہ غرور پر تھا۔ اور دوسری طرف ان کا برطانوی سہارا دم توڑ رہا تھا۔ ان حالات میں ریاستی نظام کے وارث نواب مسلم لیگ کا تکیہ چاہتے تھے اور ہمارا جھکان کانگریس کی عبا اوڑھے پھرتے رہتے۔

انتخاب کے دن بیسے جیسے قریب آتے گئے۔ دانشوروں کے ذہن اور صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی گئیں۔ یکم اپریل (۱۹۳۶ء) کو سندھ بھی سے الگ صوبہ قرار دے دیا گیا تو بعض سیاستدان بھی پر پزیرے بھاڑنے لگے۔ سمر واکھوڑا اور بھٹو خاندان کے وڈیرے اپنا اپنا پھتارا اٹھانے سنبھی حوام کے نقش پا ڈھونڈنے لگے۔ ورنہ یہ لوگ محلاتی سازشوں کے ذریعے اپنے مقصد سنوارنے کے عادی تھے۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء اقوام ہند کے ہر طبقے نے ناپسند کیا۔ البتہ درجہ مختلف تھے۔

۱۔ کانگریس چونکہ ۱۹۲۹ء کے اجلاس لاہور میں آزادی کی تکرار واد منظور کر چکی تھی۔ اور وجود آئین درجہ نوآبادیات تک محدود تھا۔

۲۔ مسلم لیگ اس وقت تک غیر مقبول جماعت تھی۔ عوام سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اور نہ کوئی پروگرام۔ مسلم لیگ وفاق میں ریاستوں کی شمولیت کے خلاف تھی کہ اس طرح مسلمانوں کا تناسب آبادی مزید کم ہو جاتا تھا۔ نیز اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے گورنروں کو دیے گئے خصوصی اختیارات کو کافی تحفظ خیال کرتی تھی، جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت بھی کر دیا۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو اقلیت میں بدل دینے پر بھی اعتراض تھا۔ تاہم مسلم لیگ نے اس سکیم کو عارضی طور پر تسلیم کر لیا۔

۳۔ وفاق کونسل میں ریاستی عوام کی بجائے والیان ریاست کو نمائندگی دی گئی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ اس طرز عمل کے خلاف تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دستور نو کا وفاق حصر نافذ نہ ہو سکا۔ کانگریس نبطا پر اپنے کو اقوام ہند کی نمائندہ سمجھتی رہی لیکن مہاسی جانی گروہ اس کی انتظامیہ پر قابض ہوتا جا رہا تھا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کے اندرونی ماحول میں بڑھتی رہا۔ ہو کر بھاگنے لگی۔ مجلس احرار اور جمعیتہ علمائے ہند گاہے گاہے آزادی وطن کے لیے کانگریس کی مہنوا ضرورت تھیں۔ ورنہ ان کا کانگریس سے کوئی سیاسی رشتہ نہیں تھا۔

نئے انتخاب کے موقع پر مسلمانان ہند کا باہم مل بیٹھنا ضروری سمجھا گیا۔ اس کے بغیر انگریز اور ہند کی سیاسی گیم کا میاب ہو رہی تھی۔ لیکن مسلمان تین حصوں میں منقسم تھے۔ مسلم لیگ تن آسان اور ماڈریٹ قسم کے مسلمانوں کو پناہ دیے ہوئے تھی۔ سیاسی دل و دماغ کا مسلمان انگریز دشمنی کے باعث ہندوستان بھر میں الگ حیثیت منجالیے ہوئے تھا۔ انگریزوں سے وابستہ طور پر مسلمان کا دولت مند طبقہ اپنی تقدیر غیر ملکی وقار سے سمجھے ہوا تھا۔ اس انفرادیت سے ہر گروہ کی سیاسی ضد ایسی بڑھ چکی تھی کہ ان کا ایک محور پر جمع ہونا دشوار نظر آ رہا تھا۔ اس مشکل راستے میں ایک موڑ آیا کہ دہلی میں یونٹی بورڈ کی مجلس عاملہ نے ایک اجلاس طلب کیا۔ اس میں مسٹر محمد علی جناح خود شریک تو نہ ہوئے مگر ان کا حسب ذیل پیغام متین پودھری نے پڑھ کر سنایا۔

بجائے یونٹی بورڈ کے تحت الیکشن رونے کے مسلم لیگ کے نام پر الیکشن

رہا جائے اور اس میں پرانی جماعتوں کو اکٹھا کیا جائے۔

اس مشورے پر ہاؤس کی یہ رائے مٹھی مٹھی کر مسٹر جناح کو خود آکر اپنی بات کی وضاحت کرنی



چاہیے۔ چنانچہ دوسرے روز صبح کے اجلاس میں مسٹر جناح کی موجودگی میں مفصل بحث ہوئی۔ اس جلسہ میں یونٹی بورڈ کے علاوہ جمعیتہ علمائے ہند کے ارکان بھی خاص دعوت پر شریک اجلاس تھے۔ اس دوران یہ سوال سامنے آیا کہ

”جو لوگ اپنا سسک کامل آزادی رکھتے ہیں، وہ مسلم لیگ کے ممبر کیسے بن سکتے ہیں؟“

جواب میں مسٹر محمد علی جناح نے کہا

”جو لوگ آگے ہیں ان کا پیچھے والوں کے ساتھ شامل ہو جانا کوئی قابل اعتراض عمل نہیں۔“

بالآخر طے پایا کہ مسلم لیگ کی بجائے مسلم پارلیمنٹری بورڈ پر الیکشن لڑا جائے، جس میں تمام جماعتیں شریک ہوں۔ نیز مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ جمعیتہ علمائے ہند کی تجویز پر قائد اعظم محمد علی جناح کو اختیار دیا گیا کہ وہ پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر خود نامزد کریں۔ اجلاس کے خاتمے پر حسب ذیل الیکشن مینیسٹو شائع کیا گیا۔

۱۔ تمام جاہلانہ قوانین منسوخ کرائے جائیں گے۔

۲۔ ملک کی اقتصادی لوٹ مار کو روکا جائے۔

۳۔ ملک کے بھاری اخراجات کو گھٹایا جائے۔

۴۔ ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے گی۔

۵۔ سکھ و شرح تبادلوں کا خیال رکھا جائے گا۔

۶۔ غیر ملکی قرضوں کا بوجھ کم کیا جائے گا۔

۷۔ ابتدائی تعلیم کو مفت کیا جائے گا۔

۸۔ مسلمانوں کے مذہب اور زبان کی حفاظت کی جائے گی۔

۹۔ ملک میں رائے عامہ کو بیدار کیا جائے گا۔

۱۰۔ اپریل کو بیٹی مسلم لیگ کے اجلاس میں

سب مسلم جماعتوں کو شرکت کی دعوت دی جائے۔

کانگریس کی قراردادوں | مسلم یونٹی بورڈ کے اجلاس منعقدہ دہلی کے بعد، اپریل کو آل انڈیا  
کانگریس کی مجلس عاملہ کے آئندہ انتخاب کے لیے اپنی واضح پالیسی کا

اعلان کرتے ہوئے حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

”کانگریس ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس اکیٹ ۱۹۲۵ء کے نئے آئین کو غیر مستحسن  
اور ملک کی آزادی کے لیے باعثِ خطرہ قرار دیتے ہوئے اسے بالکل نامطلوبہ  
اور مسترد کرنے کی سفارش کرتا ہے، نیز قرارداد پاپا کر کوئی ایسا آئین جسے کوئی غیر  
ہندوستانی طاقت وضع کرے اور ہندوستانیوں کے اس حق کو تسلیم کرنے سے  
انکار کرے، جس سے ہندوستانیوں کو اپنے سیاسی اور اقتصادی مستقبل کی  
تکمیل کا حق حاصل نہیں، وہ آئین قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔

ہندوستان کے لیے کانسی ٹیٹ اسمبلی کا تیار کردہ آئین ہی قابلِ قبول

ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ نئے آئین کے تابع صوبجاتی مجالس  
وضع قوانین کے انتخاب کانگریس کے آئندہ اجلاس سے قبل ہوں گے ایسی  
صورت میں کانگریس انتخابات میں ایسے امیدوار کھڑے کرے جو کانگریس  
کی اعلان کردہ پالیسی اور فرمان کے مطابق عمل کرے۔“

نئے وائسرائے کی آمد | ۸۔ اپریل کو ہندوستان کے نئے وائسرائے مسٹر لارڈ لیتھگو  
نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالا تو حالات میں نئی تبدیلی

آئی۔ نئے حاکم نے نئی پالیسی وضع کی، جس سے غلام ہندوستان کا احساسِ غلامی نئے جذبات  
سے ابھرا اور آئندہ انتخاب میں ہر سیاسی جماعت نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا۔ نئے  
وائسرائے کا پہلا وار مسٹر سبھاش چندر بوس پر ہوا کہ وہ یورپ سے واپسی پر ہماز سے اترتے  
ہی ریگولیشن ۱۸۱۸ء کی دفعہ ۳ کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔

یونٹی بورڈ کی گذشتہ روز کی میٹنگ کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کے ایک  
قائدِ عظیم کی تقریر | جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے صدر مسلم لیگ نے کہا:

حکومت نے یہ آئین تمام پارٹیوں کی مرضی کے خلاف اس ملک پر محض اس وجہ سے  
 ٹھونس دیا ہے کہ ہندوستانی آپس میں متحد نہ تھے اور اپنے خانگی اختلافات کا تصفیہ  
 خود کر سکتے تھے۔ تاہم مسلمان آزادی کی جنگ میں بھی ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔  
 صرف اپنا تحفظ چاہتے ہیں۔ چونکہ وہ اقلیت میں ہیں۔ یہ کوئی مذہبی سوال نہیں  
 بلکہ خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ میں ہندوؤں سے اپیل کرتا ہوں کہ کمیونل ایوارڈ پر  
 بحث کا دروازہ بند کریں تاکہ ہم سب مل کر آگے بڑھ سکیں اور ملک کے بڑے  
 مسئلے کی طرف توجہ دیں۔

ہندو اور مسلمانوں کو الگ الگ منظم ہونا چاہیے۔ اگر دونوں منظم ہو گئے  
 تو انہیں تعاون کے رشتے پر چلنے میں دیر نہ لگے گی۔

(مارشل لاء سے مارشل لاء تک ص ۱۸)

علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر | ملک کی سیاسی جماعتیں انگریز اور غیر مسلم کا جواب دینے  
 میں مصروف تھیں۔ اس بنیاد پر مسلم لیگ سمیت مسلم

جماعتوں کا باہم اتحاد ہو رہا تھا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ

”جو دھری سر ظفر اللہ (مرزائی) کو نواب حیدرآباد دکن کی سفارش پر علی گڑھ یونیورسٹی

کا وائس چانسلر بنایا جا رہا تھا۔“

اگر یہ عہدہ کسی غیر مسلم کے قبضے میں چلا جاتا تو اس اہم تعلیمی ادارے کا کیا حشر ہوتا؟ جہاں  
 ہزاروں کی تعداد میں مسلمان طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کے ایمان اور عقیدہ ختم نہوے  
 کس بری طرح مجروح ہوتے۔ احرار اپنی سیاسی مصروفیت کے باوجود اس فتنے سے غافل نہیں  
 تھے۔ چنانچہ جیسے ہی یہ اطلاع احرار رہنماؤں تک پہنچی۔ صدر آل انڈیا مجلس احرار مولانا جیسارتن  
 لدھیانوی نے ایک برقیہ والی حیدرآباد کو بھیجا۔

”علی گڑھ یونیورسٹی ایک اسلامی درسگاہ ہے۔ اس کا وائس چانسلر کسی مسلمان

کو تجویز کریں۔“

اس خبر کو ڈی جی حد تک خفیہ رکھا گیا۔ لیکن جیسے ہی صدر مجلس احرار کے برقیہ کا متن اخبارات

میں شائع ہوا۔ روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر نے اس پر غصے کا اظہار کرتے ہوئے ۴ اپریل کے شمارہ میں ایڈیٹوریل لکھ مارا، جس کے نتیجے پر یہ آگ دوڑ تک پھیل گئی۔ آخر والٹی دکن اور حکومت برطانیہ کے دماغوں کی یہ تجویز اپنی موت مر گئی۔

**نیا امیر ملت** | امیر ملت پر جماعت علی شاہ کے حج پر چلے جانے کے بعد ۱۱ اپریل کو لاہور شاہی مسجد میں ایک اجتماع ہوا، جس میں مسٹر عزیز ہندی نے جوان دنوں افغانستان سے لاہور آئے تھے، ایک تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کو ایک سردار منتخب کرنا چاہیے۔ اس پر مجمع سے ایک آواز آئی کہ پر جماعت علی شاہ کی موجودگی میں دوسرا کوئی سردار منتخب نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ پیر صاحب چونکہ کانوں کے کمزور ہیں اور وہ ہر ایک کی بات مان لیتے ہیں، چاہے بات کیسی ہی ہو، لہذا ہمیں نئے امیر ملت کی تجویز پر غور کرنا چاہیے۔ اس پر کافی ہنگامہ ہوا اور اجلاس ہنگامے کی نذر ہو گیا۔

**انسانیت پر سب سے بڑا ظلم** | طاقت دولت کی ہویا ہتھیاروں کی، انسان جب اس پر قابض ہوتا ہے تو اسے راستہ سمجھائی نہیں دیتا۔ وہ

اندھے کی لالچی بن کر چاروں طرف گھومتا ہے۔ اپنے پرانے اس کی چوٹ سے محفوظ نہیں رہتے۔ حبشہ کی مظلوم آبادی جب اپنے دفاع کے لیے اطالیہ کے سامنے آئی تو طاقت نے مظلوم کی بجائے طاقت کی ہمنوائی کی۔ لیگ آف نیشنز نے ظالم کو سزا دینے کی بجائے مظلوم کی موت کا تماشہ کیا۔ اس کی شہ پاکر ۱۳۔ اپریل (۱۹۳۶) کو اٹلی نے حبشہ پر ایسی زہریلی گیس پھینکی جس سے ہزاروں انسان اندھے اور پاہنچ ہو کر رہ گئے۔ یہی کسر بمباری تھے پوری کر دی۔

۱۹۱۳ء کی جنگ عظیم تاریخ کی بڑی بڑی طوائی قرار دی جا رہی ہے۔ لیکن اس قدر ظالم ہتھیار اس طوائی میں بھی استعمال نہ ہوا جو اطالیہ نے اپنے سے کئی درجہ کمزور حبشہ پر استعمال کیا۔ حالانکہ حبشہ اٹلی کے مقابل کوئی بڑی طاقت نہیں تھا۔ لیکن براہو، ہوس ملک گیری کا کہ انسان اس کے لیے انسانیت کی تمام راہیں روندھ ڈالتا ہے۔ زہریلی گیس کے استعمال سے یورپ اور ایشیا کا نپ اٹھے۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ اور غلام ہندوستان نے بھی اپنے رُو عمل کا اظہار کیا۔ اور مولینی کو اس انسانیت سوز حرکت پر اسے لعن طعن کی لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔

دہلی کے فیصلے کی روشنی میں ۱۰ اپریل کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ  
**مسلم لیگ کا اجلاس** کا سالانہ اجلاس سر وزیر حسن کی صدارت میں شروع ہوا، جس میں  
 صدارتی تقریر کرتے ہوئے سر وزیر حسن نے کہا: کہ

”ہر آزمائش میں تاج برطانیہ سے ہماری وفاداری مستحکم ثابت ہوئی ہے۔ یہاں  
 تک ہماری وفاداری کو آتشیں آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ہماری مساجد اور مندر منہدم  
 کر دیے گئے۔ اندھا دھند لاشیاں اور گولیاں چلائی گئیں۔ ہمارے رہنماؤں کو  
 مقدمات چلائے بغیر جیل خانوں میں بند کر دیا گیا۔ تحریک آزادی میں ہمارے  
 کارکنوں پر بے جا تشدد کیا گیا۔ بغیر کسی ثبوت کے نقل و حرکت پر پابندیاں عائد  
 کی گئیں۔ تقریر و تحریر کی آزادی سلب کر لی گئی۔ اس طرح کثیر تعداد میں متشددانہ  
 قانون بنائے گئے اور آرڈیننس نافذ کیے گئے۔ میں بلا تردید کہہ سکتا ہوں کہ  
 ہندوستان کے ریاض آئین کے حواشی پر تاج برطانیہ نے ہماری وفاداری کا  
 ثبوت تحریر کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی۔“

(روزنامہ ”انقلاب“ لاہور ۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء)

اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح نے کہا: کہ  
 ”اس آئین کے پردے میں ہم سے دھوکہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے  
 مسلمان اس دستور اساسی کے خلاف علم جہاد بلند کریں گے۔ اگر ہندو نے  
 اس قومی جنگ میں مسلمان کا ساتھ دیا تو بہتر روز مسلمان اکیلا ہی اس راہ پر  
 کامزن ہوگا۔“

کانگریس کو دیگر اقوام کی کوئی پرواہ نہیں لیکن مسلمانوں کا تعاون حاصل  
 کیے بغیر کانگریس کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر کانگریس اپنی اس پالیسی کے  
 پیش نظر چاہتی ہے کہ ملک میں برطانوی حکومت کو دوام حاصل ہو تو اسے  
 یہ نظریہ مبارک ہو۔ مسلمان اپنا فرض ادا کریں گے۔“

مسلم لیگ کے اس اجلاس میں مسٹر محمد علی جناح کے دہلی والے اختیارات کی تصدیق

کردی گئی کہ وہ کم از کم پینتیس آدمیوں کا ایک مسلم پارلیمنٹری بورڈ بنائیں جو ملک بھر میں انتخابات کی تیاریاں کرے۔ اس اجلاس میں ترقی پسند جماعتوں کی آمد اور شمولیت کے باعث کوئی زمیندار اور تعلقہ دار شریک نہیں ہوا۔ اس اجلاس میں تو بڑا زیادہ لیاقت علی خاں کو مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اگرچہ اس عہدے کیلئے راجہ غضنفر علی بھی امیدوار تھے لیکن مسٹر محمد علی جناح نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا۔

دیگر فیصلوں کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ ۲۶ اپریل تک مسٹر جناح تمام صوبوں کے رہنماؤں سے رابطہ پیدا کریں۔

یونینسٹ پارٹی | بمبئی مسلم لیگ کے اجلاس میں جو کچھ کہا گیا اس کے فوراً بعد ڈاکٹر رضیاء الدین احمد، مسٹر محمد یعقوب اور مسٹر عبداللہ دارون مسٹر جناح سے الگ ہو گئے۔ یہ اسمبلی میں ان کے ہمنوا تھے۔ سر وزیر حسن اور مسٹر محمد علی جناح نے جو تقریریں کیں، ٹوٹی مسلمان ان کا متحمل نہیں تھا۔ ویسے بھی مسلم لیگ کی تاریخ میں یہ پہلا اجلاس تھا جس میں برطانوی حکومت کو اپنے خلاف باتیں سننا پڑیں۔ ورنہ آج تک یہ جماعت جی حضور یوں کا گروہ چلی آرہی تھی اس اجلاس کے بعد رجعت پسند گروہ نے مسلم لیگ سے الگ ہو کر یونینسٹ پارٹی کی طرز پر اپنے اپنے گروہ منظم کیے۔ مثلاً مسٹر عبدالقیوم نے شمال مغربی سرحدی صوبہ میں فریئر یونائیٹڈ پارٹی بنائی۔ سندھ میں مسٹر عبداللہ دارون نے سندھ یونائیٹڈ فرنٹ قائم کیا اور یوپی میں ایگریکلچر پارٹی بنائی۔ اس کے رہنما نواب چغتاری تھے۔

مشترک اپیل | بمبئی مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارتی تقریر کے بعد آل انڈیا کانگریس کے صدر راجندر پرشاد اور مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کے دستخطوں سے ملک کی مجوزہ سیاسی جماعتوں کے نام ایک اپیل شائع ہوئی، جس میں ہندوستان کی آزادی کے پرامن اور آئینی جدوجہد کرنے پر رائے معلوم کرنی چاہی۔ اس پر کانگریس کے صدر راجندر پرشاد نے صدر مسلم لیگ کو ایک خط لکھا، جس کا متن یونائیٹڈ پریس کے ذریعے چودہ اپریل کے اخبارات میں شائع ہوئی۔

”ڈیر جناح! تمام مختلف فیہ مسائل کا حل سوچنے کے

لیے کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد ہونا چاہیے۔ خواہ ان مسائل کا تعلق آئین سازی سے ہو یا اس کے ماسواً اس خط میں صدر کانگریس نے فرقہ وارانہ فیصلہ اور مخلوط انتخاب کی پیشکش بھی کی۔

یونائیٹڈ پریس نے دوسری اطلاع دی۔

”سٹر جناح نے راجندر پرشاد کی اس تجویز سے اتفاق کیا ہے کہ تمام مسائل کے حل کے لیے کانگریس سے اتحاد عمل ہونا چاہیے“

(روزنامہ انقلاب ۱۴- اپریل ۱۹۳۶ء)

کانگریس کا اجلاس | اسی روز (۱۴- اپریل) آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ (راجندر پرشاد کی بیماری کے باعث) اجلاس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے کی۔ صدر اجلاس نے برطانوی حکومت کو ہندوستان سے فوراً نکل جانے کو کہا۔ نیز ہندوستان کے باہمی اختلاف اور تقربات پر اظہارِ افسوس کیا۔

اس اجلاس میں کونسلوں کے داخلے کی حمایت کی گئی۔ لیکن وزارتیں قبول کرنے کی مخالفت کی گئی اور ساتھ ہی کمیونل ایوارڈ کے اصولوں کی مخالفت بھی کی گئی۔

مفضل حسین کی تقریر | ۱۹- اپریل کو یونینسٹ پارٹی کے دفتر کی افتتاحی تقریب جناب شہنواز خاں وائس ممدوٹ کی کوٹھی میں منعقد ہوئی، میں تقریر کرتے ہوئے پارٹی لیڈر مفضل حسین نے کہا:

”اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم آئندہ اصلاحات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ کچھ عرصہ کے لیے برطانوی حکومت نے ایک آخری فیصلہ دیا ہے۔ ہمیں اس کو بہ طور مان لینا چاہیے۔ اگرچہ کوئی ہندوستانی اس سے مطمئن نہیں تاہم ہماری کوشش درجہ نوآبادیات حاصل کرنے کے لیے جاری رہنی چاہیے“

اس افتتاحی تقریب میں حسب ذیل افراد شریک تھے۔

خان مظفر خاں۔ سر فرید خاں نون۔ چودھری سر چھوٹو رام۔ بیگم سر شہنواز خاں بہادر  
احمد یار خاں دو تانہ۔ ڈاکٹر محمد عالم ایڈووکیٹ۔ غلام جیلانی صدر مجلس اتحاد ملت۔ چودھری منگھو رام

صدر دھرم منڈل جالندھر۔ سرسند سنگھ مجھیٹہ۔ سردار اجمل سنگھ، راستے بہادر مکنند لال پوری۔  
 مسٹر مہنگت رام پوری پیرسٹر میاں عبدالحئی ایڈووکیٹ لدھیانہ، ملک زمان مہدی خاں۔ میاں  
 عبدالحزیز ایڈووکیٹ لاہور۔ راستے بہادر رام جوایا مل کپور صدر لاہور ہندو سبھا۔ خواجہ فیروز الدین احمد  
 میر مقبول احمد۔ نواب خضر حیات ٹوانہ۔ چودھری سر شہاب الدین، خاں بہادر حبیب اللہ۔  
 نوابزادہ نور شید علی خاں۔ مسٹر محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور۔ مولانا سید حبیب مدیر روزنامہ  
 "سیاست" لاہور۔ مولانا عبدالمجید ساک۔ اور مولانا غلام رسول ہر مدیران روزنامہ انقلاب لاہور۔  
 (۲۰۔ اپریل۔ روزنامہ انقلاب لاہور)

دہلی ۲۔ اپریل کا اجلاس بمبئی ۱۰۔ اپریل کا اجلاس  
 ان کے بعد یوپی، پنجاب، سندھ اور شمال مغربی

### احرار اور دیگر رہنماؤں میں بات چیت

صوبہ سرحد میں سرکار پرست افراد کا اتحاد اور مسلم لیگ کی دعوت پر حریت پسندوں کا اجتماع  
 حالات کی واضح غمازی کر رہے ہیں کہ نئی اصلاحات کے تحت ہونے والے انتخابات اپنے  
 اندر کس قدر اہمیت رکھتے ہیں اور ان حالات میں ہندوستان کس تازک موڑ پر آن پہنچا ہے۔  
 شہید گنج تحریک کو جنم دینے والا عناصر کس بری طرح اپنے موقف سے انحراف کر رہا  
 ہے۔ گو مجلس احوار ایسی فعال جماعت پر یہ تحریک اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہ سکی۔ اسے وقتی  
 طور پر منزل سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی، تاہم شہید گنج کا ملکہ انہی لوگوں کے سرسٹھی ڈال  
 کر رہ گیا، جنہوں نے یہ خاک مجلس احوار کے لیے اڑائی تھی۔

احرار ایک واضح نصب العین لیے ہوئے عارضی رکاوٹوں کو پرکاش کے برابر جان کر اپنا  
 سفر جاری کیے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ اور جمعیتہ علماء ہند کے رہنماؤں سے احوار کی بات چیت  
 اندر خانے چل رہی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کی میٹنگ کے بعد احوار رہنما راہبہ غضنفر علی اور  
 متین چودھری سے دہلی میں ملے۔ اس ملاقات کے بعد ۲۴۔ اپریل کو مسٹر محمد علی جناح نے احوار  
 رہنماؤں کو مسلم لیڈوں کے اجلاس میں شمولیت کے لیے ۲۶۔ اپریل کو دہلی آنے کی دعوت دی۔  
 اس سے پیشتر ۶۔ فروری کو لاہور میں مسٹر جناح احوار رہنماؤں سے مل چکے تھے۔ مولانا  
 حبیب الرحمن، مولانا منظر علی انظر اور چودھری افضل حق نے مسلم لیگ کے صدر پر اپنا موقف



واضح کرتے ہوئے کہا:

” ہم آپ سے ہم آہنگ ہیں اور آپ کے ساتھ مل کر رحمت پسند پارٹی کے مقابل ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن اس شرط پر کہ آپ مرزائیوں کو مسلم لیگ سے باہر رکھیں۔“

مسٹر محمد علی جناح نے احوار رہنماؤں کی قدر کرتے ہوئے ان کی یہ شرط مان لی، مگر ساتھ ہی کہا اگر آپ لوگ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو مرزائی آپ سے آپ بھاگ جائیں گے۔ مندرجہ بالا خبر ایک نامہ نگار کی اطلاع پر ہے جو مراسلے کی صورت میں ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء کے سرروزہ ”الجمعیۃ“ دہلی میں شائع ہوا۔

نامہ نگار نے آخر میں لکھا:

” اگر ایسا ہو جائے تو پنجاب میں مسلمانوں کی ایک منظم جماعت سر فضل حسین اور سر سکندر حیات کے مقابل تیار ہو سکتی ہے اور اس کا اثر ہندوستان کے دیگر صوبوں پر بھی پڑ سکتا ہے۔“

ان دنوں سر فضل حسین اور مرزا بشیر الدین محمود کی ملاقات کے عام چرچے تھے۔ جس سے مسلمانوں میں بے چینی پائی جاتی تھی۔

۲۳ اپریل کو مجلس احوار کا وفد شاہ حجاز سلطان عبدالعزیز سے مل کر احرار وفد کی واپسی کراچی واپس پہنچا۔ بند گاہ پر کثیر حلقہ احباب نے ان کا استقبال کیا۔ نیز دوسرے روز لاہور پہنچنے پر وفد کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ان سے ایک ہفتہ بعد احوار کے مقابل وفد کے ارکان بھی کراچی پہنچ گئے۔ ان کے پاس شاہ سعود کے تحفے موجود تھے۔ جن میں گھڑیاں، رومال اور شاہی چوغے شامل تھے۔ رمال کس قدر تھے اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ بہر حال یہ لوگ اپنے دنیاوی مقصد میں کامیاب ہوئے۔ جبکہ احوار وفد کے ارکان کو قریباً دو برس لگ گئے کہ وہ اپنا قرض دوستوں کو چکاتے رہے، جو چھ کرنے اور جماعتی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے حجاز لے کر گئے تھے۔

۲۶- اپریل: تاریخ میں بعض دن مؤرخ کے لیے متابع عزیز ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہی

دست پھر آئندہ نسلوں کے لیے عنوانِ زندگی قرار دی جاتی ہے۔ تو میں اسی سنگ میل کی نشاندہی پر اپنی منزل تلاش کرتی ہیں۔ البتہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے راہرو انسانوں کے ڈگمگاتے قدم ان لکیروں کو مٹا دیتے ہیں۔ پھر صدیوں بعد شہدائے کا خون ان نشانات کو اجاگر کرتا ہے جو قافلہ ہائے زلیلت ان راہوں پر چھوڑ گیا تھا۔

۲۶ اپریل ۱۹۳۹ء تاریخ برصغیر میں مسلمانانِ ہند کے لیے نایاب دن تھا۔ جب کانگریس کے مقابل ملت اسلامیہ کا فعال گروہ دہلی میں جمع ہوا۔ اگر صیاد کی نظر اس نوموہود پودے کو کھانہ جاتی اور بہار آنے سے پیشتر اس کی پھول پتیاں بکھیر نہ دی جاتیں تو ممکن ہے یہی پودا تن اور درخت بن کر برصغیر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا باعث ہوتا۔

ہائے فلک نے تاک کر توڑا اسے  
میں نے جس ڈالی کو تاراً آشیانے کے لیے

مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) کی دعوت پر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے قریباً سبھی رہنما ۲۶ اپریل کو امپریل ہوٹل دہلی میں ان سے ملے اور یہ ملاقاتیں ۲۸ اپریل تک جاری رہیں۔ جمعیتہ علماء ہند کے رہنما مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید مسلم لیگ کے صدر سے ملے۔ اسی شام احوار رہنما مولانا حبیب الرحمن اور چودھری افضل حق نے ان سے ملاقات کی۔ اس وقت سرفیروز خاں نون قائد اعظم کے پاس بیٹھے تھے انہوں نے طنزاً احوار رہنماؤں سے کہا: "جناح صاحب کو کامیاب کرائیں"۔ اس پر مسٹر جناح نے مولانا حبیب الرحمن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا: "اگر آپ مسلم لیگ میں آجائیں تو میں ان سرکار پرستوں کو سزا دے سکتا ہوں"۔ مولانا حبیب الرحمن نے فوراً کہا: "مسٹر جناح! آپ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوں گے اور جلد ہمارا ساتھ چھوڑ جائیں گے"۔ سیاست میں کسی پر سولہ آنے یقین نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس سے پیشتر دوسری جماعتوں کے رہنما بھی ان سے مل چکے تھے۔ آئندہ ایکشن اور ملت اسلامیہ کی فلاح اس تمام گفتگو کا محور تھا۔

مولانا احمد سعید ناظم جمعیتہ علماء ہند شرط طور پر مسٹر جناح کے ساتھ متفق ہو گئے۔

لیکن مولانا حبیب الرحمن نے مسلم لیگ کے مشترک محاذ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ تاہم لاہور آنے تک بات حتمی فیصلے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

اس کارروائی سے فارغ ہو کر قائد اعظم ۲۹- اپریل کو تیسری مرتبہ لاہور آئے۔ ان دنوں آپ نواب احمد یار خاں دولت نذ کی کوٹھی پر ٹھہرے۔ اب کی بار شہید گتچ کے لیے نہیں بلکہ انتخاب کے سلسلے میں مفضل حسین اور مجلس احرار سے مذاکرات ان کے پروگرام کا اہم جزو تھا۔

قائد اعظم محمد علی جناح کی احوال و سہاؤں سے اس سے پیشتر بھی یاد آ رہی تھی۔ اگر منزل ایک ہو تو راستے کے مسافروں کا کسی نہ کسی موڑ پر مل بیٹھنا غیر ممکن نہیں۔ چنانچہ ماسٹر تاج الدین انصاری سابق صدر مجلس احرار اسلام پاکستان اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں۔

”آج سے تقریباً چالیس برس پہلے کی بات ہے، جب مسلم لیگ کے عظیم رہنما، قائد اعظم محمد علی جناح“ ابھی صرف ”محمد علی جناح“ کے نام سے پکارے

جاتے تھے۔ ان دنوں کانگریس اور مسلم لیگ میں کٹا چھنی یا چیلنجز کی بہت کم گنجائش تھی۔ غالباً ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہونے والا

تھا۔ مسلم لیگ دو متحارب گروہوں میں تقسیم تھی۔ ایک گروپ کی سربراہی مولانا محمد شفیع داؤدی مرحوم کر رہے تھے۔ دوسرا مضبوط گروپ مسٹر جناح کا تھا۔

مولانا محمد شفیع داؤدی بڑی شہرت سے مسٹر جناح کی مخالفت پر کمر بستہ تھے۔ نظر نظر مولانا شفیع داؤدی کا پتہ بھاری نظر آ رہا تھا۔ پراپا گنڈے کے زور پر

وہ مسٹر جناح کو شکست دینے کے لیے جگامہ آرائی پر تیل چکے تھے۔ کلکتہ کے بعض شوریدہ سر مولانا شفیع داؤدی کی حمایت میں پستولیں لیے پھرتے

تھے۔ مسٹر جناح آئین شکنی اور منگامہ آرائی سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ اس صورت حال سے وہ کسی قدر گھبرائے ہوئے تھے۔ ہم اس اجلاس میں

مسلم لیگ کے کونسلر کی حیثیت سے موجود تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہم میں سے بعض اراکین کی فیس بھی آخری وقت میں ادا کی گئی تھی۔ رسید کے

طو پر ہمیں بارہ بارہ روپے میں سینے پر آویزاں کرنے کے لیے خوبصورت بیج

دیے گئے تھے۔ یہی بیج کونسلری کی رسید اور گیٹ پاس کا کام دیتے تھے۔  
مولانا شفیع داؤدی کا گروپ سرمایہ پرست اور ٹوڈی قسم کے لوگوں پر مشتمل  
تھا۔ ہماری ہمدردیاں مسٹر جناح کے ساتھ تھیں۔ مسٹر جناح کانگریس سے باہر  
آکر بھی ذہنی کانگریسی تھے۔ بہر حال ہمارا دلی لگاؤ انہی کے ساتھ تھا۔

انتظامات کی ذمہ داری ہندوستان کے سابق وزیر خارجہ بمبئی والے عبدالکریم  
چھاگلا کے سپرد تھی۔ مسٹر چھاگلا ان دنوں مسٹر جناح کے دست راست تھے۔  
وہ خوبصورت ادبے پتلے اور شرمیلے سے نوجوان تھے۔ مسٹر جناح کو ان پر بڑا  
اعتماد تھا۔ اسی اعتماد کے صدقے میں مسٹر چھاگلا پروان پڑھے۔ ہم نے  
مسٹر جناح سے درخواست کی کہ وہ مسٹر چھاگلا سے کہہ کر گیٹ کی ذمہ داری ہمارے  
آدمیوں کے سپرد کر دیں۔ ہمارے پنجابی ساتھی گیٹ کی پوری ذمہ داری سنبھال  
لیں گے، جو ہنگامہ ہوتا ہے گیٹ ہی پر ہو جائے گا۔ ہم بہر حال اس سے  
بخوبی نپٹ لیں گے اور ووٹنگ کے وقت ہم آپ کے پاس اندر پہنچ جائیں  
گے۔ مسٹر جناح نے ہماری خواہش کے مطابق گیٹ کی پوری ذمہ داری ہمیں  
سونپ دی۔ خواجہ عبدالرحیم صاحب، ان کے امرتسری نوجوان ساتھی اور دوسرے  
پنجابی نوجوانوں نے بحیثیت رضا کار گیٹ کا انتظام مضبوطی سے سنبھال لیا۔  
مسٹر جناح ہمارے انتظام سے بالکل مطمئن ہو گئے۔ دوسرے دن اجلاس  
شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پیشتر ہی کراہ پر لائے ہوئے فریق مخالف کے  
غڈا عناصر ٹولیاں بنا کر گیٹ کے گرد گھومنے پھرنے لگے۔ مگر جب ان لوگوں نے  
پنجابی نوجوانوں کو گیٹ پر پراجائے اور چاق و چوبند کھڑے دیکھا تو وہ بے حوصلہ  
ہو کر پیچھے ہٹنے لگے اور گیٹ سے دور جا کھڑے ہوئے۔ اجلاس شروع ہونے  
سے قبل مسٹر جناح نے صدر جلسہ کی حیثیت سے اعلان کیا کہ جن لوگوں کے  
پاس خانلے کے نشان یعنی بیج نہیں ہیں وہ حضرات باہر تشریف لے جائیں۔  
مگر حاضر اراکین میں سے کوئی بھی بیج کے بغیر نہیں تھا اتنے میں مولانا داؤدی

گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہم سب گیٹ کو مضبوط اور بہادر ساتھیوں کے حوالے کر کے مولانا داؤدی کے ساتھ ہی اندر پنڈال کی طرف بڑھے! بھی ہم کرسیوں سے دور ہی تھے کہ اندر کے رضا کار ہم سب کو روک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ چیک کر کے آگے جانے کی اجازت دیتے تھے۔ یہ ضابطے کی بات تھی، ہونہی مولانا داؤدی آگے بڑھ کر ایک رضا کار کے قریب پہنچے، رضا کار نے انہیں روک لیا اور کہا کہ آپ کا بیج کہاں ہے؟ اگر جیب میں ہے تو نکال کر سینے پر لگا لیجئے تاکہ چکنیک مین آسانی رہے۔ مولانا موصوف نے چرائی سے اپنے سینے کی جانب نگاہ ڈالی تو بیج غائب تھا۔ ”ارے گیٹ پر آیا ہوں تو بیج میرے سینے پر موجود تھا، خدا جانے گیٹ پر گویا اندر آ کر گر گیا“ رضا کار نے مولانا سے ادب کے ساتھ کہا آئیے مولانا! گیٹ پر چل کر معلوم کر لیتے ہیں رضا کار مولانا کو اپنے ہمراہ لے کر پنڈال سے باہر گیٹ پر چلا گیا۔ دس منٹ بعد گیٹ پر ہتھیار ہوا۔ مولانا اور ان کے باہر والے ساتھی ہمارے رضا کاروں سے الجھ پڑے۔ مگر ضابطے کے مطابق انہیں بیج کے بغیر اندر آنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اندر آ بھی جاتے تو ان کے ہم خیال ووٹ ہی کتنے تھے؛ اس طرح سرکاری ٹولی اور ان کے لگے بندھے مسٹر جناح سے شکست کھا گئے۔ چند ووٹ تھے جو مسٹر جناح کے خلاف آئے۔ باقی اراکین کی بہت بڑی اکثریت کے ووٹ مسٹر جناح کے حق میں تھے۔ ہماری اور قائد اعظم کی یاد اللہ اس وقت سے تھی جبکہ آج کے اکثر لیگی رہنما اس دنیا میں تشریف بھی نہ لائے تھے۔ مگر — اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ سیاسی میدان میں ہماری اور ان کی راہیں جدا جدا ہو گئیں، اس کے باوجود فریقین نے بارہا کوشش کی کہ بیج کا پردہ ہٹے تو باہمی مشورہ اور اشتراک سے مسلمان قوم کی برتری کے لیے متحدہ محاذ قائم کیا جائے! اس سلسلہ میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں مگر بے نتیجہ۔

۱۹۳۶ء میں پنجاب کی مسلم لیگ پر محدود سے چند سرکار پرستوں کا قبضہ

تھا۔ آزاد خیال لوگ خال خال نظر آتے تھے۔ ساری کارروائی کاغذی ہوتی تھی۔ مسٹر جناح پنجاب میں ایسی جاندار لیگ بنانا چاہتے تھے جو سرکاری اثرات سے پاک ہو، مگر یہاں کا ٹوڈی طبقہ اوپر کے اشارے پر حجب چاہتا لیگ میں داخل ہو کر بیان بازی کر لیتا اور حجب اشارہ ملتا خاموش ہو کر بیٹھ جاتا۔ سر فضل حسین حکومت برطانیہ کے قابل اعتماد ذہین اور طاقتور مرے تھے۔ ان دنوں سر فضل حسین کا طوطی بولتا تھا۔ پنجاب پر دو طاقتوں کا قبضہ تھا۔ عوام کی نمائندگی میں اجڑا اور سرکاری نمائندگی میں سر فضل حسین۔ اجڑا رہنماؤں سے سر فضل حسین کے تعلقات میں بظاہر کوئی کشیدگی نہ تھی۔ فضل حسین بے حد ذہین سیاسی شاطر اور مستقیم مزاج انسان تھے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا مسٹر جناح پنجاب مسلم لیگ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ وہ مکر پرستوں سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ مگر انہیں عوام تک رسائی حاصل نہ تھی۔ وہ اس ارادہ سے پنجاب میں تشریف لائے تاکہ آئندہ الیکشن کے لیے میدان درست کیا جائے۔ وہ سر فضل حسین سے بھی مسلم لیگ کے بارے میں مبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے اور سر فضل حسین بھی مسٹر جناح سے ملاقات کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسٹر جناح کو پنجاب کے پارلیکس میں داخل ہونے سے صحتی التوسع روکا جائے چنانچہ ان دنوں بڑے آدمیوں نے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں سر فضل حسین نے نہایت جیاری سے کام لیتے ہوئے ملاقات کے کمرے میں پردے کے پیچھے دو برطانوی جاسوسوں کو بٹھا دیا تاکہ وہ بھی مسٹر جناح کے خیالات اپنے کانوں سے سن لیں۔ گفتگو کا پچوڑ یہ تھا کہ مسٹر جناح بہر حال مسلم لیگ کو الیکشن کے میدان میں اتاریں گے خواہ انہیں کانگریس سے کوئی سمجھوتہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ سر فضل حسین نے مسٹر جناح کو بے حوصلہ، دل برداشتہ اور بایوس کرنے کی انتہائی کوشش کی اور آخر میں انہیں کہا کہ ”آپ پنجاب میں جلسہ کرنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ جلسہ کامیاب نہ

ہو سکے گا۔ یہاں کون آپ کی بات سُننے گا؟ اور کس نے ساتھ دینا ہے؟

**قائد اعظم کی بے بسی** | ان حالات میں مسٹر محمد علی جناح کے سیاسی مستقبل کا انحصار صرف آزاد خیال مسلمانوں سے وابستہ تھا۔ لیکن رحمت پسند گروہ اور برطانوی ذرائع نے مسلم عوام میں انہیں ہندو کا زر خرید ظاہر کر کے اس قدر رسوا کر دیا تھا کہ جیسے ہی مسٹر جناح نے جمعیتہ علمائے ہند، مجلس احرار اور دیگر آزادی پسند مسلم جماعتوں سے تعاون کی راہیں ہموار کرنا چاہیں، چاروں طرف سے ٹوڈی مسلمان ان پر ٹوٹ پڑے۔ دوسری طرف نیشنلسٹ مسلمانوں نے کانگریس سے ناراض ہو کر مسٹر جناح سے اپنا ناتا جوڑنا چاہا تو کانگریس سمیت سارا ہندو پریس ان کے گلے پڑ گیا۔ چنانچہ اس رٹا کی میں مسٹر جناح پر سب سے بڑا حملہ سر محمد یامین نے ایک پریس بیان کے ذریعے کیا۔

"۲۶-۲۷ اپریل (۱۹۳۶) کو مسٹر جناح نے خود غرض لوگوں کی باتوں میں آن کر چونکہ وہ خود سوائے شہر بمبئی کے دوسرے صوبوں کے اندرونی حالات سے واقف نہیں اور کئی سال انگلستان رہ کر ابھی ڈیڑھ سال ہوا کہ واپس آئے ہیں۔ اس لیے یورپی کے حالات سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ چند سازشی لوگوں کے اس لالچ میں آگئے کہ اگر لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے گئے تو وہ ہندوستان کے سب سے زیادہ زوردار پولیٹیشن ہو جائیں گے۔

درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں جن کا مسلمانوں میں کوئی اقتدار باقی نہیں ہے اور ساری پبلک جانتی ہے کہ یہ کانگریس کے پھٹو اور کانگریس کے آلا کار ہیں۔ اگرچہ بھٹی لے ہیں، لیکن بھٹی کی کھال پہن کر پبلک کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور مسٹر جناح کی شخصیت سے لیگ کے نام سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اگرچہ سالہا سال سے لیگ کے مخالف رہے ہیں۔

مسٹر جناح نے ان کی باتوں میں آن کر یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک ہی اصول پر تمام صوبوں میں لیگت الیکشن لڑے۔ چونکہ میں صوبائی اسمبلی سے تعلق نہیں رکھتا تھا اور گذشتہ سال ہی کانگریس

کو شکست فاش دے چکا تھا۔ اس لیے میں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ مگر اس کو یورپی کے لیے سخت مضر سمجھا کہ اس سے مسلمان زمینداروں کی وزارت ختم ہو جائے گی اور لیگ کی وزارت کبھی نہ بنے گی۔“

”نامہ اعمال“ مصنفہ سریا میں ص ۶۳۱-۶۳۲

سر محمد یعقوب نے بھی پریس بیان میں کہا:

دہلی اجلاس کے سلسلے میں سر محمد یعقوب نے جناح پر سخت نکتہ چینی کرتے

ہوئے کہا۔

”جناح ان لوگوں کو ساتھ لے کر نکلنا چاہتے ہیں، جو ان سے راستے میں اتفاق نہیں کرتے۔ مثلاً مسلم لیگ کا نصب العین آئینی طریق پر درجہ نوآبادیات حاصل کرنا ہے۔ جبکہ احوار اور جمعیتہ مکمل آزادی کی دعویدار ہیں۔ ان حالات میں کون سا سبول میرج مطلوب ہے، جو انہیں اور مسٹر جناح کو متحد کر سکتا ہے۔ مسٹر جناح خواب دیکھ رہے ہیں کہ ان کا پلان کامیاب ہوگا حالانکہ اس خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ قبل از انتخابات ہی یہ عمارت دھڑام سے گر جائے۔“

(سہ روزہ ”الجمعیۃ دہلی“ - یکم مئی ۱۹۳۶)

راجہ غضنفر علی نے بھی انہی دنوں ایک نئی پارٹی کا اعلان کیا۔

ان دنوں دہلی اور پنجاب کے سیاسی حلقوں میں ایک افواہ عام تھی کہ راجہ غضنفر علی نے پنجاب میں نئی سیاسی جماعت بنائی ہے، جس کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

”پنجاب میں محض اقتصادیات کی بنا پر حکومت قائم نہیں ہو سکتی، جب

یک اسے نیشنل لائمنوں پر نہ چلایا جائے گا، اس کا چلنا ممکن نہیں۔ راجہ

صاحب کی رائے میں سکوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترک پارٹی ہی

وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اور یہی پارٹی پنجاب میں کامیاب حکومت کر سکتی

ہے۔ روزنامہ ”انقلاب“ لاہور ۲۸- اپریل ۱۹۳۶ء



یوپی کے زمیندار اور تعلقہ دار قسم کے لوگ پیشتر سے الگ ہو چکے ہیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی خراج سے ناراض تھا۔ سندھ کے وڈیر سے اپنا ڈیرہ الگ بنائے بیٹھے تھے۔ پنجاب میں مرفضل حسین خراج کے قدم جمنے نہیں دینا چاہتے تھے، اس لیے کسی اور بے بسی کے عالم میں مجلس احرار کے رہنماؤں نے قائد اعظم کا پنجاب میں استقبال کیا۔

انہی دنوں امرتسر میں پنجاب پروڈنشل احرار کانفرنس کا اجلاس ہونے لگا۔ احرار پر نیا عتاب والا تھا۔ صوبائی سطح پر اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ مرفضل حسین نے احرار رہنماؤں کو قائد اعظم کو خوش آمدید کہنے کی سزا دینا چاہی۔

۸۔ مئی (۱۹۳۶) کو کانفرنس کے منتخب صدر چودھری افضل حق کا جلوس امرتسر کے بازاروں سے گزر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ کٹڑہ گرم سنگھ (قلعہ بھنگیاں) میں پہنچا تو ایک مکان سے اینٹوں اور پتھروں کے علاوہ گرم تار کول چودھری افضل حق پر پھینکا گیا جس سے ان کے پھرے اور آنکھوں پر اثر پڑا۔ چودھری صاحب کو قریب کے ہسپتال پہنچا دیا گیا مگر اہل جلوس پھر سے ہونے شیر کی طرح اس مکان کی طرف پلے جہاں سے تار کول پھینکا گیا تھا قریب تھا کہ احرار رضا کار اس عمارت کو آگ لگا دیتے جس سے محلے کے باقی مکانوں کو بھی نقصان پہنچتا۔ احرار رہنماؤں نے آگے بڑھ کر حالات کو خواب ہونے سے بچا لیا۔

اس سے ایک ہفتہ پیشتر اسی محلے کے ایک نوجوان محمد رفیق نے احرار رہنما شیخ حسام الدین پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ شیخ صاحب کی بجائے محمد حسین ایک احرار رضا کار شہید ہو گیا۔

گو اس حادثہ کی وجہ سے اس علاقے کی فضا احرار کے لیے سازگار نہیں تھی مگر

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے

اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

جلوس چار گھنٹے تک محل وقوع پر رکا رہا۔ حملہ آور تماش کے باوجود نمل سکے۔

اہل محلہ نے اس ذمہ داری سے اپنے کو مبرا قرار دیا۔ یہاں تک کہ صاحب مکان بھی

رزہ براندام تھا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ جیسے جیسے چراغوں کی روشنی تیز ہوتی گئی۔ خونِ احرار کی حرارت میں اسی تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔

ان دنوں پنجاب جیوشِ احرار کی کمان صاحبزادہ سید فیض الحسن سجاد نشین آلوہار کے سپرد تھی۔ وہ برہنہ تلوار لیے موٹر کار کی چھت پر کھڑے احرار رضا کاروں کو احکام دے رہے تھے۔ سارا علاقہ احرار رضا کاروں کے غصے کی زد میں تھا۔ اگر وہ چاہتے تو مکان اور مکین محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ اتنے میں اطلاع آئی کہ چودھری افضل حق ہر طرح کے خطرے سے باہر ہیں۔ آنکھوں پر ذرا افیکٹ ہوا ہے اگر اتنا نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چودھری صاحب خود چل کر اپنی کار میں آن بیٹھے اور جلوں آگے روانہ ہوا۔

اس حادثہ کے باعث کانفرنس کا پہلا اجلاس ایک گھنٹہ تاخیر سے شروع ہوا۔ اپنی علالت کے باعث چودھری صاحب کی بجائے خطبہ صدارت شیخ حسام الدین نے پڑھا۔ جو حسب ذیل تھا۔

” عزیز نوجوانو اور احرار کارکنو!

احرار آزادی کے علمبردار ہیں، اور عالم اسلام کی ترقی کے خواہاں۔ اس بنا پر مہمانِ وطن کے لیے زندگی کی روح اور دشمنانِ دین کی نظروں میں خار کی طرح ہیں۔ احرار جمہوری نظام کے قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک باہمی مشاورت، ترقی کی بہترین ضمانت ہے۔ ہم بات بات میں باہم مشورہ کرتے ہیں اور پھر جماعتی فیصلے پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ ہم میں برسوں سے برادرانہ روابط قائم ہیں۔ اس لیے مخالفت کے طوفانوں میں چٹان کی طرح قائم رہتے ہیں۔

مجلس احرار غریبوں کی جماعت ہے اور اس کے لیے خدا خود میر سلمان بنے غیر سپردِ نکتہ چین ہماری حوصلہ مند یوں کا طنزاً ذکر کرتے ہیں۔ وہ ایسا کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ گرس، ناشاپسوار کا پتہ دیتی ہے۔ ہم نے چند سالوں میں ایک مستم بالشان کام کیا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے پوری توقع ہے کہ ملک کی تقدیر میں خوشگوار انقلاب پیدا کرنے میں ہماری قربانی سب سے اہم چیز ہے۔

ہوگی۔ دولت دنیا کی کمی ان لوگوں کی ہمتوں کو کہاں تک پست کر سکتی ہے، جو  
دل و دماغ کی دولت سے مالا مال ہوں۔

مجلس احرار میں خطیب ادیب عالم اور شاعر شامل ہیں۔ اور مسلسل قربانی  
ان کا طرہ امتیاز ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بغیر قربانی کے جذبہ کے علم اور دولت بے جا  
سید ہے۔ ملک کو جو کچھ بھی ملا قربانی سے اور جو کچھ ملے گا وہ بغیر قربانی کے  
نہیں ملے گا۔ یاد رہے کہ اطمینان کا باعث نہیں کہ ملکی قربانیوں کے  
سلسلے میں ہمارا حصہ کسی سے کم نہیں۔ انشاء اللہ آئندہ جنگ آزادی میں ہم  
بے پناہ طاقت کے ساتھ دوسری حریت پسند جماعتوں کے دوش بدوش چلیں گے۔  
کانگریس ملک میں ایشیا پیشہ لوگوں کی سب سے بڑی جماعت ہے۔  
مجلس احرار کے اکثر کارکنوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد کی ہے۔  
ہم ناپٹے پٹیٹ فارم سے کانگریس کی مذمت کی کبھی اجازت نہیں دی بلکہ  
جہاں تک ہو سکا کانگریس کے وقار کو صدمہ پہنچانے سے بچایا۔ بحالات موجودہ  
ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی ایسا پروگرام وضع کیا جائے جو دونوں جماعتوں  
ہندو اور مسلمان کے لیے مفید ہو۔ جس پر کم سے کم اختلاف اور زیادہ سے  
زیادہ اتفاق ہو سکے۔

پنجاب میں سوشلسٹ پارٹی علیحدہ گروپ کی حیثیت سے قائم ہے  
یہ امر موجب اطمینان ہے کہ اس نے اب آزاد خیال جماعتوں کے ساتھ انتخاب  
میں تعاون کا اعلان کر دیا ہے۔ اس طرح سے مدعیان سرکار کا زور بھی کمزور  
ہو جائے گا۔ مجھے کامل امید ہے کہ آئندہ پنجاب میں رحبت پسندوں کا  
مضبوط قلعہ نہیں بنے گا بلکہ آزاد خیال لوگوں کا اس پر قبضہ ہو جائے گا۔  
اگرچہ مجلس احرار کے عزائم کانگریس کے زیادہ قریب ہیں، لیکن سلم بیگ  
کے نصب العین اور احرار کے نصب العین میں نمایاں فرق ہے۔ ان مشرکان  
کے موجودہ طرز عمل سے ہم میں سے بعض زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔

بمستی لیگ کا ریزولیشن کانگریس اور احرار کے قریب ہے۔ کانگریس احرار اور مسلم لیگ کے نزدیک آئین نو کی سکیم بعض لحاظ سے ناقابل عمل ہے۔ یہ اتحاد خیال اور خود سطر جناح کے افکار اس قابل ضرور ہیں کہ مجلس احرار اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ اس طرح ممکن ہے کہ نسل کے کاروبار کے لیے ہم مل کر کوئی متحدہ محاذ قائم کر سکیں اور آئین نو میں حسب منشا ترامیم کرا سکیں تاکہ ملک کی آزادی قریب اور افلاس دور ہو سکے۔

مجلس احرار نے سیالکوٹ کے تاریخی اجلاس میں ترقی پسند جماعتوں کو متحد ہو کر رحمت پسندوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس ریزولیشن کے مطابق مجلس احرار نے عام ترقی پسند دوستوں اور جماعتوں سے خط و کتابت بھی کی۔ ہر طرف سے جوابات موصولہ افزا تھے۔ مجھے خدا کے فضل سے کامل یقین ہے کہ طول و عرض ملک میں آئین نو پر آزاد طبقہ کا قبضہ ہو جائے گا۔ میں تمام دوستوں سے جو ملک کی آزادی کے لیے بھی تڑپ رکھتے ہیں، درخواست کرتا ہوں کہ اس زریں موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ان لوگوں کو جو رحمت پسند ہیں موقع نہ دیں کہ وہ ہمارے چھوٹے چھوٹے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر صوبجاتی اسمبلیوں میں چلے جائیں اور سرکارِ برطانیہ کے حسب منشا قوانین بنا کر ملک کے مفاد کو تباہ کر دیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ایک سیٹ بھی چھوڑنا بہت بڑا قومی گناہ ہوگا۔ ہم پورے سولہ برس سے کونسلوں کو ایسے لوگوں پر چھوڑ کر خود مصیبتوں میں مبتلا رہے ہیں۔ انہی رحمت پسندوں کے ذریعے حکومت نے بدترین قوانین پاس کرائے اور ملک کے آزاد خیال لوگوں کو جیلوں میں ٹھونسنا۔

یہی رحمت پسند عناصر ملک کی ترقی کے راستے میں شدید روڑے بنے رہے۔ آج پھر کیل کانٹے سے یس ہو کر قربانی کرنے والی جماعتوں کے حاصل کیے ہوئے حقوق پر بغیر شکریے کے قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں ان

کی خواہش یہ ہے کہ ماضی کی طرح مستقبل بھی انہی کے ہاتھ میں رہے اور آزادی طلب لوگ بدستور جیلوں میں نیم لسمبل کا تماشہ دکھائیں۔ ان کے ہاتھ قدرت کی ہے۔ لیکن اب کی بار قدرت کو کچھ اور منظور ہے! اسمبلی میں تری پہد جماعتوں کے داخل ہونے کے عزائم ان کی آرزوں کو خاک میں ملائے کا باعث ہو رہے ہیں۔ اس لیے وہ غریبوں کو ستر باغ دکھانے میں مصروف ہیں غریب پر ہی کا وہ ہزار یقین دلائیں لوگ ان کے دعوے کو دوٹ لینے کی ترغیب ہی سمجھیں گے۔ جھوٹوں میں رہنے والوں کے لیے محلات کے خواب روایتی طور پر خوشگوار ہوتے ہیں، لیکن محلات میں بسنے والوں کے لیے جھوٹوں کا تصور خواب پریشیاں کے سوا کچھ اور نہیں۔

یوں تو محنت کو سراہنے سے ہمیشہ اور ہر جگہ شکایت رہی ہے۔ لیکن ہندوستان کی کیفیت اور بھی بدتر ہے۔ یہاں کے اکثر امرار دنیا سے غیر حاضر اور بعض حال مست فقیر کی طرح اپنے عشق کی دنیا آباد کیے بیٹھے ہیں۔ عوام الناس غیر بہادر دستری حکومت کے باعث جہالت اور افلاس کے عمیق گڑھے میں پڑے ہیں۔ حکومت اور امرار دونوں عوام کے مصائب سے بے پرواہ ہیں۔

غلامی بے شک ملک اور قوم کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے غلام ملک میں جہالت جب افلاس کے ساتھ شامل ہو جائے تو بد نصیبی کی انتہا ہو جاتی ہے۔ قوم احساس سے غاری اور نفع، نقصان سمجھنے سے معذور ہو جاتی ہے۔ انسان بدتر از حیوان ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو! ملک میں معزز اور محترم وہ جماعت ہے جو غلامی کی زنجیروں کو توڑے اور انہائے وطن کو افلاس اور جہالت کے گڑھے سے نکالے۔

بے شک مجلس احوار کے کارکن ملک کے بے باک سپاہی ہیں لیکن آزادی کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ابھی بھی جدوجہد کی ضرورت

ہے۔ اس کٹھن کام میں دماغ کے ساتھ دل کی ساتھ ضروری ہے۔ غلام ہو کر آزاد ہونا، ڈوب کر ابھرنا اور مر کر زندہ ہونا ہے۔ ہتھیار ڈال دینا آسان ہے لیکن ہتھیار اٹھانا مشکل ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ قوم کی مشکلیں ہماری وساطت سے آسان کرے۔ اپنے اردوں کو قومی رکھو۔ ہمتوں کو لپیٹ نہ ہونے دو۔ کم ہمت اور مردہ دلوں کی باتیں نہ سنو۔ ارباب عزم کی کہانیاں پڑھو۔ خدا ہمت میں برکت دے گا۔“

قائد اعظم کی احوار رینہاؤں سے ملاقات

سرفضل حسین سے مایوس ہو کر مسٹر عمر علی خاج

اور رینہاؤں سے ملتے آتے یہ ملاقات

ڈاکٹری عبد القوی لقمان کے مکان (۶۶- میکوڈ روڈ) پر ہوئی۔ رینہاؤں میں چودھری افضل حق اور ڈاکٹر عبد القوی لقمان (جو ان دنوں مرکزی مجلس احوار کے خازن تھے) موجود تھے۔ یہ تمام گفتگو اردو زبان میں ہوئی۔ کہیں کہیں قائد اعظم انگریزی میں گفتگو کرتے۔ مگر عام طور پر ساری باتیں جو ایک گھنٹہ تک ہوتی رہیں اردو میں ہوئیں۔ اس ملاقات میں احوار رینہاؤں نے مسٹر خاج سے ہمہ ردی کا اظہار کیا اور انہیں پنجاب کے مسلم لیگیوں اور سرفضل حسین کی صحیح پوزیشن بتائی۔ نیز انہیں یقین دلایا کہ آپ جلسہ عام میں ضرور تقریر کریں۔ احوار جلسہ کی پوری ذمہ داری لیتے ہیں۔

چنانچہ جلسہ ہوا۔ مسٹر خاج نے دل کھول کر تقریر کی اور احوار رضا کاروں نے اس موقع پر بغیر ردی کے اس جلسے کا انتظام کیا۔

باہم گفتگو میں احوار نے قائد اعظم کو مشورہ دیا کہ،

”آپ مسلم لیگ کو ٹوٹیوں اور سرکار پرست رؤسا کے پنجہ سے نکالیں اور اسے عوامی جماعت بنائیں۔ مسلم لیگ کا موجودہ طبقہ آپ کی بجائے برطانوی اشاروں پر چلتا ہے۔ جب اشارہ ملتا ہے مسلم لیگ زندہ باد کہنے لگتے ہیں، تب مسلم لیگ میں جان پڑ جاتی ہے۔ جب دوسرا اشارہ ملتا ہے، خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور مسلم لیگ کی جان نکل جاتی ہے۔ یہ لوگ مسلم لیگ کے

کے گلے میں چکی کا پاٹ ہیں۔ یہ آپ کو نہیں چلنے دیں گے۔“  
جواب میں مسٹر جناح نے کہا:

”اگر احوار میرا ساتھ دیں تو وہ فضل حسین سے ہلکے لینے کو تیار ہیں۔“  
احوار۔ ”بشرطیکہ آپ مرزائیوں پر مسلم لیگ کے دروازے بند کر دیں۔ نیز ہندوستان  
کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں۔“  
اس پر مسٹر جناح نے کہا کہ اس کا فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کرے گی۔  
میر فضل حسین نے چونکہ ملاقات کے وقت دو انگریز آفیسروں کو پس پردہ چھپا رکھا  
تھا اور مسٹر محمد علی جناح، میر فضل حسین کی اس حرکت سے سخت برہم تھے۔ وہ واقعی سر  
فضل حسین کو مزہ چکھانا چاہتے تھے۔

اس گفتگو میں یہ بات طے پاگئی کہ احوار آئندہ انتخاب میں مسلم لیگ کے سمبھو ہوں گے۔  
یہ فیصلہ ہوتے ہی قائد اعظم چند دن کے لیے سر می نگر چلے گئے۔ مگر میر فضل حسین اور احوار کے  
ابن ایک مستقل یکسر گئی۔ اور آگے چل کر احوار کو جناح کی دوستی بڑی منگنی پڑی خصوصاً  
روزنامہ انقلاب لاہور نے جو یونیٹ پارٹی کا آفیشل آرگن تھا، مجلس احوار کے  
خلاف مسلسل ادارے لکھے۔ نیز قائد اعظم محمد علی جناح کے خلاف ۵ مئی کے آڈیو ریل میں لکھا

”ہماری تمام اطلاعات کا ملخص یہ ہے کہ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی خواہش  
اور آرزوں کے مطابق کام نہیں کیا، بلکہ ہر قدم ہندوؤں کی خواہش کے مطابق  
اٹھایا۔ جس کا اقرار (قبول انقلاب) روزنامہ ٹریبون نے یکم مئی کے مقالہ  
افتتاحیہ میں کیا ہے۔ یعنی انہوں (مسٹر جناح) نے مسلمانوں کو متحد کرنے کی  
کوشش نہیں کی بلکہ ان تمام عناصر کو اکٹھا کیا ہے جو اب تک مختلف وجوہ  
کی بنا پر اتحاد پارٹی سے صلحہ تھے یا اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ یا ان  
مخالفوں اور بددیانتوں کو تقویت پہنچائی ہے جو ہماری اطلاع کے مطابق  
اتحاد پارٹی (یونیٹ پارٹی) کو نقصان پہنچانے کے موجب بن سکتے تھے۔  
اگر اسی کا نام مسلمانوں کا اتحاد ہے، تو نہیں معلوم تفرقہ اور کس کو کہا جاسکتا ہے۔“

اسی شمارے میں ایک خبر ہے کہ راولپنڈی میں اتحاد ملت کے ایک اجتماع میں کہا گیا کہ،  
 ”مسلمانو! احرار اور خراج کے اتحاد سے پہلے پہلے اپنی اصلاح کی کوشش کرو۔  
 ورنہ مسجد شہید گنج کا کام ادھورا رہ جائے گا“

(روزنامہ ”انقلاب“ لاہور۔ ۵ مئی ۱۹۳۶)

انہی دنوں سر محمد اقبال صدر پنجاب مسلم لیگ نے احرار رہنماؤں سے مسٹر خراج کی ملاقات  
 کو پسندیدہ لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے، ہمتی کے اخبارات میں اپنے مختصر بیان میں کہا کہ  
 ”مخالفین کی یہ رائے غلط ہے کہ مسٹر خراج کو پنجاب میں زیادہ کامیابی نہیں  
 ہوئی۔ اور احرار کے سوا کوئی مسلم جماعت مسٹر خراج کی جماعت میں شامل نہیں  
 حالانکہ یہ حقیقتاً نہیں۔ میں مسٹر محمد علی خراج کی پنجاب میں کامیابی کا خیر مقدم  
 کرتا ہوں۔“

ڈاکٹر اقبال کے علاوہ اس بیان پر جناب برکت علی، خلیفہ شجاع الدین،  
 غلام رسول خاں اور پیر تاج دین کے دستخط بھی تھے۔“

ڈاکٹر عبد القوی لقمان | دوہرا اور گھٹیللا جسم اور میانہ قدر، خوبصورت خدو خال، چہرے کی سفید  
 رنگت میں ہلکی سی سیاہی نے ایسا امتزاج پیدا کیا ہے کہ بار بار دیکھنے  
 کو جی چاہتا ہے۔ گفتگو میں تغزل کا رنگ، غصے میں ہوں تو چمن میں خزاں کی طرح سارا حول  
 بے رونق ہو جاتا ہے، اپنے فن میں اس قدر اہر کہ مریض دیکھتے ہی سارا مرض آپ سے آپ  
 بولنے لگتا ہے اور کہیں نظر سنبھال کر دیکھ لیں تو نصف بیماری دور ہو جاتی ہے۔ طبیعت میں  
 خاندانی شرافت، رکھ رکھاؤ اس زوال کے دور میں بھی قائم ہیں۔

یہ ہیں ڈاکٹر محمد عبد القوی لقمان۔ آپ ۶ نومبر ۱۹۰۱ء میں مولانا ابو محمد احمد کے ہاں لاہور  
 میں پیدا ہوئے۔ والد محترم مولانا حبیب اللہ سندھی کی جمیۃ انصار کے ناظم تھے۔ اور اس نسبت  
 سے حضرت سندھی کے مرشد پیر جھنڈا (سندھ) کی خدمت میں ایک مدت گزار کر جب واپس  
 آئے تو ڈاکٹر عبد القوی لقمان لاہور میڈیکل کالج سے فارغ ہو چکے تھے۔ انہوں نے تین ماہ  
 مدرسہ دیوبند میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کی خدمت میں گزارے اور وہیں سے روحانی



تربیت کے لیے حضرت پیرھنڈا کی خدمت میں چلے گئے۔

۱۹۳۱ء میں جب مجلس احرار کی بنیاد پڑی تو آپ احرار میں شامل ہو گئے جماعت نے انہیں مقامی جماعت کا خازن مقرر کر دیا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب کالاہور پرانی کوتوالی کے چوک میں ذاتی کلینک تھا۔ اور خوب پریکٹس تھی۔ اس پر بھی مجلس احرار کے لیے وقت نکالتے رہے۔ تحریک آزادی کشمیر میں مولانا طفر علی خاں نے یکایکی تحریک سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر عبدالقوی پر ڈال دی، جسے آپ نے باحسن طریق نبھایا۔

۱۹۳۵ء میں زلزلہ کوئٹہ کے مصیبت زدگان کے لیے جب احرار نے اپنا کیمپ قائم کیا تو آپ اس کے میڈیکل کے انچارج تھے۔

ڈاکٹر عبدالقوی نعمان مولانا عبید اللہ سندھی کے قرابت داروں میں سے ہیں اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے سمندی بھی۔ آپ کی نور نظر مولانا عبید اللہ انور کے حرم میں ہے۔ جن دنوں راقم کی ملاقات (۲۹/۱۱/۳۹) کو ڈاکٹر صاحب سے ان کی رہائش گاہ گلبرگ لاہور میں ہوئی، ان دنوں وہ عمر کی پچھترویں بہار گزار رہے تھے۔ آپ پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور علاج کے لیے کینیڈا جانے کی تیاریوں میں تھے۔

غلاموں کے ذہنوں میں نہ ربط ہوتا ہے، نہ ٹھہراؤ، ان کے دل و دماغ اپنے کسی فیصلے پر قناعت نہیں کرتے

وہ اپنے ارادوں کی آگ سے غلامی کی زنجیروں کو راکھ کر دینے کی تمنا میں وقت کے کسی عاجلانہ فیصلے کو جس میں بغاوت کے آثار نہ ہوں، قبول نہیں کرتے۔

ہندوستان کی سیاسی جماعتیں نئے آئین کو بہ طور پروان چڑھانے پر لبضہ تھیں۔ ان کے نزدیک ملک کی آزادی اکیٹ ۱۹۳۵ء کے الیکشن میں تھیں۔ کبھی وائسرائے کی ٹرین پر بم مار کر، کبھی کسی انگریز کو قتل کر کے اور کبھی خود پھانسی کے تختے پر لٹاکر انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کر کے اس یقین اور ارادے کو پختہ کرنا چاہا، کہ کبھی سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔

کانگریس، مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتیں انتخاب کے جوڑ توڑ میں مصروف تھیں۔

کہ انہی دنوں پنجاب میں ایک نئی اور انوکھی تحریک نے جنم لیا۔ وہ یہ کہ سرکاری لیٹر بکسوں میں تیزاب ڈال کر تمام خطوط جلاد لیے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ سارے پنجاب میں چل نکلا۔ اس تحریک کے رہنما معروف لوگ نہیں تھے بلکہ انجانے نوجوان اس آگ کو ہوادے رہے تھے۔

امر تسریٰ اس تحریک کا لیڈر ایک کھاتے پیتے گھرانے کا محمد سلیم نامی تھا۔ اسی طرح لاہور میں اوم پرکاش، امی چند اور ایک بندو لڑکی دافسوس ہیں اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا، اس تحریک کو چلا رہے تھے۔ محمد سلیم گرفتار ہوا مگر اس تحریک کے اکثر کارکن پس منظر میں رہے۔ اگرچہ پولیس اپنی تمام کارگزاری پر نازاں تھی۔ لیکن ہر موڑ پر انہیں نوجوانوں نے شکست دی۔

انہی دنوں برہی کشن نام کا ایک نوجوان رات کو کاریں جلادیا کرتا تھا۔ اس کا رسوز کا طریقہ وارثا یوں تھا کہ وہ اوور کوٹ اور مہیٹ پہنے، جیب میں پٹرول کی شیشی اور لائٹرز ڈالے سیناؤں کے گرد گھومتا رہتا۔ جہاں کوئی کار کھڑی دیکھی۔ ڈرامائی انداز میں اس کی سیٹ پر پٹرول چھڑک کر لائٹرز لگا کر چل دیتا۔ اس کا لباس ایسا تھا کہ پولیس کو ایک مدت اس پر شبہ نہ ہوا۔ حالانکہ وہ جلتی کار دیکھنے والے ہجوم میں شامل ہوتا۔

عام طور پر لاہور کے سیناؤں میں ہر روز ایک آدھ کار ضرور چل جاتی۔ اس ڈر کے مارے سر رہیہ داروں نے اپنی کاریں گیسرا جوں میں بند کر دیں۔ بالآخر یہ نوجوان گرفتار ہو گیا اور اسے پندرہ سال کی سزا ہوئی۔

ریل گاڑیاں روک کر ان میں موجود سرکاری نوازہ لوٹ لیا جاتا اور اس سرمائے سے انقلابی پارٹیاں اپنا کام کرتیں۔ چنانچہ دوران سال کے ان واقعات میں ٹپنہ کے قریب ادھو پور ریلوے اسٹیشن اور پنجاب میں جالندھر کے قریب کرتا پور میں ایسے حادثے پیش آئے جس نے حکومت کو نئی الجھنوں میں ڈال دیا۔ اگرچہ اس تحریک سے آئین پسند پارٹیاں متاثر ہوئیں، لیکن نوجوان طبقہ ان تحریکوں سے متاثر ہونے بغیر نہ رہ سکا۔

مولانا ظفر علی خاں کی جماعت اتحادِ ملت چونکہ سرفضل حسین کی رہنمائی میں شہید گنج کا ڈرامہ کھیل چکی تھی۔ ہنوز اس ڈرامے کے کچھ پلاٹ باقی تھے۔ اس لیے وہ باوجود تمام کوششوں کے مسٹر محمد علی جناح سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ اور

حسب ذیل بیان دے کر مسلم پارلیمنٹری بورڈ سے الگ ہو گئے۔  
 ”چونکہ مسٹر جناح مکمل آزادی کے حامی نہیں ہیں اور اتحادِ ملت مہمس آزادی  
 کی حامی ہے، بنا بریں ہم مسٹر جناح کا ساتھ نہیں دے سکتے“  
 حالانکہ یہ بات نہیں تھی.....

اس سے پیشتر ۹ مئی کو سر محمد یامین نے میرٹھ سے ایک پریس بیان میں محمد علی جناح کی  
 موجودہ پالیسی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

”یہ پالیسی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تمام مسلمان ایک ہی ٹکٹ پر انتخاب لڑیں  
 اور کونسل میں جا کر کسی ہندو پارٹی سے گفت و شنید کر کے نئی اصلاحات میں ترمیم  
 کرائی جائے اور وہاں نیک نیتی سے ملت اور ملک کے مفاد کے لیے کام کیا جائے۔  
 مسٹر جناح کی یہ پالیسی مجھے پسند نہیں۔ کیونکہ جہاں تک یوپی کا تعلق ہے  
 مجھے اس امر کی اچھی طرح واقفیت ہے کہ یہاں کے مسلمان اور ہندو سینکڑوں  
 سالوں سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بڑے آرام سے زندگی بسر کر رہے  
 ہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض دفعہ ان میں کشیدگی ہوتی ہے۔ لیکن جناح کی مرد  
 سکیم پر عمل کرنے سے وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے  
 ایسے لوگ مسٹر جناح کو گمراہ کر رہے ہیں“

(روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۸ مئی ۱۹۴۶ء)

۱۱ مئی کو الہ آباد سے سر شفاعت احمد نے کہا:

”مجھے مسٹر جناح کی کامیابی مشکوک نظر آتی ہے اور میں اس امر کا سخت مخالف  
 ہوں کہ مجلس آئین ساز میں فرقہ وارانہ اصول کے تحت پارٹیاں تشکیل کی جائیں۔ اگر  
 مسٹر جناح کی پالیسی ہی کو مان لیا جائے تو یہ امر ملک کے عام فساد اور فرقہ وارانہ امور  
 کے بے حد نقصان وہ ثابت ہوگا۔“

صوبہ جاتی آئین سازی میں میرے ذاتی تجربات واضح کر رہے ہیں کہ ایسی  
 پارٹیوں کی تشکیل دوسرے مذاہب کے لیے زبردست ہیجان کا باعث ہوا کرتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم ارکان کے حقوق کے بارے میں اتحاد و اتفاق کا ثبوت ہم پہنچانا چاہیے مگر جس حد تک اقتصادی اور معاشرتی سکیم کا تعلق ہے مسلم ممبروں کو اپنی ہم خیال پارٹیوں میں شامل ہونے سے نہیں روکنا چاہیے۔  
مجھے امید نہیں کہ کوئی صوبہ بھی مسٹر جناح کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے پر آمادگی ظاہر کرے گا۔

۱۰۔ مئی کو یوپی مجلس احوار کے اجلاس میں جو مولانا سعید احمد کاظمی ایم۔ ایل۔ اے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ علی گڑھ کالج میں مزار میو

کی بڑھتی ہوئی بے دینی حرکات پر سخت پریشانی کا اظہار کیا گیا۔ نیز امرتسر میں احوار کے جلوس پر تارکول پھینکنے کی مذمت کی گئی۔ اس اجلاس میں یوپی مجلس احوار کا آئندہ سال کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا۔ جس میں صدر مولانا محمد احمد کاظمی، نائب صدر مولانا ابو الوفا شاہ جہا پوری اور جنرل سیکرٹری خاں محمود علی خان رئیس کیلاش پور (سہارنپور) منتخب ہوئے۔

امرتسر کے واقعہ پر اظہارِ افسوس | روزنامہ "انقلاب" لاہور نے اپنی ۱۳۔ مئی کی اشاعت میں مجلس احوار کے جلوس پر تارکول پھینکنے کی مذمت کرتے ہوئے لکھا:

”امرتسر میں احوار کا نفرنس کے صدر چودھری افضل حق کے جلوس پر بعض لوگوں نے تارکول ڈال کر اسلامی اخلاق و شرافت کی رسوائی کا سامان مہیا کیا ہے۔ ہمیں احوار سے ہزار اختلاف ہوں، لیکن ہم اس امر کو ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ محض اختلاف رائے کی بنا پر جہانی حملے کیے جائیں۔ اگر اس قسم کے طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی کی گئی تو ہماری پیسک زندگی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی اور کسی قومی کارکن کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔“

بعض غیر ذمہ دار جو شیٹے نوجوان سیاسی جماعتوں کے اختلاف کی وجہ سے جوش میں آکر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں اور اپنی جماعت کے لیے بدنامی کا باعث ہوتے ہیں۔ ہر سیاسی جماعت کو چاہیے کہ ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔

مختلہ پن سے آج تک نہ کوئی مقصد پورا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

ہم رہنمایانِ احرار سے اس حادثے پر دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔“

۱۵۔ مئی کو احرار کے ترجمان روزنامہ ”مجاہد“ کی ایک ہزار روپے

کی ضمانت مانگی گئی اور ساتھ ہی نورانی الیکٹرک پریس سے بھی ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی، جہاں سے یہ روزنامہ شائع ہوتا تھا۔ یہ کارروائی یکم مئی (۱۹۳۶ء) کے ایک مضمون کی بنا پر عمل میں آئی تھی۔ اس مضمون کا عنوان تھا ”ہمارے جاسوس کا کارنامہ۔ شیخ الدین محمود اور سر ظفر اللہ کی خفیہ ملاقات“

یوپی ایگریکلچر پارٹی کا قیام ہوتے ہی، ۱۰ مئی کے

نوابزادہ لیاقت علی خاں کی غلیحی کی تمام اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ سٹر لیاقت علی خاں جنہیں ۲۶۔ اپریل کو دہلی اجلاس میں مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ سٹر محمد علی جناح کی موجودہ پالیسی کے خلاف ان سے الگ ہو کر ایگریکلچر پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ پارٹی یوپی میں اپنے ہکٹ پر کانگریس کا مقابلہ کرے گی۔ اس جماعت کی شاخیں یوپی میں قائم کی جا رہی ہیں۔ نواب چٹھاری، سر محمد یعقوب، نوابزادہ لیاقت علی خاں، سر شجاعت احمد اور سر محمد یوسف اس جماعت کے خصوصی رہنما ہیں۔

مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کا اعلان

سٹر محمد علی جناح پنجاب کے مختلف رہنماؤں کے لیے لاہور سے سر نیگر چلے گئے تھے۔ یہاں وہ سرکاری نمان رہے اس دوران وہ کشمیری رہنماؤں سے بھی ملے۔ ریاستی انتظامیہ کے بارے میں بھی گفتگو ہوتی۔ اس دوران وہ مولانا میر واعظ محمد یوسف سے بھی ملے۔ جب پنجاب کے پارلیمنٹس کا ذکر آیا۔ تو مجلس احرار کی تحریک کشمیر کی قربانیوں کا تذکرہ چل نکلا۔ اس پر بہت دیر باتیں ہوتی رہیں۔

اس کارروائی کی رپورٹ ۱۳۔ مئی کو یونائیٹڈ پریس نے اخبارات کو بھیجی۔ ۲۱۔ مئی کے اخبارات نے سری نگر سے اطلاع دی کہ سٹر محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کے ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا۔

بنگال: نواب آفت ڈھاکہ مسٹر منزل حسین، خان بہادر عبدالرحمن۔ دولانا کریم دین خاں، مسٹر  
شہید سہروردی، مسٹر عبدالرحمن صادق، مسٹر ایچ۔ ایم۔ اصفہانی، مسٹر مجیب الرحمن۔

مدراں: سید ترضی حسن، مسٹر عبدالمجید، مسٹر جان محمد، مسٹر بی بوکر۔

یوپی: نواب محمد اسماعیل چھتاری، نوابزادہ لیاقت علیخان، ہمارا جہ محمود آباد، مولانا شوکت علی  
مسٹر خلیق الزمان، مولانا حسین احمد مدنی، نواب محمد یوسف۔

بہار: آنریبل عبدالعزیز، مولانا محمد سجاد، مسٹر اسے۔ حفیظ شاہ، مسعود احمد۔ مولانا مفتی کفایت اللہ  
سی۔ پی: ایم روٹ شاہد، مسٹر شریف۔

سندھ: شیخ عبدالمجید بندھی، حکیم فتح محمد شیروانی، مولوی محمد صادق، مسٹر محمد ہاشم گزدر۔

سرحد: ملک پیر بخش، مولانا اللہ بخش یوسفی، مولانا عبدالرحیم غزنوی، ملک خدا بخش ایم۔ ایل سی

پنجاب: مسٹر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد اسحاق، ناسہروی، امیاں عبدالعزیز۔ پیر مسٹر

سید زین العابدین، مولانا عبدالقادر قصوری، شیخ حسام الدین، چودھری افضل حق

ایم۔ ایل سی۔ چودھری عبدالعزیز بیگوالیہ، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لائل پور

اور راجہ غضنفر علی۔

آسام: مسٹر عبدالمتین چودھری۔ ایم۔ اے۔ فاروقی۔

دہلی: مولانا احمد سعید۔

بمبئی: مسٹر سلیمان قاسم، مسٹر آر۔ ایم۔ چنبواسے، ابوبکر بیگ محمد۔ مسٹر چندریگر، ٹھاکر دوا

ایم۔ ایل سی، خاں بہادر سلیم الدین۔

ہم نہ کہتے تھے؟

**تحریک شہید گنج کا نتیجہ** ۲۸۔ جون ۱۹۲۵ء کو جس تحریک کا آغاز مفضل حسین کے اشارے

اور مرزا بشیر الدین محمود کے ایمان پر ہوا تھا، جس کے نتیجے پر سکھ مزدور سے مسجد شہید کرائی گئی۔  
مسلمان نوجوانوں نے گویاں کھائیں، جیلوں میں گئے، ایک فعال سیاسی جماعت کو مطعون کیا گیا۔  
بحیثیت قوم مسلمان رسوا ہوئے، صوبے کا امن خراب ہوا، اقوام پنجاب دست و گریباں  
ہوئیں اور کشیدگی بڑھتی رہی۔

۱۹ مئی (۱۹۳۶) کو اس کا نتیجہ نکھر کر سامنے آگیا۔ یعنی مجلس اتحادِ ملت کی عاملہ نے اپنے ارکان کو اجازت دے دی کہ وہ مسجد شہید گنج کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لیں۔ اس اجلاس میں چند نوجوانوں نے اعتراض اٹھایا کہ مقدمہ کے فیصلہ تک کونسلوں کا تذکرہ کرنے سے اتحادِ ملت کے وقار کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن اس مختصر آراء کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ اور اکثریت سے یہ قرارداد منظور ہو گئی۔ اس قرارداد کی حمایت پر ڈاکٹر محمد عالم، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبد القادر قصوری نے زیادہ زور دیا۔

لاہور کی اکثر انجمنوں نے اس قرارداد کے خلاف مظاہرے کیے اور لاہور کی تمام فضا ایڈروں کے خلاف ہو گئی۔

۲۲ مئی کو لاہور شاہی مسجد میں جلسہ عام ہوا، جس میں اس قرارداد کی سخت مخالفت کی گئی۔

۲۶ مئی کے روزنامہ ”القلاب“ کا ادارہ (جس کے ایڈیٹر غلام رسول مہر اور عبد الحمید

سالک تھے) یونیورسٹی پارٹی کا واحد ترجمان تھا۔ وہ ہر روز مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے خلاف ادارہ لکھتا۔ چنانچہ ۲۶ مئی کے انقلاب کے ادارہ کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔

”مسٹر جناح جب لیگ پارٹیز میں بورڈ کی سکیم لے کر پنجاب آئے، تو

ہمارا خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کے اہم مقاصد میں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتحاد

بین المسلمین کا وہ مفہوم سامنے رکھیں گے جو بعض دوسرے احباب

بیٹے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تشریف آوری سے قبل یا ان

کے قیام لاہور کے درمیان ان کی مساعی کے خلاف ایک حرف بھی

نہ لکھا۔ لیکن جب ہمیں معلوم ہو گیا کہ مسٹر جناح بھی صرف چند غماص کے

اتحاد کو اتحاد بین المسلمین قرار دے رہے ہیں تو پھر ہمیں رنج و قلق کے

ساتھ ان کی مساعی کو تفرقہ انگیز قرار دینا پڑا۔“

”پنجاب کے متعصب مسٹر جناح کے تجویز کردہ ارکان بورڈ کی فہرست

سامنے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اتحاد مسلمان نہیں، بلکہ تفرقہ بین المسلمین کو تقویت پہنچانے اور مضبوط و مستحکم بنانے کی ایک افسوسناک صورت ہے۔“

غرض صاف ظاہر ہے کہ مسٹر جناح نے پنجاب میں جو پارٹی بنائی ہے یا بنانے کی سعی فرمائی ہے وہ اتحاد بین المسلمین کی اس اساس پر مبنی نہیں ہے۔“

۳۰۔ مئی کے ایڈیٹوریل میں ارکان بورڈ کے ایک ایک ممبر کا نام لے کر ان میں کپڑے لگا لے گئے۔

۲۵۔ مئی کو مسٹر رسل ڈسٹرکٹ سیشن جج لاہور نے مزار حضرت کاوشاہؒ اور شہید گنج کے مقدمات کو زائد المیعاد قرار دے کر خارج کر دیا۔

اس سلسلے میں جن لوگوں کو سزائیں ہوئی تھیں، وہ رہا کر دیے گئے۔ اس فیصلے کے خلاف لاہور کے مسلمانوں نے مظاہرے کیے اور ہڑتال بھی ہوئی۔ اس مقدمے کی پیروی ڈاکٹر محمد عالم کر رہے تھے۔

۲۷۔ مئی کو مفتی کفایت اللہ صدر جمعیتہ علمائے ہند اور مجلس احرار حمایت کا اعلان | اسلام ہند کے صدر مولانا حبیب الرحمن اور مسلم یونیٹی بورڈ کے ارکان نے ایک مشترک اعلان میں کہا کہ وہ مسٹر محمد علی جناح کے مرتب کردہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

لاہور۔ ۲۸۔ مئی میاں سرفضل حسین نے مسجد شہید گنج اور مزار کاوشاہ کے فیصلوں کے متعلق بیان دیتے ہوئے کہا:

۱۔ ”مسلمانوں نے عدالت سے رواداری کا مطالبہ کیا تھا۔“

۲۔ حکومت نے مقدمات کی سماعت کے لیے ایک سینٹریج مقرر کیا اور آئینیں ہم پہنچائیں۔

۳۔ تاہم فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوا۔ مسلمانوں کو حج کی نیت پر شبہ نہ کرنا چاہیے۔ وہ قانون کے خلاف اعتراض کر سکتے ہیں لیکن حج کا بھی فرض ہے کہ جو کچھ



قانون کے اس کی پیروی کرے۔

۴۔ اب کیا کرنا چاہیے۔

۱۔ وکلاء جو مقدمہ کی پیروی کرتے رہے ہیں ان سے مشورہ لینا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

ب۔ مسٹر جناح نے اس مسئلہ کے لیے جو کمیٹی بنائی تھی اس سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔

پنجاب کے مسلمانوں نے یہ معاملہ مسٹر جناح کے سپرد کیا تھا، اب انہیں مسٹر جناح سے مشورہ لینا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔

ان حالات میں میں مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے ہمسایوں کے خلاف نفرت یا غصہ کے جذبات نہ رکھیں، لیکن اپنے حقوق پر ڈٹے رہیں۔

(روزنامہ "انقلاب" ۳۰ مئی ۱۹۳۶ء)

یہ خاموشی کیوں؟ ایک ہفتہ گزرنے پر بھی سیشن جج کے فیصلے کے خلاف نہ تو کسی لیڈر نے بیان دیا اور نہ ہی اتحادِ ملت کی طرف سے کوئی جلسہ عام ہوا۔ بلکہ سر فضل حسین کے مشورے پر راولپنڈی میں ہونے والی اتحادِ ملت کانفرنس جس میں اس کے متعلق کوئی مشورہ ہونا تھا، ملتوی کر دی گئی۔

ایک اخباری افواہ | اخبار اسٹیشن میں کے نامہ نگار کا ایک بیان ۳۰ مئی کے روزنامہ "انقلاب" نے نقل کیا۔

"احرار نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ مسٹر جناح کی انتخابی مہم میں سہیلگی کے ساتھ تعاون نہیں کر سکیں گے۔ دوسری طرف مولانا ظفر علی خاں کی اتحادِ ملت کے ساتھ احرار کے اتحاد کے امکانات ختم ہونے چکے ہیں۔ جہاں تک مسٹر جناح کی سکیم کا تعلق ہے۔ مسٹر جناح کی سکیم کم از کم اپنی ہیئت

کے اعتبار سے ایک کمیونل پارٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح مولانا ظفر علیخان کی جماعت کا مقصد خدمتِ خلق ہے۔ ان دونوں پارٹیوں کے ساتھ اتحاد سے احوار کا گزیر یہاں یہ معنی رکھتا ہے کہ احوار اپنی پالیسی کے تحت جو آزادی وطن اور مرزائیوں کے خلاف ہے، انکے رہنا چاہتے ہیں۔

۲۹- مئی کی صبح یوگیا کی یہ خبر پنجاب کے اخبارات میں پڑتی ہے جو اہر لال نہرو لاهور میں | شائع ہوتی کہ کانگریس کے رہنما پنڈت جواہر لال نہرو

لاہور پہنچ گئے۔ اپنے قیام کے دوران وہ مجلس احوار کے رہنما چودھری افضل حق اور اتحاد ملت کے رہنما مولانا ظفر علی خاں سے ایک بند مکرے میں قریباً دو گھنٹے گفتگو کرتے رہے۔ یہ بات چیت اس قدر خفیہ رہی کہ کوشش کے باوجود پریس کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ دونوں جماعتوں سے پنڈت جی نے کیا باتیں کیں۔ البتہ ۳۱ مئی کے پنڈت جی کے بیان سے اس قدر اندازہ ہو سکا کہ انہیں اپنے مشن میں ناکامی ہوتی ہے۔

(روزنامہ انقلاب ۲ جون ۱۹۳۶ء)

۲۹- مئی کو ماتما گاندھی کے بڑے بڑے رٹ کے ماتما گاندھی کا لڑکا مسلمان ہو گیا | پیر لال گاندھی نے بمبئی جامعہ مسجد میں

اسلام قبول کر لیا اور ان کا نام محمد عبداللہ گاندھی رکھا گیا۔ اپنے اعلان میں مسٹر عبداللہ نے کہا،

”میں نے اسلام قبول کیا ہے اس لیے کہ یہ ایسا بہترین مذہب ہے کہ انوثت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تمام مذاہب کا نچوڑ ہے۔ میں اسلام میں زندہ رہوں گا اور اسی پر مروں گا“

۲- جون - بنگلور سے ماتما گاندھی نے اپنے بیٹے کے مسلمان ہونے پر حسب ذیل بیان دیا۔ | ماتما گاندھی کا بیان

”اخبارات کے بیان سے پتہ چلا ہے کہ میرے بڑے بڑے رٹ کے مسیحی پیرا لعل (عمر تقریباً پچاس سال) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور

اس نے ۲۹ مئی کو جامعہ مسجد بمبئی میں مسلمانوں کے ایک بھرے اجلاس میں اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

اگر ہیرا لعل نے بصیرت قلب اسلام قبول کیا ہو اور اس میں دنیاوی امور کا کچھ فعل نہ ہو تو مجھے اس کے مسلمان ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ اسلام بھی میرے مذہب کی طرح ایک سچا مذہب ہے۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ اس کا اسلام قبول کرنا ذاتی اغراض سے متبرک نہیں۔

جو لوگ ہیرا لعل سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ مدت سے شراب پینے کا عادی ہے اور قہوہ خانوں میں جانے کا شیدا ہو چکا ہے۔ اور کچھ عرصہ سے وہ ایسے اجاب کے تعاون سے زندگی بسر کرتا آ رہا ہے، جنہوں نے اس کی بڑی مالی اعانت کی ہے۔ ہیرا لعل چند پٹھانوں کا بھی مقروض ہے اور ان پٹھانوں نے اسے بھاری شرح سود پر روپیہ بطور قرض دے رکھا ہے۔ ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ اسے ایک پٹھان سے بھی جان کا خطرہ تھا۔

ہیرا لعل کی بیوی بڑی وفادار تھی اور اس نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ ہیرا لعل کے طریق زندگی کو نظر انداز کیا جائے۔ چنانچہ اس عورت نے اپنے خاوند کے وفادار ہونے میں کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ ہیرا لعل کے تین بچے بھی ہیں جن میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ مگر اس نے کبھی ان کی پرواہ نہیں کی۔

چند روز پیشتر ہیرا لعل نے اخبارات میں ایک مضمون لکھ کر بندوؤں کو دھمکی دی تھی کہ وہ ہندو مذہب ترک کر کے عیسائی یا مسلمان ہو جائے گا۔ اس کے بعد ناگپور میونسپل کمیٹی کے ایک بندوؤں نے اسے میونسپل کمیٹی میں ملازمت دلا دی۔ اس کے بعد اس نے اخبار میں ایک اور مضمون شائع کر دیا۔ جس سے پہلے بیان کی تکذیب ہو گئی تھی اور اس نے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر قائم رہنے کا اظہار کیا تھا۔ مگر یہ خیال کسی طرح ہو چکا ہے کہ اس کی

دنیاوی ضرورتوں کی تسکین نہیں ہوئی اور انہی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اس نے اسلام قبول کیا ہے۔

میرے پاس اور بھی بہت سے دلائل ہیں، جو میرے بیان کی تائید کرتے ہیں۔ گذشتہ دنوں مجھے ناگپور جانے کا موقع ملا، تو وہاں میرا لعل میری ملاقات کے لیے آیا۔ اس وقت اس کی والدہ نے مجھے بتایا کہ میرا لعل کتنا ہے کہ بہت سے مذاہب کے لوگ اسے اپنے اپنے مذہب میں لانے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔

میں نے اپنے تمام بچوں کو آزادی کی تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے مذہب کی طرح دوسرے تمام مذاہب کو بھی محترم خیال کریں۔ اگر میرا لعل کے دل میں اسلام قبول کرنے کا شوق تھا تو اسے مجھ کو مل کر بتادینا چاہیے تھا۔ اس صورت میں مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اور میں اس کے ارادے میں ہرگز مزاحم نہ ہوتا۔ مگر اس نے مجھے یا اپنے رط کے جس کی عمر بیس سال ہے اور جو اس وقت میرے پاس ہے۔ اس بارے میں بالکل مطلع نہیں کیا مجھے اس کے اسلام قبول کرنے کا علم اس عہد کے اعلان میں ہوا۔

میرے خیال میں میرا لعل کو جن لوگوں نے مسلمان کیا ہے انہوں نے معمولی سی احتیاط بھی نہیں کی، جو ان کے لیے نہایت اہم اور ضروری تھی۔ میرا خیال ہے کہ میرا لعل کا ہندو مذہب سے جانا ہندو مذہب کے لیے موجب خسارہ نہیں ہوگا اور اگر میرا لعل بدستور سابق حرکات پر قائم رہا تو اسلام کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

آخر میں گاندھی جی نے کہا:

”میں اپنے لاتعداد مسلمان احباب کو مشورہ دے گا کہ وہ میرا لعل کو اس کے برے افعال سے روکیں اور اسے نیک بنانے کی کوشش کریں۔ تاکہ وہ شیطانی اور نفسی خواہشات سے بچا رہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ وہ

صحیح طور پر اللہ کا بندہ بن جائے۔ مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ لوگ اسے  
عبداللہ کہہ کر پکاریں یا ہیرا محل کہیں۔

(روزنامہ انقلاب، ۴- جون ۱۹۲۶ء)

۶- جون کو مسٹر محمد علی جناح کشمیر سے واپسی پر لاہور ٹھہرے  
مسٹر جناح کی کشمیر سے واپسی

پارٹی نے ان کی آمد پر سیدہ محبتیوں سے ان کا استقبال کرنا چاہا۔ لیکن بروقت اس کی اطلاع  
ڈاکٹر سراقبال اور ان کے توسط سے احرار کو بھی اس کی خبر مل گئی۔ اس پر احرار رضا کار چار پونہ  
ہو گئے۔ جس کے باعث یونینسٹ پارٹی کو یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

۸- جون کو مسلم لیگ اور پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس جلیبیہ ہال (اسلامیہ کالج) میں کرنے  
کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن عین وقت پر انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر نواب مظفر خاں نے اس  
کی اجازت نہ دی (نواب مظفر خاں یونینسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔)

آخر مجبوراً یہ اجلاس برکت علی محمدن ہال (بیرون موچی دروازہ لاہور) میں ہوا۔ اس  
اجلاس میں پنجاب کی طرف سے انیس ارکان نے شرکت کی۔ جن میں غالب اکثریت یونینسٹ  
ممبروں کی تھی۔ دیگر لوگوں میں نواب احمد رضا خاں دو تانہ، سردار حبیب اللہ، مولانا غلام محی الدین  
قصوری، نوابزادہ نور شید علی خان، بیگم شامبھوا ز اور.....

احرار کی جانب سے چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین، چودھری عبدالعزیز بیگوالہ

اور خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ قابل ذکر ہیں۔

اس اجلاس میں مسلم لیگ کا الیکشن سینی فیسٹو منظور کیا گیا۔ اور مولانا ظفر علی خاں اور  
ان کے ساتھیوں نے اسی اجلاس میں اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔ مولانا کا یہ عذر لیگ  
تھا کہ مسلم لیگ کا نصب العین درجہ نوآبادیات ہے اس لیے ہم میں اور ان میں تعاون نہیں  
ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد عالم مولانا پر چھائے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے مسجد  
شمید گنج کی بازیابی کا دیوانی دعویٰ بھی دائر کر رکھا تھا۔ لہذا وہ اتحادیت کا علیحدہ پارلیمانی  
بورڈ قائم کر کے شمید گنج کے نام پر الیکشن لڑنا چاہتے تھے۔ بدیں وجہ ڈاکٹر عالم نے نہایت

ہوشیاری سے اتحاد ملت، روزنامہ زمیندار، مولانا ظفر علی خاں اور شہید گنج کو سراہنے الیکشن کے لیے استعمال کیا۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس میں جمعیتہ علمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

”ہم مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے، اس بات کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلم لیگ کو زندہ اور فعال جماعت بنا کر میدان عمل میں داخل کر دیا ہے۔“

مرزا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب ”مسلم لیگ“ میں پارلیمنٹری بورڈ کے اس اجلاس کا حال بیان کرتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ جس سے ایک طرف ہماری قومی جدوجہد کی ابتدائی بے سرو سامانی اور دوسری طرف ہمارے علمائے کرام کی سنگدلی پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اصفہانی صاحب فرماتے ہیں۔

”پارلیمنٹری بورڈ کے اس اجلاس میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ یہ تقریریں کرنے کی عادت اب ایک طرح روایت اور کمزوری بن گئی ہے۔ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی تقریروں میں مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے اس بات کا خیر مقدم کیا کہ انہوں نے مسلم لیگ کو زندہ اور فعال سیاست کے میدان میں داخل کر دیا ہے۔ لیکن آخری روز انہی علمائے کرام میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ چونکہ انتخاب میں مسلم لیگ کو کامیاب کرانے کے لیے پروپیگنڈے کی ہم کا بڑی سرگرمی اور خوش اسلوبی سے چلانا بہت ضروری ہے، لہذا ہمارا خیال ہے کہ دیوبند کو اس پروپیگنڈے کا مرکز بنایا جائے، بشرطیکہ اس ہم کا تمام خرچ مسلم لیگ برداشت کرے۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ پروپیگنڈے کی اس ہم کا آغاز کرنے کے لیے پچاس ہزار روپوں کی ضرورت ہوگی۔“

لیگ کے پاس اس وقت پچاس پیسے بھی نہ تھے۔ صدیوں اور سیکرٹری دونوں بغیر تنخواہ کے مفت کام کر رہے تھے اور دفتر بھی گویا ان کے ہینڈ لیگ

ہی میں تھا۔ ان علمائے کرام کو ہم سے کہیں زیادہ مسلم لیگ کی اس کمزوری کا علم تھا۔ بظاہر انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ان کی اس تجویز کا جواب سوائے انکار اور معذوری کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مسٹر جناح نے انہیں بتایا کہ مسلم لیگ کے پاس کوئی سرمایہ نہیں اور مستقبل قریب میں بھی کسی چندے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ ہم سب گول لگا کر خلوص سے کام کرنا چاہیے۔ یہ سن کر علمائے کرام سخت بائوس ہوئے اور آہستہ آہستہ ہندو کانگریس کی طرف کھسکنے لگے۔ بالآخر انہوں نے اپنے آپ کو کانگریس کے پراسپیڈے کے لیے وقف کر دیا۔“

”اقبال کے آخری دو سال“ مصنفہ عاشق حسین شاہوی ص ۳۲۶-۳۲۸

اسی طرح کے ایک دوسرے اجلاس کی کارروائی جس کا تعلق یوپی کے انتخاب سے ہے ایک دوسرا مصنف مولانا عزیز الرحمن جاہی اپنی کتاب ”رہنمیں الا حرار“ کے ص ۱۹۴-۱۹۵ یوں رقمطراز ہے۔

”سلیم پور ہاؤس لکھنؤ میں کانگریس، مسلم لیگ کے اتحاد کا مشورہ زیر بحث تھا۔ رمضان المبارک میں مولانا ابوالکلام آزاد الیکشن کی تیاریوں کے سلسلے میں لکھنؤ تشریف لائے۔ سلیم پور ہاؤس میں قیام کیا۔ چودھری خلیق الزمان کے ذریعے یوپی کے مسلم لیگیوں سے کانگریس، لیگ مشترک محاذ کی گفتگو شروع ہوئی۔ یوپی میں جمعیتہ علمائے ہند کا بے پناہ اثر تھا۔ اس لیے یوپی کا الیکشن بلا جمعیتہ علمائے ہند کی امداد کے جیتا نہیں جاسکتا تھا۔ چنانچہ جمعیتہ علمائے ہند کے رہنما بھی اس گفتگو میں شامل تھے۔ مولانا حبیب الرحمن ص ۱۹۴ مجلس احوار سلیم پور ہاؤس میں مولانا آزاد کے ساتھ ٹھہرے۔ چودہ روز تک قیام کیا۔ اس دوران مولانا حبیب الرحمن کی چودھری خلیق الزمان سے بار بار گفتگو ہوئی۔ آخر یوپی میں کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیتہ علمائے ہند کا اتحاد ہو گیا۔“

سوال یہ تھا کہ الیکشن میں مسلم لیگ کے امیدواروں پر روپیہ کون خرچ

کرے، اس بارے میں پتہ جی اور خلیق الزمان میں بات چیت طے ہو گئی، کہ کانگریس مسلم لیگ کے امیدواروں کی ہر طرح مدد کرے گی۔ الیکشن پر کوئی پچاس ہزار کے خراج کا تخمینہ تھا۔ مسلم لیگ الیکشن کے نگران چودھری خلیق الزمان تباہ گئے۔ چودھری صاحب اس وقت تک کانگریسی تھے۔ انہیں صرف کانگریس نے الیکشن کی کامیابی کے لیے مسلم لیگ نبویا تھا۔

**سید حبیب کا استعفیٰ** | مولانا سید حبیب مالک روزنامہ "سیاست" لاہور نے ۸ جون کو مجلس اتحاد ملت سے استعفیٰ دے دیا۔

استعفیٰ کی وجوہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا:  
 "اس وقت اتحاد ملت کے پروگرام میں مجلس احرار کی مخالفت یا کونسلوں میں جانے کے سوا کوئی پروگرام نہیں جسے میں پسند نہیں کرتا میں خلوص نیتی سے حصول مسجد کے لیے اتحاد ملت میں شامل ہوا تھا۔ لیکن یہ جماعت اپنے موقف سے منحرف ہو چکی ہے۔"

**روزنامہ انقلاب کی رائے** | ۸ جون کے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۱ جون کے روزنامہ "انقلاب" نے بخیر کسی نام کے ایک مراسلہ شائع کیا، جس میں مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی ایک نئے انداز سے مخالفت کی گئی اور یہ تجویز پیش کی کہ:

"مسلم لیگ کا سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ توڑ دیا جائے۔ اور صوبائی لیڈروں کو اپنے اپنے صوبوں میں کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا کہ پنجاب میں پارلیمانی بورڈ کی کامیابی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

**احرار یونٹی بورڈ اور جمعیتہ علمائے ہند کا اجلاس** | ۱۰ جون کو لاہور مرکزی مجلس احرار کے دفتر میں جمعیتہ علمائے ہند،

یونٹی بورڈ اور مجلس احرار کا مشترک اجلاس ہوا، جس میں دیگر جماعتوں کے نمائندے بھی شریک تھے۔ یعنی مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد اسماعیل دیوپی، چودھری افضل حق



چودھری خلیق ازان، مولانا سید محمد احمد کاظمی ایم۔ ایل اے۔ عبدالمتین چودھری، خواجہ عبدالرحمن خان، ایم سجاد، شیخ عبدالحمید سندھی، ایم مسعود، مولانا داؤد غزنوی، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لاہور، مولانا شوکت علی، شیخ حسام الدین، مولانا منظر علی انظر قابل ذکر ہیں۔

اس اجلاس میں انتخابی بورڈ کے متعلق بعض اہم فیصلوں پر بحث کی گئی۔ چونکہ پریس کو اجلاس میں شرکت کی اجازت نہیں تھی، لہذا کوئی فیصلہ سامنے نہ آسکا۔

(یونائیٹڈ پریس، روزنامہ انقلاب لاہور ۱۱ جون ۱۹۳۶ء)

رائے بہادر چھوٹو رام پوینسٹ پارٹی کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ ان کی روٹیک سے بھیجی ہوئی ایک خبر ۱۱ جون ۱۹۳۶ء کے روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئی، جو حسب ذیل ہے۔

۲۔ جون کو عید میلاد النبی کا جلوس نکالا گیا۔ مسلمانان روٹیک نے اس تموار کو بڑی شان و شوکت سے منایا۔ سب سے بڑی مسرت اس بات پر ہے کہ عید میلاد النبی ہندو مسلمانوں کی باہمی اخوت و محبت کا موجب ثابت ہوا ہے۔ مقامی مسلمانوں نے پیشتر اپنے سالانہ جلوس کو اس لیے ملتوی کر رکھا تھا کہ مقامی حکام نے اس پر پابندی لگا رکھی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے حکومت نے اس جلوس کی اجازت دی تو شہر کے مسلمانوں نے جلوس کے لیے شربت پان اور دوسرے لوازمات کا انتظام کیا تھا۔

یہ فروری یا مارچ کی بات ہے۔

۳۔ جون کو حسب مسلمانوں نے سرور کائنات کا یوم پیدائش منایا اور جلوس نکالا تو ہندوؤں نے راستے میں پانی کی بسلیں لگائیں، جس میں شربت اور پان وغیرہ سے جلوس کی تواضع کی گئی۔ اس موقع پر دونوں قوموں کے درمیان مسرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

مسلم لیگ کی جنرل کونسل سے مستعفی ہونے پر مولانا مظفر علی خان نے جو بیان دیا اس کے جواب میں مولانا مظفر علی جنرل سیکرٹری

مجلس احرار اسلام ہند نے مندرجہ ذیل بیان پر یس کو دیا۔  
 گذشتہ سال مسجد شہید گنج کی آڑ میں مجلس احرار کو نیست و نابود کرنے کی ہر ممکن  
 کوشش کرنے کے بعد کل مولانا ظفر علی خاں نے مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ  
 میں ایک سنسنی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے بیان شائع کیا ہے کہ  
 ”وہ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ سے تعاون نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لیگ

کا سیاسی عقیدہ درجہ نوآبادیات کا حصول ہے؛

اگر ان کا اختلاف محض اس بنا پر ہوتا کہ ان کا عقیدہ مکمل آزادی حاصل  
 کرنے کا ہے تو نہایت خوشی کی بات تھی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا  
 ظفر علی خاں مسلم لیگ سے ایک بچے کی طرح روٹھ گئے ہیں تو معلوم ہوتا ہے  
 یہ لیگ پارلیمانی بورڈ سے علیحدگی کا ایک بہانہ ہے اور اندر خانہ کچھ اور وجہ ہو سکتی  
 ہے۔ خاص کر مٹر خاج نے جب ان سے کہہ دیا ہے کہ ان کے علاوہ اور  
 اشخاص بھی ایسے ہیں، جو مکمل آزادی چاہتے ہیں، لیکن وہ مسلم لیگ پارلیمانی  
 بورڈ سے تعاون کر رہے ہیں۔ کیونکہ پارلیمانی بورڈ ان سے یہ نہیں کہتا کہ وہ  
 اپنا عقیدہ ترک کر دیں یا اس کے حصول کی کوشش نہ کریں۔

پارلیمانی بورڈ کی منشا صرف یہ ہے کہ آزاد خیال لوگوں کا تعاون حاصل  
 کیا جائے اور اس طرح رحبت پسند طاقتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ بہت سے  
 مسلمان مجلس احرار سے کہہ رہے تھے کہ مولانا ظفر علی خاں اور اتحاد ملت میں  
 مخالفت اور تعاون کریں۔ مٹر خاج کے پارلیمانی بورڈ نے اس کے لیے  
 بہت اچھا موقعہ پیدا کر دیا تھا۔ مگر مولانا ظفر علی خاں نے اس سے فائدہ  
 اٹھانے سے انکار کر دیا۔ آج وہ جن سہاروں پر بڑی بڑی امیدیں باندھے  
 ہوئے ہیں، انہیں جلد بچھپانا پڑے گا کہ یہ سہارے ریت کے سہارے  
 ہیں۔“

(روزنامہ ”انقلاب“ لاہور، ۱۳-جون ۱۹۳۶ء)

## سر سکندر اور فضل حسین کے درمیان کشمکش

سیاست میں رشتے ناٹے اور دوستانہ تعلقات پر راجح سحری معلوم ہوتے ہیں۔

یہ اس کی عمر اس پھول کی سی ہوتی ہے جو بادِ سموم کے ایک ہی جھونکے سے مرجھا جاتا ہے۔

سر فضل حسین پنجاب کی وزارتِ عظمیٰ کے شوق میں دائرہ سرائے کی کونسل سے مستعفی ہو کر پنجاب آئے تو سر سکندر حیات انہیں اپنے راستے کی دیوار نظر آئے۔ چنانچہ انہوں نے نبطاہر سر سکندر حیات پر یہ احسان کیا کہ انہیں ریزرو بنک کا ڈپٹی گورنر بنا کر کلکتہ بھیج دیا۔ سر سکندر حیات حاتم طائی کی اس خیرات کو بخوبی سمجھتے تھے، تاہم وہ بادلِ خواستہ صوبہ سے باہر چلے گئے۔ لیکن اندر خانہ اس بساط پر اپنی چال سوچتے رہے۔ گو ۲۹۔ اپریل سے نبطاہر سر سکندر حیات اور سر فضل حسین کے باہم صلح ہو چکی تھی اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد بنک کی گورنری سے مستعفی ہو کر پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو میں مصروف ہو جائیں گے، لیکن یہ بھی ایک سیاسی چال تھی۔ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے، اس کہانی کو ایک دوسرے مصنف کی زبانی سنئے۔

عین جس وقت آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں میں فکر و عمل کی وحدت پیدا کرنے کے لیے پروگرام مرتب کر رہی تھی، سر سکندر حیات خاں پنجاب کی ریونیو نمبر می کی پانچ سالہ میعاد ختم کر کے ہندوستان کے ریزرو بنک کے ڈپٹی گورنر بن چکے تھے، جہاں وہ ساڑھے پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ لیتے تھے۔ ان کی جگہ نواب مظفر خاں پنجاب کے ریونیو نمبر بن گئے تھے۔ میاں فضل حسین کو معلوم تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک طاقتور عنصر ان کے خلاف ہے اور سر سکندر اس باغی فریق کے لیڈر ہیں۔ تاہم وہ اس پارٹی کے منتشر عناصر کو یکجا کرنے کی فکر میں شب و روز کام کر رہے تھے۔ پنجاب میں نواب مظفر خاں۔ میاں احمد یار خاں دونوں تھے اور میر مقبول، سکندر کے بہت بڑے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔

سر سکندر کو معلوم تھا کہ میاں فضل حسین سے نبرد آزما ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ فضل حسین بیمار تھے اور کام کی شدت جس قسم کی جسمانی طاقت و توانائی اور صحت کی طلب گار تھی، وہ انہیں حاصل نہ تھی۔ لیکن فضل حسین کی غیر معمولی قوتِ ارادی اور ذہانت

ایک ایسا حربہ تھا جس کا لوہا ان کے حریف بھی مانتے تھے اور سر سکندر کو یقین تھا کہ اگر ان کے اور میاں فضل حسین کے درمیان مقابلے کی نوبت آئی تو انجام کار یونینسٹ پارٹی فضل حسین ہی کو اپنا لیڈر منتخب کرے گی۔ اس صورت میں سر سکندر کے سامنے دو راستے کھلے تھے۔ اول یہ کہ میاں فضل حسین کے تحت ایک وزیر کی حیثیت سے کام کرنا قبول کر لیں۔ دوم یہ کہ یونینسٹ پارٹی سے اپنا رشتہ منقطع کر کے کسی نئی پارٹی کی داغ بیل ڈالیں۔ سر سکندر ایک وقت ان دونوں راستوں پر گامزن تھے۔

ادھر وقتاً فوقتاً میاں فضل حسین کو اپنے خلوص اور نیاز مندی کا یقین دلاتے رہتے تھے۔ ادھر فضل حسین کے خلاف ایک نئی پارٹی کی طرح ڈالنے کی دوڑ دھوپ بھی کرتے رہتے۔ سر سکندر خود تو بنک کی ملازمت کی وجہ سے کلکتہ اور بمبئی میں مقیم تھے۔ لیکن میاں احمد یار خاں دو تانہ اور میر مقبول ان کے نائب سالار کی حیثیت سے برابر لاہور میں کام کر رہے تھے۔ جونہی سر سکندر کو معلوم ہوا کہ مسلم لیگ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کا عزم رکھتی ہے انہیں فوراً یہ ڈھارس بندھی کہ شاید لیگ ہی ان کی پریشانیوں کا مداوا بن سکے۔ اور وہ مسلم لیگ ہی کے توسط سے میاں فضل حسین کے خلاف اپنی پارٹی مضبوط کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے احمد یار خاں دو تانہ کو لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی بھیجا اور ۱۲۔ اپریل کو مذکورہ بالا قرارداد میاں احمد یار خاں دو تانہ کی موجودگی میں اور ان کی رضامندی سے منظور ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس وقت مسٹر جناح اس تذبذب میں تھے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب کی جنگ لڑی جائے یا نہ لڑی جائے تو سر سکندر نے مسٹر جناح سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پنجاب میں مسلم لیگ کے نام پر اپنی جماعت منظم کریں گے اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میاں فضل حسین کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دیں گے۔

سر سکندر کے راجہ نریندر ناتھ سے بھی بہت خوشگوار تعلقات تھے اور راجہ صاحب بر اس شخص کی مدد کرنے کو تیار تھے جو میاں فضل حسین کے خلاف خم مٹھو تک کر کھڑا ہو سکے۔ چنانچہ سر سکندر جب لاہور آتے تو راجہ نریندر ناتھ سے ضرور ملتے۔ ان کا اندازہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا وہ عنصر جو ان کا حامی تھا، اگر راجہ نریندر ناتھ کی پارٹی سے تعاون کرے تو اس طرح

خائبان کی جماعت کے ارکان کی تعداد میاں فضل حسین کے حامیوں سے بڑھ جائے گی۔  
 میاں فضل حسین اسر سکندر کی ان سازشوں سے سخت پریشان تھے اور محسوس کرتے  
 تھے کہ حالات و واقعات پر ان کی گرفت پہلے کی طرح مضبوط نہیں رہی۔ ایک خط میں چودھری  
 شہاب الدین کو لکھتے ہیں :

”دوست، عزیز اور رشتے دار اس قدر خود غرض، حاسد اور ناشکرے ہو گئے ہیں  
 کہ ان کی کمینہ حرکات دیکھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے لیکن کیا کیا جائے۔ صبر و شکر  
 کرنے اور خذرداریوں کو برداشت کرنے کے سوا کیا چارہ ہے۔ اب تو زندگی کا  
 صرف یہی مقصد رہ گیا ہے کہ جو کام شروع کیا تھا اسے بالآخر انجام تک پہنچایا جائے۔“  
 میاں فضل حسین اس بات پر بھی آمان ہو گئے تھے کہ اگر سر سکندر ان کی قیادت میں کام  
 کرنا نہیں چاہتے تو وہ بخوشی سیاسیات سے کنارہ کش ہونے اور لیڈری کا منصب سکندر کے  
 حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں سر سکندر کو لکھتے ہیں۔

”اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تو میں صرف پارٹی کی قیادت ہی سے نہیں بلکہ سبک  
 زندگی اور سیاسی کاموں سے کلیتاً دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ آپ بنک سے  
 فوراً استعفیٰ ہو کر یہاں آجائیے اور پارٹی کی زمام قیادت سنبھال لیجئے۔ میں چونکہ  
 سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو رہا ہوں، اس لیے آپ کو غالباً اس بات پر  
 چنداں اعتراض نہیں ہوگا کہ میں ایک بیان شائع کر کے عوام کو ان حالات و کوائف  
 سے مطلع کر دوں جن کے تحت مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے۔ میری تمنا ہے کہ آپ  
 اور آپ کے دوست اور آپ کی پارٹی کو ہر قسم کی کامیابی نصیب ہو۔“  
 جب کشیدگی یہاں تک پہنچ گئی تو سر سکندر نے بطور مصلحت خود لاہور آ کر میاں فضل حسین  
 سے معذرت کی اور اپنی وفاداری کا یقین دلا کر جملہ خدشات رفع کرنے کی کوشش کی۔ احمد یار خاں  
 داتا نے بھی منت سماجت کر کے فضل حسین کو خوش کرنا چاہا۔

آخر میاں فضل حسین اس قسم کی نیازی مندانه گذارشات سے مطمئن ہو کر لبطاً ہر پھر کام کی طرف  
 متوجہ ہو گئے۔ لیکن اس مصالحت پر ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک اور شگوفہ کھلا۔

میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل کرنل ہارپنسن، فضل حسین کے معالج تھے اور نواب مظفر خاں چکے چکے ہارپنسن کے پاس جا کر پوچھتے تھے کہ فضل حسین کی زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ ہارپنسن نے ایک ذمہ دار معالج کی حیثیت سے نواب مظفر خاں کو تو کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ لیکن انہوں نے میاں فضل حسین کو فوراً آگاہ کر دیا کہ ان کے حریف اب ان کی زندگی کی گھڑیاں شمار کر رہے ہیں۔ فضل حسین کو نواب مظفر خاں کی اس حرکت سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ انہوں نے رنج و الم کی شدت میں خودکشی کا ارادہ کر لیا اور آخر ایک کرب انگیز ذہنی کشمکش کے بعد اس مذموم ارادے سے باز آئے۔“

”اقبال کے آخری دو سال“ مصنف عاشق حسین شاہوی ص ۲۹۲ تا ۲۹۸

اقتدار کی ان اندرونی سازشوں نے پنجاب کو مختلف دھڑوں میں منقسم کر دیا۔ **پنجاب** میاں سرفضل حسین اپنے مستقبل کے لیے یونینسٹ پارٹی کو منظم کر رہے تھے۔ سر سکندر حیات پس منظر میں بیٹھے اپنے اقتدار کی تلاش میں تھے۔ ان کی دورانی پالیسی باغبان سے بھی یارانہ گانٹھے ہوتے تھی۔ اور صیاد کی مزاج پر سی بھی کر رہی تھی۔ اتحاد ملت کا علم اٹھانے مولانا ظفر علی خاں کا دل دماغ فضل حسین کی منڈھیر پر تھا۔ اور ڈاکٹر محمد عالم انہیں آئندہ الیکشن کے لیے اپنی مرضی کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔ دونوں مل کر شہید گنج کی اینٹیں مجلس احرار کی طرف پھینک رہے تھے۔

مجلس احرار ان صبر آزمائیاں سے گزر کر بھی تو انا تھی تاہم شہید گنج کے زخم ہنوز تازہ تھے۔ اس پر بھی احرار رہنماؤں نے سٹر محمد علی جناح کی آواز پر لبیک کہا۔ اور پنجاب میں ان کا سہارا بنے۔ ورنہ رحبت پسند گروہ قدم قدم پر ان کا راستہ روکے ہوئے تھا۔

پنجاب جیسے حالات یوپی میں بھی پیدا کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں سرفضل حسین، **یوپی** نواب چھتاری کو ایک خط کے ذریعے مشورہ دیتے ہیں۔

”مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب رکھ کر مسلمان گورنمنٹ میں شریک نہیں ہو سکتے اس لیے زمیندارہ یا ایگریکلچر سیٹ پارٹی بنا کر الیکشن رٹے جائیں، تاکہ ایسی پارٹی

میں سب ہی گورنمنٹ میں آجائیں گے“

(”نامہ اعمال“ حصہ اول ص ۶۳۷)

سر محمد یامین خاں ایم۔ ایل۔ اے سے جب مسلم لیگ کے مینی فیسٹو کی بابت، جو پارلیمنٹری بورڈ نے شائع کیا ہے، رائے دریافت کی گئی تو انہوں نے کہا، مینی فیسٹو سے صاف ظاہر ہے کہ بورڈ مسلمانوں کے ایک طبقہ سے خاص کر زمینداروں سے تعاون کرنا نہیں چاہتا اور ان پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے گورنمنٹ پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اور ممبران بورڈ حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، اپنا اقتدار بڑھانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ بات کون سی ہو سکتی ہے کہ مسٹر جناح مسلمانوں کو متحد کرنے میں قطعی ناکام ہو گئے ہیں۔ بلکہ متحد کرنے کی بجائے ان کے درمیان ایک بڑی خلیج بلاوجہ زمینداروں پر مینی فیسٹو میں حملہ کر کے پیدا کر دی۔ مینی فیسٹو سے ان لوگوں کی ذہنیت اور خواہش جاہ صاف عیاں ہے، جنہوں نے یہ مینی فیسٹو بنایا ہے۔

مسلمان پبلک کو مذہب اور اتحاد کے نام پر یہ چالاک لوگ عرصہ سے دھوکہ دے کر اپنے لیے اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور اقتدار و شہرت حاصل کرنے کے واسطے استعمال کرنے رہے ہیں۔

اب پھر اعلیٰ انفاذ استعمال کر کے اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے ہیں۔ تمام ایماندار اور قوم کے سچے بھی خواہوں کو اس کا انسوس ہے۔ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کا نام استعمال کر کے وہ لوگ ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، جن کی غلط پالیسی نے گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈالنے کے سوا کوئی کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچایا۔ اب اس طرح اپنا کھویا ہوا اقتدار اپنی ذاتی وجہات کے لیے مسلمانوں کو ہوتوں بنا کر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس دن کے پرچے ۲۲۔ جون میں چودھری ضبوق الزمان جو کہ سازشوں کے سرگرم ہیں اور جو اب تک کانگریسی رہے ہیں اور انتخاب جداگانہ کے جو مسلمانوں نے بڑی مشکل درگوشی سے حاصل کیا ہے اسخت مخالف رہے ہیں۔ اور اب بھی ہیں۔ اور اس حق کو چھیننا چاہتے

ہیں۔ اور اب کانگریس کے جاسوس کی حیثیت سے مسلم لیگ میں شامل ہو کر اندر سے خلفشار پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کا حسب ذیل بیان چھپا۔

دو چودھری خلیق الزمان نے نواب چھتاری اور نواب سر محمد یوسف کے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے استعفیٰ دینے پر جاری کیا اور کہا کہ مجھ کو ان کے استعفیٰ پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ یہ تو دیر سے یا جلد ہونے ہی والا تھا۔ جو وجوہ بیان کی گئی ہیں یہ تو صرف پرانی اور قدامت پسندیت کو چھپانے کے لیے دی گئی ہیں۔

دخلیق الزمان کے بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ

نیشنل ایگریکلچرلسٹ پارٹی مسلمانوں اور ہندوؤں کو مشترک طور پر نیشنل کاموں کا مفود سے گی لیکن نواب چھتاری یہ بھول گئے ہیں کہ انہوں نے ۲۶ اپریل کو مسلم لیگ کے ممبروں کو باور کرایا تھا کہ نیشنل ایگریکلچرلسٹ پارٹی کے آپن میں ایک دفعہ ہے جس کی رو سے ہندو اور مسلمان ممبروں کو یہ حق حاصل ہے کہ فرقہ وارانہ رائے دینے پر آزاد ہیں، چاہے جدھر رائے دیں۔

ایسی پارٹی جو اپنے ممبروں کو یہ سہولت دے، اس کو نیشنلسٹ برگر نہیں کہا جاسکتا۔ اس پارٹی کا اصل منشا یہ ہے کہ مل کر کانگریس کی مخالفت کریں اور ترقی پسند مسلمانوں کی مخالفت کریں، چاہے کتنا ہی پوشیدہ رکھ کر یہ کیا جائے رائے دہندگان سے یہ بات چھپ نہ سکے گی کہ مشترک پارٹیاں اشتراک عمل کے لیے جب ہی کامیاب ہو سکتی ہیں، جب انتخاب بھی مشترک ہو۔

مسلمان وہ دن نہیں بھولے ہیں کہ جب نیشنلسٹ مسلمان انتخاب مشترک کے واسطے کوشاں تھے۔ اور ان کی سخت مخالفت کی جاتی تھی۔ اور نواب سر محمد یوسف ٹرین بھر کر اپنے ساتھیوں کو مسلم لیگ میں انتخاب مشترک کی مخالفت کرنے کے لیے لے جاتے تھے۔ اب جبکہ انتخاب جداگانہ کی بنیاد پر الیکشن ہونے والے ہیں، تو نواب صاحب مشترک پارٹی بنانے کے حامی نہیں اگر پالیسی میں کوئی ایمان داری ہے تو ان صاحبان کو چاہیے کہ مکان کی چھت



سے باواز بلند اعلان کریں کہ وہ انتخاب مشترک کے حامی نہیں یا انگریزیکلچر سٹ پارٹی کے آئین سے یہ دفعہ نکال دیں کہ فرقہ وارانہ معاملات میں ہندو اور مسلمان نمبر آزاد ہوں گے یا جس طرح چاہیں رائے دیں۔“

خلیق الزمان کا یہ بیان صاف ظاہر کرتا ہے کہ بھیڑ کی کھال پہن کر بھیڑیا بول رہا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ کانگریس کا جاسوس، مسلم لیگ میں داخل ہو کر مسلمانوں کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

”نامہ اعمال“ حصہ اول ص ۶۳۶ تا ۶۳۹

یہی حالات ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے تھے۔ وہ انتشار اور پریشانی حالات سے گذر رہے تھے۔

۱۰۔ جون کو لاہور میں ایک جلسہ عام کے موقع پر، جو بیرون موچید روارہ میں ہوا۔ اس میں مولانا ظفر علی

آپ ڈھموزی کیوں گئے تھے؟

تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

”آپ ڈھموزی کیوں گئے تھے؟ آپ وہاں سرفضل حسین اور مرزا بشیر الدین محمود سے کیوں ملے تھے؟“

(ان سوالات کے جواب میں مولانا ظفر علی نے کہا)

ان کا جواب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق یا مولانا منظر علی انظر دے سکتے ہیں۔

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سرفضل حسین، مولانا منظر علی انظر سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ میں مسلمانوں کو سول نافرمانی کا مشورہ نہیں دے سکتا میرا افضل حسین کے پاس جانا، مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں تھا مجھے اس سلسلے میں چھوٹو رام یا گورنر پنجاب سے بھی ملنا پڑے تو ملوں گا؛

(روزنامہ ”انقلاب“ لاہور - ۱۲۔ جون ۱۹۳۶ء)

اس جلسے میں دس ہزار کے قریب مسلمان جمع تھے، مگر جلسہ منگوانے کی نظر ہو گیا۔

جناب کی لاہور سے روانگی | جون کو مسٹر محمد علی جناح نے پارلیمنٹری بورڈ کا جو اعلان کیا تھا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے پریس بیان میں کہا۔

وہ میں نہایت مخلصانہ طریق پر مسلمانان ہند سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر لیگ کے امیدواروں کے علاوہ کسی کو ووٹ نہ دیں۔ کیونکہ مسلم لیگ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی دولت سے مالا مال کرے اور انہیں صوبجاتی ساز باز کرنے والی جماعتوں میں منقسم نہ ہونے دیں۔  
مسلم لیگ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا

۱۔ مسلمانان ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی اور دوسرے حقوق کی حفاظت کے لیے کوشش کرے

۲۔ ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوستان کی دوسری اقوام میں دوستانہ روابط کا قیام۔

۳۔ ہندوستانی مسلمانوں اور دنیا کے ممالک کے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا

قیام اور ان کے باہمی تعلقات کے استحکام کی کوشش۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے مندوبین کونسلوں میں جا کر دستور اساسی سے

دستبرداری کے لیے کوشش کریں گے تاکہ جس طرح ہو سکے قومی زندگی کی حالت

کو سدھارنے اور عوام الناس کی ترقی کے لیے کوشش کی جائے۔

مسلم لیگ پارٹی کو جداگانہ انتخاب کے اصول پر قائم ہونا چاہیے۔ مگر

یہ پارٹی کونسلوں میں جا کر ایسی پارٹی سے تعاون کر سکے گی، جس کے اغراض و مقاصد

لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے مفاد سے مشابہت رکھتے ہوں۔

لہذا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ مسلمانوں سے ملتے جلتے ہے کہ اقتصادی اور

دوسرے اہم معاملات کے بارے میں دوسروں کا راستہ نہ روکیں۔ اتحاد و اتفاق کے

اصول پر کاربند رہیں۔“

مسٹر محمد علی جناح کے اس اعلان کے خلاف روزنامہ ”انقلاب“ نے ۱۳-۱۴ اور ۱۹ جون کے

شماروں میں پارلیمنٹری بورڈ کے خلاف مسلسل ادارے لکھے اور ۳۰ جون کے ادارے میں لکھا کہ

”مسٹر جناح اور اس کا پارلیمنٹری بورڈ ہندو اور مسلمانوں کی پوزیشن کمزور کرنے کی خواہش رکھتا ہے“

بنگالی پارٹی لیگ بورڈ سے الگ ہو گئی | گزشتہ دنوں یونائیٹڈ مسلم پارٹی نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے اتحاد کر

یا تھا۔ لیکن ۱۵۔ جون کو اس پارٹی کی اکثریت نے الگ ہو کر اور مسٹر فضل الحق و خان بہادر عبدالمومن نے نال نے پر جا پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیا۔

نئی نال کی ایک اطلاع کے مطابق کہ نواب چھتاری اور سر محمد یوسف نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے اپنا استعفیٰ دے دیا۔ ۱۸۔ جون کو پٹنہ سے ایک مراسلہ اخبارات میں شائع ہوا کہ مسٹر حسین ام بھی پارلیمنٹری بورڈ سے الگ ہو گئے۔

لال ڈھنڈورا | جیسے کہ زیر نظر کتاب کے گزشتہ اوراق میں یہ بات اچھی ہے کہ انقلاب پسند نوجوان ملک کی سیاسی جماعتوں سے الگ تھنک اپنی ڈگر پر رواں دواں تھے۔ لیٹر بکسوں میں تیزاب ڈالنے کی تحریک پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں پھیل چکی تھی۔ انہی دنوں ایک اشتہار نے حکومت اور عوام کے ساتھ پولیٹیکل جماعتوں کو بھی ہراساں کر دیا۔ اشتہار کا عنوان تھا ”لال ڈھنڈورا“ اس میں درج ہوتا تھا کہ یہی وقت ہے انگریزوں کو ہندوستان سے نکلانے کا۔

یہ اشتہار ریویوے اسٹیشنوں اور لارمی اڈوں پر خاص طور سے چسپاں کیے جانے لگے۔ اشتہار کے نیچے نام درج تھا ”رشید حید“ دراصل اس کا مصنف ونگا داس نامی ایک نوجوان تھا، جو ان دنوں لاہور ہسپتال روڈ پر مقیم تھا۔

کمال یہ ہے کہ ”لال ڈھنڈورا“ اس انداز سے تقسیم اور چسپاں کیا جاتا کہ پولیس کے تمام انتظامات کے باوجود کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔

کار سوزی کا سلسلہ منہور جاری تھا۔ حالانکہ اس کا ایک مجرم منرا پا چکا تھا۔

سندھ بھی کیا | ۱۶۔ جون کو حاجی سیٹھ عبداللہ ہرون کی کوشش سے سندھ یونائیٹڈ فرنٹ قائم کر دیا گیا۔ اور اس کے اغراض و مقاصد وہی تھے جو پنجاب میں یونینسٹ پارٹی

کے تھے۔

سید گیلانی کا استعفیٰ | راویپٹھی میں اتحاد ملت کے سرگرم کارکن سید سرور شاہ گیلانی نے اتحاد ملت سے استعفیٰ ہوتے ہوئے اپنے استعفیٰ میں کہا

” اتحاد ملت کے نزدیک اب حصول مسجد نہیں بلکہ کونسلوں کی ممبری زیادہ عزیز ہے۔ ان حالات میں میں اس جماعت سے الگ ہوتا ہوں۔“

حکومت پنجاب کا اعلان | جون کے دم توڑتے دنوں حکومت پنجاب نے اعلان کیا کہ

” ۱۵ جولائی کو مسجد شاہ چراغ مسلمانوں کے حوالے کر دی جائے گی۔“

ایکٹ ۱۹۳۵ء کی منظوری | ۳ جولائی ۱۹۳۶ء کو لندن سے ملک معظم نے جدید آئین کی منظوری دیتے ہوئے اعلان کیا

” نیا آئین (۱۹۳۵ء) آئندہ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے نافذ کر دیا جائے گا۔“

سکھ لیڈر کا اعلان | ۸ جولائی سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا کہ ” جب تک

کا نگریس شہید گنج کے متعلق سکھوں کی حمایت کا فیصلہ نہیں کرتی میں ہر اس سیٹ پر سکھ امیدواروں کی مخالفت کروں گا، جو کانگریس ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لے گا۔“

سرفضل حسین کا انتقال | ۷ جولائی کی صبح روزنامہ انقلاب نے چوکھ میں یہ خبر صفحہ اقل پر شائع کی کہ۔

” وزیر تعلیم پنجاب کی سابقہ بیماری پھر سے عود کر آئی ہے۔ قارئین ان کی صحت کے لیے دعا کریں۔“

لیکن ۹ جولائی رات ساڑھے دس بجے پنجاب کے وزیر تعلیم اور یونیورسٹی پارٹی کے

۱۔ یاد رہے تحریک مسجد شہید گنج کے ابتدائی دنوں میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور شاہی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ لاہور میں ایک اور مسجد بھی ہے جس پر حکومت کا قبضہ ہے وہ مسجد شاہ چراغ ہے۔ وہ بھی آزاد کرانی ہے۔“

رہنا اپنی طویل بیماری (دوم) کے باعث انتقال کر گئے۔ اتنا بڑا انا ایہ راجہوں۔  
 انسان نیند میں جو کہ بیماری کے عالم میں اپنے مستقبل کے کئی محل استوار کرتا ہے۔  
 میاں سرفضل حسین مرحوم بڑے زیرک سیاستدان تھے۔ اپنے حریف کو شکست دینے  
 کے لیے بساط پر اس انداز سے ہرے چنتے کو شکست خوردہ نہ تو ہاتھ کی شناخت کر سکتا  
 تھا اور نہ ہی فاتح کو مورد الزام دے سکتا تھا۔

میاں سرفضل حسین بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی زندگی میں  
 غیر ملکی حکمرانوں کے مخالف رہے اور ۱۹۱۹ء کی مارشل لا کے دنوں میں مجرم بھی ٹھہرائے  
 گئے تھے۔ مگر اپنی دانشمندی سے اس راہ سے ایسے فرار ہوئے کہ پھر انہیں انگریزوں کی  
 چوکھٹ پر ہی دیکھا گیا۔ وہ موت تک اسی تک و دو میں رہے کہ فرنگی راج کو کس طرح دوام  
 حاصل ہو۔ ایکٹ ۱۹۲۵ء کے تحت ہندوستان کو صوبائی خود مختاری ملنے لگی تو ان دنوں آپ  
 وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ مگر وزارت عظمیٰ کی خواہش لے کر پنجاب آن پیسجے اور  
 اپنے راستے کی تمام دیواریں ایک ایک کر کے گراتے چلے گئے۔ اس طرح انہیں یقین ہو گیا  
 تھا کہ ”اب میں ہی ہوں اور کوئی نہیں“ لیکن موت کا ایک دن متعین ہے۔

فطرت انسانی حرکات پر مسکراتی ہے، کہ باوجود آشنا ہو کر دیوانوں کی طرح صحراؤں میں  
 ریت کے محل تعمیر کر رہا ہے یہ جانتے ہوئے کہ تند و تیز ہوائیں آنکھ جھپکنے میں ان ریت  
 کے ذرات کو اڑا لے جائیں گی۔ پھر بھی اپنے ہیولے کے سائے کو پائیدار خیال کرتا ہے۔  
 اور جب اس دیوار میں دراڑ آنے لگتی ہے تو پھر سہارے ڈھونڈتا ہے۔ مگر تاجکے؟  
 سرفضل حسین کی موت سے ایوان حکومت میں صفت ماتم بچھ گئی۔ حکومت ہند کے  
 دفاتر بند کر دیے گئے۔ بہ دن حکومت نے ہائی دن کے طور پر منایا۔ روزنامہ ”القلاب“ نے  
 نماز جنازہ کی روک دین لکھا۔

” بٹالہ کے نواحی دیہات کے مسلمان بھی اپنے قائد اعظم اور اپنے حبیب القدر  
 ہموطن کی آخری عقیدت کے اظہار کے لیے آئے ہوئے تھے۔“

(ضمیمہ روزنامہ ”القلاب“ لاہور ۱۲ جولائی ۱۹۲۶ء)

یونینسٹ پارٹی کا نیا لیڈر | ۱۰۔ جولائی کو یونینسٹ پارٹی نے اپنے تخریبی اجلاس

میں سرفضل حسین کی جگہ رائے بہادر چودھری چھوڑ کر  
 کو یونینسٹ پارٹی کا عارضی لیڈر منتخب کر لیا۔ نیز سر سکندر حیات کو پنجاب واپس آنے کی  
 درخواست کر دی۔

اس اجلاس کے ساتھ ہی یونینسٹ پارٹی کے اندر خانہ جنگی اقتدار شروع ہو گئی۔ نواب  
 مظفر خاں اور سر سکندر حیات میں کشمکش تھی کہ پارٹی لیڈر کون بنے؟ سرفضل حسین مرحوم چونکہ  
 وزیر تعلیم تھے، اس پر بھی ٹکراؤ تھا کہ یہ عہدہ کون لے؟ نواب احمد یار خاں دو تانہ وزارت تعلیم  
 کے امیدوار تھے۔

مدیران "انقلاب" کو اپنا غم کھائے جا رہا تھا کہ وزارت تعلیم کا قلمدان اگر کسی غیر یونینسٹ  
 کے ہاتھ چلا گیا تو ان کا کیا بنے گا؟ پچاسچہ انہوں نے ۱۴ جولائی کی اشاعت میں اس پر ڈیرہ  
 لکھ مارا کہ یہ عہدہ یونینسٹ پارٹی کے ممبر کو ہی ملنا چاہیے۔

مجلس احوار کے نزدیک مرزائی چونکہ غیر مسلم تھے۔ اس اعتبار  
 سے ان کا ہر قسم کا مقابلہ چاہیے اور ضروری تھا۔ قومی اور ملکی

## مسلمانوں کا قبرستان

مسلمانوں کے علاوہ موت و حیات کے سلسلے میں بھی احوار کا موقف تھا کہ مرزائی کی لاش  
 قبرستان میں دفن نہیں ہونی چاہیے۔ آخر ۱۹ جولائی کو امرتسر میں بلا کا سنگھ کے  
 قبرستان میں ایک مرزائی کو دفن کرنے پر ہنگامہ ہو گیا۔ پولیس نے اس موقع پر مداخلت  
 کی۔ احوار رضا کاروں پر لاطھی چارج ہوا۔ گرفتاریاں ہوئیں، لیکن آخر کو مرزائی کی لاش ایک  
 دوسرے قبرستان میں دفن کی گئی جس میں امتیاز مذہب کے بغیر بچوں کو دفن کیا جاتا تھا۔

اس سے پیشتر ۵۔ جولائی کو پٹھانکوٹ میں مدیر انقلاب مولانا جہاںگیر ساکت کے والد منشی  
 غلام قادر کا انتقال ہوا تو مقامی احوار کارکنوں نے اس پر قدغن لگا دی کہ وہ انہیں مسلمانوں کے  
 قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیں گے۔ منشی غلام قادر پٹھانکوٹ میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری  
 رہ چکے تھے، لہذا میونسپل کمیٹی نے انہیں اپنی تحویل میں لے کر قبرستان سے باہر ٹرک کے کنارے  
 دفن کیا۔

احرار اور یونینسٹ کے مابین اختلاف کی لمبی لکیر تھی۔ اس ضمن میں روزنامہ انقلاب یونینسٹ پارٹی کا آفیشل آرگن تھا۔ وہ احرار کی ہر بات میں کیرے نکلنے کا عادی ہو چکا تھا۔

۵۔ جولائی کے حادثے کو مدیر انقلاب نے ہوا دینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن امر سر کے واقعہ کی آڑ میں اپنے دل کا غبار نکالا، گو اس کا روئے سخن دوسرا تھا۔ یعنی احرار کی عسکری قوت ایسا کہ زیر نظر کتاب کے گذشتہ اوراق میں آچکا ہے کہ احرار نے اپنے دفاع کے لیے رضا کاروں کی تنظیم کو شدت سے محسوس کیا اور اپنا عسکری نظام قائم کیا۔ جب تک احرار رہنماؤں کی گپڑیاں اچھلتی رہیں یہ خوش رہے۔ مگر جیسے ہی احرار رضا کاروں نے سنبھالا لیا۔ اور اپنے سیاسی جرنیوں کی گوشمالی شروع کی، تو مدیر انقلاب پیچھے ہٹے۔

۱۹۔ جولائی کے روزنامہ انقلاب نے احرار کے خلاف احرار کی عسکری تنظیم کے عنوان سے ادارہ لکھ دیا۔

۱۵۔ جولائی کو حکومت پنجاب کے ایما پر مقامی پولیس نے لاپپور **سودیشی نبی کی تلاش** مجلس احرار کے صدر حکیم نور الدین کے مکان پر چھا پہ مارا، انہیں "سودیشی نبی" نامی ایک پمفلٹ کی تلاش تھی، جو مرزا غلام احمد کے خلاف لکھا گیا تھا۔ مگر یہاں سے انہیں اس پمفلٹ کی کوئی کاپی دستیاب نہ ہوئی۔

۱۷۔ جولائی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت **مسجد شاہ چراغ کی واپسی** پنجاب نے مسجد شاہ چراغ خالی کر دی ہے۔ لیکن ابھی تک انجمن اسلامیہ نے اسے اپنے قبضے میں نہیں لیا۔ کیونکہ حکومت پنجاب نے مسجد کے سلسلے میں جو شرائط عائد کی ہیں وہ ایسی ہیں کہ انجمن کو منظور نہیں۔ شرط یہ ہے کہ اس مسجد میں کوئی مذہبی یا سیاسی جلسہ یا کوئی دوسری کارروائی نہیں ہو سکتی۔

۱۸۔ جولائی کو شملہ سے اطلاع آئی کہ سیٹھ عبداللہ ہارون **عبداللہ ہارون کا استعفیٰ** نے جو اسمبلی میں مسٹر جناح کے انڈینڈنٹ لیڈر تھے۔ مسٹر جناح کی موجودہ پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے مستعفی ہو گئے ہیں۔

امرتسر کے علماء کا فتویٰ | ۱۹ جولائی کو مرزائی کی لاش پر قبرستان میں جو ہنگامہ ہوا تھا اس میں اسرار کی تائید میں امرتسر کے علماء نے حضرت مولانا مفتی محمد حسین

کی معیت میں اس فتویٰ پر دستخط کیے کہ مرزائی چونکہ غیر مسلم ہیں، انہیں مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن نہیں کیا جاسکتا۔ علماء کا یہ فتویٰ ۲۰ جولائی کے جلسہ عام میں پڑھ کر سنایا گیا، جس کی صدارت مولانا عبدالحق غزنوی کر رہے تھے۔ اس جلسہ میں ۱۹ تاریخ کو قبرستان میں پولیس کے لاٹھی چارج اور رضا کاروں کی گرفتاری پر احتجاج کیا گیا۔

تحریک مدح صحابہ | متحدہ ہندوستان کے یہ دن سیاسی رہنماؤں کی مصروفیت کے اہم ترین دن شمار ہوتے ہیں۔ کانگریس اپنی انفرادی پالیسی کے

تحت دوڑ دھوپ میں تھی۔ مسٹر محمد علی جناح مسلم لیگ کے قلب میں نئی روح پھونک رہے تھے۔ جمعیتہ علماء نے ہند مسلم لیگ سے تعاون کو اپنے بہتر مستقبل کی سیڑھی سمجھے ہوئے تھے۔ مجلس احرار ہند تحریک مسجد شہید گنج سے زخم خوردہ ہونے کے باوجود پنجاب میں قائد اعظم کا سہارا تھی۔ یونینسٹ پارٹی اپنی بیچ پر رحبت پسند اور سرمایہ داروں کی نمائندگی کر رہی تھی۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف عنوانات سے ٹوٹی مسلمان غیر ملکی حکومت کی شرپرائیکشن کے ڈنڈے پر پیل رہے تھے۔ انہی دنوں یوپی کے شہر لکھنؤ میں تبرائیکٹیویشن کے مردے کو قبر سے نکال کر اس میں جان ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں مولانا فطرح علی انظر اپنی کتاب تحریک مدح صحابہ کے صفحہ ۵۵ تا ۶۰ پر لکھتے ہیں۔

”لکھنؤ کے شیعہ حضرات بھی جانتے تھے کہ مدح صحابہ کی تحریک کو تقویت دینے والی قوت شیعیان یوپی کی باہمی کشمکش بھی تھی۔“

لاہور سے بعض شیعہ احباب تحریک تبرائیکٹیویشن کے سلسلہ میں کام کرتے ہوئے لکھنؤ گئے اور لاہور واپس آکر انہوں نے مجھ سے اور دیگر احباب سے دوران گفتگو اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اب تو لکھنؤ کے شیعہ حضرات فرماتے ہیں کہ مدح صحابہ کے معاملے میں ہمارا جو محمود آباد اور سروریزیر حسن کے خاندان کی باہمی رنجش کا بھی دخل ہے۔



موجودہ مہاراجہ محمود آباد کے ایک بھائی ہیں، جو وزیر حسن کے خاندان سے  
 قرابتداری کے تعلق رکھتے ہیں۔ جب سابق مہاراجہ محمود آباد وفات پا گئے تو دونوں  
 بھائیوں میں تعلقہ کی وراثت کا قصہ چلا، جس کے سبب سے دونوں بھائیوں  
 اور ان کے طرفداروں میں رقابت ہو گئی۔ موجودہ مہاراجہ صاحب کو، جو مسلم لیگ  
 کے رکن رکن تھے اور ہیں، کامیابی ہوئی اور اس طرح ان میں اور سر وزیر حسن  
 کے خاندان میں ناچاقی ہو گئی۔ ہر دو فریق کے تعلقات سستی اجاب سے تھے  
 جیسے کہ ہر مقام پر صاحب اثر اور صاحب جائیداد لوگوں کے ہوتے ہیں۔  
 مہاراجہ محمود آباد نہیں چاہتے تھے کہ وزیر حسن کے فرزند سطر علی ظہیر لکھنؤ سے اسمبلی  
 کے ممبر منتخب ہو سکیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے دوست چودھری خلیق الزمان  
 کو، جو خود مسلم لیگ کے مقتدر لیڈر تھے، اور یو پی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی  
 کے لیڈر ہیں، سید علی ظہیر کے مطالبے پر کھڑا کیا۔

لکھنؤ کے سنی مدت کی باہمی کشمکش کے باوجود سید علی ظہیر کو اپنا نمائندہ  
 چننے رہے۔ لیکن اب ان کی شکست کے لیے سنیوں کو ان سے برگشتہ کرنے  
 کی ضرورت تھی۔ اس لیے شیعوں کی باہمی رنجش نے ایک فریق کو اس بات پر  
 آمادہ کیا کہ وہ شیعہ سنی کشمکش کو بڑھا کر اپنے حریف کو شکست دیں اور اس  
 بات کا انتظام ہو جائے کہ سنی علی ظہیر کو ووٹ نہ دیں، بلکہ چودھری خلیق الزمان  
 کے لیے امداد کریں۔

حالانکہ صدیوں پرانی اس تحریک کا اب کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن عقل عیار ہے سو  
 بھیس بھالیتی ہے۔ شیعہ عقیدہ رکھنے والوں نے لکھنؤ میں اپنی اکثریت کے مان پر خاندانی  
 رقابت کو استعمال کرنا ضروری سمجھا۔ اہل سنت نے اپنی جگہ اسلام کے بنیادی عقیدہ کی  
 محافظت میں خلفائے راشدین کا تحفظ جزو ایمان سمجھا۔ اس کشمکش میں جو ہاتھ پس منظر میں  
 کام کر رہا تھا اسے کسی نے نہ دیکھا۔ مدح صحابہ کی تحریک کیونکر وجود میں آئی اس سلسلہ میں  
 چودھری خلیق الزمان اپنی کتاب "شاہراہ پاکستان" کے صفحہ ۶۱۵ تا ۶۱۷ پر لکھتے ہیں کہ

”بدقسمتی سے ایک صاحب مقبول احمد نامی رام پور سے ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ آئے۔ اور انہوں نے نئے انداز سے شیعوں کو مخاطب کرنا شروع کیا۔ میونسپل اور دیگر انتخابات میں شیعہ سنی سوال کھڑا ہو جاتا تھا، جس سے شیعہ امیدواروں کو ناکامیابی ہوتی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر مقبول احمد صاحب کو اپنے مواعظ میں دلے ہوئے جذبات کو ابھارنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ اور یہ انہی کے مواعظ کا نتیجہ تھا کہ شیعوں کو اعتراض ہوا کہ سنی اپنے تعزینے تال کٹورے شیعہ کر بلا میں نہ لے جائیں، کیونکہ سنی تعزینوں کے ساتھ عشرہ کے دن کچھ ایسے اعمال بھی کرتے ہیں جو محرم جیسے دن کے لیے نہایت قبیح ہیں۔ سنیوں نے اپنی کر بلا پھول کٹورا کے نام سے لکھنؤ سے تین میل دور کاکوری روڈ پر ۱۹۰۳ء میں بنالی۔

اس تفریق سے لکھنؤ کے محرم کا رنگ جسے دیکھنے کے لیے ہندوستان بھر سے لوگ آیا کرتے تھے، نسبتاً بہت پھیکا ہو گیا۔

شیعہ کر بلا کچھ ویران سی ہو گئی اور سنی کر بلا آہ و بکا کے مظاہرے کی بجائے محض تماشا گاہ بن کر رہ گئی۔ مناقشات میں شدت اور تیز ہوئی تو شادی بیاہ بھی شیعہ اور سنیوں میں بند ہو گئے۔ طنے جلنے میں بھی آپس میں خلیج حائل ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے ۱۹۰۸ء میں ایک شیعہ سنی بلوا بھی ہو گیا۔ اور یہ اس شہر میں ہوا، جہاں اس وقت تک کوئی ہندو مسلم فساد بھی نہیں ہوا تھا۔“

اس واقعہ کو مولانا مظہر علی اظہر اپنی کتاب ”تحریک مدح صحابہ کے ص ۲۳ تا ۲۹ میں یوں رقمطراز ہیں

” ۱۹۰۵ء سے قبل لکھنؤ میں شیعہ سنی اور ہندو اکٹھے مراسم تعزیر داری ادا کرتے تھے اور مجالس اور جلوسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں باہر سے واعظ آئے، جن میں سے ایک شیعہ عالم کے متعلق سنیوں کو ہمیشہ شکایت رہی کہ انہوں نے اختلاف کی بنیاد ڈالی۔

بہر حال ابتداءً لکھنؤ کے شیعہ اور سنی باہمی کشمکش کے در پر نہ تھے بلکہ جو کچھ ہوا بیرونی اثرات کے تحت ہوا۔ وہ اثرات آمدہ تھے یا آوردہ اس کا اندازہ

مجھ سے بہتر لکھنؤ کے حالات جاننے والے لگا سکتے ہیں۔

۱۹۰۴ء تک شیعہ سنی اور ہندو تعزیر کے جلوس میں شامل ہو کر تال کٹورا

کی کر بلا میں جاتے تھے۔ اس وقت تک کئی پشت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ کچھ لوگ ننگے سر اور ننگے پاؤں جلوس میں شامل ہوتے اور کچھ لوگ سر پر ٹوپی اور پاؤں میں جوتا پہن کر جلوس کے ہمراہ ہوتے تھے۔ اور کر بلا تال کٹورا میں جاتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں محرم کے موقع پر بظاہر شیعوں کے ایما پر یہ حکم دیا گیا کہ کوئی

شخص جو پابندی اور سربرہمنہ نہ ہو وہ کر بلا تال کٹورا میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس حکم کے ساتھ اور پابندیاں بھی تھیں۔

سنی حضرات نے ان احکام پر الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی تیس برس

سے زیادہ مدت کی ایک غلط فہمی ہے کہ سنی حضرات نے ان امور پر الگ ہونے

کا فیصلہ کیا۔ بلکہ ۱۹۰۵ء میں جب یہ احکام نافذ ہوئے تو سنیوں نے علیحدگی

کا کوئی مطالبہ نہیں کیا بلکہ ۱۹۰۵ء کا محرم جیسے ہی ہوا۔ خواہ سنیوں اور ہندوؤں

نے احکام کو پسند کیا یا نہ کیا، امن سے گذر گیا۔

۰۔ جس چیز پر سنیوں کو اعتراض تھا وہ یہ تھی کہ کر بلا میں ننگے سر اور ننگے سر

جانا چاہیے۔

۰۔ فاتحے کی سی صورت سب کے لیے بنانا ضروری ہے۔

۰۔ جلوس میں سوائے ماتم کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“

غرضیکہ ایسی چیزیں جن سے جلوس میں خالص شیعہ طریق رسم کا غلبہ ہو

ان پر سنی رضا مند نہ تھے۔ چنانچہ سنیوں کا ایک وفد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لنگرپڑا

کے پاس ان پابندیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

نے ان پابندیوں کے بارے میں معذوری کا اظہار کیا اور ان سے کہا کہ اگر وہ

بھی اپنی علیحدہ کر بلا کا انتظام کر لیں تو جداگانہ جلوس کا انتظام کر دیا جائے

گا۔ چنانچہ سنیوں نے لکھنؤ سے قریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ایک اراضی کا

بطورِ کربلا کے انتظام کیا اور اس کی اطلاع ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دے دی اور وہاں پر تحریروں وغیرہ لے جانے کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انتظام کر دیا۔

سابقہ کربلا کا نام تال کھورا تھا اور نئی کربلا کا نام پھول کھورا رکھا گیا۔ شیعوں اور شیعہوں کے دونوں جلسوں کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مختلف راستوں اور مختلف اوقات مقرر کر دیے۔ تاکہ باہم تصادم نہ ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں ہر دو جلسوں علیحدہ علیحدہ نکالے گئے۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ شیعوں کی شیعہوں سے علیحدگی اور شیعوں کے تعزروں کے لیے نئے راستوں کا تعین اور ان کے لیے نئی کربلا کا تقرر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کے ارشادِ گرامی کا رہن منت ہے۔

یہاں پر صاحبِ فہم یہ دریافت کرے گا کہ کوئی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایسا اہم قدم اپنی ذمہ داری پر اٹھا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسی تجویز کے لیے صوبہ کی حکومت کی منظوری شرطِ اول ہے اور کوئی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب اختیار ہونے کے باوجود حالات موجودہ میں اس قدر اہم تغیر اپنے افسرانِ اعلیٰ کے مشورہ اور ان کی رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور یو پی کی حکومت نے ایسا کیوں کیا؟۔ یہ وہی بتا سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی دو غالب قوموں کے **پنہائے قساو** درمیان خلیجِ حائل کرنے اور انہیں باہم متصادم کرانے کی حکمتِ عملی سے فارغ ہو کر مسلمانوں کو متحارب گروہوں میں تقسیم کرنا بھی اپنی تقاریر کے لیے ضروری سمجھا۔ چنانچہ قادیانیوں کی تخلیق اور ان کے نئے مذہب کی بنیاد، اس کے ساتھ ساتھ شیعہ اسمی اختلافات اور اہل حدیث کو لفظِ وہابی میں تبدیل کر کے تقریباً ڈیڑھ سو سال جو تماشہ انگریزوں نے متحدہ ہندوستان میں کیا اس کی مثال تاریخِ عالم میں شاید ہی کہیں مل سکے۔

۲۰۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو حکومتِ یو پی نے شیعوں کی اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا۔ مٹر گپٹ اس کمیشن کے صدر تھے۔ اس بنا پر تاریخ میں یہ گپٹ کمیشن کے نام سے

معروف ہے۔ اس نے، جنوری ۱۹۰۹ء کو اپنی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کی۔ جس میں  
کہا گیا کہ

۱۔ آئندہ تعزیر کے جلوس کو شیعہ سنی جلوس کی بجائے صرف تعزیر کا جلوس  
کہا جائے۔

۲۔ پھول کٹورا اور تال کٹورا جانے والے تعزیرے ایک ہی راستے پر چلیں اور  
آگے جا کر اپنی اپنی کربلا کو چلے جائیں۔

۳۔ عشرہ محرم، چہلم اور ۲۱۔ رمضان کے دنوں مدح صحابہ پر پابندی عائد کر دی  
اس کی وضاحت میں کہا گیا کہ ان تین دنوں میں کوئی شخص ایسے اشعار

یا نظمیں نہ پڑھے، جن میں (حضرت) ابوبکر، (حضرت) عمر اور (حضرت) عثمان  
کی تعریف یا مدح کی گئی ہو۔ یہاں تک کہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نہیں کہہ سکتا۔

۴۔ اشعار یا نظمیں تعزیوں یا کسی اور اسلامی جلوس کے راستے میں نہ پڑھے  
جائیں۔ اور کسی ایسی جگہ بھی نہ پڑھے جائیں، جہاں سے جلوس تک ان اشعار

کی آواز پہنچ سکے۔

۵۔ کسی مجمع یا پبلک مقام پر ایسے مدحیہ اشعار نہ پڑھے جائیں۔

۶۔ اگر کسی شخص نے مذکورہ بالا احکام کی خلاف ورزی کی تو اسے فوراً گرفتار  
کر لیا جائے گا۔ اور اس پر دفعہ ۲۹۸ یا کسی اور مناسب دفعہ تعزیرات ہند کے

تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔

گپٹ کمیشن کی تائید میں حکومت یوپی نے حسب ذیل بیان جاری کیا۔

” بہت پر جوش سنی کے لیے بھی اس امر پر استدلال کرنا ممکن نہیں کہ لکھنؤ

میں ان کے ہم مذہبوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

کی شہادت کی یادگار میں جو جلوس لکھنؤ کی سڑکوں پر نکالے جاتے ہیں اور جن

میں شرکت کی اس کو اجازت دی گئی ہے، ان جلوسوں کو بے وقوف اور بلا اختیاراً

حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی مدح سزائی کے جلوس میں تبدیل کر دے

کیشن کی اکثریت کی رائے جس سے لفٹیننٹ گورنر کو کئی اتفاق ہے یہ ہے کہ اس خوابی کو اس حد تک دور کیا جائے جہاں تک کہ اس سے کوئی غیر ضروری مداخلت سُنیان لکھنؤ کے اس حق میں نہ ہو، جو ان کو ہر مجبوسی کی رعایا ہونے کی حیثیت سے تمام دیگر رعایا کے ساتھ حاصل ہے کہ وہ مناسب مقامات کے اوپر اپنے عقائد کے خصوصی اصولوں کا اعلان کریں۔ اگر سنی گواہان، جن کی شہادت کینیڈا کے سامنے ہوئی ہے ان کا ہر لفظ بھی مان لیا جائے پھر بھی یہ سوال باقی رہے گا کہ جس کی وجہ سے لکھنؤ کے محرم کا طریق کلیتہً بدلنے کا اندیشہ ہے۔ وہ کسی ایسی کارروائی سے رنج ہو سکتی ہے کہ جو تجویز متذکرۃ الصدر سے کم ہو۔

پیراگراف ۱۲: مذکورہ بالا بحث سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ گپٹ کیشن اور حکومت یوپی نے محض تین ایام یعنی عشرہ محرم، چہلم اور ۲۱۔ رمضان کو مدح صحابہ پر پابندی عائد کی ہے۔“

(تحریک مدح صحابہ ص ۳۳ تا ۲۵)

اس کے برعکس شیخان لکھنؤ کا مطالبہ تھا کہ ۲۸۔ ذوالحجہ سے ۸۔ ربیع الاول تک جب تک وہ (شیخ) مراسم عزہ دارنی ادا کرنے میں مصروف ہوں مدح صحابہ بالکل بند کر دی جائے۔ مذکورہ بالا واقعات نے ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں ایسی شکل اختیار کی کہ ذمہ دار شیخ حضرات محض ایکشن جیتنے کے لیے کھلم کھلا حالات کے بگاڑ پر اترائے۔ اس پر یوپی مجلس احوار نے مداخلت مناسب سمجھی۔ کیونکہ لکھنؤ کے بازاروں میں صحابہ کرام کی توہین ہونے لگ پڑی تھی۔

مرکزی مجلس احوار نے یوپی مجلس احوار کی رپورٹ پر اس قضیے پر غور شروع کیا تو اس دوران حالات مزید خراب ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ اس کے پس منظر میں شیخ امراء اور حکومت کی سیاسی ضرورت کارفرما تھی۔ یہ حالات یہاں تک بڑھ گئے کہ اگر کوئی شخص گھر میں یا چار دیواری میں صحابہ کرام کو رضی اللہ عنہم بھی کہے تو اسے بھی گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اکثر احوار کارکن اس سلسلہ میں گرفتار ہوئے۔ لیکن اجتماعی سول نافرمانی یا مدح صحابہ کی تحریک کا کسی کو گمان تک نہیں تھا۔ حکام کو بھی یقین تھا کہ احوار نے شہید گنج میں

سول نافرمانی نہیں کی لہذا وہ اس تحریک میں بھی عملی طور پر آگے نہیں آئے گی۔ لیکن یوپی مجلس احوار نے مرکز کے مشورے پر تحریک سول نافرمانی شروع کر دی اور ۱۰ جولائی ۱۹۳۶ء کو ذمہ دار احوار کارکن مدح صحابہ پڑھ کر گرفتار ہونا شروع ہو گئے۔ احوار رضا کار حسب ذیل شعر پڑھتے اور انہیں گرفتار کر لیا جاتا۔

جن کا ڈنکا بج رہا ہے چار سو لیل و نہار

وہ ابوبکر و عمر و عثمان و حیدر چار یار

اس سے پیشتر یہ تحریک جمعیتہ علمائے ہند کی تحویل میں آئینی انداز میں چل رہی تھی۔ یوپی میں جمعیتہ علمائے ہند کا بھی خاصا اثر تھا اور وہ آئندہ الیکشن میں مسلم لیگ سے اتحاد کر رہی تھی۔ لہذا اس نے اپنی طاقت کو منتشر کرنا مناسب نہ سمجھ کر یہ تحریک صوبائی مجلس احوار کے سپرد کر دی۔

**سکندر حیات کی آمد** | جلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ سرفضل حسین کی موت کیا ہوئی کہ

سرفضل حیات کے لیے میدان صاف ہو گیا۔ اور وہ جھٹ سے

لاہور پہنچ گئے۔ ۲۳ جولائی کو یونینسٹ پارٹی کا اجلاس سرفضل حیات کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں ایک سو پچاس ارکان نے شرکت کی اور تیس کے قریب پنجاب کونسل کے ممبر بھی آئے ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے سرفضل حیات نے کہا۔

”سرفضل حیات کے بعد سرفضل حسین دوسرے آدمی تھے۔ اب ان کی موت کے بعد

مسلمانوں میں کوئی لیڈر ایسا نظر نہیں آتا، جو ملت کی رہنمائی کر سکے“

اس اجلاس میں سرفضل حیات کو یونینسٹ پارٹی کا مستقل لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ اس سے ایک روز پیشتر آپ نے گورنر پنجاب سے ملاقات کر کے یونینسٹ پارٹی سے متعلق مشورہ کیا۔ اور ۲۴ جولائی کو سرفضل حسین کی جگہ سرفضل شہاب الدین کو وزیر تعلیم مقرر کر دیا گیا۔ سرکاری طور پر یہ اعلان ۲۶ جولائی کے اخبارات میں آیا۔

۲۶ جولائی کے روزنامہ ”انقلاب“ لاہور نے سرفضل حیات کو پارٹی کا لیڈر نامزد ہونے پر سرفضل حیات کو قائد اعظم کا خطاب دیا۔ یاد رہے یہی خطاب سرفضل حسین کو دیا گیا تھا۔

متحدہ محاذ | ۲۷ جولائی کو لاہور برکت علی ہل میں اجراء اور مسلم لیگ کا پنجاب کے لیے متحدہ محاذ قائم کر دیا گیا۔ اس فیصلے میں دونوں جماعتوں کے پارلیمانی ممبر

شریک ہوئے۔ صدارت میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ نے کی۔ بورڈ نے سترہ آدمی مزید پارلیمانی بورڈ کے لیے نامزد کیے۔ اس اجتماع میں چندہ فراہم کرنے کے لیے کمیٹیاں بھی بنائی گئیں اور فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کی بہر نشست پر محاذ اپنے آدمی کھڑے کریگا۔

کانگریس اور ہندو مہا سبھ | ٹائمز آف انڈیا نے شملہ سے اطلاع دی کہ سرگوبھل چندا رنگ صدر ہندو

مہا سبھ کی رائے ہے کہ وہ براہ راست کانگریس سے مقابلہ نہ کرے بلکہ یونینسٹ پارٹی کے امیدواروں کی کانگریس کے مقابلہ کرے۔ اس کے برعکس سندھ کے ہندوؤں نے فیصلہ کیا کہ وہ کانگریس کی سخت مخالفت کریں گے۔ اس کے لیے بھائی پرمانند ڈاکٹر مونسجے اور دیگر ہندو بھائی لیڈروں کو سندھ آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ کانگریس نے سندھ میں ہندو بھائی کا مقابلہ کرنے کے لیے ڈاکٹر خاں صاحب، بابو راجندر پرشاد اور بھولا بھائی ڈیسیائی کو سندھ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

مولانا ظفر علی خاں کی تقریر | مجلس اتحاد ملت کے صدر مولانا ظفر علی خاں نے ۳۰ جولائی کو

پٹنہ میں اخباری نمائندوں سے ملاقات کے دوران کہا: "ممكن ہے اتحاد ملت کے طرز عمل سے کانگریس کو کوئی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہو۔ میں اس غلط فہمی کو واضح الفاظ میں رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتحاد ملت ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جو ہندوستان کے لیے ممکن آزادی کی طرف اشارہ ہو۔ مگر اس قسم کی مجلس کا قیام کانگریس کے راستے میں روٹے نہیں اٹکا سکتا۔ کیونکہ کانگریس بھی ملک کو آزاد کرانے کے اصولوں پر کاربند ہے اور ہم آخری سمجھوتے کے لیے میدان صاف کر رہے ہیں۔"

روزنامہ "انقلاب" یکم۔ اگست ۱۹۳۶ء

یونائیٹڈ پریس کی اطلاع | جیسے کہ یہ اطلاع آچکی ہے کہ ۱۰ جولائی کو مجلس اجراء یوپی نے مدح صحابہ پر پابندی کے خلاف سول تافرمانی شروع کر رکھی ہے



۳۱۔ جولائی کو لکھنؤ کے مسلمانوں نے دفعہ ۴ کی خلاف ورزی میں ایک جلوس نکالا۔ یہ دفعہ مدح صحابہ کو نئے والوں پر لگائی گئی ہے۔ کیونکہ اس سے شیعوں فریقہ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ لیکن مجلس احرار نے اس دفعہ کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

جلوس کے دوران ایک گولہ چھٹا، جس سے کئی نشتی مسلمان زخمی ہوئے۔ آج کا جلوس چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے اکثر کو گرفتار کر لیا گیا۔ شہر میں مسلسل گرفتاریوں کے خلاف بطور احتجاج کے کئی روز سے ہڑتال ہے اور کسی قسم کا کوئی کاروبار نہیں ہو رہا۔

۲۲۔ اگست کو مسٹر ستیہ مورتی نے اسمبلی کے اجلاس میں ایک تحریک **اسمبلی میں تحریک التوا** التوا کا نوٹس دیا، کہ

» حکومت نے دیدہ دانستہ ریزورٹنگ کے ایک ڈپٹی گورنر (سر سکندر حیات) کو

پنجاب میں اپنی پارٹی کے لیے سیاسی پروپیگنڈا کرنے کی کیوں اجازت دی؟

۴۔ اگست کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ آل انڈیا مجلس احرار کے صدر مولانا حبیب الرحمن کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ جبکہ صاحبزادہ فیض الحسن سجاد نشین آلودہ کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

۱۰۔ اگست کے روزنامہ انقلاب لاہور نے یہ خبر شائع کی کہ اس قسم کی افواہ عام ہے کہ یونینسٹ پارٹی کو مزید مضبوط کرنے کے لیے سر سکندر حیات اور مندوہا سبھا کے رہنما سر گوگل چند نارنگ کے درمیان کوئی سیاسی سمجھوتہ ہونے والا ہے۔

حکومت پنجاب نے انتخاب کے سلسلے میں ابھی سے تیاریاں شروع **قبل از مرگ واویلا** کر دی ہیں۔ خصوصاً یونینسٹ پارٹی کے مخالفین کے لیے ایک سرکل

تمام مجسٹریٹوں کو بھیج دیا گیا کہ وہ الیکشن پروپیگنڈہ کے لیے پوری طرح تیار رہیں۔ اور اس سلسلے میں اگر انہیں بغاوت کا امکان ہو یا فرقہ وارانہ حالات پیدا ہونے کا ڈر ہو تو انہیں دبانے کے لیے دفعہ ۱۲۴ الف، ۱۵۱، ۱۰۷، ۱۰۸ ضابطہ نویداری سے گریز نہ کیا جائے۔

۳۔ اگست کو لکھنؤ میں چودھری خلیق الزمان نے علیہ نام کی عداوت کرتے **تحریک رواں** ہوئے حکومت کے اس فعل کی مذمت کی کہ وہ مسلمانوں کو صحابہ کی مدح کرنے

سے روک رہی ہے۔ جلسے کے اختتام پر میں احوار کارکنوں نے صحابہ کی مدح میں یہ شعر پڑھا۔  
 ہمیں کرنیں ایک ہی مشعل کی جو بکرو عمر عثمان علی  
 ہم مرتبہ ہیں یاران نبی کوئی فرق نہیں ان چاروں میں  
 اس پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

۴۔ اگست کو لکھنؤ میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا اجلاس  
 یوپی پارلیمانی بورڈ کا اجلاس  
 راجہ سلیم پور کی صدارت میں سلیم پور ہاؤس میں ہوا۔ جس  
 میں راجہ محمود آباد، مولانا شوکت علی، نواب اسماعیل خاں اور نوابزادہ لیاقت علی خاں نے خاص طور  
 پر شمولیت کی۔ اجلاس کے شروع میں نوابزادہ لیاقت علی خاں رکن نیشنل ایگریکلچر پارٹی، اجلاس  
 سے واک آؤٹ کر گئے۔

یہ مظاہرہ امنوں نے مسٹر جناح کی موجودہ پالیسی کے خلاف بطور احتجاج کیا۔ کیونکہ اس  
 اجلاس میں فیصلہ ہونے والا تھا کہ ۱۵-۱۶ اگست کو صوبہ بھر کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجلاس  
 بلا یا جائے اور اس اجلاس کے افتتاح کے لیے مسٹر محمد علی جناح کو دعوت دی جائے۔  
 بورڈ میں اس فیصلے پر سخت اختلاف پایا گیا۔ اس اجلاس میں یہ افواہ بھی گشت کر رہی تھی  
 کہ راجہ سلیم پور اور راجہ محمود آباد نے نیشنل ایگریکلچر پارٹی سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔  
 (دیونائیٹڈ پریس ۵۔ اگست ۱۹۳۶ء)

بنگال کے ہندوؤں نے گذشتہ کئی ماہ سے کمیونل ایوارڈ  
 بنگال کے ہندوؤں کو جواب  
 کے خلاف تحریک شروع کی ہوئی ہے کہ انہیں اس  
 قانون سے سخت نقصان پہنچنے کا احتمال ہے، لہذا اسے فوراً بدل دیا جائے۔ اس کے لیے  
 ہندوؤں کا ایک وفد بھی انگلستان گیا کہ وزیر ہند سے مل کر یہ درخواست کریں۔ لیکن ۴ اگست  
 کو بنگال کے گورنر کی طرف سے اس کا جواب وصول ہوا۔  
 » وزیر ہند نے کہا ہے کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کمیونل ایوارڈ میں کوئی تبدیلی  
 نہیں کرے گی۔ اور وہ اپنی پالیسی پر قائم ہے۔«

مدارس کے مسلمان | مدرس کے مسلم اکابر کی ایک کانفرنس ۷ اگست کو منعقد ہوئی! اس میں ایک ممبر کی یہ تجویز دیر تک زیر بحث رہی کہ اس جماعت کے رکن کسی

غیر مسلم پارٹی کے ساتھ اتحاد نہ کریں۔ مگر اس تجویز کی سخت مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ مسلمانوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اپنے سیاسی فائدے کے لیے مشترک پارٹیوں میں شریک ہوں۔ مذہب یا فرقہ کی بنیاد پر پارٹی بنانا سراسر نامناسب ہوگا۔ (روزنامہ انقلاب ۹ اگست ۱۹۳۶ء)

تواثر زیادہ لیاقت علی خاں کا استعفیٰ | ۷ اگست کو تواثر زیادہ لیاقت علی خاں نے حسب ذیل بیان کے ذریعے مسلم لیگ کے منتخب پارلیمینٹری بورڈ

سے استعفیٰ ہونے کا اعلان کر دیا۔

۵۔ مسٹر خاج نے پارلیمینٹری بورڈ میں صرف ایک خیال کے لوگوں کو کثرت سے بھر دیا ہے، جن کا کوئی وقار قوم میں نہیں ہے اور ان لوگوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں۔ اور انتخاب میں الیکشن کے ذریعے آئے ہیں۔ میرا ایسے بورڈ میں ہونا فضول ہے، جس میں اکثریت اس ایک پارٹی کے ممبران کی ہو، جو عرصہ دراز سے مسلمانوں سے دور ہیں۔ اور اپنے اپنے پھوڑوں کو لیگ کا ٹکٹ دلو کر مسلمانوں میں رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں مل کر کے ایک ساتھ ووٹ دیتے ہیں۔ اس لیے میرا اس بورڈ کا ممبر ہونا بیکار ہے۔ میں اس میں شریک نہیں رہ سکتا۔ اور اس کو ملک و ملت کے خلاف سمجھتا ہوں۔

لہذا میں استعفیٰ دیتا ہوں۔ ”(نامہ اعمال“ حصہ اول ص ۶۸۳-۶۸۴)

بے بنیاد افواہیں | انتخابات کے دنوں اور زمانہ جنگ میں عوام پر اثر انداز ہونے کے لیے افسانے اور جھوٹ کی عمارت استوار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ ایک ایسا

فن ہے، جس میں دلائل سے زیادہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جھوٹ بولنے والا دانشور ہو تو افواہ کے تمام قلعے حقیقت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ سراسر دور سے سمندر دکھائی دینے لگتا ہے لیکن قریب پہنچ کر ریت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ہنوز انتخابات میں چھ ماہ کا عرصہ پڑا تھا، مگر یار لوگوں نے افواہوں کی ایسی آندھیاں مٹھائیں

کہ سچائی بیٹھ کر رہ گئی۔ کاغذ کے پھولوں پر ایسا جھڑکا کہ لالہ گل شرم محسوس کرنے لگ پڑے۔  
انسانے پر حقیقت کا ایسا رنگ چھایا کہ وہ حقیقت معلوم ہونے لگا۔  
اس ضمن میں اگست کے وسط کی دو خبریں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ”نئی دہلی کی اطلاع۔ دہلی کے مقتدر لیڈروں (نام کسی کا نہیں بتایا گیا) دیگر  
مسلم زعماء کے نام ایک خط لکھا کہ ہیرائی نس سر آفاخاں کی زیر صدارت ایک اور  
آل انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی گئی ہے۔ اس ضمن میں کہا گیا ہے کہ سر  
آفاخاں نے یہ جواب دیا ہے: ”میں مسلم قوم کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہوں  
مگر میں مسلمانوں کو ایسی کانفرنس طلب کرنے کی دعوت کو حتی بجانب قرار نہیں دیتا۔ اگر  
سر سکندر حبیبیا مقتدر لیڈر اور دوسرے بار سوخ پنجابی، سندھی، بنگالی اور سرحدی مسلمان  
قائدین جنہیں انتخابات کے بعد اکثریت کا یقین ہو۔ اگر ایسی کانفرنس کے انعقاد کی  
دعوت دیں تو میں یقیناً کانفرنس میں شریک ہوؤں گا۔“

۲۔ لاہور۔ ۱۲ اگست پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ خطرات سے دوچار ہے۔  
سر محمد اقبال نے جو بورڈ کے صدر ہیں، اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہے۔ بورڈ کا ایک  
اجلاس پنج شنبہ کے دن طلب کیا گیا ہے، تاکہ صورت حال پر غور کیا جاسکے۔

اندازہ کیا جا رہا ہے کہ اس صورت حال کے پیچیدہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے  
کہ مسلم لیگ اور احوار کے ارکان میں اس قدر اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ احوار  
کی رائے ہے کہ جس حلقہ انتخاب میں کامیابی کی امید ہو وہاں بورڈ کے ممبر پر  
احوار اپنا نمائندہ کھڑا کرے۔ احوار کی اس تجویز سے شہرہ پور ہے کہ مسلم لیگ کو  
لاہور کے صرف دو حلقوں تک محدود رہنا پڑے گا۔ باقی شہری حلقے احوار اپنے  
پاس رکھے گی اور اس بارے میں بورڈ کے ممبر سے فائدہ اٹھائیں گے۔“

(روزنامہ انقلاب، ۱۳-۱۴ اگست ۱۹۳۶ء)

مندرجہ بالا دونوں خبروں سے اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ رحبت پسند طبقہ اور ان کی  
صحافت ان دنوں برطانوی استعمار کے مستقبل کی ضمانت کس طرح فراہم کر رہے تھے۔ حالانکہ

تاریخ کے کسی گوشے میں سرآغا خاں کا مندرجہ بالا خط یا اس کا کوئی منہ نہیں تھا اور نہ ہی اس وقت تک احرار کے ذہن میں ایسی کوئی تجویز تھی۔ لیکن جھوٹ بنانے والوں کے قربان جانیے کہ محض اپنے دانے دنگے کے لیے شفاف پانی کو کس طرح گدلا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

**حکومت حجاز کو تشویش** | از عمائے احرار نے حکومت حجاز کے برطانوی کمپنیوں سے کان کنی کے معاہدے پر جس تشویش کا اظہار کیا تھا اور انہیں جس طرح کے

خدشات تھے۔ حسب ذیل خبریں اس کی تائید کرتی ہیں۔

○ ”حکومت برطانیہ جزیرہ بحرین کے شیوخ کو متحد کرنے اور انہیں ایک نظم منسک کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ حکومت حجاز کو برطانیہ کے اس اقدام سے سخت تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ سلطان ابن سعود نے اس جدید صورت حال پر غور کرنے کیلئے اپنی سلطنت کے امراء کی مجلس مشاورت طلب کی ہے۔ اس میں شیوخ کے اس اتحاد کے نتائج پر سرحدی مسائل کی روشنی میں غور کیا جائے گا۔“

○ ”امیر بحرین شیخ اسمعین عسلی انگلستان کا ایک وسیع سفر کر کے واپس بحرین پہنچ گئے ہیں۔ اگرچہ امیر بحرین کا یہ سفر پرائیویٹ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس سفر میں امیر بحرین کے اور برطانیہ کے مفید رہنماؤں کے ساتھ مل کر کو زیادہ پر رونق بنانے کے امکان پر بحث کی گئی ہے۔“

مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امیر کے ایک بلند حوصلہ دار نائب ایک نہایت ہی وسیع بیان سے پریس گاسٹ اور ایک روزنامہ شائع کرنے کا ارشاد کیا ہے۔ جس کے لیے مشر سے خاص طور پر ایک اخبار نویس کو مقرر کیا گیا ہے۔ تاکہ پروپگنڈہ کا کام شروع کر دیا جائے۔“ (روزنامہ انقلاب، ۱۲ اگست ۱۹۵۲ء)

**پنجاب پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس** | لاہور، ۱۲ اگست کو برکت علی محطون ہال میں پرنسپل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس ملک برکت علی کی صدارت میں ہوا جس میں قریباً چالیس افراد نے شرکت کی، جن میں سے کچھ نام یہ ہیں۔

۱۔ ان دنوں مصر پر انگریز کا اثر تھا۔ ۲۔ ابھی دیکھئے اور کیا ہوتا ہے۔ مصنف

غلام رسول خاں ایڈووکیٹ، سید عطار اللہ شاہ بیرسٹر جالندھر، ملک محمد بن ایڈووکیٹ  
 خان بہادر ملک زمان مہدی خاں، میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ، میاں عبدالحمید بیرسٹر، ڈاکٹر خلیفہ  
 شجاع الدین بیرسٹر، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ، شیخ اکبر علی ایڈووکیٹ، چودھری افضل حق ایم ایچ  
 (اوجڑا) شیخ حسام الدین بی۔ اے (اوجڑا) میر عبدالقیوم پیٹریڈا (اوجڑا) صاحبزادہ فیض الحسن سجاولہ  
 آلوہار (اوجڑا) چودھری عبدالعزیز بگھو والیڈا (اوجڑا) خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لاہور (اوجڑا)  
 مولانا منظر علی انظر ایڈووکیٹ (اوجڑا)۔

اجلاس کے ابتداء میں ڈاکٹر اقبال کی ایک چٹھی پیش کی گئی، جس میں ان کے استعفیٰ کا کوئی  
 ذکر تک نہیں تھا۔ بلکہ اخبار انقلاب کی خبر کو غلط قرار دیا گیا تھا۔ اجلاس میں ایک سب کمیٹی ترتیب  
 دی گئی۔ جس کے ذمہ تھا کہ وہ امیدوارین اسمبلی کے حلف نامے کا مسودہ تیار کرے۔ اس کمیٹی میں  
 ڈاکٹر اقبال، ملک زمان مہدی، غلام رسول، چودھری افضل حق اور مولانا منظر علی انظر شامل تھے۔  
 لیکن بعد میں چار مزید ممبران کا اضافہ کیا گیا، جن میں مولانا حبیب الرحمن، میاں عبدالحمید، ملک  
 برکت علی اور عاشق حسین ٹٹاوی تھے۔  
 (مسلم نیوز سروس)

مولانا ابوالکلام آزاد کا جواب | تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلے میں منتخب امیر پیر جماعت علی شاہ  
 کے حج پر چلے جانے کے بعد ماہ رواں کے پہلے ہفتے شاہی مسجد

لاہور میں ایک جلسے کے دوران مسٹر عزیز مہدی نے امیر ملت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کا نام  
 تجویز کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا آزاد نے عزیز مہدی کے نام حسب ذیل مراسلہ ارسال کیا۔

” لاہور کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ بعض حضرات نے ایک جلسہ میں یہ تجویز پیش  
 کی ہے کہ کوئی امیر منتخب کرنا چاہیے۔ اور اس کے لیے میرا نام پیش کیا گیا ہے۔  
 میں ان صاحبوں کا ہلکا گزار ہوں لیکن بتانا چاہتا ہوں کہ اس طرح مسائل حل  
 نہیں کیے جاسکتے۔ البتہ ایک بات ضرور کی جاسکتی ہے، یعنی ان کی منسی آرائی  
 جاسکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حضرات کو اس کا خواہش مند نہیں ہونا چاہیے۔  
 ان صاحبوں کو شاید معلوم نہیں کہ میں اب سے پندرہ برس پہلے نہ صرف  
 اس پر غور و فکر کر چکا ہوں، بلکہ بطور ایک انتہائی تجربے کے ایک صوبے میں

اسے قائم بھی کر چکا ہوں۔ بائیں سہ ماہی ۱۹۲۳ء میں مجھے یہی رائے قائم کرنا پڑی کہ موجودہ حالات میں اس طرح کے کسی نظام کی مزید سہ ماہی سود مند نہ ہوگی۔  
بہر حال اگر میری رائے سے انہیں اتفاق نہ ہو تو ایک بات انہیں یاد رکھنی چاہیے۔  
وہ یہ کہ اس سلسلے میں میرا نام نہ تجویز کیا جائے۔

(ابوالکلام آزاد کلکتہ۔ ۱۳۔ اگست ۱۹۲۶)

حلف نامہ | مسلم لیگ پارلیمینٹری بورڈ کی طرف سے اسمبلی میں جانے والے ممبران یا الیکشن میں بطور امیدوار کے حصہ لینے والوں کے لیے حسب ذیل حلف نامہ تیار کیا گیا۔

۱۔ بخدمت آنری سیکرٹری پروڈنشل مسلم لیگ پارلیمینٹری بورڈ لاہور میں اپنے کو آئندہ اسمبلی کے انتخابات کے لیے حلقہ..... کے لیے پیش کرتا ہوں۔  
ب۔ میں مبلغ پچاس روپے بذریعہ متی آرڈر یا چیک یا نقد اس درخواست کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

ج۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ پنجاب پروڈنشل مسلم لیگ پارلیمینٹری بورڈ کے فیصلے کا اپنی نامزدگی کے متعلق پابند رہوں گا۔

د۔ میں حلف اقرار کرتا ہوں کہ میں آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمینٹری بورڈ کے پروگرام کو منظور کرتا ہوں اور ہر ممکن طریقے سے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی کوشش کروں گا۔

س۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ پنجاب پروڈنشل مسلم لیگ پارلیمینٹری بورڈ نے مجھے آئندہ کے لیے اپنا امیدوار نامزد نہ کیا تو میں کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر یا اپنے طور پر اسمبلی کے انتخاب کا خواہاں نہیں ہوؤں گا۔

و۔ میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ میں اپنی حیثیت میں اسلامی اوقاف کی حفاظت حسب شرعیہ کروں گا۔

ح۔ میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ میں ہر ممکن طریقے سے مسجد شہید گنج کی واگذاری کے لیے کوشاں رہوں گا۔

جب تمام حلف نامہ پڑھ کر سنایا گیا تو مولانا حبیب الرحمن نے اعتراض اٹھایا کہ اس میں ایک اور شق بڑھا دیکھتے کہ:

مسلم لیگی امیدوار کو اقرار صراح کرنا چاہیے کہ وہ اسمبلی میں جا کر مرزائیوں کو مسلمانوں سے خارج کرا کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیے جانے کی پوری کوشش کرے گا۔

اس موقع پر مسلم لیگی پارلیمینٹری اجلاس میں کیا ہوا اس کی روداد عاشق حسین ٹالوی اپنی کتاب اقبال کے آخری دو سال کے صفحہ ۳۳۸-۳۳۹ پر لکھتے ہیں۔

”سچی بات یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمن نے نئی شق پیش کر کے ہمیں حیران ہی نہیں پریشان کر دیا تھا۔ ہم میں سے کوئی شخص مرزائیت یا غیر مرزائیت کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یوں بھی مسلم لیگ جیسی قومی اور سیاسی جماعت سے توقع رکھنا کہ مرزائیت کے بارے میں اپنے عقیدے کا اعلان کرے، ایک لایعنی بات تھی۔ اس اجلاس کی صدارت زماں مہدی خان کر رہے تھے۔ انہوں نے مولانا حبیب الرحمن

سے کہا کہ بے سود جھگڑا نہ کیجئے۔ یہ نئی شق پیش کرنے کا یہاں کیا موقع محل ہے؟ اس پر مولانا حبیب الرحمن نے کہا، جس طرح مسجد شہید گنج کی بازیابی آج پنجاب کے تمام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے، اسی طرح یہ بھی متفقہ مطالبہ ہے کہ مرزائیوں کو مسلمانوں سے خارج کر کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں، تو چلیے اسی وقت ہم موجود روزہ کے باغ میں ایک جلسہ عام کر کے مسلمانوں سے استصواب کرا لیتے ہیں۔

مولانا کی یہ رائے درست تھی۔ حواری نے سالہا سال کے پروپیگنڈے سے عام مسلمانوں میں مرزائیت کے خلاف سخت نفرت پیدا کر دی تھی۔ اگر اس امر سے متعلق کسی جلسہ عام میں استصواب کیا جاتا تو مسلمان یقیناً مرزائیت کے خلاف رائے دیتے۔ چنانچہ مجبوراً غلام رسول خاں کو حلف نامہ میں ایک نئی شق کا اضافہ کرنا پڑا۔ یعنی



”میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دیگر مسلمانوں سے ایک علیحدہ اقلیت قرار دے جانے کی انتہائی کوشش کروں گا“

یہ ۲۲ اگست کے اجلاس کی کارروائی ہے۔

دوسرے روز غلام رسول خاں حلف نامہ کا مسودہ لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں سارا واقعہ کہ سنایا تو ڈاکٹر صاحب نے مرزائیت کے متعلق نہی شق بڑھانے جانے پر کسی تعجب کا اظہار نہ فرمایا اور نہ ہی کوئی اعتراض کیا۔

۲۵ اگست کو مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس میں گذشتہ پارلیمنٹری بورڈ کی نئی شرائط

اجلاس کی کارروائی کی تصدیق کرتے ہوئے امیدواروں کو نئی شرائط پیش کر دی گئیں کہ جو شخص پارلیمنٹری بورڈ کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لیے کھڑا ہونا چاہے وہ اپنی درخواست کے ساتھ ایک سو پچاس روپے پیش کرے۔ اگر اس کی درخواست منظور نہ ہو تو یہ رقم اسے واپس نہیں کی جائے گی۔ نیز جس کی درخواست منظور ہو جائے اس سے ایک مہینے کے اندر اندر پانصد روپیہ نقد کے طور پر وصول کیا جائے گا۔

مسلم لیگ بورڈ کے اس نئے فیصلے پر احرار ممبران نے ترمیم کرتے ہوئے ایک سو پچاس کی بجائے ایک سو روپیہ وصول کرنے کی تجویز پیش کی۔ جسے اجلاس کی اکثریت نے منظور کر دیا۔ چودھری افضل حق؛ یہ پانصد روپے کس مقصد کے لیے جمع کرائے جائیں؛

غلام رسول؛ بورڈ کے تمام امیدواروں کے الیکشن کے سلسلے میں مختلف قسم کے اشتہارات اور پمفلٹ شائع کرنے ہوں گے۔ مسلم لیگ کے امیدواروں کی حمایت کے لیے مسلم لیگ کے لیڈروں کو ان کے انتخابی حلقوں میں دورہ کرنا ہوگا۔ ان تمام کاموں کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا۔

چودھری افضل حق؛ پانصد روپیہ صرف اشتہاروں اور پمفلٹوں کے لیے اور الیکشن کے لیے رقم الگ ہوگی؛ مگر پانصد روپیہ میں تمام الیکشن رٹسکتا ہوں۔ گذشتہ انتخاب میں میں نے اپنے حلقے میں کام کرنے والے کارکنوں کو دو صد روپیہ دیا تھا۔ انہوں نے آخر میں مجھے تیس روپے

واپس کر دیے تھے۔

اس اجلاس کے اختتام پر چودھری افضل حق نے ایک پریس بیان میں کہا۔

”بورڈ کی نئی شرائط نے احوار کو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ احوار مخلص اور درمیانے طبقے کی نمائندہ جماعت ہے۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے جس قدر روپے کا مطالبہ کیا ہے احوار اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بہر حال جماعت بورڈ کی نئی شرائط پر غور کرے گی“

احوار کی پارلیمنٹری بورڈ سے علیحدگی | تقسیم کائنات میں فطرت نے جن اصولوں کو نمایاں طور پر اپنایا ہے ان میں \_\_\_\_\_ تو ناؤں اور ناتوانوں کے درمیان

ایسی حد فاصل قائم کر دی گئی ہے کہ ان حدود کو توڑنا یا انہیں پھانڈنے کی کوشش کرنا نظام خداوندی میں مداخلت کے مترادف سمجھا جائے گا۔ نہ تو غریب کا دل امیر سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ہی دولت مند کا ضمیر غریب سے قرابت داری پسند کرتا ہے۔ جس طرح دریا آبِ جوں میں نہیں سما سکتا یا سمندر، دریا کی روانی کو خاطر میں نہیں لاتا، عین اسی طرح غریب اور امیر کے خانے جدا جدا مٹی سے تعمیر کیے ہیں۔ زندگی کے سفر میں کہیں اگر ان اصولوں میں ملاپ ہو جائے تو اس کی عمر اتنی مختصر ہوتی ہے، جتنی کہ شبنم کی پھول کی پتی پر۔ جیسے ہی سورج کی پہلی کرن آنکھ کھولتی ہے یہ آگینے پانی پانی ہو کر بہہ جاتا ہے۔

لوہا اور لکڑی ایک ساتھ سطحِ آب پر نہیں تیر سکتے۔ دونوں چند لمحے ایک ساتھ چلتے ہیں، لیکن آخر کو یہ ساتھ ٹوٹ جاتا ہے۔

ایمان اور دولت جب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو دونوں میں سے ایک کی موت لازمی ہے۔ ورنہ زمانے کی نظروں میں دونوں مشکوک ہو جائیں گے۔ دونوں کا چلن روایات کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ اگر ان میں نیجا ہو سکتا تو داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، فزکوٰۃ کے ضابطے پر سختی سے پابند رہنے کی تاکید نہ کرتے اور نہ ہی زکوٰۃ کو اسلام کے ارکان میں شامل کیا جاتا۔ یہی دلیل کافی ہے کہ امیر اور غریب دو الگ الگ دھڑے ہیں۔

سرمایہ دار کے اصولوں میں غریب کے لیے کوئی لچک نہیں۔ مساوات تو دور کی بات ٹھہری مزاج کا باہمی رنگ بھی نہیں ملتا۔ ذاتی اغراض ہوں تو سرمایہ دار موسمی ہواؤں کی طرح ملک کی گلیوں

میں اتر جاتا۔ لیکن ضرورت نہ ہو تو فرعون کے سنگھاسن پر بیٹھ کر خدائی دعوے کرنے لگتا ہے۔  
 مجلس احوار نے مسلم لیگ کو پنجاب میں اس وقت سہارا دیا، جب یونینسٹ پارٹی اس کے  
 دہور سے بھی انکاری تھی۔ لاہور میں مسٹر محمد علی جناح کا ہر میزبان منافقانہ چال چل رہا تھا۔ ان کے  
 دل قائد اعظم کے ساتھ نہیں تھے۔ ان کا ایک قدم مسلم لیگ اور دوسرا یونینسٹ پارٹی کے دفتر  
 میں ہوتا۔ سروں اور خان بہادروں کا یہ ٹولہ سرفضل حسین اور انگریز کے اشارے پر قائد اعظم کا  
 سیاسی حریف تھا۔ یہاں تک کہ انہیں لاہور میں جلسہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے وقت میں  
 احوار رضا کاروں نے قائد اعظم کا حوصلہ بڑھایا، ان کے راستے کے تمام کانٹے صاف کیے۔  
 جب زمین ہموار ہو گئی تو کرگس، شہباز کا ببادہ اور ھے پرواز کرنے لگے۔

احرار کا خلوص انہیں راس نہ آیا۔ مجلس مگر ایشیا پیشہ لوگوں کا تعاون رحمت پسند امراء کے  
 لیے وبال جان بن گیا اور ہر گھڑی انہیں اپنی محفل سے اٹھانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ مولانا  
 حبیب الرحمن کا یہ اعتراض کہ حلف نامہ میں مرزائیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی شق کا  
 اضافہ کیا جائے، اس گروہ کے لیے پہلا بہانہ تھا۔ نمبر دو یہ کہ درخواست کے ساتھ سچاپس روپے  
 پھر ایک سو سچاپس روپے اور پھر امیدوار کے لیے مزید پانصد روپے فنڈ میں جمع کرانے کی نئی  
 تجویز صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ بہانہ تھا کہ احوار کے پاس نہ اس قدر سرمایہ ہوگا، نہ ہمارے ساتھ  
 چل سکیں گے۔ لا محار وہ پارلیمنٹری بورڈ سے الگ ہو جائیں گے۔

امراء کی اس سازش سے احوار نے دل برداشتہ ہو کر چار ماہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں رہنے  
 کے بعد ۳۰ اگست ۱۹۴۷ء کو بورڈ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ آل انڈیا احوار ورکنگ کمیٹی نے  
 اس علیحدگی کی وضاحت میں حسب ذیل بیان پریس کو دیا۔

گذشتہ ماہ ہی میں احوار ورکنگ کمیٹی نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے تعاون کرنے  
 کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت سے احوار نے مسلم لیگ بورڈ سے پورا پورا تعاون کیا۔  
 بورڈ کے دوسرے گروپ کی اس حرکت کی مخالفت بھی نہ کی کہ وہ بورڈ میں اپنا پریزیڈنٹ  
 فائس پریزیڈنٹ اور سیکرٹری بھی اپنا بنانا چاہتے تھے۔ لیکن تبدیریچ چند دستوں  
 نے ایسی صورتحال پیدا کر دی، جس نے احوار کو تمام مسائل پر از سر نو غور کرنے پر

مجبور کر دیا۔ آغاز میں بھی ہمارے لیگ کے دوستوں نے پرو نشل بورڈ کی بہت سی نشستیں لاہور کے لیے ہی مخصوص کر دیں تھیں۔ جب کہ بورڈ میں لاہور کی نمائندگی پہلے ہی زیادہ ہے۔ لیکن بورڈ میں مزید ایک یا دو احوار ممبر کے لیے انکار کر دیا گیا۔ تمام حلقوں سے ایک یا دو ممبر لینے کی تجویز کی گئی تھی۔ احوار ممبروں نے اس سکیم پر بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ حتیٰ کہ ڈیرہ غازیخان، منظر گڑھ، راولپنڈی اور دوسرے دور افتادہ اضلاع سے اشخاص کے نام تجویز کیے۔ یہ تجویز سراسر زیادتی سمجھی گئی۔ حالانکہ پہلے ہی دوسرے گروپ کی غالب اکثریت تھی۔

احوار کارکن ہر مقام پر لیگ کے ٹکٹ پر اپنے امیدوار کھڑا کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے پنجاب کے ہر حصے میں پرو پیگنڈہ کیا لیکن دوسرے گروپ کے ارکان نے لیگ بورڈ میں ایسا عناصر داخل کر لیا۔ جس نے مجلس احوار کے خلاف کھلم کھلا پرو پیگنڈہ کرنا شروع کر دیا اور بورڈ سے احوار کے اخراج کا مطالبہ ہونے لگا۔ ۱۳ اگست کو مختلف امور پر غور کے لیے بورڈ کی میٹنگ بلائی گئی۔ تمام نئے ممبروں کی نامزدگی کا سوال ایجنڈے کے آخر میں تھا تاہم جن اشخاص کو بورڈ میں لیا جانا تھا، ان کی فہرست جو صدر کی طرف بھیجی گئی پہلے اس پر غور کیا گیا۔ حالانکہ وہ ایجنڈے کی آخری شق تھی۔ اور یہ فہرست پاس کر دی گئی! احوار ممبران اس وقت موجود نہ تھے، وہ ذرا دیر سے آئے۔ کیونکہ میٹنگ کا وقت پانچ بجے تھا۔ لیکن یہ حضرات سارے چار بجے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ اس جگہ پر قابل ذکر ہے کہ گذشتہ میٹنگ میں احوار ممبران نے دوسرے ممبروں کے لیے اکتالیس منٹ انتظار کیا تھا۔

صدر عالی فہرست میں اٹھاون ممبر تھے، جن میں اکتالیس صرف لاہور کے تھے حالانکہ بورڈ میں لاہور کے ممبران کی پہلے ہی اکثریت تھی۔

بورڈ میں اس پر بھی مزید اضافہ کیا گیا کہ بورڈ ممبری کی فیس ۵۰ روپے درخواست دینے والے سے اور امیدوار سے ایک سو پچاس روپے اور نامزد امیدوار کے لیے

پانصد روپے مقرر کر دیے گئے۔

احرار نے اس کمیٹی کی میٹنگ میں، پھر بورڈ کی میٹنگ میں صاف طور پر کہہ دیا کہ احرار ممبران یا امیدوار اس بوجھ کو برداشت کرنے کے ناقابل ہیں۔ مگر دوسرے گروپ کے ارکان نے اعلان کر دیا کہ جو اتنی رقم ادا نہیں کر سکتے، ان کو اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑے ہونے کا کوئی حق نہیں۔ بدیں حالات احرار درکنگ کمیٹی کا قیام غور کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے۔

۱۔ گذشتہ چار مہینے عملی طور پر ضائع کیے گئے ہیں۔ اس وقت بھی اگر بورڈ سے قطع تعلق نہ کیا گیا تو اس سے قوم کے نقصان کے علاوہ مزید وقت ضائع ہونے کا احتمال ہے۔

۲۔ یہ کہ چند اشخاص جو کہ غالباً الیکشن کے لیے کھڑے نہیں ہوں گے، صرف اس لیے میدان میں لائے گئے ہیں کہ ترقی خواہ جماعتوں کو پاؤں پر کھڑا نہ ہونے دیں۔

۳۔ ان حالات میں احرار مجبور ہیں کہ پنجاب اسمبلی کے انتخاب میں شامل ہونے کے لیے احرار کی طرف سے ایک جداگانہ انتخابی بورڈ قائم کیا جائے۔“

احرار پارلیمنٹری بورڈ | احرار درکنگ کمیٹی نے مندرجہ ذیل ارکان کو پارلیمنٹری بورڈ کی حیثیت سے منتخب کیا اور انہیں مزید ارکان کے منتخب کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔

چودھری افضل حق ایم ایل سی، مولانا منظر علی اظہار ایم ایل سی، مولانا محمد داؤد غزنوی، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لاکپور، میر عبدالقیوم پلیڈر لاکپور، شیخ غلام حیدر پلیڈر فیروزپور، سردار محمد شفیع رئیس عثمان والا ضلع لاہور، میاں قمر الدین رئیس اچھرہ لاہور، سردار احمد خان پٹانی جامپور، ڈیرہ غازیخان، شیخ حسام الدین میونسپل کمشنر امرتسر، چودھری عبدالعزیز بگھیو والیہ کپور تھلہ، سردار گل محمد خان ڈیرہ غازیخان، مولانا عبدالرحمن ضلع جالندھر، مر شوق محمد باگڑ سرگاندہ ضلع قتان، مولانا ظہور احمد گوبی ضلع سرگودھا۔

اس طرح کل پندرہ ارکان ہونے، اس کے ساتھ ہی بورڈ کو ہدایت کی گئی کہ وہ درخواستیں طلب

کرے اور ۱۵ ستمبر تک پہلے قافلے کو نامزد کر دے۔ نامزد امیدواروں کے پہلے گروپ پر غور کرنے کے لیے اجوار پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس ۱۳ ستمبر کو لاہور اجوار آفس میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس واضح حقیقت کے باوجود روزنامہ "انقلاب" نے ۵ ستمبر کی اشاعت میں لکھا۔

عنوان تھا: "ان تلوں میں تیل نظر نہ آیا"

چونکہ مسلم لیگ اجوار کی خواہش کے مطابق انہیں کوئی روپیہ نہ دے سکتے تھے۔ لہذا وہ بہانہ تراش کر الگ ہو گئے:

روزنامہ انقلاب کی یہ رائے اس قدر دلخراش نہیں کیونکہ یہ پیشہ ور لوگ تھے! فسوس حلق حین بٹاوی پر ہے کہ وہ تمام کارروائی میں برابر کے شریک چلے آ رہے تھے۔ اجوار کو پارلیمنٹری بورڈ سے الگ کرنے کی سازش ان کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ اس پر بھی وہ لکھتے ہیں:

"یوں تو اجوار مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس بورڈ سے جو توقعات انہوں نے قائم کر رکھی تھیں وہ بظاہر پوری نہیں ہوئیں۔ انہیں سب سے بڑی غلط فہمی یہ تھی کہ خراج نے بمبئی کے تاجروں اور اوردہ کے تعلقداروں سے کئی لاکھ روپے جمع کیے ہیں، جو الیکشن میں یگی امیدواروں کے کام آئیں گے۔ اس معاملے میں متبلا ہو کر چودھری افضل حق پور مولانا حبیب الرحمن وغیرہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اس فنڈ سے کم از کم ایک لاکھ روپیہ پنجاب کے حصے میں ضرور آئے گا اور یہ رقم جلسے، جلسوں کے علاوہ اخباری پریسنگ پر خرچ ہوگی۔"

اجوار کا یہ بھی خیال تھا کہ ملک برکت علی، غلام رسول خاں، خلیفہ شجاع الدین وغیرہ صرف آدمی ہیں، انہیں ہائیکورٹ کی پریکٹس سے فرصت ہی کہاں ہے کہ وہ پنجاب کا دورہ کریں اور شہر بہ شہر دھوم دھامی جلسے منعقد کر کے دھواں دھار تقریروں کا جادو بکھیریں۔ ادھر اجوار اس فن میں یدِ طولی رکھتے تھے اور سہ ماہ سال سے ان کی زندگیوں انہی ہنگاموں کے لیے وقف ہو چکی تھیں۔ اس لیے ان کا اندازہ تھا کہ خراج کے فنڈ میں سے پنجاب کو جو ایک لاکھ روپیہ ملے گا، اس کا بیشتر

حصہ انہی کی مرضی اور خواہش سے خارج ہوگا۔

(اقبال کے آخری دو سال ص ۳۲۲)

عاشق حسین ثبالی نے سارا کچھ جانتے ہوئے سیاسی ضرورت کے تحت ایک تو اپنی شخصیت کو گدلا کیا، دوسرا تاریخ سے نا انصافی کی جس سے آئندہ نسلوں کے گمراہ ہونے کا ڈر ہے اور ساتھ ہی انہوں نے جھوٹ بول کر اپنی عاقبت بھی خراب کی۔

**پول کا ڈاکٹر قتل کر دیا گیا** | ہندو ماسیاجی سوچی سمجھی سکیم تھی کہ ہندوستان میں پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توہین کی جائے۔ ۱۹۲۹ء میں اس سازش

کے تحت لاہور میں راجپال نے پہل کی، جسے غازی علم الدین نے قتل کر دیا۔ قصور کے پالارام کا قتل، کراچی میں نھورام کا قتل اور دہلی میں شردھانند کا قتل اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔

گذشتہ سال روہتک ضلع حصار کے موضع پول کا ڈاکٹر رام گوپال نے حیوانات کے ہسپتال میں ایک گدھے کا نام احمد (نعوذ باللہ) رکھا، اس پر ہنگامہ ہوا اور چودھری افضل حق ایم۔ این سی نے حکومت پنجاب کو اس پر متوجہ کیا۔ اس پر ڈاکٹر مذکور نے یہ کہا کہ میں نے گدھے کا نام احمد رکھا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں سے معذرت کر لی اور بظاہر یہ بات ٹل گئی۔ لیکن مجرم جرم سے باز نہ آیا۔ آٹھ ماہ بعد سال کے ایک مسلمان نوجوان مرید حسین نے موقع پا کر ڈاکٹر رام گوپال کو قتل کر دیا۔

**منشی احمد دین کی گرفتاری** | پنجاب کے معروف سوشلسٹ لیڈر منشی احمد دین کو حکومت پنجاب نے راولپنڈی سے لاہور آتے ہوئے جہلم کے پل پر دفعہ ۱۲۴

کے تحت گرفتار کر لیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں مسجد شہید گنج کے انہدام کی تمام تر ذمہ داری حکومت پنجاب پر عائد کی تھی۔ یہ ۳۱ اگست کا واقعہ ہے۔

**لکھنؤ میں گرفتاریاں** | ۱۰ ستمبر کو پولیس نے یوپی مجلس احوار کے مرکزی دفتر پر چھاپہ مار کر مدح صحابہ کے سلسلے میں پمفلٹ اور اشتہار اپنے قبضے میں لے کر آفس سیکرٹری

مسٹر ریاض الدین کو گرفتار کر لیا۔ اس سے پیشتر بہت سے اجراء کارکنوں کو زیر دفعہ گرفتار کیا جا چکا تھا۔

اتحاد ملت کا پارلیمنٹری بورڈ | لاہور ۱۶ ستمبر کو شیخ صادق حسن امرتسری کی صدارت میں مجلس اتحاد ملت کا ایک اجلاس ہوا، جس میں ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا گیا۔ جس کے ارکان حسب ذیل ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالقادر قصوری، ڈاکٹر محمد عالم، مولانا محمد اسحاق (دانسہرہ) سید زین العابدین (مقتان) شیخ صادق حسین (امرتسر)، چودھری غلام حسن، ڈاکٹر محمد نواز، ملک علی بہادر صدر میونسپل کمیٹی حافظ آباد، ملک لال خاں میونسپل کمشنر گوجرانوالہ، ملک لال دین قیصر (لاہور)، میاں فیروز الدین احمد، ظہیر الدین ایڈووکیٹ (انبالہ)، سید عظمت علی وارثی ایڈووکیٹ (کرناٹ)، سید دیوان علی شاہ ایڈووکیٹ لاہور، مولانا غلام محی الدین احمد بی۔ اے، راجہ عبدالرحمن ایڈووکیٹ (راولپنڈی)، شیخ عبدالرحمن (ترنتارن)، ضلع امرتسر، پرونیسٹر ملک عنایت اللہ، خان محمد نواز میونسپل کمشنر فیروز پور، پیرزادہ عبدالحمید ایڈووکیٹ جالندھر، ملک نصر اللہ خاں عزیز مدیر زمیندار، کامریڈ یعقوب الحسن۔ کل میں ارکان۔

مسجد شاہ چراغ کا قبضہ دیدیا گیا | ۱۶ ستمبر کو مسجد شاہ چراغ کا قبضہ انجمن اسلامیہ کو دے دیا گیا۔ جہاں اسی وقت نماز ظہر ادا کی گئی۔ یہ مسجد اسی سال کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آئی۔

مجلس احرار کامرکزی اجلاس | ۲۵ ستمبر کو مولانا منظر علی اظہر کی صدارت میں مجلس احرار کامرکزی اجلاس ہوا جس میں دیگر امور کے علاوہ آئندہ اکتوبر میں آل انڈیا احرار پبلسکل کانفرنس لاہور میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

جمعیتہ علماء ہند کا اجلاس | نیو دہلی ۲۴ ستمبر کو مرکزی جمعیتہ العلماء ہند کا ایک اجلاس ہوا جس میں برادران وطن کے اس رویے کے خلاف اظہار ناراضگی کیا گیا کہ انہوں نے کمیونٹی ایوارڈ کے خلاف بلاوجہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے جس سے ملک میں مزید فرقہ وارانہ اختلاف کو آگے بڑھنے کا موقع ملے گا۔

پنجاب تقسیم ہو گیا | اپنی ثقافتی زندگی میں پنجاب مخصوص بانع و بہار کا مالک ہے۔ اس کے سبب و نہار میں آبشاروں کا ترغیم کوہ و بیاباں کی رونقیں، نہروں اور دریاؤں



کے منگائے، سرسبز اور لہلہاتی کھیتیاں، جواؤں میں موسیقی، جوان دوشیزاؤں کی طرح جوانی کے ابھار پر دکھائی دیتی ہے۔ پنجاب کے گھروں و بسنت بہار کی طرح اپنے چہروں پر جوان موسم کا رنگ چھانے۔ جب راوی اور پنجاب کے کناروں پر محو گل گشت ہوتے ہیں تو فضاؤں میں ہزاروں لہریں اور سونبیاں ان کی بلائیں بنتی ہیں۔ ان کے قدم ڈھول اور چمپے کی لے پر تھرکتے ہیں تو سارا پنجاب ناچنے لگتا ہے۔ مگر آہ یہ پنجاب مرچکا۔ اس کی بہاریں چرائی گئیں۔ اس کے دریاؤں کا پانی دکھی آنکھوں سے آنسو بن کر بہ گیا۔ اس کے جوان جوانرگ ہو گئے اور اس کی لہلہاتی کھیتوں میں خاک اڑنے لگی۔ اس کے تمدن پر منوں ریت ڈال دی گئی۔ تاکہ اس کے گل بوٹے جوانرگی کا شکار ہو جائیں۔

کوئی راجل ارشد ہے جو گم کردہ بہاروں کو ڈھونڈ لائے؛ کوئی ان راہوں کی نشاندہی کر سکتا ہے، جن راہوں سے پنوں کے بھائی سسی کا ساگ بوٹ کر لے گئے ہیں؛ اگر نہیں تو ان قبروں کے نشان تلاش کرو۔ جن میں پنجاب کی ثقافت دفن کر دی گئی۔ شمشان بھومیوں کی راکھ ڈھونڈو! شاید کوئی چنگاری سلگتی ہو۔ لیکن نہیں۔ سنگلاخ وادیوں کی ہر چیز بے آب و گیاہ زمین کی طرح خشک ہو چکی ہے۔

اتحاد پنجاب کی آخری پونجی تھا۔ لیکن تن آسان لوگوں کا ٹولہ اسے بھی اپنی خواہش کی بھینٹ چڑھا چکا۔ اب یہ شاخ ٹوٹ کر گر چکی ہے۔ سال ۱۹۳۶ء اس کے برگ و باد بھی سمیٹ کر لے گیا۔ اگر پنجاب کے رحبت پسند ذرا حوصلے سے کام لیتے تو پنجاب کا اتحاد برصغیر کا نقشہ جدید انداز سے لکیرتا۔ مگر سیاسی طالع آزماؤں نے بھانوی سامراج کے کیمے میں آن کر ایسے واقعات کو جنم دیا کہ اس صوبے کے مسلمان چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ مجلس احرار، مسلم لیگ، اتحاد ملت اور یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان جدا جدا راہوں پر سفر کرنے لگے۔ حالانکہ یہ سب صراطِ مستقیم کے مسافر تھے۔ مگر ان کی موج اور فکر نے انہیں اپنی اغراض کے لیے اکسا کر ایسی راہوں پر ڈال دیا کہ انہیں منزل کا نشان نہ مل سکے۔

مسلم لیگ اور مجلس احرار اگر اکیٹ ۱۹۳۵ء کے الیکشن ایک ساتھ رہ کر اٹھتے تو پنجاب کی وزارت یہ ترتیب دیتے۔ اس طرح نہ یونینسٹ کو اقتدار ملتا، نہ پنجاب تقسیم ہوتا۔ مگر آہ! وہ لوگوں کو مارا جگر کے شعروں نے۔ جگر کو بٹرا سب نے مارا۔

تیزاب ڈالنے کی تحریک کا خاتمہ | کوئی بھی تحریک ہو۔ جب تک اس کے رہنماؤں میں  
عزم اور باہمی اعتماد نہ ہوگا۔ کامیابی نہیں ہوگی۔

سال رواں کے شروع میں امرتسر میں ایک نیم دہشت پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ بیٹریوں  
میں تیزاب ڈالنا اس تحریک کے کارکنوں کا مقصد تھا۔ رات کے اندھیرے میں چھپ کر یہ لوگ  
شہر کے مختلف، سرکاری بیٹریوں کو جلا دیتے، جس سے حکومت کی پریشانی میں اس قدر اضافہ  
ہوا کہ اس کی شہری انتظامیہ معطل ہو کے رہ گئی۔ اس تحریک کے کسی مجرم کا گرفتار نہ ہونا حکومت  
کے لیے اور بھی حیرانی کی بات تھی۔ صرف ایک کارکن شیخ سلیم اللہ گرفتار ہوا۔ یہ نوجوان امرتسر کا  
باشندہ تھا۔ اس کے والد شیخ جلیب اللہ الایڈیٹنگ امرتسر کے خزانچی تھے۔

۲۹۔ ستمبر کو اس تحریک کا ایک اور نوجوان خواجہ منظور احمد امرتسر سے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ  
کانگریس کے مشہور لیڈر خواجہ عبدالرحمن کا بھانجا تھا۔ خواجہ منظور احمد ۱۹۲۲ء کو امرتسر میں مولوی  
محبوب احمد المعروف خیر شاہ کے ہاں کٹھنہ بگھیاں میں پیدا ہوا۔

گرفتاری کے بعد منظور احمد نے پولیس کے روبرو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہم ایم۔ بی۔ ہائی  
سکول کے چند طالب علم تھے جنہیں سرور بھگت سنگھ کے کارناموں نے متاثر کیا تھا۔ چنانچہ ہم نے  
شیخ سلیم اللہ کو اس گروپ کے لوگوں سے ملاقات کے لیے لاہور بھیجا کہ وہ ہمیں اپنی پارٹی میں  
شامل کر لیں۔ مگر انہوں نے آزمائش کے طور پر ہمارے سپر ویز کام کیا۔ ابھی ہم ابتدائی منزلوں میں تھے  
کہ ہمارے ایک ساتھی کامرپنڈ پنالال نے مخبری کر دی اور ہم سب گرفتار کر لیے گئے۔

رہائی کے بعد خواجہ منظور احمد کا کہنا ہے کہ میرے بیان کے بعد جب مقدمہ عدالت میں  
لے جایا گیا تو میں اپنے ابتدائی بیانات سے منحرف ہو گیا۔ لیکن پنالال بدستور سلطانی گواہ بنا رہا۔  
میں نے عدالت میں کہا کہ میرا سابقہ بیان پولیس کے بے جانشد کی وجہ سے ہے ورنہ کامرپنڈ  
پنالال اس کام کے کرنے والوں میں صفت اول کا آدمی ہے۔ چونکہ ہمارے مقدمہ میں کوئی  
عینی شاہد نہیں تھا، لہذا عدالت نے مجھے اور دوسرے ساتھیوں کو ایک ایک سال قید کی سزا  
دی۔ لیکن اپیل میں سب بری کر دیے گئے۔ پنالال بطور سرکاری گواہ کو بھی ابتدائی مراحل میں ہی  
بری کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد میں مجلس اہوار میں شامل ہو گیا۔ اور اس طرح امرتسر میں یہ تحریک ختم ہو گئی۔



اجلاس خلافت قانون قرار دے دیے۔ نیز حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مرزا غلام نبی جانپاز اور مولانا لال حسین اختر کو ضلع ہزارہ سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی دو ماہ کے لیے ضلع ہزارہ کے احوال کارکنوں کی تقریروں پر پابندی عائد کر دی گئی۔

اس سے پیشتر کانفرنس کے اجلاس میں سرحدی قبائل پر بمباری، مسجد شہید گنج میں حکومت پنجاب کی جانبدارانہ پالیسی اور کھنڈر میں مدح صحابہ پر پابندی کے خلاف حکومت یوپی کی مذمت میں قراردادیں منظور کی گئیں۔

ریاستوں کے رئیس خواہ کسی عقیدہ یا مذہب سے ہوں۔ اپنی حیاشی کے سوا، مالیر کوٹلہ کے مہاجرین رعایا کے حقوق سے انہیں ہمیشہ غافل اور بے تعلق پایا گیا۔ محلات کی اونچی دیواروں کی اوٹ میں جس قدر گناؤں نے جرائم کے یہ لوگ مرتکب ہوئے ہیں، اگر کہیں انہیں انسانیت کی کسی عدالت میں پیش کیا جائے تو ان کی فرد جرم سے ابن آدم کو شرم آنے لگے۔ لیکن برطانوی سلراج کے سیاسی اغراض نے ایک صدی تک ان کی پردہ پوشی کی، لیکن راجاؤں اور نوابوں کے گناہوں کی ہر اس خریب رعایا کو ہی مجرم قرار دیا گیا۔

ریاست مالیر کوٹلہ کی مسلم رعایا اپنے نواب احمد علی خان بہلور سے ہمیشہ نالاں رہی۔ اس پر غیر مسلم اس قدر سر چڑھے کر آئے دن مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی پریشان ہو کے رہ گئی۔ مسجدوں میں حرام کے گوشت پھینکے جاتے۔ عیدین کی نمازوں پر قدغن لگائی گئی۔ ذرا ذرا سے جھگڑے کو فرقہ وارانہ قرار دے کر مسلمانوں کو مجرم قرار دیا جانے لگا۔ اگر مسلمان احتجاج کرتے تو داوری کی بجائے ان پر مقدمات قائم کیے جاتے۔

مجلس احوال نے ان واقعات کا کئی دفعہ نوٹس لیا اور نواب آف مالیر کوٹلہ سے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کے جائز حقوق کی پاسداری کریں اور انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے تشدد سے آزادی دلائیں۔ لیکن نواب نواب ہوتے ہیں۔ ان کے کان سونے اور جواہرات کے آویزوں سے اس قدر بوجھل ہو گئے ہوتے ہیں کہ رعایا کی آواز کا اول تک رسائی کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

آخر یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء کو مالیر کوٹلہ کے مسلمان ریاست سے ہجرت کر کے لاہور پہنچ گئے۔ لاہور کے مسلمانوں نے اپنی روایات کا ثبوت دیا۔ ۳۔ اکتوبر کو حضرت مولانا احمد علی لاہوری کی صدارت میں

مجلس احوار اور اتحادِ ملت کا مشترک اجلاس ہوا، جس میں ایک کمیٹی مرتب کی گئی۔ جس کے صدر میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ قرار پائے۔ باقی ارکان میں چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی، فیروز الدین احمد اور شیخ عنایت اللہ شامل تھے۔ روزنامہ مہیاست کے ایڈیٹر مولانا سید حبیب نے نواب صاحب کے ایما پر مہاجرین کے خلاف لکھا۔ جس پر لاہور کے علاوہ تمام پنجاب میں ان کے خلاف سخت تنقید ہوئی۔ اس اجلاس میں اخبار مذکور کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا گیا اور نواب صاحب اور مہاجرین کے درمیان سمجھوتہ کرایا جانا بھی طے پایا۔

میاں سرفضل حسین کی موت کے بعد یونینسٹ پارٹی کی لیڈر شپ سرفضل حیات کی واپسی کا کافی دیر متنازعہ فیہ رہی۔ ۱۲ نومبر ۱۹۴۰ء کو سرفضل حیات بنکوں کی ڈپٹی گورنری سے مستعفی ہو کر لاہور پہنچ گئے۔ ۲۰ اکتوبر کو نواب آف مدوٹ کی قیامگاہ پر یونینسٹ پارٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت سکندر حیات نے کی۔ سب سے پہلے اس اجلاس میں سکندر حیات کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انہوں نے بھاری تنخواہ کو لات مار کر پارٹی کی عنانِ اقتدار سنبھالی۔ اس قرارداد کی تائید میں خان بہادر حبیب اللہ، ملک فتح خاں، خان بہادر مشتاق احمد گورمانی، چودھری ریاست علی اور رائے بہادر چھوٹو رام نے تقریریں کیں۔

انتخاب کا آغاز ۱۱۔ اکتوبر کو مسلم لیگ کے صدر سرفضل علی خاں نے اپنی جماعت کی طرف سے ایکشن پروپیگنڈے کا آغاز کرتے ہوئے کیا۔

۱۔ ہم کونسلوں اور اسمبلیوں کے اندر غیر فرقہ دارانہ پارٹیاں بنانے کے لیے تیار ہیں۔

۲۔ پنجاب کا پریس دیدہ دانستہ بورڈ کے مقاصد کو غلط طریق پر پیش کر رہا ہے۔ لیگ

فرقہ دارانہ پارٹی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، یونینسٹ پارٹی میں کئی ممبر ہیں۔ کیا وہ

غیر فرقہ دارانہ پارٹی ہے؟

۳۔ پنجاب کا حال تو یہ ہے کہ یہاں وزارت پہلے ہی سے بن چکی ہے۔ میں اس وزارت

کو توڑنا چاہتا ہوں۔

۴۔ پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے۔ پھر میں انہیں اس بات کی اجازت

نہیں دے سکتا کہ وہ دوسرے فرقوں سے نا انصافی کریں۔

۵۔ اگر سرسکندر حیات غیر ذمہ دار نہ پارٹی بنانا چاہتے تھے تو کیوں انہوں نے آج سے پہلے ریزرو بینک کی نمبر می سے استعفیٰ نہ دیا؟

۶۔ میں ایسا آئین تیار کرانا چاہتا ہوں جو آزادی ملک کے لیے ہندوؤں سے تعاون کرے۔  
(روزنامہ انقلاب ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

روزنامہ انقلاب لاہور کے ادارے کے لئے لکھا: قائد اعظم کے مندرجہ بالا چھ نکات پر روزنامہ انقلاب

• بیگ بورڈ اور مسٹر جناح کے ارشادات مسلمانوں کی تنظیم کی بجائے تفرقہ انگیز ہیں۔

(۱۶۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

مسٹر جناح کی لاہور والی تقریر کے متعلق جو ہم اپنی گذشتہ اشاعتوں میں عرض کر چکے ہیں اور تفریقین ملاحظہ فرما چکے ہوں گے۔

انہوں نے مسٹر جناح نے صوبے کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں سے ترقی خواہ عناصر کو متنبہ کیا ہے کہ پنجاب میں ایک ایسی وزارت بن چکی ہے جو گورنر کی تجویز پر بنائی گئی ہے۔ سب کو چاہیے کہ اس کے مقابل اپنی مرضی کی وزارت قائم کریں۔ نیز کہا کہ اتحاد اسی سکیم کا پہلا مرحلہ ہے۔

(۱۸۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

نواب آف ملیر کوٹلہ کا اعلان ۱۵ اکتوبر کو مقرر کردہ وفد نے نواب آف ملیر کوٹلہ سے ملاقات کی اور ان کی مظلوم رعایا پر ان کی ریاست میں جو کچھ گزر چکا ہے اس

کے متعلق پیش کیا، جو کہ نواب صاحب نے نہایت توجہ سے سنا اور وعدہ فرمایا کہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر غور نہ کیا جاسکتا ہو۔ میں بہت جلد ایسے لوگوں کو ان کے گھروں میں واپس بلاؤں گا۔ اس وعدہ کے چار روز بعد ۱۹ اکتوبر کو نواب احمد علی صاحب بہادر والئی ملیر کوٹلہ نے اعلان کر دیا کہ

زیادتی مہاجرین کے تمام مطالبات منظور کر لیے گئے ہیں۔ ہجرت کرنے والے اپنے اپنے گھروں کو واپس آجائیں۔ اس ضمن میں تمام قیدی رہا کر دیے جائیں گے اور واپس آنے والوں سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ تعلقہ پولیس افسروں کو ان کی ذمہ داریوں سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ داسی طرح نواب صاحب

نے کہا، مجھے امید ہے کہ رہایا بھی ریاست کے وقار کا خیال رکھے گی۔

(نوٹ)۔ نواب صاحب سے گفتگو کے لیے جو وفد گیا۔ اس میں چودھری افضل حق کی جگہ شیخ حسام الدین شامل کر لیے گئے تھے۔

۲۰۔ اکتوبر کے اخبارات میں حکومت پنجاب نے اعلان کیا کہ خان بہادر مظفر خان نئے ریونیو ممبر

ریونیو ممبر ۲۰۔ اکتوبر سے چار ماہ کی رخصت پر جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ سر سکندر کو عارضی طور پر پنجاب کا ریونیو ممبر مقرر کیا گیا ہے۔

نواب مظفر خاں سے پیشتر اس عہدے پر سر فضل حسین (مرحوم) متعین تھے۔

حکومت نے سر سکندر حیات کو پنجاب میں ریونیو ممبر کا عہدہ سونپ کر یونینسٹ پارٹی کو آئندہ الیکشن میں کامیاب کرانے کی ایک تجویز سوچی جو بالآخر کامیاب رہی۔

بعض نام نہاد مسلم لیگیوں اور یونینسٹ پارٹی کے

آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس لاہور

اغراض پسندوں کی سازش سے جب مجلس احرار

اور مسلم لیگ کے راستے جدا ہو گئے تو مجلس احرار نے من حیث الجماعت اپنے وجود کی بقا کے لیے اپنی الگ راہ تلاش کی۔ گوان دنوں احرار کے راستے میں یونینسٹ پارٹی حکومت سمیت پنجاب مسلم لیگ یونینسٹ کی نہر ہی میں اور اتحاد ملت، پہاڑ کی طرح حائل تھیں۔ مگر کاروان حریت ان سب کو روندتا اور رکاوٹوں سے ماورمی چلتا جا رہا تھا۔ اور چلتا رہا، تا آنگہ یہ تمام رکاوٹیں ریت کے گھروندے ثابت ہوئیں۔

۲۲-۲۳۔ اور ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس کے عظیم اجلاس لاہور میں ہوئے۔ ۲۲۔ اکتوبر کو کانفرنس کے منتخب صدر سید محمد احمد کاظمی ایم۔ ایل۔ اے کے جلوس دن کے دو بجے دہلی دروازہ اجازت گری سے روانہ ہوا۔ جلوس کی پذیرائی کرنے والوں میں انجمن خدام المسلمین لاہور چھاؤنی، جیش مجلس احرار اسلام ہری پور ہزارہ، جیش مجلس احرار اسلام مزنگ لاہور، جیش مجلس احرار اسلام امرتسر، جیش مجلس احرار اسلام انبالہ، جیش مجلس احرار اسلام کھیالی، ضلع گوجرانولہ، جیش مجلس احرار اسلام گجرات، غازی جیش امرتسر، جیش مجلس احرار اسلام فیروز پور۔ جیش مجلس احرار اسلام مہنگ، غازی کور لاکھپور، مجاہد کور گوجرہ، ضلع لاکھپور، جیش مجلس احرار اسلام

جا کے (ضلع سیالکوٹ) پیش مجلس احوار اسلام عثمان والا (ضلع میانوالی) پیش مجلس احوار اسلام گورداسپور۔

ان جیوش کے بعد گھوڑ سوار تھے اور ان کے بعد سیالکوٹ مجلس احوار کا بنیڈ اپنے جیوش کے ساتھ اور خالد کور جو برہمنہ تلواریں لیے ہوئے تھی۔ ان کے درمیان صاحب صدر کی کار تھی، جن کے ساتھ مولانا منظر علی انظر اور صاحبزادہ فیض الحسن بیٹھے تھے۔

یہ عظیم جلوس اندرون دہلی دروازہ سے شہر میں داخل ہوا۔ اور شام ۷ بجے کے قریب بھاٹی دروازہ سے ہوتا ہوا احوار نگر میں ختم ہوا۔ راستے میں اکثر مقام پر پھولوں کی بارش کی گئی موسم کے مطابق چائے اور پانی سے جلوس کی تواضع کی گئی۔ جلوس کا انتظام احوار گوریوں کے سپرد تھا۔ بھاٹی دروازہ سے باہر چند غیر ذمہ دار لوگوں نے تلخی پیدا کرنی چاہی، جنہیں ہزاروں جواڑوں نے درست کر دیا۔

کانفرنس میں پنجاب، یوپی، بمبئی اور بہار کے ڈیپٹی کمشنروں کی ایک بھاری تعداد موجود تھی۔ ان کے علاوہ پشاور، راولپنڈی اور صوبہ سندھ سے کافی ڈیپٹی کمشنروں نے بھی شرکت کی۔

۲۲- تاریخ بعد نماز عشا مولانا محمد احمد کاظمی کی صدارت میں پہلا اجلاس قرآن کریم کی تلاوت سے شروع ہوا۔ شہزاد کی دلور انگریز نظموں کے بعد منتخب صدر نے فرمایا۔

”مسلمانان ہندوستان اس وقت ایسے مقام پر کھڑے ہیں، جہاں سے دو راہیں نکلتی ہیں۔ ایک اتحاد و اتفاق اور وحدت و تنظیم کی ہے اور دوسری اختلافات و تفریق کی اور فساد کی راہ ہے۔ ایک عزت اور کامرانی کی راہنمائی کرتی ہے اور دوسری ناکامی کی طرف۔“

مسلمانوں کی فطرت تمام انسانوں کی طرح جبر و اختیار کے درمیان ہے۔ نہ وہ اتنے مجبور ہیں کہ سیدھی راہ اختیار نہ کر سکیں اور نہ اتنے مختار و مطلق ہیں کہ حالات کی مجبوریوں کی وسیع خلیج کو کم کر سکیں۔ اصل چیز ان کی قوت فیصلہ ہے۔ اگر یہ قوت فیصلہ موجود ہے اور پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے تو ان کا فیصلہ بہترین فیصلہ ہوگا اور بہترین طاقت پر مبنی ہوگا۔



دوستو! اب ہمارے سامنے ملک کی آزادی کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ اور اس کی تکمیل کے لیے ایک پروگرام ہے۔ ہمیں اپنے پروگرام کی رہنمائی حاصل ہے، جو پچھلی صدی کے علماء کی طرح اپنی ذات کے لیے نہیں۔ بلکہ وہ دوسروں کے لیے قربانی کرتے رہے ہیں۔ ہر دست بو پروگرام ہمارے سامنے ہے، وہ کونسلوں اور صوبائی اسمبلی کے نمائندگان کا انتخاب کا ہے۔ جس کے لیے ہر قسم کی کشمکش ہو رہی ہے۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے جھگڑوں کے درمیان کچھ بدگمانیاں ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان بدگمانیوں کی وجہ سے کشمکش زیادہ تر اس جرم پر ہے کہ اسمبلی کی ممبروں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اور کہا جا رہا ہے کہ مسلمان سیاسیات میں پیچھے ہیں۔ حتیٰ کہ پچھلی گول میز کانفرنس کے انعقاد کے وقت ہمارے برادران وطن کا خیال یہ ہو گیا کہ مسلمان ان کے دوش بدوش نہیں چل سکتے۔ اس لیے انہوں نے کانفرنس مذکورہ میں شرکت کرتے ہوئے انگلستان جاتے وقت یہ بھی سمجھ لیا کہ وہ تنہا بلا شرکت مسلمانوں کے سوراخ سے آئیں گے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاملات طے نہیں کیے۔

مگر حضرات! یہ درست نہیں کہ مسلمان سیاسیات سے دور ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ عرصہ ۱۴ سال کا گزرا ہے کہ ہندوستان میں اشاعت اسلام کے مضمون پر ایک انگریز نے ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں یہ درج ہے کہ مسلمان کی سیاسی تعلیم محض کتابی اور ذہنی ہے۔ لیکن ہماری تعلیم کا سلسلہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے ۱۸۷۰ء تک جاری رہا ہے۔ بے شک ہم دھوکے میں رہے۔ مگر اب مسلمان سیاسیات میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں؟

آخر میں صدر کانفرنس نے مسلمانوں کی مذہبی معلومات، مسئلہ فلسطین اور مدح صحابہ پر مفصل تبصرو کیا۔ نیز مجلس استقبالیہ کے محرزین کا حکم یہ ادا کیا۔

صدر کانفرنس سے پہلے صدر استقبالیہ مولانا منظر علی اظہر نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں کہا کہ "ہندوستان کی غلامی قوموں کی باہمی نفرت کا نتیجہ ہے۔ ملک کی اقتصادی بحالی،

بے کاری، مسند فلسطین، تحریک مدح صحابہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ آخر میں تحریک مسجد شہید گنج کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا:

گذشتہ سال بعض خود غرض افراد نے سکھوں اور حکومت کی مخالفت کی بجائے مجلس احرار کو فنا کرنے کی کوشش کی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ جماعت آج پھر اپنی شاندار روایات کے ساتھ زندہ ہے۔ اور ایسی ہزاروں سازشوں کے باوجود زندہ رہے گی۔

آپ نے آئندہ ایکشن کا تذکرہ کرتے ہوئے عوام الناس کو مشورہ دیا کہ وہ رحمت پسندوں کی امداد نہ کریں، بلکہ ان بے خوف اور ایماندار لوگوں کو دوٹو دیکر کامیاب کرائیں، جو حکومت اور حکومت کے گماشتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں، جنہیں ملک اور مذہب کی پاسداری کا خیال ہو۔

۲۲۔ اکتوبر صبح نو بجے احرار کا سرخ پرچم جس پر سفید چاند تارہ بنا ہوا تھا صدر رسم پرچم کشائی کا نفرنس نے احرار پارک میں لہرایا۔ اس موقع پر مولانا نورصابری، خواجہ عبدالرحیم عاجز اور جانباز مرزا نے اپنی جوشیلی اور جذباتی نظموں سے پرچم کی اہمیت واضح کی۔ دس ہزار سے زائد سرخ پوش رضا کاروں نے بینڈ کی فوجی دھنوں کے ساتھ پرچم کو سلامی دی۔

۲۲۔ تاریخ کورات دو بجے کانفرنس کی کارروائی ختم ہوئی، جس میں حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

۱۔ آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس اس حقیقت کا اعادہ کرتا ہے کہ ہندوستان کی اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مشکلات کا واحد حل آزادی ہے اور مسلمانان ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ حصول آزادی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں مزید برآں یہ اجلاس اس حقیقت کا بھی اعلان کرتا ہے کہ اسلامی اور الیشیائی مقبوحات کی نجات بھی ہندوستان کی آزادی سے وابستہ ہے۔

۲۔ آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کی ہندوستان کے بے کاروں کے متعلق غفلت مشاری پر اظہار مذمت کرتا ہے اور اس

جرمانہ عفلت کو اصول حکومت کی طرح خلاف دزدی تصور کرتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ  
حکومت بلا تاخیر مزید تمام ہندوستان میں تعلیم و غیر تعلیم یافتہ ماہر اور غیر ماہر بے کاروں کی  
فہرستیں تیار کر دے اور ان کو کام پر لگانے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرے۔

۳۔ آل انڈیا ایوارڈ پوٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس حکومت کی اس متشددانہ پالیسی  
پر جس کے ماتحت مولوی عنایت اللہ امیر جماعت احرار قادیان اور دیگر کارکنوں کو  
مختلف سزائیں دی گئیں ہیں، اظہارِ مذمت کرتا ہے اور صریح مداخلت فی الدین  
تصور کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ مسلمان، قادیانی فتنہ کو کسی صورت میں برداشت  
نہیں کر سکتے۔ نیز صوبہ سرحد میں جو غیر معمولی تدابیر قادیانیوں کی حفاظت کے لیے  
حکومت کی طرف سے اختیار کی جا رہی ہیں، ان پر اظہارِ نفرت کرتا ہے۔

۴۔ آل انڈیا پوٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ موجود  
مصائب میں پوری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے حکومت برطانیہ کی استعمار پرستی اور  
یہود نوازی کی سخت مذمت کرتا ہے اور تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کو یورپین اقوام  
کی مخصوص چال تصور کرتا ہے، جس سے کسی صورت میں بھی انصاف کی توقع نہیں  
ہو سکتی۔

۵۔ آل انڈیا احرار پوٹیکل لاہور کا یہ اجلاس اس وقت جیسا کہ ملک میں سول ناظرانی  
اور بے چینی کی بجائے بالکل امن و سکون ہے۔ سرخپوشان سرحد پر پابندیوں کو  
سراسر خلاف انصاف تصور کرتا ہے۔ اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان پابندیوں  
کو جلد از جلد دور کر دے۔

نیز یہ اجلاس فخرانہ غزنہ خاں عبدالغفار خاں صاحب کے صوبہ سرحد میں داخلہ پر  
پابندی کے خلاف اظہارِ مذمت کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس  
پابندی کو فوراً دور کر دیا جائے۔

۶۔ آل انڈیا احرار پوٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس حکومت ہند اور حکومت برطانیہ  
کو متنبہ کرتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے تمام اسلامی اداروں اور عامۃ المسلمین

کے زیر دست احتجاج کے باوجود ظفر اللہ خاں مرزائی کو جس کی جماعت ناپائے نے مذہب کی رو سے چند ہزار مرزائیوں کے ماسوا دنیا کے متکرر وڈ مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہوئے ان کا مذہبی اور موٹل بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ گورنر جنرل کی مجلس مشطر کارکن منتخب کر کے مسلمان ہند کو گورنر جنرل کی کابینہ میں نمائندگی سے محروم کر دیا ہے۔ انگریزی حکومت کے لیے اب بھی وقت ہے کہ وہ اپنی اس غلطی کا فوری افسار کرے ورنہ مسلمانان ہند یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ حکومت مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی مخالف کو ان کی گردن پر مسلط کر کے مرزائے قادیان کی نبوت کو فروغ دینے کی خواہاں ہے۔

نیز یہ اجلاس حکومت کی بے اعتنائی اور جمیع مسلمانان ہند کے متفقہ مطالبہ سے بے توجہی کے پیش نظر تجویز کرتا ہے کہ ایک انٹی ظفر اللہ ڈے تمام ملک میں ہنایا جائے، جس میں اس مطالبہ کا اعادہ کیا جائے۔

۷۔ آل انڈیا اوارپوٹیکل کانفرنس کا یہ اجلاس کسانوں اور زمینداروں کی مفکالہ کی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس امر کا پر زور مطالبہ کرتی ہے کہ گورنمنٹ شرح معاملہ راضی کو کم از کم چھپس فیصدی کم کر دے اور آئندہ کے لیے اس اصول کو جو انکم ٹیکس گزاروں پر عائد ہے کہ دو ہزار آمدنی سے کم والے اشخاص مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح زمین سے جب تک زمیندار کو دو ہزار کی سالانہ آمدنی نہ ہو اس پر معاملہ اور لگان بھی منسوخ کیا جائے۔

سیکرٹری استقبالیہ | آل انڈیا اوارپوٹیکل کانفرنس کے سیکرٹری استقبالیہ شیخ بشیر احمد رضوانی تھے۔ امرتسر کے یہ مشہور قومی رہنما جن کی بیشتر زندگی آزادی وطن کی راہ

میں مصائب جھیلے گذری۔ آپ ہوشیار پور کے رہنے والے ہیں لیکن زندگی کا بیشتر حصہ امرتسر میں گزارا۔ ذاتی کاروبار کے علاوہ آپ مقامی کانگریس کے جنرل سیکرٹری اور پنجاب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ۱۹۳۱ء میں قیام مجلس اوار کے بعد آپ مجلس میں شامل ہو گئے۔ آپ مخلص ترین اور محنتی لوگوں میں شمار ہوتے رہے۔ تا دم تحریر آپ ادکاٹھ میں مقیم ہیں۔

ان کے زیر اہتمام آل انڈیا اوار کانفرنس نہایت کامیاب اور باحسن طریق سے ختم ہوئی تاریخ

میں شیخ بشیر احمد رضوانی کا کردار ہمیشہ زندہ رہے گا۔

**اچھوت تبلیغ کانفرنس** آل انڈیا اوارڈ پولیٹیکل کانفرنس کے پنڈال میں ۲۳ اکتوبر کو دن کے

گیارہ بجے حضرت امیر مٹر لعیت کی صدارت میں تبلیغ کانفرنس شروع ہوئی۔ خطبہ مسنونہ کے بعد شاہ جی نے اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کے موضوع پر اڑھائی گھنٹے تقریر کی:

» اس وقت ہمارے سامنے تین مسئلے سب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہیں۔ پہلا مسئلہ انتخاب کا ہے جس کا ظاہر اتنا دفریب ہے کہ بڑے سے بڑا تارک الدنیا گورنر نشین بھی اس کے حسن فریب کی تاب نہ لاسکا اور بے چین ہو کر میدان عمل میں نکل آیا۔ نہ کوئی ہندو بچا، نہ سکھ، نہ عیسائی۔ مسلمان بھی اس سے بے نیاز نہیں۔ کوئی بھی جماعت ایسی نہیں جو مسئلہ انتخاب میں دلچسپی نہ لیتی ہو۔

دوسرا مسئلہ ختم نبوت کا ہے۔ چونکہ مسلمان سیاسی الجھنوں میں پڑ گئے ہیں اس لیے انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی اور ہندوستان کو ابدی غلامی میں جکڑے رکھنے کے لیے قادیانی نبوت اپنا جال پھیلا رہی ہے۔ مسلمانوں کو اس دائمی لعنت سے بچنے کے لیے کوئی راہ سوچنی ضروری ہے۔

تیسرا مسئلہ جو اہم ہے اچھوت کا مسئلہ ہے، اور اس وقت تمام ہندوستان کی توجہ بڑا کٹر ابید کار کے اعلانات کی طرف مرکوز ہے۔ وہ پولیٹیکل اچھوت ہے۔ وہ ہندوؤں سے بخوبی واقف ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہندوؤں کو دہانے سے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ اب وہ ٹاٹ پر بیٹھنا نہیں چاہتا۔ لیکن ہندوستان کے آٹھ کروڑ اچھوت جو ہزاروں سال سے حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اگر ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اگر ان کو مساوات و انسانیت کا درجہ کسی مذہب میں حاصل ہو سکتا ہے تو وہ مذہب اسلام ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اچھوت کو اپنے میں جذب نہیں کر سکتا۔

کائنات میں سب سے بڑا غلام اچھوت ہے۔ غلام کا جسم اور اس کی کمائی اپنی نہیں ہوتی، بلکہ مالک کی ہوتی ہے۔ لیکن اسلام نے اگر دنیا میں غلام کا درجہ

بلند کر دیا اور اچھوت پر سب سے بڑا احسان کرنے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جنہوں نے اپنی پھوپھی زاد ہمیشہ زید سے منسوب کر دی، جو غلام تھا۔

مذہب اسلام نے مذہب کے معاملہ میں جبر واکراہ سے کام نہیں، بلکہ اپنے عمل سے اسلام کی تلقین کی کہ ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جائے جو مسلمان نہیں۔ ”نشہ پلا کے گرانہ تو سب کو آتا ہے“ لیکن بغیر نشے کے کسی کو سچاڑنا کام رکھتا ہے ہمارا فرض ہے کہ اپنے عمل سے اور اپنے مذہب کی خوبیوں کے ذریعہ اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں اور سوائے مذہب اسلام قبول کرنے کے ان کے لیے کوئی چارہ نہ رہے گا۔

کردٹ بدلو اور پکڑ لو ان گرے ہوئے اچھوتوں کو اور اپنے سینے سے لگاؤ۔ ہم روپیہ دے کر کبھی بھی ان کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ اسلام، اسلام ہے۔ تشنگی بچانے کے لیے دریا کسی کے گھر نہیں جاتے۔ پیاسے ہی دریا پر جاتے ہیں۔ اگر دریا کسی کے گھر جاتے ہیں تو راوی بن کر جاتے ہیں۔ کوئی تلوار کا گر نہیں ہوتی۔ اخلاق کی تلوار انسان کو ہمیشہ کے لیے رام کر لیتی ہے۔ اس لیے اچھوتوں کو ساتھ لانے اور دین اسلام میں داخل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اس خلقِ عظیم کو اختیار کرو جو اسلام نے بخشا ہے۔“

مجلس احرار کا انتخابی منشور | امرتسر پائونشل احرار پولیٹیکل کانفرنس کے موقع پر مفکر احرار چودھری افضل حق نے جو تقریر بطور صدر کی۔ احرار کی ورکنگ

کمیٹی نے اسی تقریر کو آئندہ انتخابات کا انتخابی منشور قرار دے دیا جو حسب ذیل ہے۔

”جماعت احرار اگر اپنا انتخابی پروگرام مرتب کرنے کی مجھے اجازت دے تو میں نفلوں میں مطلب کو نہ چھپاؤں۔ بلکہ صاف صاف اعلان کر دوں کہ غریب ہی غریب کی مصیبت کو سمجھ سکتا ہے۔ غریب جاہلوں کے بھیجے ہوئے نمائندے ہی ملک کی ۹۵ فی صدی غریب آبادی کی حالت کو بہتر بنانے کا سچا دکھ درد رکھ کر کام کر سکتے ہیں۔ ہندوستان دنیا کا بہترین زرعی علاقہ ہے۔ لیکن ملک کی دولت اور تمام کمائی غیر ملکی سرمایہ دار مختلف حیلوں اور بہانوں سے لوٹ کر لے گیا ہے۔ اب بھی اگر چروٹ کھسٹ

کو بند کرنے کی کوشش کی جائے تو اپیل ملک فاریغ ابطال ہو سکتے ہیں۔ اندر میں حالات مجلس احوار منبند کے نمائندے ہی ایسے ہو سکتے ہیں، جو انگلستان کے مفاد کے مقابلہ میں کبھی بندوستانی مفاد کو قربان نہیں کریں گے۔

اگر ہمارا انتخابی حریف یا معترض کرے کہ اقتصادی آزادی سیاسی آزادی حاصل کیے بغیر ممکن نہیں تو میں جواب دوں گا کہ یہ بات تو دراصل ہمارے ہی حق میں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک کے محاصل پر ہمارا پورا قبضہ ہو۔ فوجی اخراجات اور غیر ممالک سے معاہدات ہمارے حسب منشا ہوں درآمد اور برآمد پر ہم حسب منشا محصول لگا سکیں۔ مجلس احوار سے بڑھ کر سیاسی آزادی کے لیے قربانی کرنے کا کس کو دعویٰ ہے۔ مجلس احوار غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے لوگوں کو بلاتی ہے۔ اگر معترض یہ کہے کہ تمہارا پروگرام گورنر اپنے منشا کے خلاف پا کر چلنے نہ دے گا تو میں جواب دوں گا کہ کیا ہمارے حریف گورنر کے حسب منشا کام کرنے کے لیے جارہے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں بھیجا ہی کیوں جائے؟ ہمارا تو دوسری جماعتوں پر اعتراض ہی یہ ہے کہ حکومت کی مرضی کے مطابق کام کریں گی۔ ان کی ذات کو فائدہ ہوگا۔ لوگوں کو نقصان ہوگا۔

اگر آئندہ اسمبلی میں اکثریت ہمارے ہم خیال لوگوں کی ہو۔ اور گورنر کو وزارت کی ترتیب کیلئے بنا پڑے تو سب سے پہلے ہماری پارٹی کا لیڈر بھی کہے گا۔ تو ایکسیلینسی، جیل اور اسمبلی میرے لیے برابر ہیں۔ نہ جیل کا خوف نہ وزارت میں کوئی کشش ہے، مجھے تو اپنے اہل وطن کی خدمت مطلوب ہے۔ میں خدمت کا جذبہ لے کر یہاں آیا ہوں۔ اگر مجھ پر کوئی ذاتی احسان کرنا چاہتے ہو۔ تو آپ کا شکریہ۔ کسی اور کو وزارت کے لیے آادہ کرو اور مجھے رخصت دو۔ ترتیب کے بعد وہ ان سے کہے گا کہ خدا نے تمہیں خدمت خلق کا موقع دیا ہے اسے فہمیت سمجھو اور لوگوں کی بھلائی میں لگ جاؤ۔ اہل وطن مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ان کو تکلیف میں سے نکالو۔ ہمارے وزیر کا اصول سیاست یہ ہوگا۔ کہ وہ برطانوی حکومت کی ناراضگی بھی برداشت کر لیں گے۔ لیکن وطن اور اہل وطن کے ساتھ غداری نہیں کریں گے۔ سب سے اول وہ اپنی توجہات افلاس، اجمالت کو دور کرنے اور انصاف اور حفظان صحت کی طرف منعطف کریں گے۔ معاملہ سرکار وصول کرنے میں یہ امر ملحوظ رکھیں گے کہ زمیندار کا پیٹ کاٹ کر تو معاملہ خزانہ میں داخل نہیں کیا جاتا اور تبدیلی سچ اس پیداوار کو معاملہ کے قابل سمجھا جائے گا۔ جو

زمیندار کے خاندان کی پرورش کے بعد بچہ رہے۔ قیم سے معاملہ وصول کرنا بغیر اس امر کی تحقیق کے کہ اس کی پرورش کا کیا انتظام ہے یا بیوہ سے معاملہ وصول کرنا بغیر یہ دریافت کرنے کے کہ اس کا گزارہ ہے یا نہیں قطعاً ناقابلِ فہم ہے۔ ہم ایک انتہائی اراضی کے متعلق صلح و تحقیق کریں گے کہ کہیں کوئی حکم اور فرقہ اپنی سرخانہ عادات کی وجہ سے اراضیات کو غیر معمولی سرعت سے فروخت تو نہیں کر رہا۔ اور اس کے انفرادی کا بندوبست کیا جائے گا۔ مبادا وہ فرقہ یا قوم اور چند سالوں میں گزارے سے محروم ہو کر حکومت کی پریشانی کا باعث بن جائے۔ محکمہ امدادِ باہمی کے متعلق ہم اپنی کونسل میں پیش کردہ تصریحات پر قائم رہیں گے۔ یعنی سود پر قرض دینے والی سوسائٹیوں کو تبدیلی کچھ کم کر کے ان کی بجائے قرضہ حسنہ کا طریقہ رائج کیا جائے گا۔ ورنہ سود پر روپیہ دینے والی انجمنوں کی وجہ سے قرض اور قرض دونوں تباہ ہو جائیں گے۔

معرض کو میں جواب دوں گا کہ سود کے عام طور پر یہ معنی ہیں کہ ایک ایسے بجائی کی مصیبت سے جو مشکلات میں مبتلا ہے تاہا نئے فائدہ اٹھایا جائے۔

فلے کی منڈیوں میں ایسے سرکاری ایجنٹ مقرر کیے جائیں گے، جو سادہ لوح زمینداروں کو چالاکی خریداروں کے پر پیر اور لوٹ کھسوٹ سے بچائیں۔ اجناس کو منڈیوں میں سمولت ہم بیچنا یا چاری حکومت کا فرض ہو گا۔ کہیں کہلانے والی قوموں کے ساتھ زمینداروں کے منصفانہ تعاون پر اصرار کیا جائے گا تمام سرکاری محکموں میں ایسی مصنوعات کے استعمال پر زور دیا جائے گا۔ جو چیزیں ملک میں نہ بن سکیں ان کی ساخت کے فوری ذرائع سوچے جائیں گے۔ ان سرمایہ داروں کو معزز و محترم سمجھا جائے گا۔ جو غیر ملکی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے لیے حوصلہ مندی کا ثبوت دیں اور چاری حکومت انہیں ہر قسم کی سہولتیں ہم بیچنا دے گی۔

انگلستان جیسے صنعتی ملک نے زراعت کی حوصلہ افزائی شروع کر دی ہے۔ ہندوستان جیسے زراعتی ملک کے لیے ضروری ہے کہ زراعت کو اعلیٰ پیمانے پر بیچنے کی سعی کے ساتھ ساتھ صنعتی طور سے دنیا کا مقابلہ کرے تاکہ خام اجناس کی کھپت بھی اس ملک میں ہو سکے۔ ہمارے بچے بھی کام پر لگے رہیں۔ اور ہمارا ملک کسی دوسرے ملک کا محتاج بھی نہ رہے۔ بھلوں کی پیداوار کا خاص اہتمام اور سرکاری طور پر اس کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ لیکن صنعتی مرکز قائم کرنے کے ساتھ ساتھ چاری حکومت



کی سب سے زیادہ توجہ مزدوروں کی بہتری پر مرکوز ہوگی۔ اور ان کے مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے اوقات اور اجرت کا تعین کیا جائے گا۔

### تفصیل پروگرام

- ۱۔ ہمارے وزراء قلیل ترین تنخواہ پر گزارہ کریں گے۔ تاکہ قومی اخلاق کا بہترین معیار پیش کیا جاسکے۔
- ۲۔ کم تنخواہ والے ملازمین کی تنخواہ کے اضافہ کا خاص خیال رہے گا۔ تاکہ جائز کمائی سے پیٹ پال سکیں۔
- ۳۔ گھریلو صنعتوں کے رواج میں بچہ امکان کو کوشش کی جائے گی۔
- ۴۔ بائبنڈوں (جولاہوں) کو موجودہ تباہ حالی سے بچانے کی کوشش کی جائے گی۔
- ۵۔ گداگری کا انسداد اس ہمدردانہ طریق پر کیا جائے گا کہ ہر ایک گداگر ایک بہتر کاریگر اور شریف شہری بن جائے۔ علاوہ ازیں عمر رسیدہ، اپاہج اور لاوارث افراد کے لیے محتاج خانوں کا انتظام کیا جائے گا۔

۶۔ دریا کے کنارے پر بنے والے لوگوں کو طغیانی سے جو نقصان پہنچتا ہے۔ ان کو فوری امداد بم پنہانے کا بندوبست کیا جائے گا۔

۷۔ ان تجربات کو پاپر تکمیل تک پنہانے میں مدد دی جائے گی، جن کے ذریعہ رطوبت سے پیدا شدہ دلدلوں کا انسداد ہو سکے۔ اور ایسے علاقوں کی ہر گز امداد کی جائے گی۔

۸۔ غیر مزروعہ رقبہ جات کو زیر کاشت لانے کے اسباب مہیا کیے جائیں گے۔

۹۔ کاشت کے جدید اور سائنٹفک طریقوں کی ترویج اور ایسے اسباب مہیا کرنا کہ زرعی پیداوار میں ترقی ہو۔

ب۔ محکمہ جنگلات کو کاروباری طریقہ پر چلانے کا بندوبست کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں جنگلات کے قریب بسنے والی آبادی کی مشکلات کو رنج کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۹۔ موجودہ طریقہ تعلیم چونکہ ہماری ضروریات پوری نہیں کرتا۔ بلکہ ملک میں بیکاری کی مصیبت پیدا

کرنے کی وجہ میں سے ایک ہے۔ لہذا ہماری حکومت اس میں ضروری تبدیلیاں کرے گی اور ایسا

نصاب تجویز کرے گی جو آزادی و حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرے اور بیکاری کا خطرہ بھی ہمیشہ کے لیے

دور ہو جائے۔

۱۰۔ جدید طریقہ تعلیم کے مطابق علم کو ملک میں فروغ دیا جائے گا۔ اور ہماری حکومت کی کامیابی اور

ناکامی تعلیم کے اسی فروغ پر موقوف ہوگی۔

(ب) جدید طریقہ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ اس پر اخراجات کم از کم ہوں گے اور طلباء کو سہولتیں بہم پہنچانا ہماری حکومت کا فرض ہوگا۔

(ج) اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے گا کہ بچے کو اور نہ پھر سب اور کوئی بچہ بغیر تعلیم کے نہ رہے۔

(د) علمی تحقیقات کے سلسلہ میں کام کرنے والوں کے لیے خاص سہولتیں بہم پہنچاتی جائیں گی اور ان کیلئے خاص وظائف مقرر کیے جائیں گے جو کسی علمی تحقیق کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں۔

### حفظانِ صحت

۱۰۔ صفائی کے افسوسناک فقدان کی طرف بذریعہ تقریر و تحریر لوگوں کو متوجہ کیا جائے گا اور حکومت کی طرف سے صفائی کے لیے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائے گی۔

۱۱۔ تمام دیسی کھیلوں کی سرکاری طور پر حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

۱۲۔ تمام دیہاتی مراکز میں ڈسپنسریاں قائم کی جائیں گی۔

۱۳۔ طب یونانی اور جدید طریقہ ہائے علاج اور ہومیو پیتھک وغیرہ کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

### حیوانات

۱۴۔ مویشیوں کے علاج کے لیے زیادہ سے زیادہ ویٹرنری ڈسپنسریاں قائم کی جائیں گی۔

۱۵۔ گائے بھینس، گھوڑے وغیرہ مویشیوں کی نسل افزائش کیلئے زیادہ سے زیادہ مرکز قائم کیے جائیں گے۔

### محکمہ انصاف

۱۶۔ پنجاب کونسل کے ریزولوشن ۱۹۲۱ء کی بناء پر جوڈیشل اور ایگزیکٹو اختیارات کو علیحدہ رکھا جائے گا۔ تاکہ

انشطامی افسر اپنی مرضی پر انصاف کو قربان نہ کر سکیں۔

۱۷۔ موجودہ پنچایت سسٹم پر نظر ثانی کی جائے گی۔ اور ایسے پنچایت افسر مقرر کیے جائیں گے، جنہیں صحیح معنوں

میں اہل علم کی تربیت کا خیال ہو۔

### انسداد رشوت ستانی

کننگ کمیٹی اور لیڈن کمیٹی کی تحقیقات کی بنا پر ایسے آزاد بورڈ کا قیام جس میں سرکاری اور غیر سرکاری نمبر

شامل ہوں جو حکومت کے تمام محکمہ جات کا جائزہ لیں اور رشوت ستان افسروں کا مزاج لگائیں اور انہیں

حکمانہ یا عدالتی سزائیں دوائیں علاوہ انہیں ہمارے گورنمنٹ بذریعہ اعلان تمام ملازمین پر یہ امر واضح کرے گی کہ رشوت رعایا کے ساتھ بدسلوکی ناقابل عفو جرم ہے۔ البتہ جھوٹے الزامات کی صورت میں حکومت کی طرف سے ملازمین کو امداد کا یقین دلایا جائے گا۔

### لوکل سیلف گورنمنٹ

تمام ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں اور سال ٹاؤن کمیٹیوں میں نامزد عنصر کو ختم کر دیا جائے گا۔ تمام ڈسٹرکٹ بورڈوں کے صدر منتخب اراکین میں سے بذریعہ انتخاب بنائے جائیں گے۔ ایگزیکٹو افسروں کی بجائے پبلک سرنٹس کا تقرر عمل میں لایا جائے گا۔ جو وقتاً فوقتاً بذریعہ تقریر و تحریر لوگوں کو بہتر شہری بننے کی ترغیب دیں۔

### محکمہ پولیس

پولیس ٹریننگ سکول میں اخلاقی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ اور تین سال کی ملازمت تین ماہ کا ایک کورس مقرر کیا جائے گا۔ جس میں بلا تشدد سراسر رسانی کی تعلیم دی جائے گی۔ تاکہ تفتیش جرائم میں لاتوں اور ہاتھوں کی بجائے دماغ سے کام لیا جائے۔

پولیس حوالات کی اصلاح کی جائے گی۔ اور پولیس روز پر نظر ثانی کی جائے گی۔

### محکمہ جیل

۱۹۳۱ء کے امپیریل کمیشن اور ۱۹۲۰ء کی یوپی تحقیقاتی کمیٹی اور پنجاب کی جیل انکوائری رپورٹ کی سفارشات کو جامہ عمل پہنایا جائے گا۔ اور خصوصیت کے ساتھ جیل کا انتظام ان بنیادوں پر قائم کیا جائے گا جو اس رپورٹ کے اختلافی نوٹ کے حسب منشاء ہوں۔

### بورڈل انسٹی ٹیوشن

بورڈل انسٹی ٹیوشن کو انگلستان کے بورڈل انسٹی ٹیوشن کے نمونہ پر بنایا جائے گا۔ تاکہ یہ جیل صحیح

مسنوں میں بچوں کی تربیت گاہ بن سکے۔

سرکار کا حامی پکاراٹھے گا کہ یہ تودہ پروگرام ہے جس کی بنیاد ۱۹۳۰ء کی اس گفت و شنید پر رکھی گئی ہے جو ہاتما گاندھی اینڈت موتی لال اور پنڈت جواہر لال اور لارڈ اردن کے درمیان ہوئی تھی۔ سرکاری قرضوں کی چھان بین، درآمد و برآمد پر حسب منشاء پابندی اور قومی بھٹ میں حسب منشاء ترمیم، فوج کے بجٹ میں

مناسب ترمیم اور غیر مالک سے حسب منشاء معاہدات یہ تو ایسی چیزیں ہیں جس پر حکومت بڑی بے جا حالت موجودہ متفق نہیں ہو سکتی۔ گویا مجلس احرار کے پروگرام کے دوسرے معنی یہ ہونے۔ کہ یہ مجلس آئین نو کو قبول کرنا پسند نہیں کرتی ہمارا نکتہ چینی اس پروگرام کے متعلق خواہ کچھ کہے۔ مگر امر واقعہ یہی ہے کہ متذکرہ صدر چیزوں کے بغیر جو آئین ہو گا وہ مفلس کسانوں، غریب زمینداروں اور بے کس مزدوروں کی امداد کرنے سے قاصر رہے گا۔ اور جب ملک کی ۹۹ فیصدی آبادی کی بھوک کا کوئی علاج نہ ہو۔ تو آئین نو کو کون پسند کرتا ہے۔ ایک آدھ سکول اور دو چار ہسپتال کھول دینے سے ملک کی اقتصادی مشکلات میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ اور فاقہ مست لوگوں کی یہ کوئی صحیح امداد نہیں۔

مخاطب لوگ مجلس احرار کو شاید احتیاط کا مشورہ دیں کہ اس دور رس پروگرام کی حقیقت کو کہیں اٹے معنی دے کر عوام ان اس کو مخافی بن گمراہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اور کہیں کہ یہ جماعت تو حمد سے قبول کرنے کے حق میں نہیں ہے اور جو وزارت قبول نہ کرے وہ عوام کا کیا کام کرے گی۔ اس کے متعلق ہمارا صاف جواب یہ ہونا چاہیے کہ جب تک یہ مبادیات طے نہ ہو جائیں، تب تک آئین نو کو کامیاب بنانے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں ہندوستان کی عام آبادی کا کوئی بھلا نہیں۔ کوئی دیانتدار جماعت بھی آئین نو کو قبول کر کے ہندوستان کی کثیر التعداد نیم فاقہ کش آبادی کے درد کا مداوا نہیں کر سکتی۔

البتہ ملکی سیاست کے طور پر وزارتوں پر قابض ہو کر مزید اصلاحات کے لیے حکومت کو آئینی طور پر مجبور کرنے کی پالیسی کو اختیار کرنا اور بات ہے۔ یقیناً مجلس احرار کو آئینہ اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ تاکہ گورنمنٹ کو مجبور کیا جائے کہ وہ آئین نو میں متذکرہ ترمیمیں کر کے تبدیلی کرے اور اگر خدا نخواستہ کسی وجہ سے اکثریت کا حاصل ہونا ممکن نہ ہو۔ تو دوسری ترقی پسند جماعتوں سے اتحاد کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہتے تاکہ رجحیت پسند عناصر کو ملکی سیاست سے نکال دیا جائے۔ رجحیت پسند عناصر کو برسر اقتدار آنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ اور ۱۹۲۶ء کی طرح آئین کا بائیکاٹ نہ ہونا چاہیے۔

### تاویاتی جماعت اور احرار

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حکومت قدرتی طور سے ان لوگوں کو برسر اقتدار دیکھنا چاہتی

ہے جو اس کے اغراض و مقاصد میں مدد و معاون ہوں۔ مگر ملکی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ سرکار پرست لوگوں کی قوت کو کم کیا جائے۔

غیر ملکی حکومت اپنے استحکام و دوام کے لیے صرف خود غرض افراد کے سیاسی گرد ہوں ہی سے فائدہ نہیں اٹھاتی۔ بلکہ لوگوں کے مذہبی رجحانات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے۔ قادیانی فرقہ بھارت کے زیر سایہ نشوونما پاتا رہا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اس فرقے کا بانی انگریز کی غلامی پر قانع اور چالپوی کا عادی تھا۔ آزادی کی تڑپ شرافت کی قومی دلیل ہے۔ اس معلم اخلاق کے بارے میں کیا کہا جائے جو غیر ملکی حکومت کی وفاداری اپنے مذہب کی ضروری شرط قرار دے۔ کیا وہ نبی مذہبی اور سیاسی طور پر قابل پیروی ہے۔ جس کے الہامات اور وحی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے رک جائیں اور جو خود اپنی جماعت کو حکومت کا خود کاشتہ پورا رکھے۔

ہیں اس جماعت سے صرف یہی شکایت نہیں کہ وہ اسلام کے شیرازے کو بکھیرنا چاہتی ہے۔ بلکہ یہ شکایت بھی ہے کہ وہ ان قوتوں سے ساز باز رکھتی ہے جو ملک کو دائمی طور پر غلام رکھنا پسند کرتی ہیں۔ یہ جماعت کبھی ترقی پسند لوگوں کے ساتھ مل کر نہیں کر سکتی۔ اس سے آزادی کی جنگ میں شرکت کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے ہر محبت و وطن کا بغض ہے کہ ملک کے اس دشمن کے منصوبوں سے ہم گاہ ہے۔ میں ملک کی سیاسی جماعتوں کے علاوہ اسلامی جماعتوں سے بھی متوقع ہوں کہ عالم اسلام کے مخالف اس قادیانی گروہ کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھیں۔ یہ درست بن کر مسلمانوں کی دشمنی کرتے ہیں۔ ہر اسلامی سلطنت ان کی جاسوسی سے خبردار رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ حکومت کی کھلی حوصلہ افزائی کے باعث یہ مسلمان شمار ہو کر مسلمانوں کے حقوق پر جلد جلد قابض ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کو مل کر ایسے حالات پیدا کر دینے چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے نام پر قادیانی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ الحمد للہ احرار اور دوسرے مقتدر مسلمانوں کی مساعی سے حاکم المسلمین ان کی فتنہ انگیزیوں سے باخبر ہو رہے ہیں۔ اور چونکہ احرار منتظم ہیں۔ اس لیے مرزا محمود کا سارا غصہ احرار کے خلاف ہے اور اس مقولہ کی بنا پر کہ جنگ میں ہر ہتھیار کا استعمال کرنا مناسب ہے۔ وہ غیر دیانت دارانہ مخالفت سے بھی نہیں چوکتا۔ قادیانی گروہ باوجودیکہ مسجد شہید گنج کے معاملہ میں حسب معمول سول نافرمانی کے مخالف تھا۔ تاہم احرار کو بدنام کرنے کے لیے بعد میں خفیہ طریقہ پر بے دریغ رو پیر صرت کرتا رہا۔ آخر اسے صاف طور پر اعلان کرنا پڑا کہ بے شک مرزائی احرار کے

خلافت پوسٹر نکالتے رہے ہیں۔ اب بھی وہ ہماری مخالفت میں کوتاہی نہیں کر رہے۔ ہمیں ان سے گلہ نہ ہونا چاہیے۔ البتہ مسلمانوں کو بتانے کی ضرورت ہے کہ احوار کی مخالفت میں مرزائی خطیر رقم خرچ کر رہے ہیں۔ وہ مسلمان بن کر اہل ایمان کے سامنے آتے ہیں اور ان کو مجلس احوار کے خلاف درخلاتے ہیں۔

بادبود اس کے کہ مٹر بخاج کی مساعی سے مسجد شہید گنج کے معاملہ میں عام مسلمانوں کا نقطہ نگاہ ایک ہو گیا ہے۔ اور ساری قوم نے اسی خیال کو قبول فرمانا پسند کیا ہے۔ جو مجلس احوار نے ابتدا میں ظاہر کیا تھا۔ تاہم قادیانی گروہ بدستور فتنہ انگیزی میں مصروف ہے۔ انہیں مسلمانوں کی اتحاد خیالی بھی پسند نہیں۔ وہ اب بھی چاہتا ہے کہ کوئی گروہ اٹھے اور کہے کہ احوار کا زاویہ نگاہ غلط ہے۔ سول نافرمانی کے ذریعہ ہی مسجد مل سکتی ہے۔ الحمد للہ کہ ڈاکٹر محمد عالم نے قادیانیوں کی توقع پر عدالت میں یہ کہہ کر پانی پھیر دیا کہ مدعیان اور تمام مسلمانوں کو جن کے وہ نمائندہ ہیں۔ اس آپ کے انصاف پر کامل اعتماد ہے۔ مجھے امید ہے کہ فیصلہ خواہ کچھ ہو۔ اس فیصلے کے بعد مسلمان کوئی غیر آئینی کارروائی نہیں کریں گے۔ یا امر اور بھی موجب مسرت ہے کہ مولانا ظفر علی خاں صاحب اور دوسرے نظر بندوں نے سکوت سے ڈاکٹر عالم کی تائید کی۔ ڈاکٹر موصوف کی تصریحات کے خلاف کوئی پروٹسٹ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اخبارات کے مالک ہیں۔

اب قادیانیوں کی لے دے کے امید یہ رہ گئی ہے کہ وہ ہمارے بعض دوستوں کی ذاتی رقابتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کا ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ ایسے دوستوں کی اشتعال انگیز تقریروں اور تحریروں کے باوجود ہم تحمل سے کام لیتے ہیں۔ وہ سب دشتم کر کے خود ہی تھک جائیں گے۔ ہمارے اخلاق کی شاندار فتح ہوگی۔

تعجب ہے کہ بعض بزرگ مرزائیوں کے پھندے میں پھنس کر مرزا بشیر الدین محمود کے بل بوتے پر احوار کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ جو دولت دین اظہار مرزائیوں کے ساتھ اس لیے شامل ہیں کہ انہیں دنیا میں کچھ فائدہ پہنچے گا۔ وہ کان کھول کر سن لیں کہ مسلمانوں کے نزدیک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد ہر رنگ میں نبوت کا دعویٰ اگر گروہ شیرازہ اسلامی کو پراگندہ کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے گروہ کی امداد پر جو دنیا میں سرفرازی چاہے گا۔ انشاء اللہ نیچا دیکھے گا۔ مرزائیوں کی اتحادی پارٹی کے خلاف مجلس احوار ہر جگہ اپنے امیدوار کھڑے کرے گی۔ مسلمانوں سے کامل توقع ہے کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن قادیانیوں اور ان کے ساتھیوں کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیں گے۔

### منٹو چفسفور ڈریفارم سکیم

شہری اور دیہاتی کا سوال کھڑا کر کے ہشیار لوگوں نے خوب اوسیدھا کیا اور ملکی مناصب پر قبضہ جائے رکھا۔ مجلس احرار کے نزدیک شہر اور دیہات کی تمیز چندان مفید نہیں۔ پس ماندہ لوگ خواہ کسی حصہ ملک میں آباد ہوں ہماری یکساں توجہ کے محتاج ہیں۔ مصیبت زدہ شہر میں ہو یا دیہات میں حکومت کی امداد کا مستحق ہے۔ مصیبت زدہ اور پس ماندہ لوگوں میں تمیز کرنا عدل و انصاف کے منافی ہے۔ مجلس احرار میں شہری اور دیہاتی دونوں عنصر کامل اتحاد و اتفاق سے کام کر رہے ہیں۔ آئندہ بھی امید ہے کہ شہر اور دیہات کی فلاح و بہبود کے لیے وہ بدستور سابق منہمک رہیں گے۔

اسی طرح لائق شہری کے مقابلے میں دیہات کے نالائق آدمیوں کو منصب پیش کرنا بدترین پالیسی ہے۔ البتہ دیہاتی کے حقوق کو نظر انداز کر دینا بھی افسوس کتنا ہے۔ نتایج پیدا کرنے کا باعث ہو گا۔ ایسے آئندہ آئین میں خرم و احتیاط کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔ مبادا کسی ذریعہ کو جائز شکایت پیدا ہو جائے۔

### مسلمان اور ملازمتیں

مسلمان ملازمتوں میں مناسب حصہ لینے کے آرزو مند ہیں۔ اگرچہ مجلس احرار کے خلاف بند و نواہی کا الزام ہے، تاہم میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ مجلس احرار کے نمائندوں نے کم سے کم ملازمتوں میں مناسب حصہ کے لیے اتنی کوشش کی ہے کہ اور مسلمان ممبر ایسا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کے باہرمت کے حصہ میں میرے اپنے سوالات باقی تمام ممبران سے زیادہ ہیں۔ میرے ذاتی تاثرات یہ ہیں کہ حکومت وقت نے اس بارے میں معنی خیز تساہل سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کونسل میں بند و اور مسلمان کی ۱۹ برس کی تو۔ تو۔ میں۔ میں کے باوجود مسلمانوں کو کچھ نام نہ نہ پہنچا، بلکہ بعض حالات میں اٹل ناقصان پہنچا۔ مجھے امید ہے کہ مجلس احرار کے نمائندے اپنی اولین فرصت میں ملازمتوں میں معنی بر انصاف حصہ حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ملازمتوں میں اپنی مساعی کے ساتھ ساتھ میں مسلمان ملازموں کی توجہ بیرون ہند کی سیاسیات کی طرف مبذول کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ بدقسمتی سے حکومت ہند جب کبھی ملازمتوں میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کا اعلان کرتی ہے، تو متصل ہی کسی نہ کسی اسلامی ملک پر اغیار کے جارحانہ اقدام کی خبر

آجاتی ہے، اور مسلمانان ہند ملازمتوں کے سبب بائع دیکھتے ہیں۔ لیکن بیرون ہند کے مسلمان خاک و خون میں لٹا دیے جاتے ہیں اور ہندوستان کی ۹ کروڑ مسلمان آبادی سے صدائے احتجاج تک بلند نہیں ہوتی۔ ہمیں ملازمتوں کے اس منگے سود سے پرخاص نظر رکھنی چاہیے۔ سب باتوں پر آزادی ہند کو ترجیح دینی چاہیے تاکہ ہمسایہ قوم کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کر کے ہندوستان میں اپنی پوزیشن مضبوط کر لیں اور خود آزاد ہو کر اسلام اور محاکم اسلامی کو غیروں کی غلامی سے آزاد کر سکیں۔ میں پھر بھی مجلس احوار کے دعویٰ کا اعادہ کرتا ہوں۔ کہ ہندوستان کی آزادی پر ہی عالم اسلام کی آزادی منحصر ہے، ہر مسلمان نوجوان سے مجلس احوار کو یہی توقع ہے کہ وہ آزادی ہند کے بلند مقصد کو نظر سے کبھی اوجھل نہیں ہونے دے گا۔

### خدمتِ اہل وطن

نئے انتخابات کا شور و غلب آئندہ سال تک ختم ہو جائے گا۔ لیکن ملک کے سیاسی اخلاق کو بلند کرنے کی سعی بروقت اور ہر حال میں جاری رہنی چاہیے۔ سیاست ملکی کا زریں اصول اور مذہب کی جان یہ ہے۔ کہ اپنی جان بوجھوں میں ڈال کر اہل وطن اور مخلوق خدا کی خدمت کی جانتے، جس قوم کے افراد میں قربانی کی روح زیادہ ہوگی، وہی معزز اور محترم ہوگی۔ نوجوان سیاسی میدان میں آنے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ وہ قوم کے سیاسی اخلاق کو بلند کرنے کی کہاں تک قابلیت رکھتے ہیں۔ اس قابلیت کا معیار محض علم اور سرمایہ نہیں۔ بلکہ سارا دار و مدار قربانی اور مخلوق کی خدمت کے سچے جذبے پر ہے۔ خدمت میں عظمت ہے۔ اگر ایسا کر دگے تو اطمینان کی دولت حاصل کر لو گے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو سیم وزر کے انبار سے زیادہ تسلی دیتی ہے۔ وطن کی محبت کو عشق کے درجے تک پہنچاؤ۔ عشق میں سوداگری نہیں ہو سکتی۔ وہاں لینے کی توقع چھوڑ کر سب کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔ اس لیے اہل وطن کی خدمت میں بہتریں آرزوں کو قربان کرنے کا ارادہ کر کے اٹھو۔ دعا کرو کہ خدا ہمیں دین اور اسلام کی خدمت کا موقع دے آمین۔

(پہلے روز) افضل حق

۵ اکتوبر کو مولانا شوکت علی نے ایک بیان میں جو ہفت روزہ عبداللہ گاندھی کی مخالفت

دہلی میں شائع ہوا۔ کہا کہ

”میرے دوستوں نے مجھ سے سوال کیا کہ میں کانپور تبلیغ کانفرنس میں کیوں شامل نہیں

ہوا، جس کی صدارت عبداللہ گاندھی کر رہے تھے۔، اگر میرے دوست یہ بات سمجھنا



چاہتے ہیں تو میں کتنا ہوں کہ میں اس شرانگیز تحریک میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں، جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ ہیرالال گاندھی کے مسلمان ہونے کی تشہیر کی جائے، جو مسلمانوں کو لوٹنے کے لیے حلقہ اسلام میں آیا ہے۔

۲۵۔ اکتوبر کو مسٹر محمد علی جناح نے، مسٹر فضل الحق سے جو کلکتہ کارپوریشن کے میٹراور بنگال کے مزارعوں کے صدر بھی تھے، ایک خط کے

ذریعے یہ دریافت کیا ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے غداری کیوں کی؟ اس کے جواب میں فضل الحق نے کہا کہ

» مسٹر جناح مزارعین کے حامی اور سرمایہ داروں کے شدید مخالف تھے، مگر جس وقت سے آپ نے گورنمنٹ ہاؤس میں وزیروں کی پارٹی سے ملاقات کی ہے۔ آپ کے حالات میں دفعتاً انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ یہی انقلاب ہے، جو مزارعین کے مفاد کو زخمی کرتا ہے۔«

آگے چل کر مسٹر فضل الحق نے مسٹر جناح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

» آپ کا اپنا طریق کار مسلمانوں کا اعتماد کھو چکا ہے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے، مسلمانوں کی خواہشات کو آپ مسخ کر رہے ہیں۔ لیگ پارلیمنٹری بورڈ آپ کی ہوس کا تیار کردہ ہے۔ اوروہ مسلم طبقات میں گہری خلیج حائل کر رہا ہے۔ آپ کی پرائیویٹ گفت و شنید سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے اتحاد کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے بہت زیادہ مصروف عمل ہیں۔ مگر جس وقت آپ پبلک پیٹ فارم پر کھڑے ہوتے ہیں، آپ اپنے آپ کو ہندوستانی وطن پرستی کے سخت پیروکار ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے ہندو مسلم اتحاد کی سیاست کے سوا کچھ بھی مجھلا معلوم نہیں ہوتا۔

(روزنامہ انقلاب، ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

عظیم اور روزنامہ انقلاب بعض دفعہ انسان ذاتی منفعت کے لیے انسانیت ضائع کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہی وہ زیور ہے، جس سے آراستہ ہو کر انسان انسان

کہلاتا ہے۔ ورنہ خالق کی مخلوق بجز ویر میں اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا شمار دشوار ہو رہا ہے۔

آسمان کے ستاروں سے زمین کے ذرات، حیوانات سے نباتات اور جاندار سے غیر مرنی مخلوق میں سے پروردگار نے انسان کو اشرف یا احسن مخلوق کہہ کر پکارا۔ صرف اس لیے نہیں کہ مالک الملک کو اپنی عبادت یا بندگی مقصود تھی۔ بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے کہ کائنات میں عقل و شعور رکھتے ہوئے برے بھلے کی نشاندہی کر سکے۔ اور اپنی دانشمندی سے بھولے بھٹکوں کو سیدھی راہ پر چلنے کی ترغیب دے۔ لیکن یہی تا خدا جب انسانیت کے پتو اتوڑ کر طوفان میں الجھ جائے تو ساحل پر پہنچنے والے نہنگوں کی خوراک بن جاتے ہیں۔

اک زمانہ تھا جب پنجاب کی صحافت اس قدر بلند مقام پر فائز تھی کہ ہندوستان کے دوسرے صوبے اس کے نقش پا ڈھونڈتے۔ مگر اب ۵

ایوانِ امریت میں قلم نیلام ہوتا ہے

چھوڑے آگئے جب سے صحافت چھوڑ دی ہم نے (جانبا ز مرزا)

ہزار سیاسی اختلاف کے باوجود مسٹر محمد علی جناح متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے قابلِ احترام شخصیت تھے۔ جن افراد یا جماعتوں نے ان کی رائے سے اختلاف کیا وہ اپنی جگہ درست ہوں یا غلط، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے آرگن روزنامہ انقلاب کے مدیران نے "علم اور ضمیر کا جس ستے بھاڑ مگراری سودا کیا اس کی مثال اس دور میں پنجاب کی صحافت میں کم دکھائی دیتی ہے اس ضمن میں ۲۰ نومبر ۱۹۳۶ء کے اخبار انقلاب کے ایک طویل مضمون "جناح اور سیاست سے چند اقتباس درج ذیل ہیں۔

» بہتی مسٹر جناح کا وطن ہے۔ حال ہی میں جو فرقہ وارانہ فسادات (بئی) وہاں رونما ہوئے وہ مسٹر جناح کی عام حیثیت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جن کے پروان پڑھانے کے لیے وہ چند ماہ سے کوشاں ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات روز بروز زیادہ ہو رہے ہیں اور نہایت شرمناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ مسٹر جناح کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ان کا سیاسی پرچار ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان جانگ خلیج کو روز بروز وسیع تر کیے جا رہا ہے۔ اس مہیا تک صورت حالات پر قابو پانے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ مختلف صوبوں کی غیر فرقہ وارانہ پارٹیوں کو مضبوط بنایا جائے۔

”اپنے نام نہاد پارلیمنٹری بورڈ کو منظم کرنے کی غرض سے گذشتہ چند ماہ میں مسٹر جناح کی دفعہ پنجاب آئے۔ گران کی کوششیں ناکام رہی ہیں۔ اپنے مشن کو کامیاب بنانے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرود گذاشت نہیں کیا۔ لیکن ان کا وہ عطا صدرا بصر ثابت ہوا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہندوستان میں کسی جگہ بھی مسٹر جناح کو کامیابی نہیں ہوئی تو میرے اس بیان میں ذقہ برابر بھی مبالغہ نہ ہوگا“

”یہ کہہ کر مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک ڈالنے سے کچھ فائدہ نہیں کہ مسلمانوں کو منظم کیا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس جناح کو جب بھی موقع ملا ہے، انہوں نے مخالف فرقوں میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کیا انہیں یاد نہیں کہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس وقت باوجودیکہ تمام ہندوستان کے مسلمان جداگانہ طریق انتخاب کے حامی تھے۔ مگر مسٹر جناح مخلوط انتخاب کے علمبردار تھے۔ مسلمانوں کے جذبات کا احترام نہ کرتے ہوئے انہوں نے مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کیا۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ اجلاس کامیاب نہ ہوا اور ان کی سکیم کو تقویت نہ پہنچ سکی۔ کیا انہیں یاد نہیں کہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے لیجسلیٹو اسمبلی میں سنٹرل مسلم پارٹی بنانے جانے کے راستے میں کتنے روڑے اٹکائے تھے۔ اس کے خلاف مسٹر جناح کی دلیل یہ تھی کہ میری اپنی پارٹی انڈین نیشنل غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے اور یہ کہ مجالس آہن ساز میں فرقہ وارانہ پارٹیاں نہیں بنانی چاہئیں“

”مسٹر جناح کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مدت ہوتی ان کا مشن پنجاب میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت یہ ہے کہ حال ہی میں مسٹر جناح نے لاہور میں ایک تقریر کی تھی۔ جس میں انہوں نے اتحاد پارٹی کے لیڈر کو بہت بری طرح کوسا۔ مسٹر جناح جیسی پوزیشن اور تجربہ رکھنے والے کے لیے یہ بات نمایاں نشان نہ تھی۔ لیکن یہ ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ سیاستدان کی آخری جائے پناہ بدزبانی ہوتی ہے“

(نوٹ)۔ اس مضمون کے مصنف نوابزادہ خورشید علی خاں سیکرٹری اتحاد پارٹی تھے۔ بعد میں یہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر بڑے لیڈروں میں شمار ہونے لگے تھے۔

ایک خبر اور اس کا عنوان | مسلم لیگ کا ڈکٹیٹر۔ مٹر فضل الحق کو سزا۔ خداری اور سرکشی کا الزام۔

”بیمبی - ۲۔ نومبر آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے صدر مٹر جناح نے مٹر فضل الحق کو بورڈ کی ممبری سے خارج کر دیا۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے سنٹرل بورڈ کے اصولوں کی خلاف ورزی، خداری اور سرکشی کی ہے“

(روزنامہ ”انقلاب“ - ۵۔ نومبر ۱۹۳۶ء)

سندھ میں نئی پارٹی | ۵۔ نومبر ۱۹۳۶ء کو کراچی کے اخبارات میں ایک نئی سیاسی جماعت کے متعلق خبر شائع ہوئی۔ یہ نئی سندھ مسلم پوٹیکل پارٹی۔ یہ جماعت سندھ یونائیٹڈ فرنٹ کے خلاف ایک نیا محاذ تھی۔ اس کے رہنماؤں میں سر غلام حسین ہدایت اللہ خان بہادر محمد ایوب کھوڑو اور سردار علی بخش تالپور نمایاں تھے۔

جرمن اور جاپان میں سمجھوتہ | ۶۔ نومبر ۱۹۳۶ء کو جرمن اور جاپان میں باہمی معاہدہ ہو گیا۔ اس طرح برلن، ٹوکیو محور قائم ہو گیا۔ جاپان، جرمن اور اطالیہ کی یک جہتی سے

بحرالکابل، بحیرہ روم، بحیرہ احمر اور بحر اوقیانوس میں یہ محور نئے انداز سے اپنا رنگ دکھانے لگا۔

فرانس اور برطانیہ یورپ میں روسی اثر پھیلتا دیکھ کر ناک متہ پڑ رہے تھے۔ لیکن ہٹلر اور موسولینی کے ارادوں سے تصادم بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔ یورپ کے ان سامراجی ملکوں کی رائے یہ تھی کہ کسی طرح جرمن اور اطالی، روس سے دست دگر بیاں ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ فرانس اور برطانیہ جیشہ کی جنگ میں شریک تھے بھی اور نہیں بھی۔ ان کی یہ دورخی پالیسی محض اس لیے کہ کسی طرح جرمن جیشہ کے خلاف اٹلی کی امداد کو آگے بڑھے اور جرمن کی موجودہ طاقت ضائع ہو جائے۔ مگر ہٹلر دور کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔

جاپان اور جرمن کے باہم معاہدہ پر ۱۶۔ نومبر کو برطانیہ کے وزیر خارجہ مٹر ایڈن سے دارالعلوم میں ایک سوال کیا گیا، جس کے جواب میں مٹر ایڈن نے کہا کہ حکومت جرمن نے معاہدہ دارسانی پر ایک طرفہ کارروائی کی ہے۔ اگرچہ گذشتہ ۲۱۔ مئی کو ہٹلر نے اعلان کیا تھا کہ بعض بین الاقوامی دریاؤں کے متعلق گفتگو کی جائے۔ چنانچہ کچھ بات چیت طے بھی ہو گئی تھی۔ لیکن بعض ممالک کے اس پر دستخط نہ

ہونے کے باعث اس پر عمل نہ ہو سکا۔

سٹریٹن کے اس بیان سے ایک روز پیشتر ۱۶ نومبر کو ہٹلر نے معاہدہ وارسائی کی آخری شق جس کے ذریعے یورپ کے دریاؤں کو جرمن کے بغیر بین الاقوامی محوری طاقتوں کو ہی استعمال کا حق دیا گیا تھا اپنے کو جرمن اس شق سے آزاد کر لیا۔

ہٹلر کے اس اعلان سے چیکو سلواکیہ اور ہالینڈ کو جہاز رانی کے لیے اب جرمن کا تابع ہونا پڑے گا۔ ان حالات سے سب سے زیادہ مشکلات برطانیہ کے لیے تھیں۔ چنانچہ وہ ہٹلر سے ترکی اور برطانیہ معاہدہ کی طرح پر کوئی معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔

اگرچہ ہٹلر نے ۱۶ مارچ ۱۹۳۵ء کو ہی معاہدہ وارسائی کی تمام پابندیوں سے اپنے کو آزاد کر لیا تھا۔ لیکن فرانس اور برطانیہ نے ہٹلر کے اس اعلان کا خاص اثر نہ لیا۔ لیکن جیسے ہی ۱۶ نومبر کو معاہدہ وارسائی سے اپنے کو کلیتاً آزاد کر لیا تو محوری طاقتیں سوچ میں پڑ گئیں۔

انہی دنوں ۱۶ نومبر کو یہ خبر بھی شائع ہو گئی کہ جرمن اور جاپان کے درمیان جنگی معاہدہ طے پا گیا۔ جس کی رو سے سویٹ روس کے طرز عمل کے خلاف اور اس کی روک تھام کے لیے کوشش کی جانے۔ نیز اگر کسی ملک پر حملہ کیا گیا تو دوسری جنگ عظیم کی ذمہ داری سویٹ روس پر ہوگی۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جہتہ کو بھی اس معاہدے میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یوں تو برطانوی حکومت کا ہر وعدہ مٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے، لیکن مسجد شاہ چراغ کا وعدہ تو ایسا نہیں تھا، جسے وہ روایتی وعدوں کی

طرح توڑ دیتا۔ جولائی ۱۹۳۵ء سے حکومت پنجاب مسلمانوں کو جن وعدوں پر ٹال رہی تھی۔ آخر ۲۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو پنجاب کونسل میں چودھری انضام حق نے ایک سوال کے دوران پنجاب کے وزیر خزانہ سے یہ پوچھ لیا۔

”کیا یہ حقیقت ہے کہ مسجد شاہ چراغ کی واپسی کے لیے حکومت نے کوئی شرط عائد کی ہے؟“  
جواب میں وزیر خزانہ نے کہا کہ شرط واپس لے لی گئی ہے۔

یوں ہی کونسل میں تحریک مدح صحابہ گزشتہ کئی ماہ سے لکھنؤ میں تحریک مدح صحابہ کے باعث یوں اور پنجاب کے شیعوں اور سنیوں کے دل منافرت

کی میل سے اس قدر داخل ہو چکے تھے کہ ہر فرقہ ایک دوسرے کے خون کا تمنائی تھا۔ جیسا کہ زیر نظر کتاب کے گذشتہ اوراق میں اس تحریک کا سیاسی اور خاندانی پس منظر بیان ہو چکا ہے۔ مگر اس ڈرامہ کے شیوع کرداروں اور ان کے ہدایت کاروں نے سارا ڈرامہ اس انداز سے کھیلا کہ ساری برائی میں شیوع قوم ملوث ہو کے رہ گئی۔

انتخاب کے دنوں گڑے مردے کیوں اکھاڑے؟ اس کے لیے ۱۰۔ نومبر ۱۹۳۶ء کا دن تاریخ کے لیے بڑا اہم اور قابل ذکر دن ہے کہ اس روز مسلم لیگ کے سابق جنرل سیکرٹری اور یوپی کونسل کے ممبر نوابزادہ لیاقت علی خاں نے بیس سوالات پر مشتمل تحریک التواہی یوپی کونسل میں پیش کی تاکہ لکھنؤ میں مدح صحابہ کی بندش کے سلسلہ میں تمام سیاق و اسباب سامنے آسکیں اور اس پر بحث کی اجازت چاہی۔

۱۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ حکومت نے، جنوری ۱۹۰۹ء کو ایسے احکام (جی او آئی ۱۱۱ ۵۹۱) نافذ کیے جن کی رو سے لکھنؤ میں عشرہ اہلم اور اکیس رمضان کو اسلام کے پہلے میں خلفاء کی علی اعلان تعریف ممنوع قرار دی گئی؟

۲۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ حکومت نے متذکرہ بالا حکم نامے میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ سال کے متذکرہ صدر تین دنوں کے علاوہ اور کسی روز خلفائے ثلاثہ کی علی الاعلان تعریف کرنا ممنوع قرار نہیں دے سکتی اور اس کے مقابلہ کو معمولی قانون کے تحت چھوڑ دیا؟

۳۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ سنی مسلمانوں نے، ان پابندیوں پر جو حکومت کے اس حکم نامے کے ذریعے سے عائد کی گئی تھیں، سخت اظہار ناراضگی کیا۔ اور ان میں کسی کثیر تعداد نے اس حکم نامے کو نفاذ پذیر کرانے کے لیے حکام مقامی سے جو احکامات نافذ کیے گئے تھے، ان کی خلاف ورزی کے سلسلے میں اپنے آپ کو گرفتار کرایا اور قید ہوئے؟

۴۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ مسٹر ریڈیسی نے، جو اس وقت لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ شہر میں ایک اعلان مورخہ ۲۶-۱-۱۹۰۹ء کو شائع کیا، جس میں اس چیز کی تشریح کی گئی تھی کہ خلفائے ثلاثہ یا رسول اللہ کے دیگر اصحاب کی علی الاعلان تعریف یعنی مدح صحابہ بالکل ممنوع قرار نہیں دی گئی ہے بلکہ صرف ان دنوں یعنی عشرہ اہلم اور اکیس رمضان کے روز۔ پبلک سڑکوں، پبلک گلیوں اور پبلک مقامات پر مدح صحابہ پر کچھ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اور یہ کہ بقیہ دنوں میں پولیس آفیسر کے

تحت لائسنس حاصل کر کے اسے شارع عام پر پبلک گلیوں اور سبک مقامات پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

۵۔ (د) کیا یہ واقعہ ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ نے یکم جون ۱۹۳۶ء کو زیر دفعہ ۱۴۲ ضابطہ فوجداری ایک حکم نافذ کیا جس کی رو سے ۲۔ جون ۱۹۳۶ء کو جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے موقع پر ان کے اعزاز میں شہر کے اندر ایک جلوس نکالنے والا تھا، مدح صحابہ پڑھنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

(ب) اگر یہ واقعہ ہے تو اس قسم کے حکم نافذ کرنے کے کیا وجوہات تھے؟  
۶۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کے خلاف بطور احتجاج وہ جلوس نہیں نکالا گیا؟

۷۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ۳۔ جون ۱۹۳۶ء کے فوراً بعد سنی مسلمان لکھنؤ کا ایک وفد لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس ان سے یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا کہ سنیوں کا ایک جلوس رسول اللہ کے اعزاز میں شہر کی عام سڑکوں پر ۱۳۔ جون کو نکالا جانے والا ہے۔ جس میں خود رسول اللہ کی شان میں نظمیں پڑھی جائیں گی۔ اور ان کے اصحاب کی (بشمول ان کے چاروں جانشین یعنی خلفاء) شان میں بھی۔

۸۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کا جلوس نکالنے کے لیے زیر دفعہ ۱۴۲ پولیس ایکٹ شہر کے پانچ مختلف محلوں کی پانچ مقامی سٹی انجنیوں کی طرف سے سپرنٹنڈنٹ پولیس لکھنؤ کو ایک باضابطہ درخواست دی گئی۔

۹۔ (د) کیا یہ واقعہ ہے کہ ۹۔ جون کو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جلوس کے متعلق اپنے احکامات سے اطلاع دی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ جلوس کے راستے یا اس کی سماعت میں کسی شخص یا کسی جماعت کی طرف سے شارع عام پر کسی قسم کی ایسی نظم یا اشعار یا ایسے الفاظ نہ نکالے جائیں، جس سے خلفاء ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کی تعریف مقصود ہو۔؟

(ب) اگر یہ واقعہ ہے تو ان پابندیوں کو حاکم کرنے کے کیا وجوہات تھے؟

(ج) کیا یہ واقعہ ہے کہ ان پابندیوں کے حاکم کرنے کے خلاف بطور احتجاج جلوس نہیں نکالا گیا۔

۱۰۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ بعض سنی مسلمانوں نے زیر دفعہ ۳۰ پولیس ایکٹ سپرٹنڈنٹ پولیس کو ایک دوسری درخواست اس امر کی دی کہ انہیں ۲۸ جون ۱۹۳۶ء کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے جانشین ابو بکر صدیقؓ کے اعزاز میں شہر میں ایک جلوس نکالنے کا لائسنس دیا جائے، جس میں خلیفہ مذکور اور دوسرے خلفاء کی مدح میں نظمیں بھی پڑھی جاسکیں۔

۱۱۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ سپرٹنڈنٹ پولیس نے یہ عرضداشت لکھنؤ کے سٹی مجسٹریٹ کے پاس اس سفارش کے ساتھ بھیجی کہ جلوس کی اجازت نہ دی جائے۔

۱۲۔ (ا) کیا یہ واقعہ ہے کہ سٹی مجسٹریٹ نے جلوس نکالنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

(ب) اگر ایسا ہوا تو اجازت نہ دینے کے وجوہات کیا تھے؟

۱۳۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ مقامی حکام کی طرف سے شارع عام پر یا پبلک مقام پر علی الاعلان مدح صحابہ پڑھنا ممنوع ہے۔

۱۴۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ جون سے حکام لکھنؤ کی طرف سے ایک حکم زیر دفعہ ۱۴۲ ضابطہ فوجداری اس امر کی ممانعت میں دیا جاتا ہے کہ مسجد ٹیلا لکھنؤ کے نصف میل کے رقبہ کے اندر پانچ آدمیوں سے زائد نہ جمع ہوں۔

۱۵۔ (ا) کیا یہ واقعہ ہے کہ کئی آدمیوں پر جن کو حکومت لکھنؤ کے احکامات کے خلاف مظاہروں سے منسک بتایا جاتا ہے زیر دفعہ ۱۰۶ فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ اور ان کی سرسری سماعت ہوئی؟

(ب) کیا یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں سے زیر دفعہ ۱۰۶ ضابطہ فوجداری بڑی بڑی ضمانت کی رقمیں طلب کی گئیں۔ ورنہ بصورت عدم ادائیگی طویل مدت کی سزائیں مقرر کی گئیں۔

۱۶۔ (ا) کیا یہ واقعہ ہے کہ لکھنؤ میں بہت سے مسلمانوں پر مدح صحابہ کے مسئلے پر زیر دفعہ ۱۸۸ مقدمہ چلایا گیا اور انہیں قید کی سزا دی گئی۔

(ب) اگر ایسا ہوا تو ان کی تعداد کیا ہے۔

۱۷۔ کیا حکومت کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ایک کثیر طبقہ میں لکھنؤ کے مقامی حکام کے احکام کے خلاف جن کے ذریعے سے مدح صحابہ ایک غیر مضرت رساں مذہبی فعل کی مسلسل ممانعت کی جا رہی ہے، سخت ناراضگی پھیل گئی ہے۔



۱۸۔ کیا حکومت اس امر سے واقف ہے کہ مدح صحابہ کے علی الاعلان پڑھنے پر پابندی مسلمانوں کے ایک کثیر طبقہ کے نزدیک ان کے شہری اور مذہبی حقوق میں مداخلت ہے۔

۱۹۔ کیا حکومت لکھنؤ حکام کو مدح صحابہ کے علی الاعلان پڑھنے پر مزید احکام نافذ کرنے سے منع کرنے کو تیار ہے۔

۲۰۔ کیا حکومت اس کے لیے تیار ہے کہ ان تمام لوگوں کو جو مدح صحابہ کے سلسلہ میں قید ہیں یا زیر حراست ہیں، رہا کر دے اور حکومت نے اس سلسلہ میں جو جرمانے وصول کیے ہیں، ان کی رقمیں واپس کر دے۔

نوابزادہ بیات علی خاں کے جواب میں ہوم ممبر لوپی نے جو تقریر کی اس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

**ہوم ممبر کے جواب**

۱۔ ہاں۔

۲۔ ہاں۔

۳۔ ہاں۔

۴۔ ہاں اس قسم کا نوٹس سٹر ریڈیسی نے شہر لکھنؤ میں تقسیم کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سنیوں کی طرف سے ایک درخواست وصول ہوئی کہ جلوس نکالنے کی اجازت دی جائے جس میں مدح صحابہ علی الاعلان پڑھی جائے گی۔ اس درخواست کے مقابلہ میں بعض دوسرے آدمیوں کی تعریف علی الاعلان پڑھنے کی درخواست کی تھی چونکہ نقص امن کا اندیشہ تھا اس لیے نامنظور ہوئی۔

۵۔ ہاں۔

(ج) وجوہات یہ تھیں کہ پیغمبر اسلام کی پیدائش کے موقع پر یہ جلوس حال ہی میں سکنا شروع ہوا تھا۔ چند برس ہوئے جب یہ جلوس پہلی مرتبہ نکالا گیا تو وہ ایک مشترک شیعہ سنی جلوس تھا جس میں علی الاعلان مدح صحابہ پڑھنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ گذشتہ دو سال سے دونوں فرقوں کے تعلقات کشیدہ ہونے کی وجہ سے چند شیعہ جلوس میں حصہ لیتے ہیں۔ مگر اس جلوس کی مخلوط صورت نہیں بدلی اور اس سال بھی شیعوں نے جلوس میں پھر اسی شرکت کا اعلان کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنیوں کا شدید اندیشہ پیدا ہو گیا۔ علاوہ اس کے مقامی حکام نے عام پالیسی کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ وہ

ان دنوں میں جب کہ گذشتہ زمانہ میں اس قسم کا کوئی جلوس نہ نکلا ہو۔ کوئی ایسا جلوس جس میں علی الاعلان مدح صحابہ پڑھی جائے نکالنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ سنیوں کو بھی مطلع کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ علی الاعلان مدح صحابہ پڑھنے کے حق کے عام سوال کا پچیس برس کی خاموشی کے بعد اجیار کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ آئینی طریقہ سے حکومت کے پاس اپنی معروضات پیش کریں اور یہ کہ اس وقت تک کسی نئے جلوس کی اجازت نہیں دی جاسکتی جب تک پالیسی کا عام سوال نہ طے ہو جائے۔

۶۔ ہاں۔

۷۔ ہاں۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس سستی مسلمانوں کا ایک وفد گیا تھا۔ ان سے یہ کہا گیا کہ اس نئی چیز کی اجازت ان وجوہات کی بنا پر نہیں دی جاسکتی، جو کہ سوال نمبر ۵ کے آخر حصہ میں لکھی گئی ہیں۔

۸۔ ہاں۔

۹ (د) ہاں۔

(ب) سوال ۵ ب کے جواب کے آخر میں وجوہات لکھے گئے ہیں۔  
(ج)۔ نہیں ۱۲۔ چون کہ ایک جلوس نکالا گیا تھا۔

۱۰۔ ہاں۔

۱۱۔ ہاں۔

۱۲ (د) ہاں۔

(ب) سوال نمبر ۵ (ب) کے جواب کے آخری حصے میں وجوہات بتا دیے گئے ہیں۔  
۱۳۔ ہاں۔ لکھنؤ میں مقامی حکام نے علی الاعلان مدح صحابہ پڑھنے کی ممانعت کر دی ہے۔  
۱۴۔ ہاں اس قسم کے حکم کے نفاذ کی اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ جمعہ کے دن ایک غیر آئین پسند مجمع ٹیلا کی مسجد کے گرد جمع ہو جایا کرتا تھا۔  
۱۵۔ (د) ہاں زیر دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری بہت سے آدمیوں پر مقدمہ چلا ہے۔ ان کی ممانعت سرسری طور سے نہیں ہوئی ہے۔

(ب) دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری کے ماتحت لوگ پکڑے گئے۔ ان سے غیر معمولی ضمانت

نہیں طلب کی گئیں۔ عدم ادائیگی کی صورت میں ان لوگوں کو ایک برس قید محض کی سزا دی گئی۔

۱۴۔ (و) ان زیر دفعہ میں تعزیرات ہند ایک سو ساٹھ آدمیوں کے مقدمات عدالت میں

پیش ہوئے ہیں۔ ایک سو پچاس آدمیوں کو سزا دی گئی۔ نو آدمیوں کو معافی مانگ لینے پر چھوڑ دیا گیا۔ ایک کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔

۱۵۔ حکومت کو معلوم ہے کہ لکھنؤ کے مقامی حکام کے احکام کے خلاف سنیوں میں سخت

بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔

۱۸۔ گورنمنٹ کو یہ معلوم ہے کہ مدح صحابہ کے علی الاعلان پڑھنے کی ممانعت اکثر سنیوں

کے نزدیک ان کے مدرسہ میں مداخلت ہے۔

۱۹۔ حکومت اس کے لیے تیار ہے۔ اور ہمیشہ تیار تھی کہ ایک ایسی طریقہ سے لکھنؤ کے سنیوں

کا ایک وفد اس سے ملے۔ اس قسم کی درخواست حال ہی میں وصول ہوئی ہے۔ اور ہذا کیسے لکھی

گورنر نے ۱۴۔ نومبر کو اس وفد سے ملنا منظور کیا ہے، جو ان کے سامنے اپنے معروضات پیش کریگا۔

۲۰۔ حکومت اس درخواست پر فوراً کرے گی۔

ان سوالات اور جوابات کے بعد نوابزادہ یاقوت علی خاں اور دوسرے مسلمان ممبران نے اس پر

تقریریں کیں۔

تشدد کی نئی تحریک  
 کاریں جلانے اور لیٹر بکسوں میں تیزاب ڈالنے کی تحریکات بالآخر ظاہری طور پر ختم ہو گئیں۔ کچھ دن لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ امرار کی کاریں سرعام کھڑی ہونے لگیں۔ حوام کی ڈاک متعلقین تک پہنچنے لگی۔ پولیس اور محکمہ انتظامیہ نے سکھ کا سانس لیا نہہر کوئی آرام کی نیند سونے لگا۔ لیکن سکون کے ان دنوں کی عمر بہت کم نکلی۔

۱۵۔ نومبر کو لاہور میں آئی فیسر کی کار جلادی گئی۔ اس سے اگلے روز ریوے روڈ پر ایک دستی

پوسٹر چسپاں پایا گیا کہ سنیوں کے باہر اپنی کاریں کھڑی نہ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی ذمہ داری آپ

پر ہوگی۔ ابھی لوگ کاریں سنبھال ہی رہے تھے کہ شہر کے امرار کی کوٹھیاں جلنا شروع ہو گئیں۔ آج ایک

محلہ کی کوٹھی کو آگ لگی، کل دوسرے مکان جلا۔ کبھی شہر سے باہر کسی امیر کی رہائش گاہ کو آگ لگا دی گئی۔

پولیس موقوفہ واردات پر پہنچتی تو رہاں۔ انہیں دستی کھینچے ہوئے سرخ پوسٹر ملتے۔ انہیں لانا بھر کی پولیس

نے مختلف مقامات پر چھاپے مار کر سابق بدنام سیاسی کارکنوں کے گھروں پر رات کے وقت شکنجے مارے اور چند نوجوانوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں رومی دت، ودیا ساگر، اوم پرکاش اور اے سنگھ شامل تھے۔

**ہندو مسلم فساد** | الیکشن سے قریب تر غیر ملکی حکمرانوں نے غلامی کی زنجیروں میں مزید کڑیاں جوڑنے کے لیے کئی بہانے سوچے۔ لیکن جب خزاں کے دن آجائیں تو پہاڑوں کے سبز زاروں کا چہرہ بھی زرد پڑ جاتا ہے۔ دیباؤں کے پانی خشک ہو جاتے ہیں۔ آبِ حیات کے ڈھیر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتی۔ درختوں کے آوارہ پتے اپنی رونق کھو بیٹھتے ہیں۔ ہرے بھرے باغ ویران صحرا کی طرح بہار کے دن یاد کر کے روتے ہیں۔ شبنم کے اُنسو بھی پھولوں کی دلجوئی نہیں کر سکتے۔ باغبان انہی دنوں بہار کے انتظار میں وقت گزار دیتا ہے۔

اسی طرح زوالِ سلطنت کے دن آتے ہیں تو تقدیر اور تہمیر آمنے سامنے ایک دوسرے کے خلاف آگ اگلا شروع کر دیتی ہیں۔ شاہی قلعے سے فریب کی جھونپڑی تک آگ کی ایک لمبی لکیر پھیل جاتی ہے، جس کا دھواں ایوانِ سلطنت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

ان دنوں جب سارا ہندوستان اکیٹ ۱۹۳۵ء کے آئین پر آزادی وطن کی راہ سے گزر رہا تھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ اپنے اپنے زمین اور اطوار سے غلامی کی زنجیریں توڑنے میں مصروف تھے۔ کسی قوم کے دل و دماغ میں اس کے سوا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ عین اسی موسم میں فرنگی شاطروں نے پرانی بساط پر نئے مہرے چنے۔ یعنی ہندو مسلم فساد کی آگ کو از سر نو ہوا دی۔ چنانچہ ۱۱ نومبر کو بمبئی میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ اور اس کے بعد اورنگ آباد، پٹنہ، میں ایک مسجد کو شہید کر دیا گیا۔ کئی نمازی زخمی ہوئے۔ اس کے جواب میں پونا میں ایک مندر کو آگ لگا دی گئی۔ اس کے برابر مسجد تھی اسے گرا دیا گیا۔ راولپنڈی میں سکھ اور مسلمان کے درمیان فساد ہوا۔ الہ آباد میں بھی فرقہ وارانہ جھگڑا اس قدر بڑھا کہ کئی دن شہر کا کاروبار معطل رہا۔ اس طرح مختلف شہروں سے اطلاعات آئیں۔ ان فسادات پر رہنمایان ملک نے دوڑ دھوپ کے بعد جلد قابو پایا۔ مگر انہوں نے کوئی کمی نہ کی جو کچھ بھی ان سے ہو سکا کیا گیا۔

## آل انڈیا شہید گنج کانفرنس

۱۲۔ نومبر کو لاہور میں مولانا شوکت علی کی زیر صدارت آل انڈیا شہید گنج کانفرنس منعقد ہوئی۔ چونکہ انتخابات قریب آ رہے تھے اور اس ڈرامے کا پرہ بھی اٹھ چکا تھا۔ لہذا مولانا شوکت علی کے علاوہ پنجاب سے باہر کا کوئی معروف اور قابل ذکر رہنما کانفرنس میں شریک نہیں تھا۔ پنجاب کے وہ نوجوان جنہوں نے گذشتہ تحریک میں جانفشانی سے حصہ لیا تھا، اس کا رروائی سے نہ صرف الگ رہے بلکہ دوران اجلاس انہوں نے ہنگامہ بھی کیا۔ جس پر کافی دیر اجلاس کی کارروائی معطل رہی۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں مولانا ظفر علی خاں کی طرف سے حسب ذیل قرارداد پیش ہوئی۔

”مسجد شہید گنج کانفرنس کا یہ اجلاس تمام اسلامی دوستوں سے اسلام کی عزت کے نام پر اپیل کرتا ہے کہ وہ دوستانہ تعلقات کی بنا پر جو ان کے دولت برطانیہ کے ساتھ ہیں۔ مسجد شہید گنج کے متعلق مسلمانان ہند کے جذبات کا احترام کرنے پر آمادہ کریں۔ اگر اس کوشش میں انہیں کامیابی نہ ہو تو وہ اسلامی عزت کی خاطر انجمن اقوام سے علیحدہ ہو جائیں۔ اور یورپ کی دوسری اقوام پر ثابت کریں کہ اسلامی اخوت اب بھی ایک زندہ حقیقت ہے“

اس قرارداد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا محرک تو تھا لیکن موید کوئی نہیں تھا اس طرح دونوں فرانس مولانا ظفر علی خاں نے ادا کئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا | مسلمان من حیث القوم حقیقت سے بیگانہ ہو کر جب سے انسانوں کے رنگ و روغن میں کھو گیا ہے اس

کا دامن جذبات اور ہنگاموں کی خانہ زحیڑوں میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ ہر چمکے زچیز سونا نہیں ہوتی اور جنہوں نے ایسا سمجھا وہ گرہ کٹوں سے ایسے لٹے کہ پھر خالی جھولی لے کر گھر لوٹے۔

ہماتما گاندھی کا بیٹا ہیرالال گاندھی مسلمان ہوا تو مسلمانوں نے اسے سزا کھوں پر جگ دی اس پران کے والد نے ایک پریس بیان میں کہا۔

”اگر ہیرالال اسلام کو سمجھ کر مسلمان ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی لیکن وہ اپنی ذاتی اور بری عادتوں کے تحت مسلمان ہوا ہے“

مولانا شوکت علی نے حال ہی میں کہا کہ

” میں ہیرالال گاندھی کی تشہیر کے لیے تیار نہیں، جو مسلمانوں کو ٹوٹنے کے لیے

اسلام کے حلقے میں آیا ہے۔“

مولانا شوکت علی کا یہ بیان مسلمان پریس نے شائع نہیں کیا اور نہ مناسب سمجھا۔ بلکہ ایک کمیونسٹ اخبار ہفت روزہ دہلی نے اسے شائع کیا۔ ہنوز اس بیان کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ نومبر کے آخری دنوں پریس میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

” مہاتما گاندھی کا بیٹا ہیرالال گاندھی پھر سے ہندو دھرم میں واپس چلا گیا۔

اخبارات کی اطلاع کے مطابق بمبئی کے بعض سینٹوں نے اسے ایک لاکھ

تیس ہزار روپیہ دیا کہ وہ اسلام چھوڑ کر دوبارہ ہندو ہو جائے۔ پچنانچہ اس نے

اپنے ایک بیان میں کہا کہ ہندو دھرم میں وہ سارا کچھ موجود ہے جو اسلام میں ہے۔“

اس سال ۱۰ جولائی کو حالات سے مجبور ہو کر لکھنؤ میں

صحابہ کرام کی عزت و احترام کے لیے جو سول نافرمانی

**تحریک مدح صحابہ ملتوی کر دی گئی**

شروع کی تھی نومبر کے وسط تک یوپی کی جیلوں میں ایک ہزار سے زائد رضا کار جا چکے تھے۔

رہنماؤں کے علاوہ بھی جو تحریک کی رہنمائی کرتے رہے، جیل حکام نے ان پر جو سختی روا رکھی اس

کی تفصیل الگ ہے۔ رضا کاروں کی قربانی اور کونسل کی کارروائی پر جس انداز سے بحث ہوئی۔

۱۲۔ نومبر ۱۹۳۶ء کو گورنر یوپی نے صحابہ کمیٹی کا ایک وفد حالات کے لیے بلا بھیجا۔ کافی دیر گفتگو

کے بعد گورنر نے ارکان وفد کو یقین دلایا کہ اہل سنت کی شکایت پر وہ غور کریں گے بشرطیکہ

سول نافرمانی کی تحریک بند کر دی جائے۔

گورنر سے ملاقات کے بعد لکھنؤ کے مسلم اکابر نے احوال رہنماؤں سے درخواست کی کہ

آپ ہماری گزارشات مان کر اپنی تحریک عارضی طور پر ملتوی کر دیں۔ پچنانچہ ۱۹۔ نومبر کو احوال

رہنماؤں نے سول نافرمانی کی تحریک کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دی۔

۲۰۔ نومبر کو یوپی مجلس احوال نے مسٹر محمد احمد کاظمی کی صدارت میں اس فیصلے کی توثیق

کر دی۔

دہشت پسندوں کی ہر روز کی کارروائیوں نے لاہور میں کافی بے چینی  
 اور افراتفری پیدا کر دی۔ سرمایہ دار طبقہ اپنی زندگی تک سے مایوس

نظر آنے لگا۔ گو پولیس اور دوسری انتظامیہ خافل نہیں تھی اس پر بھی آئے دن کہیں نہ کہیں حادثہ  
 کی اطلاع ملتی رہی۔ کاروں اور کوشیوں کو آگ لگنے کی کارروائی باز سچہ اطفال بن کر رہ گئی۔ اس پر  
 ۲۲۔ نومبر کو پنجاب پولیس نے اعلان کیا کہ اگر کہیں کسی قسم کی کوئی کارروائی ہو تو ۲۱۶ پر فون کریں  
 اس وقت تک لاہور میں ایس کاریں نذر آتش ہو چکی تھیں۔ ۲۲۔ نومبر کو گورنمنٹ کالج لاہور کے  
 پرنسپل کی کار بھی جلا دی گئی۔

اسی دوران لاہور میں آتش زنی کے بڑھتے ہوئے واقعات پر روزنامہ "انقلاب" نے ایک  
 ادارتی نوٹ لکھا جس میں اس نے اس تحریک کی مذمت کی۔ اس پر ۲۳۔ نومبر کو وزیران انقلاب  
 کے نام ایک بیزنک نفاذ آیا جس کی عبارت تھی، کہ

۱۔ اخبار انقلاب مورخہ ۲۱۔ نومبر میں کارسوزی کی وجہ کے عنوان سے جو کچھ  
 لکھا گیا ہے اسے پڑھ کر بہت تعجب ہوا۔ آپ جیسے حضرات نے بھی ہماری  
 مخالفت کی مٹان لی ہے۔ کیا غریبوں اور بے کاروں کی حمایت یہی ہے؟ جو  
 لوگ خودکشی کرنے اور مچھو کے مرنے سے ایسے اقدام کو بہتر سمجھتے ہیں گورنمنٹ  
 کو ہمارا کھلا چیلنج ہے کہ اگر وہ بیکاری کا انسداد نہ کرے گی تو نتیجہ غدر کے سوا  
 کچھ نہ ہوگا۔ ہم لوگ سرمایہ داروں کی کاریں جلا کر ان سے ایک بل پاس کروانا چاہتے  
 ہیں جس سے بے روزگاروں کو الاؤنس دلانے کا انتظام کیا جائے۔ کارسوزی  
 کے بند کرانے کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ بے کاروں کے لیے الاؤنس مقرر کیا جائے  
 (خط کے آخر میں لکھا تھا۔)

آپ کا بھاگ سنگھ

بھاگ سٹریٹ، نسبت روڈ۔ لاہور۔ راولپنڈی

آخر بڑی ڈر دھوپ کے بعد ۲۵۔ نومبر کو رات نو بجے فیروز پور روڈ لاہور سے ایک بیرسٹر  
 کی کوشی کے قریب سے ایک نوجوان کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے قبضے سے بوتل پٹرول، چند انقلابی  
 اشتہار ایک لبا چاقو اور دیاسلانی کی ڈبی برآمد ہو گئی۔ گرفتاری کے وقت اس شخص نے سوٹ،

بوٹ اور ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ اس کا نام بھی سابق کارسوز کی طرح ہیرلال ہے۔ گرفتاری کے وقت اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ اس کام میں کوئی دوسرا آدمی شریک نہیں وہ اکیلا ہی تمام کارروائی کا ذمہ دار ہے۔ اس سے پیشتر کے گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔

**انتخاب کی تیاریاں** | ۲۳۔ نومبر کے اخبارات میں پنجاب کی ۱۷۵ نشستوں کے لیے یونینسٹ پارٹی نے ایک سو گیارہ امیدواروں کا اعلان کر دیا۔ اسی روز مجلس اہوار نے صرف پنجاب کے لیے چوبیس امیدواروں کا اعلان کیا۔ لیکن فی الحال دونوں پارٹیوں نے اپنے اپنے امیدواروں کے نام ظاہر نہیں کیے۔

**پنجاب شیعہ پوٹیکل کانفرنس کی قرارداد** | لاہور ۲۹۔ نومبر کو پنجاب شیعہ کانفرنس کا اجلاس میر باقر حسین رئیس میر کوٹلہ کی صدارت میں ہوا۔ ابتداء میں اس انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کیے گئے۔

۱۔ پنجاب شیعہ پوٹیکل کانفرنس کا نصب العین آزادی وطن قرار دیا گیا۔  
۲۔ تمام اسلامی فرقوں سے رابطہ اتحاد قائم کرنے کو نصب العین قرار دیا گیا۔  
آل انڈیا شیعہ پوٹیکل کانفرنس کے نمائندے نامزد کیے گئے اور آخر میں حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

”پنجاب شیعہ پوٹیکل کانفرنس کا یہ اجلاس گورنمنٹ یوپی کی توجہ اس تحریک (مدح صحیح) کی طرف دلانا ہے جو پوٹیکل اغراض کی بنا پر فساد برپا کرنے کے لیے جاری کی گئی ہے۔ حکومت، اس تحریک کے متعلق فیصلہ کرتے وقت شیعیان ہند کے جذبات کا خیال رکھے۔ تاکہ مسلمانوں میں اس سے افتراق پیدا نہ ہو۔ اور مسلمان باہم فساد سے محفوظ رہیں“

یہ قرارداد ۳۔ دسمبر ۱۹۳۶ء کے روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئی۔

**برطانیہ کے شاہی خاندان میں انقلاب** | محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ دلوں کا یہ طوفان جب ساحل سے ٹکرا کر آپے سے باہر

ہو جائے تو دیوار چین بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ بہالہ اپنی پوری بلندی اور سمندر اپنی ساری



گہرائی اگر داؤ پر لگا کر کسی دل و نظر کے سینے کا راستہ بدلنا چاہیں تو خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔ یہ آگ سگتے سگتے جب شعلہ جوالہ بن جاتی ہے تو شہنشاہوں کے محل اور غریب کی جھونپڑی ایک ساتھ جلتے دکھائی دیتے ہیں۔

عشق کی دنیا دوسری ہے۔ یہاں مندر و مسجد کے لیے کوئی مقام نہیں۔ یہ صرف انسانوں کا جہاں ہوتا ہے، یہاں کا مذہب محبت ہے اور بس۔ اس الزام کے مجرم کبھی آرے سے پیرے جلتے ہیں، تو کبھی سولی ان کی آخری آرام گاہ ہوتی ہے۔ وہ لوگ صحراؤں میں اپنا جہان آپ آباد کرتے ہیں۔ قیس ہو، فرہاد ہو، واقع ہو، رومی ہو، مہینوال ہو کہ رانجھیا یا کران کا شہزادہ بنوں۔ ان سب نے رسم زمانہ سے بغاوت کر کے اپنے لیے ایسی راہ تجویز کی، جو انسان کی زندگی کی سب سے عزیز متاع ہے اور اسے محبت کے پھولوں سے سجایا۔ ان کے باعث جب انسان کانٹوں پر لٹیتا ہے تو ابلیس اسے مجنون کہہ کر پکارتا ہے۔

بلخ بخارے کا شہزادہ عزت بیگ مہینوال کہلاتا ہے۔ پوچھ چوہدری کا بیٹا دھیدو سیال خاندان کا چرواہا بن جاتا ہے۔ پنجاب کا پانی، بلوریت کے ٹیلے اور ایران کے بیلے ایران کے سلطان خسرو کی طرح گواہ ہیں کہ محبت کے باسی انسان اس جنس سے نہیں کسی اور جنس کے لوگ ہوتے ہیں۔ آگ میں جل جاتے ہیں، پہاڑ کاٹتے ہیں، صحراؤں میں پڑے پڑے سوکھ جاتے ہیں، دریا کے طوفانوں میں کچے گھڑے پر تیرتے ہیں، چاہے موت ہی کیوں نہ آجائے، لیکن قول و قرار سے نہیں ہارتے۔

گواہ یہ جنس ناپید ہو چکی ہے، تاہم ۱۹۳۶ء کے آخری پہرے میں برطانوی سلطنت کے شاہی خاندان کے شہزادہ ایڈورڈ ہشتم نے ایک عوامی عورت کی محبت میں ایک ایسی سلطنت کو کھٹو کر مار دی جس کی شاہی میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

شاہ جارج پنجم کی موت کے بعد ان کا بیٹا ایڈورڈ ہشتم کے نام سے تخت کا وارث تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے خاندان سے باہر کی ایک عورت منسٹرمن سے انہیں محبت ہو گئی۔ دونوں ازدواجی زندگی گذرنا چاہتے تھے، لیکن برطانیہ کا شاہی خاندان اور برطانوی پارلیمنٹ ان دونوں کے راستے کی دیوار بن گئی۔ اس پر مشر بالڈن وزیر اعظم سے اختلاف شروع ہوا۔ اول تو آرج بشپ کنٹربری نے گرجا میں ایک مطلقہ عورت کی شادی کرنے سے انکار کیا۔ دوسرے ملکہ میری نے جو بادشاہ کی والدہ ہیں اور نہایت

پرانے خیالات کی۔ انہوں نے ایسی شادی کو منظور کرنے سے اور ایسی عورت کو ملکہ مانتے سے انکار کر دیا جو پیشتر سے ایک شوہر سے طلاق لے چکی ہے اور عوامی خاندان کی ہے۔ یہ نہ کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور نہ کسی ڈیوک یا لارڈ کی بیٹی ہے۔ اس کو ملکہ میری، جو خود پچیس سال ملکہ رہ چکی ہیں، کس طرح نذر پیش کر سکتی ہیں اور اب اس سے نیچے درجے پر ماور ملکہ کی حیثیت لے بیٹھیں۔

مستر بالڈون نے کہا کہ بادشاہ کے نیچے بہت سے ہندوستانی دایان ملک ہیں۔ وہ اس کو کس طرح ملکہ مانیں گے۔ اس پر کچھ دن خفیہ گفتگو اور خط و کتابت ہوتی رہی۔ جب ایڈورڈ اس پر مصر ہوا کہ اس کی خوشی کا دار و مدار اس پر ہے تو منر سپین سے شادی کرے، تو یہ تجویز ہوئی کہ وہ رجسٹریشن کے ذریعے شادی کر لے لیکن اس کو ملکہ کا اعزاز حاصل نہ ہوگا اور نہ وہ شاہی خاندان کے گروہ میں شمار ہوگی، نہ شاہی خاندان کے اجتماع میں شریک کی جائے گی۔ نہ اس کی اولاد آئندہ بادشاہت کی حقدار ہوگی۔ ایڈورڈ نے کہا کہ یہ باتیں اس عورت کو ذلیل کرنے کے لیے کہی گئی ہیں، جس سے میں محبت کرتا ہوں اور میں یہ ذلت گوارا نہیں کر سکتا اور اس کو چھوڑ بھی نہیں سکتا، لیکن سلطنت سے استعفیا دے سکتا ہوں، جو میرے اور میری محبوبہ کے درمیان حائل ہے۔ چنانچہ قصر وندسمر میں مسٹر جوبل کے مشورے سے اعلان بنا، جو وزیر اعظم کو دکھا کر منظور کر لیا گیا اور ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ریڈیو پر اعلان ہو گیا اور اسی دن پارلیمنٹ کی منظوری سے استعفیا منظور ہوا اور شاہ چارج کشمیر کو بادشاہ مقرر کر دیا گیا۔

آل انڈیا کانگریس کی قرارداد | ہر صاحب شعور جانتا ہے کہ یورپ کے افق پر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے مہرگشت ہیں، بہت جلد یہ مہیب گھٹاؤں کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ انہی حالات کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے ۲۲ دسمبر کو دار و عہد میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے دوسری جنگ عظیم کے متعلق حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

”کانگریس خود کو ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے، لوکیت کے کنٹرول کو ملک سے خارج کرنے اور اہل ہند سے ناجائز نفع اٹھانے دینے کا پابند بنا چکی ہے اور

کئی سال سے اس پالیسی پر عامل ہے اور اس سلسلے میں ہندوستان کی تقریب

تاج پوشی میں شریک نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ اگر اقوام یورپ میں کوئی بڑی لڑائی ہوئی، جس کا امکان بڑھتا جا رہا ہے تو کانگریس کا کوئی کارکن اس جنگ میں برطانیہ کے ساتھ شریک نہیں ہوگا۔

مجلسِ حرار نے اپنے امیدواروں کا اعلان کر دیا | امرتسر سے شیخ حسام الدین، گڑھ شکر ضلع ہوشیار پور سے چودھری افضل حق

سیکوٹ سے مولانا منظر علی انظر، راجوں ضلع ہوشیار پور سے چودھری عبدالرحمن، خواجہ غلام حسین ایڈوکیٹ، لاکپور اور جھنگ سے چودھری غلام حیدر فیروز پور اور جالندھر سے۔ چوہدری غلام رسول سترہ ڈسکہ سے، سردار محمد شفیع پونیاں تحصیل قصور سے، خان منظر نواز تٹان سے۔ خواجہ محمد یوسف لدھیانہ سے۔

سید حبیب کو براہ راست ٹکٹ نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ اس کی حمایت کا اعلان کر دیا گیا۔

جدید دستور کو مسترد کر دیا | آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے پچاسویں سالانہ اجلاس منعقدہ مئی پور میں ۳۰ دسمبر کو جدید دستور کو مسترد کرتے ہوئے ہندوستان کے لیے از سر نو دستور کا مطالبہ کر دیا۔

پنجاب اہل حدیث کا فیصلہ | ۳۰ دسمبر کو لاہور میں پنجاب اہل حدیث حضرات نے فیصلہ کیا کہ

”اہل حدیث کسی ایسے امیدوار کو ووٹ نہ دیں جو کمیونٹی ایوارڈ کے خلاف رائے رکھتا ہو۔ نیز اہل حدیث حضرات کو تاکید کی گئی کہ وہ کسی ایسے امیدوار کو ووٹ نہ دیں، جو یونینسٹ پارٹی کا بھرو یا اس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہا ہو کیونکہ وہ حکومت کی جماعت ہے۔“

ہندو مسلم اتحاد | کراچی۔ ۳۰ دسمبر سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے لیڈر سیٹھ عبداللہ ہارون ایم۔ ایل۔ اے نے پریس بیان میں کہا کہ

”ماضی میں ہم سے کئی فروگزاشتیں ہو چکی ہیں۔ لیکن اب کے بارندھ یونائیٹڈ پارٹی کے ہر رکن نے اپنے کو صوبے کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ یہ امید

رکھنا دراصل ایک قسم کی زیادتی ہوگی کہ سندھ اسمبلی کے ایک سو ساٹھ ارکان جو چھ لاکھ رائے دہندگان کے نمائندے ہوں گے۔ اپنے صوبے کی بڑھتی ہوئی غربت اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے کاری کا کوئی حل ان کے پاس نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی دیہاتی یا شہری مسداس وقت تک حل نہیں ہو سکتا، جب تک ہندو مسلمان کونسل یا اسمبلیوں کے اندر یا باہر باہم اتفاق نہیں کریں گے۔

تحریک مدح صحابہ شیعوں کے خلاف ہے | لکھنؤ - ۲۹۔ دسمبر پانچویں شیعوں پر ٹھیکر کانفرنس نے جس کی صدارت اودھ کے انجمنی بادشاہ

کے فرزند شہزادہ اکرام حسین نے کی، اپنے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت اور شیعوں کو متنبہ کیا گیا کہ وہ شیعوں کے جذبات اور حقوق کا خیال رکھیں کیونکہ ہماری حیثیت کو عمداً نظر انداز کیا جا رہا ہے اور تحریک مدح صحابہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو شیعوں کے خلاف ہے اور اس طرح ان کی سیاسی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے چلائی گئی ہے۔

صدر مجلس احرار کا جواب | مندرجہ بالا قرارداد کے جواب میں مولانا حبیب الرحمن صدر آل انڈیا مجلس احرار نے ۳۱۔ دسمبر کو ردھیانہ سے پریس بیان میں کہا:

”یقیناً غلط ہے کہ تحریک مدح صحابہ کی سیاسی حیثیت کو ختم کرنے یا انہیں آئندہ الیکشن میں نقصان پہنچانے کے لیے شروع کی گئی ہے۔ اس قسم کی الزام تراشی خود شیعوں امیدواروں کے حق میں مفید نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے ان کے مفاد کو زیادہ نقصان پہنچے گا۔ پنجاب دیوبند میں احرار خود شیعوں امیدواروں کی حمایت کر رہی ہے اور احرار کا جنرل سیکرٹری مولانا منظر علی تھرا، جو ہمیشہ بلا مقابلہ منتخب ہو رہا ہے، حالانکہ جس حلقے سے وہ انتخاب لڑتے ہیں وہ تمام کا تمام شیعوں کا ہے اور ان کا مقابلہ کسی تھا۔ مجلس احرار نے کبھی کسی شیعوں یا سنی کا خیال کیے بغیر ہمیشہ حق کی لڑائی لڑی ہے۔ اس طرح تحریک مدح صحابہ کا مقصد یہ بھی ہے کہ ایک ناجائز قانون کا خاتمہ کیا جاسکے۔ کیونکہ اس قانون کے تحت سنی اور شیعوں کے درمیان بہتر فیصلہ رہتا ہے۔“ مولانا نے انہیں کہا: ”انصاف پسند شیعوں حضرات علیحدہ نیابت کا خیال اپنے ذہنوں سے نکالیں اور مدح صحابہ پر غیر ضروری پابندیوں کے خلاف ہمارا ساتھ دیں۔“

۱۹۳۶ء کے دامن پر گزشتہ سالوں کی نسبت غلام ہندوستان کے خون کا کوئی چھینٹا نہیں۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں، اس سال کو مغرب کی تہراتیوں میں جب اوداع کہہ رہی تھیں تو ان کے چہرے پر بھرتی ہوئی شرمیلی ڈھن کی مانگ کے مندور کی طرح چمک رہی تھی۔ اس پر شفق کی لالہ گوں مہاروں نے جب اپنا آنچل ڈالا تو آسمان کے ستارے اپنی تمندلیں روشن کرنے لگ پڑے کہ اندھیروں کے سائے میں، ۱۹۳۷ء اپنا راستہ نہ کھو جائے۔

نئی اصلاحات کی آمد اور اس کے نفاذ کی تیاریوں میں دانشور اور سیاستدان غیر ملکی حکمرانوں سے کوئی الجھاؤ پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سال ۱۹۳۶ء میں نہ تو کانگریس نے حکومت سے بگاڑ مناسب سمجھا اور نہ ہی غلام باہم دست و گریباں ہوئے۔ اگر کہیں اس کی نوبت آئی تو وہ بہت جلد دم توڑ کر رہ گئی۔ البتہ مجلس احوار کو اس سال ایسی سنگلاخ وادیوں سے گزرنا پڑا، جہاں تدبیر اور ایشیا رائے تکتے رہ گئے۔ مسلمان کے جذبات میں ایسا زہر گھول دیا گیا کہ کوئی ترشی بھی اس نشہ کو تار نہ سکی۔ جب اس کا اثر زائل ہوا تو دشمن اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا۔

مسجد شہید گنج کے سوداگروں نے اپنے ضمیر کے بھاؤ اس قدر ہلکے رکھے کہ خریدار نے کوئی دقت محسوس نہ کی۔ لیکن اس پکڑ بٹھمی پر لٹنے والا قافلہ حریت آسمان کے سوا اپنی ساری پونجی کھو چکا تھا۔ ہنوز اس خارزار وادی کے سبب ان کے تلووں سے خون بہ رہا تھا کہ لکھنؤ میں یارن ریل (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ناموس پر کچھڑا پھلنے لگا۔ حواری ایمان کی رہی سہی دولت لے کر وہاں جا پہنچے۔ یہ قضیہ ابھی طے نہیں ہوا تھا کہ ۱۹۳۶ء رخصت ہو گیا۔

نیا سال اپنے ساتھ کس قدر نیکیوں اور برائیوں کا پھتارا اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ یہ دیکھنا مستقبل کے سپرد ہے۔ مگر جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے وہ بہتے پانی کی طرح صاف واقعات

کے تمام خدو خال کو سمیٹتے جا رہی ہے بشرطیکہ دل ودماغ میں کوئی خلل نہ ہو۔ ورنہ سیدھی لکیریں بھی طیڑھی نظر آنے لگتی ہیں۔

صدر کانگریس کا خط | الیکشن کے دنوں ہندوستان کی سیاسی جماعتیں غلامی کے خلاف ذہن رکھتے ہوئے بھی انفرادی فکر سے باز نہیں تھیں۔ کانگریس ایسی پوٹیکل پارٹی کے دل ودماغ بھی الٹی سیدھی موج میں تھے۔ انہی دنوں مولانا حبیب الرحمن صدر آل انڈیا مجلس اہوار اور کانگریس پریذیڈنٹ پنڈت جواہر لال نہرو کے مابین خط و کتابت ہوئی جس سے کانگریس کی اندرونی پالیسی واضح ہو کر سامنے آگئی۔

» مولانا حبیب الرحمن صاحب صدر مجلس اہوار اسلام۔ لاہور  
 مگر می! آپ کا خط مجھے بہنی سے واپسی پر کل ملا۔ اس کا جواب انگریزی میں بھیجتا ہوں۔ لیکن آپ کی آسانی کے لیے یہ مختصر اردو ترجمہ بھی ساتھ ہے۔  
 میں نے اپنے پہلے خط میں آپ کی توجہ چند سوالوں کی طرف دلائی تھی۔ ان سوالوں کا ذکر آپ نے اپنے جواب میں نہیں کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر غور کریں اور مجھے مشورہ دیں۔ مجھے اس بات سے مطلب نہیں کہ ہندو مہا سبھا یا سوشلسٹ پارٹی کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے۔ مجھے تو کانگریس کی رائے سے مطلب ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو اس سے کیا شکایت ہے کانگریس کی رائے یہ ہے۔

فرقہ وارانہ فیصلہ ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کی آزادی کے لیے نقصان دہ ہے۔ وہ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اور ہمارے اصل سوال غریبی اور بے کاری کے ہیں۔ ان کو پیچھے کر دیتا ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ فیصلہ ہندو مسلمانوں کی نسبت نہیں ہے۔ اس میں بہت سی قومیں اور فرقے شامل کیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ انگریز بھی اس کے ذریعے سے ہندوستان میں آٹھ نو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ بنگال میں جو یورپین ہیں، انہیں خاص اہمیت ہو گئی ہے۔ ان کی رضامندی کے بغیر کسی گروہ کے لیے کام کرنا مشکل ہوگا۔ اس لیے یہ فرقہ وارانہ

فیصلہ ہندو مسلمانوں کا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اور بھی مہبت سی پھیل گئی ہیں۔ جو یہیں آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ ایک اور بات غور طلب ہے کہ اس فیصلے کا اثر کچھ اوپر ہی لوگوں پر ہونا ہے۔ چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا کوئی اور۔ عام لوگوں پر ان کے سوا لوگ کا کوئی اثر نہیں۔ غریبی یا ہندوستان کی بڑھتی ہوئی بے کاری سے کوئی مطلب نہیں جو شخص ملک کی آزادی چاہتا ہے، یا جو شخص عام لوگوں کی غریبی دور کرنا چاہتا ہے اس کو ان دوہری باتوں سے دلچسپی نہیں ہو سکتی اور جو رکاوٹیں ان کے راستے میں آئیں ان کو ہٹانا چاہتا ہے۔ لہذا فرقہ وارانہ فیصلہ ایک بنیادی طور سے ہماری قومیت اور آزادی کے خلاف ہے۔ اس لیے اس کو اٹھانا ہی ہے۔ کیونکہ آزادی اور یہ فیصلہ ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

یہ کانگریس کی رائے ہے۔ جہاں تک اصول کا سوال ہے کانگریس کا یہ بھی یقین ہے کہ اس پر کوئی مناسب فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک مختلف فرقے رضامندی سے کسی فیصلے پر نہ پہنچیں۔ اس لیے کانگریس کوئی قدم بغیر اس رضامندی کے نہیں اٹھا سکتی۔ علاوہ اپنی رائے کے وہ یہ کوشش کرنا چاہتی ہے کہ ہم سب مل کر فیصلہ پر پہنچیں۔ آپ ان دونوں باتوں میں فرق دیکھئے گا۔ کانگریس کی رائے بالکل صاف ہے۔ وہ فرقہ وارانہ فیصلے کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن عملی طور پر وہ کچھ کرنا نہیں چاہتی۔ جب تک کہ آپس کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ اس کی رائے کہیں لی جائے تو وہ رائے تو ضرور دے گی۔ اگر نئی نسلوں میں یہ بات پیش ہو۔ کانگریس والے پیش نہیں کریں گے۔ تب کانگریس اپنی رائے ضرور دے گی۔ کہ فرقہ وارانہ فیصلہ غلط اور نقصان دہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کو صاف کرنا چاہیے گی کہ اس میں ترمیم آپ کے سمجھوتے کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ایسے مسئلہ پر کوئی رائے نہ دکھانا یا خاموش رہنا ایک فضول اور نکستی بات ہو جاتی ہے۔

مہربانی کر کے آپ مجھے بتائیں کہ کانگریس کی رائے سے آپ کیوں

اتفاق نہیں کرتے۔ آپ اور احرار لوگ ہندوستان کی مکمل آزادی چاہتے ہیں آپ کیا سمجھتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فیصلے کے ہوتے ہوئے ایسی آزادی ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کو ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں تو وہ ایک غلط چیز ہے اس کو ہٹانا چاہیے۔ سوال یہ نہیں کہ ہندوؤں کو کیا ملے اور مسلمانوں کو کیا ملے۔ جو بھی کچھ کسی کو ملے یہ فیصلہ غلامی کا فیصلہ ہے اور کوئی قوم جو آزادی چاہتی ہے اس کو منظور نہیں کر سکتی۔ یہ ممکن ہے کہ مسلمانوں کو جو کچھ ملا ہے وہ کسی اور ذرائع سے بھی محفوظ رہ سکے۔ لیکن اس فیصلے کی بنیاد ہر صورت سے بدلنی پڑے گی اور عام مسلمانوں کو ملا کر آگے بڑھا جاسکتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مسئلوں پر غور کر کے مجھے اپنی رائے بھیجیں۔ میرا خیال ہے کہ اس فیصلے سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان ہے بہ نسبت اوروں کے۔ اگر کسی کو فائدہ ہے تو وہ منطقی بھراؤ پر کے آدمیوں کو۔ عام لوگوں کو نہیں۔

(نقطہ نیاز مند۔ جواہر لال نہرو۔ سورج بھون الہ آباد ۱۴ مئی ۱۹۴۷ء)

جواب۔ پیارے پنڈت جی!

تسلیم۔ آپ کا گرامی نامہ پہنچا۔ یاد آوری کا شکر یہ۔

آپ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مجھے آپ کے کس طرح عمل سے شکایت ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ البتہ جب آپ ایسے حضرات جو ہندوستان کی آزادی کے علمبردار ہیں، بے ضرورت غلطیاں کرتے ہیں تو مجھے دکھ ضرور ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ غوغا چھاپا جا رہا ہے کہ مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ بات سرے سے ہی غلط ہے مگر نیشنلسٹ ہندو اور انگریز اپنے اپنے مفاد کے لیے پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ اس پروپیگنڈا سے دونوں کا مقصد جدا جدا ہے۔ انگریز یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا پر ظاہر کرے کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اس میں مسلمان شریک نہیں اور ہندو اس لیے پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے کانگریس کے جھڈے تلے وطن کی



آزادی کے لیے قربانی اور آزادی کا کام تو لیں لیکن ملکی حقوق کی تقسیم کا وقت آئے تو ہم مسلمانوں سے یہ کہہ کر انہیں محروم کر دیں کہ تم نے وطن کی آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ آج بھی مسلمان اس اتحاد سے شریک ہیں، جو ہندو کی تناسب آبادی سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ ننانوے فیصد ہندو نیشنلسٹ زبان سے یہ کہتے ہیں کہ مسلمان کانگریس میں آئیں اور دل سے یہ چاہتے ہیں کہ نہ آئیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مولانا شفیع داؤدی، اسید مرتضیٰ بہادر وغیرہ وغیرہ ۱۹۲۲ء تک کانگریسی تھے۔ لیکن جب سراج پارٹی نے اسمبلی میں سرحد کی اصلاحات کے متعلق ہندو ذہنیت کا ثبوت دیا اور واک آؤٹ کر گئی تو یہ لوگ کانگریس سے الگ ہو گئے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں، جن کا جذبہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی تمام غلط کاریوں کے باوجود آزادی وطن کے لیے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک رہنا چاہیے۔ مجھے وطن کی آزادی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

فرقہ دارانہ تصفیہ کے متعلق جو رپورٹ پیگنڈا ہندوستان میں ہو رہا ہے مجھے پڑھ کر بے حد حیرت ہوتی ہے۔ ہم کیسی احمق دنیا میں آباد ہیں۔ جو چیز ہمارے اپنے تصفیہ کی ہے اور جس کا تصفیہ محض خود غرض اور وطن دشمن ہندوؤں نے خود نہیں ہونے دیا۔ اس کا الزام دوسروں پر کیوں دیتے ہیں۔ دلچسپ وزیر اعظم برطانیہ پر لکھنؤ میں نہرو رپورٹ کی شکل میں فرقہ دارانہ تصفیہ ہوا مگر گاندھی جی نے سکھوں کو خوش کرنے کے لیے اسے دربانے راوی میں غرق کر دیا۔ جن لوگوں نے نہرو رپورٹ کے لیے اپنی قوم سے بازاروں میں پتھر کھائے ان سے اس کے غرق کرنے کے وقت مشورہ بھی نہ لیا گیا۔ اس کے بعد گاندھی جی مکمل آزادی، راؤ ٹیٹیل کانفرنس میں لینے کے لیے گئے۔ ان دنوں میں بہتی میں موجود تھا۔ میں نے ان سے مل کر کہا کہ آپ لندن نہ جائیے۔ جب تک ہندوستان کی قومیں آپس میں تصفیہ نہ کریں۔ مگر گاندھی جی دنیا میں کسی کی سنسنے والے نہیں۔ نہ ماننے والے گاندھی جی راؤ ٹیٹیل کانفرنس میں لندن گئے اور ملک کو اس سے جو نقصان پہنچا تھا، منہ بچ گیا۔

ملک کے بدترین دشمن فرقہ پرست ہندو اور مسلمان کانفرنس میں بلائے گئے تھے، جنہوں نے وزیر اعظم کو دیکھ کر لکھ دیا کہ ہمارے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق جو فیصلہ آپ کر دیں گے وہ ہمیں منظور ہوگا۔ جب وہ تصفیہ ان لوگوں کے ارادے کے خلاف آیا تو انہی لوگوں نے اس کو فرقہ وارانہ وقار کا مسئلہ بنا کر اس کے خلاف پروپگنڈا کیا۔ سردار ٹیل نے ایک تقریر میں جو انہوں نے لڑھی تھی اس کی معنی، کما تھا کہ:

ماویہ جی خود وزیر اعظم برطانیہ سے فرقہ وارانہ فیصلہ لے کر آئے ہیں اور خود ہی اس کے خلاف پروپگنڈا کر رہے ہیں۔ سردار ٹیل نے ماویہ جی کے بارے میں سخت الفاظ کہے تھے۔ مگر میں انہیں نقل کرنا نہیں چاہتا۔

کاش! یہ پارٹی اس فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف اگر اس بنیاد پر پروپگنڈا کرتی کہ فیصلہ ہندوستانی قومیت کے منافی ہے تو یہ بات معقول ہوتی۔ لیکن پنڈت ماویہ جی سے لے کر ان کی پارٹی کے تمام اراکین اور ہندو اخبارات نے یہ کہا کہ پنجاب اور بنگال میں اسلامی راج قائم ہو گیا ہے۔

میرا یقین تھا کہ آپ اس خیال سے علیحدہ رہیں گے۔ کیونکہ جو شخص ہندوستان کی مکمل آزادی چاہتا ہے، اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کو کیا دیتا ہے۔ اس کا تو ایک ہی کام ہے کہ وہ بدیشی طاقت کو کسے کہ میرا گھر خالی کرو اور بس۔

لاہ لاجپت رائے نے مجھے دھرم سالہ جیل میں کہا تھا کہ اگر کانگریس نے ہندوستان کے لیے کوئی آئین تیار کیا، یا وہ کسی آئین کے رد و قبول کی بحث میں پڑ گئی تو تمام اقوام ہندوستان میں لڑنے لگ جائیں گی اور ہندوستان کی آزادی بہت دور ہو جائے گی۔

یہ بات کتنی سچ لگتی۔

آپ سے یہ دکھ پہنچا ہے کہ آپ نے کمیونل ایوارڈ کے سلسلے میں کانگریس

میں تبدیلی پیدا کی اور آپ اس پارٹی کے سامنے جھٹ گئے جو وطن کی آزادی کے ساتھ ہندو راج کے خواب دیکھ رہی ہے۔ کیا آپ مجھے سمجھا سکتے ہیں کہ کمیونٹی یوٹھ کے مسترد کرنے کے کیا معنی ہیں۔ کیا ہم پھر انگریز سے کہیں گے کہ وہ دوبارہ ہمارے لیے فیصلہ دے۔ اگر اس سے یہ مراد نہیں تو پھر فرقہ وارانہ فیصلے کو مسترد کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہندوستان کی تمام فرقہ وارانہ ملتیں خود کو فی باہمی تعفیہ کر لیں۔ اگر پہلی بات ہے تو بدیشی حکومت جو فیصلہ کرے گی وہ ہندوستانی مفاد کے خلاف ہوگا۔ اور اگر ہم خود کو فی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ فیصلہ خود کو اپنا چلیے۔ باہمی فیصلہ سے فرقہ وارانہ فیصلہ خود بخود مسترد ہو جائے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پنجاب کے سکھ اور ہندو اب کمال کے ہندوستان کی کسی ایسی فیصلے کو ماننے کے لیے تیار نہیں خواہ وہ خالص قوم پرستی کی فیصلوں پر مبنی کیوں نہ ہو کہ جس سے ان کو خطرہ پہنچائے۔ کہ اس فیصلے سے پنجاب اور پنجاب کے لوگوں کی اکثریت ہونے لگی۔

آپ کے موجودہ طرز عمل سے کانگریس کے وقار کو خدہ بردار ہے۔ پنجاب میں اول تو سپریم ہی کانگریس کا کوئی خاص وقار نہیں۔ کیونکہ پنجاب کی کانگریس آپ نے چار ڈاکٹروں (ڈاکٹر گوپی چندر بھارگو، ڈاکٹر سیف الدین کھلو، ڈاکٹر گوپال) ڈاکٹر تیرپال، کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے۔

بندہ برس سے میں دیکھ رہا ہوں کہ ان ڈاکٹروں کو لہستان کے سوا کوئی کام نہیں دوڑا کر تو سنا نہ کانگریس سے الگ ہو گئے ہیں۔ اس میں سے ایک تو مسجد شہید گنج کے ٹکٹ پر کام کر رہا ہے اور دوسرے ڈاکٹر نے اسب اسٹریٹ کی مسجد کے حوض میں نماز ترویج کے بعد مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ پنجاب اسمبلی میں اس لیے جا رہا ہوں کہ پنجاب اسمبلی میں مسلمانوں کو تین فیصد سیٹیں ملیں۔ باقی دو ڈاکٹر ہیں انہیں لڑنے سے فرصت نہیں۔ ان کے ہاتھوں نے ایک مخلص کانگریسی لیڈر کو لہستان کے لیے بلا دیا ہے۔

گئی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مالویہ جی کی پارٹی پنجاب الیکشن میں کامیاب ہوگی۔  
مکمل آزادی کے ریزولیشن کے بعد کانگریس کا یہ کام ہے کہ وہ انگریزی حکومت  
کے ہر عہدے سے بے نیاز رہے اور انگریزی حکومت کے ہر فیصلے کو فرقہ پرستوں کے  
حوالے کر دے اور ہر کانگریسی کا ایک ہی فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے عوام میں آزادی  
کی سچی تڑپ پیدا کرے۔ میرے نزدیک نہ اب ہندوستان میں اسلامی حکومت ہے  
نہ آئندہ ہوگی۔ اس لیے فرقہ وارانہ فیصلے کو ماننے اور تبدیل کرنے سے کوئی دلچسپی  
نہیں۔ لیکن نہ معلوم آپ جیسے آدمی کو کیوں دلچسپی ہے۔

(آپ کا جلیب الرحمن۔ جلیب روڈ۔ لدھیانہ۔ ۲۔ جنوری ۱۹۳۷ء)

مندرجہ بالا خطوط سے ظاہر ہے کہ مجلس احوار اور کانگریس میں کس قدر بوجہ موجود ہے۔ اس  
سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نئے آئین کے مصنفین کی نیتیں درست نہیں تھیں ورنہ ایک ڈگر کے  
مسافروں میں بعد کیوں؟ — جبکہ منزل بھی جدا نہیں۔

ظاہر ہے کہ غیر ملکی مفننہ کے ممبران کی تمام تر کدو کاوش میں خلوص مفقود تھا۔ وہ پتیل کو سونا اور  
کوئلے کو ہیرا بنا کر لائے تھے۔ تاکہ اقوامِ افرنگ کا سورج کچھ دیر مزید غلاموں کی آنکھوں کو خیرہ  
کر سکے۔ مگر ٹارنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

ان دنوں کانگریسی حلقوں میں یہ بحث زور پکڑ رہی تھی کہ اسمبلی میں جا کر وزارتیں قبول کی جائیں  
یا نہ۔ کیونکہ نئے آئین میں صوبائی خود مختاری کے باوجود تمام تر اختیارات گورنروں کے پاس  
تھے اور وزارت محض ایک کھلونا تھی۔ جس سے یہ شبہ مزید بچتا ہو چکا تھا کہ ایکٹ ۱۹۳۵ء  
کوئی جاندار چیز نہیں۔ انگریز صرف اپنے غلاموں کو مہلانا چاہتا ہے اور بس۔

مولانا شوکت علی ان دنوں مسلم لیگ کے امیدواروں کی حمایت کے لیے پنجاب کا دورہ کر  
رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اگر اسمبلیوں میں وزارتیں قبول نہیں کرنی  
تو پھر اسمبلیوں میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں وزارتیں قبول کرنی چاہیں، تاکہ حکمرانی  
کی ٹریننگ ہو سکے۔ ہمیں چاہیے کہ رحمت پسندوں کو اقتدار پر نہ آنے دیا جائے۔

میں جدید آئین کو تباہ کرنے کے خلاف ہوں۔ بلکہ ہمیں اس آئین کو کامیاب بنانا چاہیے۔



”اس وقت ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں۔ ایک حکومت برطانیہ اور دوسری کانگریس۔ اگر آئندہ کوئی بات چیت ملکی اصلاحات پر ہونی ہے تو وہ صرف انہی کے درمیان ہوگی“

اس کے جواب میں مسلم لیگ کے صدر مسٹر عمر علی بخاری نے مولانا محمد علی جوہر کے یوم وصال کے موقع پر ۵۔ جنوری کو نکلنے میں کہا کہ

”کانگریس کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں۔ میں کہتا ہوں دو نہیں تین جماعتیں ہیں۔ یعنی حکومت، کانگریس جو ہندوؤں کی نمائندہ ہے اور اس کے علاوہ تیسری جماعت مسلمان ہیں۔ ان کے مشورے کے بغیر ہندوستان کی آزادی کی گفتگو نامکمل ہوگی“

کانگریس پریذیڈنٹ نے ۶۔ جنوری کو بانکی پور (پٹنہ) میں ایک تقریر کے دوران کہا کہ

**جو اہل** ”ہمیں مقصد کے لیے ہم سب بڑے ہیں اگر اس کے حصول کے لیے کونسلوں اور مجلس وضع قوانین سے انکار نہ ہو تو مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔

کونسلوں کے اندر سوراخ کے لیے اتنی جدوجہد نہیں ہو سکتی، جتنی باہر رہ کر ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود ہم کونسلوں میں جائیں گے اور اس ملک کی بہتری کے لیے جس قدر غامدہ ہو سکے گا، حاصل کریں گے“

**بنگال کا مسئلہ طے ہو گیا** وزارتوں کی ترتیب اور الیکشن سے پیشتر ہر پارٹی جوڑ توڑ میں مصروف تھی۔ بنگال اور پنجاب ایسے صوبے تھے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت کی کسی پارٹی سے نہ تو خوف تھا۔ نہ ہی ان دو صوبوں میں جوڑ توڑ کی ضرورت تھی۔ لیکن اس پر بھی بنگال کے سٹراے ایچ۔ غزنوی نے بغیر کسی مشورہ کے بنگال کے ہندوؤں سے فیصلہ طے کر لیا۔ ۷۔ جنوری کو ہندوؤں کی طرف سے ہمارا جو دھرج راج آف بردوان نے سٹراے ایچ۔ غزنوی سے بات چیت کر کے بنگال کا قضیہ ختم کر دیا۔ مسٹر غزنوی نے بنگال کے فرقدارانہ مناقشات کو رفع کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز ہمارا جو بردوان کو پیش کیں۔

۱۔ کیمونٹا اور آرڈر بس سال تک بحال رہے گا۔ اور اس کے بعد اس پر نظر ثانی کی

جائے گی۔ یا اس وقت تک بجال رہے گا۔ جب تک متعلقہ قوموں کے باہمی فیصلہ سے کمیونل ایوارڈ میں ترمیم نہ ہو جائے۔

۲۔ بنگال کی کابینہ میں ہندو اور مسلمان کی تعداد مساوی ہوگی۔

۳۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندو اور مسلمانوں کا تناسب یکساں رہے گا۔ یعنی یورپین اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائیوں کے مقررہ تناسب کے بعد دونوں قوموں کا تناسب یکساں ہوگا۔

ہمارا جہ بردوان نے بحیثیت انٹی کمیونل ایوارڈ کے صدر۔ ان تجاویز پر دستخط کر دیے۔

(کلکتہ ایسوسی ایٹڈ پریس)

ظاہر ہے کہ اسے ایچ۔ غزنوی کی مندرجہ بالا تجاویز بنگالی مسلمانوں کے لیے ضرر رساں تھیں مگر اس پر بھی ۱۰ جنوری کے روزنامہ انقلاب نے اپنے ادارہ میں خوشی کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس سے یونیٹ ذہن کی تائید ہوتی تھی۔

منشی احمد دین کوئٹا | مشیر سوشلسٹ لیڈر منشی احمد دین اجنوں نے اپنی تقریر میں مندرجہ  
مسجد شہید گنج کی ذمہ داری حکومت پنجاب پر عائد کی تھی۔ انہیں  
دفعہ ۱۲۴ کے تحت راولپنڈی سے واپسی پر ہٹل کے پل پر گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۰ جنوری کو ہٹل  
ڈرٹھکٹ محبٹرٹ جانڈھرنے منشی صاحب کو دو سال قید با مشقت کی سزا دی

سر سکندر حیات کی تقریر | ہوشیار پور میں ۱۱ جنوری کو سر سکندر حیات نے اپنی انتخابی  
تقریر کے دوران کہا، اگر مجھے کاہنہ بنانے کا موقع ملے تو میں اتحاد

پارٹی کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں کے نمبرن کو بھی کاہنہ میں شامل کروں گا۔ گواہی ملی میں اتحاد  
پارٹی کے ارکان کی اکثریت ہوگی۔ اس کے باوجود اتحاد پارٹی ایک سیاسی جماعت ہے جس  
میں کسی فرقہ وارانہ تمیز کے بغیر ہندو، سکھ اور مسلمان شامل ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ یونیٹ  
پارٹی صرف مسلمانوں کی سیاسی جماعت ہے۔

آپ نے کہا دستور اساسی کو چلانے کے لیے ہندو پروگریسو پارٹی دہندو مہا سبھا  
کے ساتھ تعاون کرنے میں مجھے انتہائی خوشی ہوگی، کیونکہ اتحاد پارٹی کوئی مذہبی جماعت

نہیں، جس کا مقصد کسی خاص مذہب کی حفاظت کرنا ہو۔ بلکہ یہ امیر اور غریب اور صوبہ کے درمیانہ طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ تقریر کے آخر میں آپ نے میثاقِ بنگال کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

”میں پنجاب میں بھی اس قسم کی تجویز کا خیر مقدم کروں گا“

(روزنامہ ”انقلاب“ لاہور۔ ۱۲۔ جنوری ۱۹۳۷ء)

۱۲۔ جنوری کو الہ آباد سے ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے مولانا شوکت علی کی ناراضگی

ہوئے مولانا شوکت علی نے کہا کہ:

”اے۔ ایچ۔ غزنوی اور ہمارا جبر بر روان کو کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہیں اور نہ ہی غزنوی کی مسلم قوم میں کوئی حیثیت ہے۔ لہذا میثاقِ بنگال سے بنگال کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس میثاق کی حیثیت ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں“

جیسے کہ سر سکندر حیات نے ۱۱۔ جنوری کو ہوشیار پور میں اپنی تقریر

مرزاؒ اور سکندر حیات

کے دوران کہا کہ یونینسٹ پارٹی کوئی مذہبی جماعت نہیں۔ اس

پر روزنامہ ”احسان“ لاہور نے اپنی ۱۵۔ جنوری کی اشاعت میں ایک ادارتی نوٹ لکھا کہ:

”یونینسٹ پارٹی کا لیڈر اگر مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا وعدہ کرے

تو ہم احرار رہنماؤں کو مشورہ دیں گے کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تعاون کریں“

ایکشن کے دوران احرار کے خلاف باضابطہ پروپیگنڈہ کی

بجلی چٹھیوں کی اشاعت

مہم چل رہی تھی۔ اس سلسلے میں عاشق حسین طباوی اپنی

کتاب ”اقبال کے آخری دو سال“ کے صفحہ ۳۷ اور صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں۔

”امرتسر سے دو آدمیوں نے کھڑے ہونے کا اعلان کیا تھا۔ ایک یونینسٹ

پارٹی کے امیدوار شیخ محمد صادق اور دوسرا احرار کے امیدوار شیخ حسام الدین۔ اس

مقابلے میں شیخ محمد صادق کا پڑا بھاری نظر آتا تھا۔ اور اندیشہ تھا کہ کہیں یونینسٹ

پارٹی کامیاب نہ ہو جائے۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو



کو کھڑا ہونے پر آمادہ کیا جو ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں تین سال قید کاٹ کر رہا ہوئے تھے۔ اور اب امرتسر کی بجائے لاہور میں پریکٹس کر رہے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ امرتسر میں ڈاکٹر کچلو کے سامنے کسی بڑے سے بڑے آدمی کا پرہیزگار نہ جل سکتا تھا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ کچلو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے کو تیار نہ تھے۔ ادھر کانگریسی ٹکٹ پر ان کی کامیابی کے امکانات قطعاً نہیں تھے۔ علامہ اقبال نے ایک درمیانی راستہ تلاش کیا اور ڈاکٹر کچلو کو انڈین نیشنل کھڑا ہونے پر آمادہ کر لیا۔ جب انہوں نے امرتسر کے شہری حلقے سے کھڑے ہونے کا اعلان کیا تو ایک سپیک جلسے میں لوگوں نے پوچھا کہ آپ کس ٹکٹ پر کھڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔ کچلو ٹکٹ“

ڈاکٹر اقبال کے اس مشورہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے ووٹ بجم تقسیم ہو گئے۔ جس سے اجرا اور یونینسٹ پارٹی دونوں شکست کھا گئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو مجلس اجرا کا نمائندہ کامیاب ہو جاتا۔

ان دنوں اجرا کے خلاف سابقہ شائع شدہ جعلی چھٹیاں بھی از سر نو شائع کی گئیں چنانچہ ۲۰ جنوری کے روزنامہ انقلاب نے ان جعلی چھٹیوں کو اپنے اخبار کے صفحہ اول پر جعلی عنوان سے شائع کیا۔ حالانکہ گذشتہ سال تحریک مسجد شہید گنج میں یہ چھٹیاں اور بعد میں ان کے تصنیف کا حلفی بیان شائع ہو چکا تھا۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کا حق نمک ادا کرنے کے لیے جعلی چھٹیوں کو شائع کرنا مناسب سمجھا۔ بعد میں ان چھٹیوں کے بڑے بڑے پوسٹر شائع ہوئے جو پنجاب بھر میں تقسیم ہوئے۔ اس پر مولانا منظر علی اظہر کا حسب ذیل بیان ۲۱ جنوری کے روزنامہ احسان میں شائع ہوا۔

”کسی شخص کا سر پر محمد حسین امرتسری نے ایک اشتہار کے ذریعے میری ایک فزنی چھٹی شائع کی ہے، جس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ میں نے چودھری افضل حق کو مسجد شہید گنج کے متعلق کچھ باتیں لکھی ہیں۔

میں نے یہی اعلان کر چکا ہوں کہ جعلی چھٹیاں میرے اور احباب کے نام

پر شائع کی جائیں گی۔ چنانچہ یہ پہلی چھٹی ہے، جو شائع کی گئی ہے۔ بالکل فرضی اور بے بنیاد ہے۔

اس چھٹی پر ۲۲۔ جولائی ۱۹۳۵ء کی تاریخ ہے۔ اور ظاہر کیا گیا کہ یہ چھٹی گورداسپور سے لکھی گئی ہے۔ اس کا پہلا فقرہ یہ ہے کہ

میں دورے سے واپسی پر دفتر پہنچا لیکن آپ موجود نہ تھے۔ زبانی طور پر تمام واقعات مولوی محمد شفیع سے کہہ آیا ہوں۔ غالباً انہوں نے تمام نشیب و فراز بیان کر دیے ہوں گے۔ احتیاطاً دوبارہ عرض کرتا ہوں۔

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں ۲۲۔ جولائی ۱۹۳۵ء کو گورداسپور میں تھا اور لاہور سے گورداسپور گیا تھا اور اس سے پہلے لاہور سے باہر دورے پر تھا اور دورہ کرتا ہوا لاہور پہنچا۔ لیکن چودھری افضل حق ۲۲۔ سے پہلے لاہور میں نہ تھے۔

کیا آج کوئی واقف حال شخص اس عظیم غلطی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ شائع کردہ چھٹی میری لکھی ہوئی ہے۔ کس کو معلوم نہیں کہ ڈیڑھ سال تک ہمارے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ جب گولیاں چل رہی تھیں ہم دفتر میں بیٹھے پلاؤ اور کیاب کھا رہے تھے۔ گولیاں ۲۰۔ ۲۱۔ جولائی ۱۹۳۵ء کو چلیں اور سب کو علم ہے کہ چودھری افضل حق ان دنوں لاہور میں تھے۔ ۲۲۔ جولائی کو ہم سب مسجد وزیر خاں میں گئے، جہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی موجود تھے۔ ۲۳۔ جولائی کو ہم نے سول نافرمانی کے خلاف اپنا پہلا بیان دیا، جو زمیندار لاہور میں مورخہ ۲۶۔ جولائی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اور بھی اعلان شائع ہوئے اور چودھری افضل حق اور میں لاہور میں رہے۔ حتیٰ کہ ۳۲۔ اور ۲۸۔ جولائی کو برکت علی ہال لاہور میں احرار کارکنوں کے اجلاس ہوئے۔ پنجاب اور سرحد کے زعماء کے اجلاس ہوئے تو ہم لاہور میں تھے۔

۱۲۔ جولائی کو پنجاب کونسل کے ارکان کا اجلاس ہوا اس میں شامل ہوا

اور ۱۸-۱۹ جولائی کی گفتگو سے مصالحت کے سلسلہ میں لاہور میں مقیم رہے۔  
الغرض ۱۰ جولائی سے ۲۹ جولائی تک چودھری افضل حق اور میں  
لاہور میں رہے۔ لیکن اس مفروضہ چھٹی سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں اور  
چودھری صاحب دونوں دورے پر نئے۔ کیا اس سے زیادہ بھی کوئی بدکاری  
ہو سکتی ہے کہ ایکشن کے دروغ یا ایجنٹ یہ جعلی خط شائع کر کے مجھے اور  
احرار کو بدنام کرنے کی کوشش کریں۔

میں ان اخبارات سے اجنبیوں نے اس جعلی چھٹی کو شائع کیا ہے اسے  
رکھتا ہوں کہ وہ میرے اس بیان کو شائع کر کے اس پر تنقید کرنے کی تکلیف  
گوارا فرمائیں گے۔“

انہی دنوں پنجاب اسمبلی کے مسلم لیگی امیدوار ملک برکت علی کے  
ملک برکت علی پر الزام | خلاف ایک اشتہار شائع ہوا جو مسلم لیگ پارلیمنٹری سیکرٹری  
غلام محمد خاں بیرٹر کے نام بھیجا گیا اور اس کی نقل اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس اشتہار میں  
ملک برکت علی پر دو الزام لگانے گئے تھے۔

۱۔ کیا ملک برکت علی نے مسجد شہید گنج میں بحث کرنے کے لیے مبلغ تین سو  
روپیہ شہید گنج ٹریفنس کمیٹی سے حاصل نہیں کیے اور اس رقم کا تحریروں کی شہادت  
انہوں نے عدالت میں داخل نہیں کیا۔ ۲۔

۲۔ کیا اس مسلم نہیں اور نواب سے۔ جن کی طرف سے متذکرہ بالا اشتہار میں  
اشارہ ہے۔ انہوں نے معائنہ مثل اور حصول نقل کے لیے مبلغ ایک سو  
روپیہ چیک نمبر ۲۶۵۲۱ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء کو حاصل نہیں کیے۔

(وزیر اعلیٰ انقلاب - لاہور - ۲۱ جنوری ۱۹۴۶ء)

۱۹۔ جنوری کو پنڈت مدین مومن مالوی کانگریسی امیدواروں کی  
پنڈت مالوی پنجاب ہیں | مخالفت کے لیے پنجاب کے دورے پر لاہور پہنچے۔ مگر وہ  
جس جگہ گئے وہاں کے ہندو عوام نے ان کی مخالفت کی اور ان کی تقریر سننے سے انکار کیا۔

آخر وہ ایک ہفتہ کے بعد واپس چلے گئے۔

حلف نامہ آزادی خلاف قانون قرار دے دیا گیا | ۲۲۔ جنوری کو مدراس گورنمنٹ نے

۲۶۔ جنوری یوم آزادی کے موقع

پر پڑھا جانے والا حلف نامہ خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس کے بعد بمبئی، سی پی اور پنجاب کی صوبائی حکومتوں نے بھی یہ حلف نامہ ممنوع قرار دے دیا۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے ریزولیشن کے مطابق ہر سال

۲۶۔ جنوری کو یوم آزادی منائے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس میں اس ریزولیشن کا اعادہ کیا

جاتا اور اسے بطور حلف نامہ کے ہر سال پڑھا جاتا تھا۔ لیکن اس سال صوبائی حکومتوں نے

ایمر جنسی پورا کیٹے ۱۹۳۱ء کی دفعہ ۱۹ کے تحت حکم ملک معظم اس حلف نامے کو خلاف قانون

قرار دے دیا۔ چنانچہ پولیس نے اس ریزولیشن کی تمام کاپیاں سارے ملک میں کانگریس کے

دفتروں پر چھاپہ مار کر ضبط کر لیں۔

مجلسِ احرار کا اعلان | ۲۳۔ جنوری کو مجلس احرار ہند کے سالانہ عظیم سردار محمد شفیع نے

اعلان کیا کہ

احرار وطن عزیز کی آزادی کے لیے کانگریس سے پورا پورا تعاون کریں گے

کیونکہ ہندوستان کی آزادی سے وسط ایشیا کے مسلمان ممالک کی آزادی

وابستہ ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی صدائے بازگشت | سیٹھ عبداللہ ہارون نے ۲۶۔ جنوری

۱۹۳۰ء کو اسمبلی کے اجلاس میں

حکومت ہند سے دریافت کیا کہ:

» آیا حکومت نے عبید اللہ سندھی کے ہندوستان میں داخلے کو منسوخ

قرار دے دیا ہے۔ کیا حکومت کو یہ علم ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی

ہندوستان واپس آنا چاہتے ہیں؟

جواب میں سر ہنری بیگ نے کہا کہ

”مولانا نے خود اپنے آنے کی تفصیل سے حکومت کو ابھی تک آگاہ نہیں

کیا اور نہ ہی کوئی درخواست کی ہے“

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ہندوستان سے کابل گئے تھے اور سات برس کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو افغانستان سے روس پہنچے۔ ایک سال یہاں رہنے کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی ٹرکی چلے گئے اور ابھی تک وطن سے باہر ہیں۔

انتخابات شروع ہو گئے | ایکٹ ۱۹۲۵ء جس کی رو سے ہندوستان کو نئی اصلاحات مل رہی تھیں جس کے لیے گذشتہ سال سے سیاسی جماعتیں مصروف

تھیں۔ آخر وہ دن، وہ گھڑی، اور وہ وقت آن پہنچا۔ جب ہندوستان کی پولیٹیکل پارٹیز اپنے منشور اور اس کے حصول میں عوام کے سامنے پہنچ گئیں۔

کانگریس، مسلم لیگ اور مجلس احرار کے علاوہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی، سندھ میں سندھ یونائیٹڈ اس طرح یوپی، بہار، سی پی، اڑیسہ، بنگال، آسام اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مختلف عنوانات اور ناموں سے جدا جدا جماعتیں الیکشن کے میدان میں اتر چکی تھیں۔

لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے ۱۸ سے ۲۵ جنوری تک لاہور میں الیکشن کی تاریخوں کا اعلان کر دیا۔ فروری کے شروع میں دوسرے صوبوں میں بھی انتخابات شروع ہو چکے تھے۔ ہر روز طلوع ہونے والا آفتاب اخبارات کو نئی اطلاعات فراہم کرتا۔ جس سے تپاس آرائیوں نے جنم لینا شروع کیا۔ کبھی کانگریس، کبھی مسلم لیگ اپنے اپنے نیچائی گھوڑے دوڑا رہی تھیں لیکن سرکاری اعلان کا انتہائی تھا جو آخری اور حتمی تھا۔

اس دوران ۲ فروری کو ڈاکٹر محمد عالم نے بوشہید گنج کے ٹکٹ پر راولپنڈی سے انتخاب لڑتے تھے، اپنی کامیابی کے گمان میں اعلان کر دیا کہ

”وہ کانگریس کے خادم ہیں اور کامیاب ہو کر کانگریس میں کام کریں گے“

اس پر اتحاد ملت کے کارکنوں نے اعتراض کیا کہ آپ شہید گنج کے لیے الیکشن لڑ رہے

تھے۔ اب آپ نے کانگریس کی پٹیا لے لی۔

اس پر ڈاکٹر محمد عالم نے کہا کہ:

” میں اسمبلی میں کانگریس کی مدد سے مسجد کے لیے لڑوں گا۔ جو اہر لال کی امداد بھی

مجھے حاصل ہوگی۔ میں صرف حصولِ مسجد کے لیے کانگریس میں جا رہا ہوں۔“

پنجاب میں مسلم لیگ کے دو امیدوار تھے۔ ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی۔ اول الذکر نے مجلس اتحاد ملت کا ٹکٹ بھی برائے کامیابی حاصل کر لیا تھا۔ جس پر مسلم لیگی حلقوں میں تعجب کیا گیا۔ ۹ فروری کے اعلان کے مطابق مسلم لیگ کے دو ممبر کامیاب ہوئے۔ ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی۔ لیکن آخر الذکر کامیاب ہو کر یونینسٹ پارٹی میں جا ملے۔ راجہ صاحب کا استقبال کرتے ہوئے سر سکندر حیات نے کہا

” راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایماء پر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے میرے ساتھ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کامیاب ہونے کے فوراً بعد یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔“

(اقبال کے آخری دو سال صفحہ ۳۴۷)

راجہ صاحب کے اس فعل پر سبقت روزہ نیوٹانز نے اپنی ۲۲ فروری کی اشاعت میں لکھا

” یہ صاف سیدھا فریب اور دھوکہ ہے۔ اگر مسلم لیگ کو معلوم ہوتا کہ راجہ غضنفر علی اور سر سکندر کے درمیان کوئی عہد و پیمانہ قائم ہے تو پارلیمنٹری بورڈ کبھی ایسے شخص کو ٹکٹ نہ دیتا، جو فریق مخالف کے لیڈر کے ساتھ خفیہ ساز باز میں شریک تھا۔“

(اقبال کے آخری دو سال صفحہ ۳۴۸)

یکم فروری کو صوبہ سرحد میں الیکشن کے دوران سارے صوبے میں دفعہ ۱۲۲ نافذ کر دی جس کے تحت صوبہ بھر میں جلوس اور جلسے خلاف قانون قرار دے دیئے گئے۔

یوپی میں بھی اسی قسم کا کھیل تماشہ ہوا۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے کے بعد حافظ اسماعیل، حافظ ابراہیم اور سعید الدین کانگریس میں جا شامل ہوئے۔

وسط فروری تک مسلم لیگ اور کانگریس کو اپنی اپنی پوزیشن کا واضح علم ہو چکا تھا۔ اس بنا پر بابور جند پرشار نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ کانگریس کسی دوسری جماعت سے اسمبلی کے اندر وزارت کے سلسلے میں منافقت نہیں کرے گی۔

کانگریس رہنما کا یہ بیان یوپی کے چودھری خلیق الزمان کے لیے پریشانی کا باعث ہوا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ آخر اس بیان کی اتنی جلدی کیا تھی۔ جب کہ ابھی تک اکثر صوبوں کے انتخابات کے نتائج بھی معلوم نہیں ہوئے۔ علاوہ ازیں گوانیکشن کے دوران بیگ اور کانگریس کا کوئی باقاعدہ تحریری سمجھوتہ بھی نہ تھا۔ پھر بھی دونوں ادارے ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے تھے۔ اس سے مجھے خوف ہوا کہ راجن بابو کا یہ بیان بہت خطرناک مستقبل کی دعوت دے گا۔ اور اسی وقت میں نے ایک مجمع کے سامنے کہہ دیا کہ کانگریس کی اس پالیسی کا میں پورا مقابلہ کروں گا۔

دشاہراہ پاکستان مصنف چودھری خلیق الزمان ص ۲۲

برطانیہ کی جنگی تیاریاں | لندن - ۱۲ فروری کو دارالعلوم میں برطانیہ کے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ جنگی تیاریوں کے پیش نظر حکومت کو چالیس کروڑ پونڈ خرچ لینا پڑے گا۔

راہبہ غضنفر علی کا بیان | ۱۱ فروری کے روزنامہ "القلاب" لاہور میں راہبہ غضنفر علی کا ایک بیان شائع ہوا۔

”میں ہمیشہ سے ہندو مسلم اتحاد کا حامی رہا ہوں۔ چنانچہ یہ ٹیسٹ پارٹی میں تھا جو اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ میں زمینداروں کی خدمت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اتحاد پارٹی کے تمام افراد کو اس کو زندہ ثبوت سمجھنا چاہیے۔ یہ سب پارٹی کا نصب العین بھی مسلم لیگ۔ کی طرح ہے۔ اور اہم بات یہ ہے کہ اتحاد پارٹی کے لیڈروں سے مجھے مدت سے نیاز مندی حاصل ہے۔ یہ مختلف قوموں میں اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ مخلص ہے تو وہ سرکندہ حیات ہے۔ یہ وہ ہے جو بزرگوں کے گورنر ہے۔ حالات بہت خراب تھے۔ لیکن ان کے گورنر بننے ہی حالات درست ہو گئے۔ اس پر تمام اخبارات نے انہیں مبارکبادیں دیں۔ وہ مذہبی اعتبار سے بالائے شبہ“

برلن - ۱۹ فروری کو ہٹلر نے جرمنی کے تمام سابق برخاستہ فوجی پارٹیوں ہٹلر کا اعلان اور افسران کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

”جرمن قوم کسی قوم سے جنگ نہیں چاہتی۔ اس وقت ہمارے دل میں اپنے  
قدیم مخالفین کے سوائے احترام کے اور کچھ نہیں۔ آج تک جنگیں کسی قوم کے  
یہے مفید نہیں رہیں، بلکہ تباہی لائی ہیں۔“

جس حالت میں جرمن حالات سے برہم ہو جائیں گے یا ہمارے امن میں  
خلل وارد ہوگا اور جرمن کے حالات بگڑ جانے کا خدشہ ہوگا تو جرمن مجبور ہوگا کہ  
وہ اپنا دفاع کرے اور اس کی تمام تر ذمہ داری ہم پر نہیں ہوگی۔“

(روزنامہ انقلاب لاہور ۲۱ فروری ۱۹۳۷ء)

انتخاب کے نتائج | فروری کے آخر تک تمام صوبوں کے نتائج نکھر کر سامنے آچکے تھے  
اس کے نتیجے میں کانگریس کی پوزیشن حسب ذیل تھی۔

مدراں	کل دو سو پندرہ نشستیں	کانگریس	ایک سو اکیاون
بمبئی	کل ایک سو پچھتر	"	اٹھاسی
اڑیسہ	کل ساٹھ	"	چھتیس
پوپی	دو سو اٹھارہ	"	ایک سو بارہ
سی پی	ایک سو بارہ	"	اکتر
بہار	ایک سو باون	"	تسانوے
شمال مغربی صوبہ علیہ۔ پچاس	"	"	انیس
آسام	ایک سو اسی	"	پنستیس
بنگال	دو سو پچاس	"	بیالیس
پنجاب	ایک سو پچھتر	"	اٹھارہ
سندھ	ساٹھ	"	سات

اس کے مقابل آل انڈیا مسلم لیگ کسی جگہ بھی ایسی پوزیشن حاصل نہ کر سکی کہ وہ اپنی  
وزارت بنا سکتی۔ مثلاً بنگال میں مسلمانوں نے ایک سو تیس نشستیں حاصل کیں۔ یہاں کا  
لیڈر فضل الحق تھا اور وہ پر جا پارٹی بنا کر بیٹھا ہوا تھا۔ گو اس کا اتحاد مسلم لیگ سے تھا مگر وزارت



فضل الحق نے ترتیب دی جسے لیگی وزارت نہیں کہا جاسکتا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے  
 ناعاقبت اندیش کارکنوں کی وجہ سے مسلم لیگ کو شکست ہوئی۔ البتہ صوبجات متحدہ میں مسلم لیگ  
 نے انیس نشستیں حاصل کیں یعنی اسی فیصد کامیاب رہے۔ لیکن یہاں وزارت بنانے کا سوال ہی  
 پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ علاقہ یوپی میں شامل تھا۔

مختصراً نتائج یہ ٹھہرے کہ مسلمانوں کے چار سو اکانوے حلقوں میں مسلم لیگ نے ایک سو  
 چار نشستیں حاصل کیں۔ جبکہ کانگریس مدراس، یوپی، سی پی، بہار اور اڑیسہ میں واضح اکثریت  
 سے کامیاب ہوئیں۔

**مجلس احرار** | مجلس احرار نے پنجاب اور دیگر صوبوں میں بری طرح شکست کھائی  
 پنجاب میں اس کے امانتدے کامیاب ہوئے۔ لیکن پارٹی ایڈیٹور چودھری  
 افضل حق کے شکست کھا جانے کے باعث صرف تین آدمی جماعت کے ساتھ رہے۔ مولانا مظہر علی اعظم  
 ایڈووکیٹ (لاہور) خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ (لاہور) چودھری عبدالرحمن راجہ (ضلع جالندھر)  
 اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول مسجد شہید گنج کا غلط پروپیگنڈہ۔ دوسرے درجے پر یونیونسٹ پارٹی  
 اور حکومت کا گٹھ جوڑ۔ تیسری وجہ یہ کہ مجلس احرار کا اپنا کوئی اخبار نہیں تھا۔ اس وجہ سے پنجاب کا  
 غیر مسلم پریس احرار میدانوں کی مخالفت کرتا رہا۔ مسلم لیگ کے کارکنوں کی منافقت یعنی سوشلسٹ  
 کے ساتھ احرار کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ حقیقت میں مسلم لیگ کے تمام تر میدانوں سے  
 یونیونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ وہ فضل حسین کے اشارے پر مرٹر جناح کو فریب دیتے رہے۔  
 یوپی میں جمعیۃ علماء ہند نے مسلم لیگ سے ناٹ جوڑا تو اس صوبہ کے احرار نے  
 لیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور کونیک مارچ کے لچھاؤں پر سے کسی یوپی احرار سے اجتناب  
 سے اجتناب ترا۔ مرحد کے احرار کو ان کی عواہد پر چھوڑ دیا تھا۔ البتہ یوپی مجلس احرار نے لیکشن میں حصہ  
 لیا۔ حافظ علی بہادر مدیر اعلیٰ "روزنامہ ایماں" بی بی کے علاوہ عورتوں کی ایک سیٹ پر ہونے کے لیے  
 یہاں بھی دونوں سیٹوں پر شکست ہوئی۔ بہرحال مجلس احرار ۱۹۳۱ء کے الیکشن میں ات کھا گئی  
**یونیونسٹ پارٹی** | یوپی جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد دو سالوں میں جمعیۃ علماء ہند نے  
 بیرونی ممالک کی طرف سے ہونے والے ہتھیاروں کی خرید و فروخت کو روک دیا۔

تھیں پنجاب کے دیہاتی سکھ نوجوان جوان دنوں ہندوستان سے باہر کاروبار کے لیے گئے ہوتے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف اپنے وطن کے لیے ایک عظیم سازش کی جس کی تفصیل زیر نظر کتاب کی دوسری جلدوں میں آگے چل کر آئے گی، جب یہ لوگ واپس وطن آئے تو ان کے گاؤں برطانیہ کے خلاف بغاوت کا مرکز بن گئے۔ شہروں میں تو آگ روشن تھی جب دیہاتی عوام بھی فرنگی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو حکومت کی حکمت عملی سے شہری اور دیہاتی کی تمیز اور اس افتراق کو ہوادینے کے لیے ۱۹۲۲ء میں سر فضل حسین کی سرپرستی میں یونینسٹ پارٹی قائم کی گئی تاکہ انگریز کے خلاف اٹھنے والی آواز بگڑ کر رہ جائے۔ اور شہروں کی طرح گاؤں بھی فرقہ وارانہ فضا میں جلنے لگے۔ گو یہ سکیم کامیاب نہ ہو سکی تاہم ۱۹۲۴ء کے انتخابات سے پیشتر اس لاش کو جس میں بدبو پڑ چکی تھی تیر سے نکالا گیا۔ حکومت کی خواہش پر رائے بہادروں، خان بہادروں اور سروں کا یہ ٹولہ ہندو مسلم اتحاد اور شہری، دیہاتی کے جوان سے پنجاب میں کامیاب ہوا۔

پنجاب میں ناکامی پر مسٹر جناح کا بیان | پنجاب میں مسلم لیگ کی شکست پر ۲۸ فروری کو بمبئی میں مسٹر محمد علی جناح نے حسب ذیل

بیان دیا۔

میرپور میں واقعہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے کسی مؤثر صوبائی یا ڈسٹرکٹ اداروں کے بغیر پنجاب میں حصہ لیا۔ اگرچہ یہ اجتہادی کوشش ہے، تاہم میں اس کے نتائج سے مطمئن ہوں۔ جبکہ آل میں مسلم لیگ نے پچاس فیصد مسلم نشستوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ یوپی مسلم لیگ کے پینتالیس امیدواروں میں انیس کامیاب ہوئے ہیں۔ مدراس میں گیارہ امیدوار تھے، اس کامیاب ہوئے ہیں۔ بمبئی میں دو تہائی مسلم نشستیں لیگ کے حصہ میں آئی ہیں۔

پنجاب کا ذکر کرتے ہوئے قائد اعظم نے پنجاب میں مسلم لیگ کی ناکامی کا افسوس ناک لہجے میں اعتراف کیا۔

لیگ کی طرف سے بہار، صوبہ سرحد، اڑیسہ اور سندھ میں پارلیمنٹری بورڈ قائم نہیں

کئے گئے تھے۔ اسام میں چوبیس مسلم نشستوں میں سے بیگ کو صرف ایک نشست ملی ہے۔ اس جگہ مسلم لیگ کے دو دستوں کی قیادت میں باہم مارے تھے۔

(روزنامہ انقلاب لاہور ۲۔ مارچ ۱۹۴۲ء)

**سیکرٹری انجمن اسلامیہ** | یکم مارچ کو سیکرٹری انجمن اسلامیہ نے کہا کہ روزنامہ احسان کی یہ خبر غلط ہے کہ انجمن اسلامیہ لاہور نے مرزائیوں پر اپنے دروازے کھول دیے ہیں۔ انجمن اسلامیہ کا ممبر صرف مسلمان ہو سکتا ہے۔

**سیاسی قیدیوں کی رہائی** | امرتسر یکم مارچ کو ایک سرکاری اعلان کے ذریعے کہا گیا کہ ۱۵-۱۹۴۲ء کے وہ قیدی جنہیں ایک سازش کے تحت عمر قید کی سزا دی گئی۔ وہ رنگون جیل سے رہا کر دیے گئے ہیں۔ ان قیدیوں میں بابا امر سنگھ نامی شخص گرفتاری سے پہلے ملایا میں انجمن رہتا تھا۔

ان لوگوں نے انگریزوں کے خلاف عسکری جنگ لڑنے کے لیے جاپان سے گاماگانا مارو جہاز خریدی تھی۔ یہ بحری جہاز جب بچ بچ کے گھاٹ پر پہنچا تو انگریزوں سے اس کا مقابلہ ہوا جس سے بہت سے ہندوستانی اسے گئے، جو بچے وہ گرفتار کر لیے گئے۔ سردار گوردت سنگھ اس جہاز کا لیڈر تھا۔

گرفتاری کے وقت ان لوگوں کی عمریں بیس تیس سال کے درمیان تھیں اور جب رہا ہوئے تو ان کی ڈاڑھیاں سفید ہو چکی تھیں۔ پھر یہ لوگ بابے کہلائے۔ ہر ہندوستانی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

**حکومت پنجاب کا اعلان** | چار مارچ کے اخبارات میں حکومت پنجاب نے اعلان کیا کہ نئے آئین میں پنجاب کے وزراء کون کون ہوں گے۔ سرکنڈر

چودھری چھوٹو رام، نضر حیات ٹوانہ، میاں عبدالحی، سرزبور رحیل، سرکنڈر سنگھ مجھیڈ، پنجاب وزیر کے متعلق آخری فیصلہ یکم اپریل ۱۹۴۷ء تک کوئی اعلان یا نوٹیفکیشن نہیں ہوگا تاہم یہ امر قطعی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ گورنر پنجاب نے سرکنڈر حیات کے مشورے سے مندرجہ بالا اصحاب کو کابینہ میں لے لیا ہے۔

وزیر اعظم پنجاب کا اعلان | سرکاری اعلان کے دوسرے روز پنجاب کے وزیر اعظم نے

آئین کے تحت ہر صوبے کا وزیر اعلیٰ وزیر اعظم کہلاتا تھا۔

سر سکندر حیات نے اپنی پارٹی کی ایک میٹنگ میں اخبارات کے نمائندوں کو چائے پر بلایا۔  
ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا: کہ

”آئندہ حکومت پریس کے متعلق قوانین بنانے میں ایک نئی پالیسی کا اعلان

کرے گی۔ نئی حکومت کی نگاہ میں کسی اخبار کے جرائم میں سب سے بڑا جرم  
ایسی تحریریں ہوں گی جو مختلف اقوام کے درمیان نفرت پھیلانے والی ہوں گی“

(روزنامہ انقلاب لاہور ۶ مارچ ۱۹۳۷ء)

روزنامہ پرتاپ کی ایک خبر | ۶ مارچ کے روزنامہ پرتاپ لاہور میں یہ خبر مندرجہ ذیل  
پر شائع ہوئی۔

”سر سکندر شگھ مجیٹھ نے یونینسٹ پارٹی سے اس شرط پر اتحاد کیا ہے کہ اسمبلی  
کے اندر مسجد شہید گنج کے متعلق کوئی سوال نہیں اٹھایا جائے گا۔ اگر کسی نمبر نے  
یہ سوال اٹھایا تو حکومت اس کی مخالفت کرے گی“

مسٹر جناح کا ایک اور بیان | ۹ مارچ کو نئی دہلی سے ایک اخباری نمائندے کے سوال  
کے جواب میں مسٹر جناح نے کہا۔

”ہماری پوزیشن بالکل واضح ہے۔ ہم ہر اس ترقی پسند پارٹی سے تعاون کریں  
گے جس کا پروگرام ہمارے بنیادی اصولوں کے مطابق ہوگا۔

ہماری اور جگو پال اچاریہ کی پالیسی میں کوئی فرق نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ  
وزراء اور ممبران مجالس وضع قوانین میں جانے کے مسئلہ پر غور کریں۔ اور اپنی  
ذمہ داریاں انجام دیں اور اصولوں پر حکومت چلائیں“

مرکزی مجلس احرار کا اجلاس | لدھیانہ ۱۱ مارچ مرکزی مجلس احرار کا اجلاس ہوا جس میں  
احرار امیدواروں کی شکست پر غور کیا گیا۔ اس ضمن میں سرگتے

کی کمی اور مناسب سرکاری مداخلت اور پارٹی کا آرگن نہ ہونے کو شکست کا موجب قرار

دیا گیا۔

سرحد میں وزارت کا قیام | جیسے ہی انتخابات ختم ہوئے گورنروں نے اکثریتی پارٹیوں کو دعوت دی کہ وہ وزارت

قائم کریں۔ اس سلسلے میں ۱۶ مارچ کو شمال مغربی صوبہ سرحد کے گورنر نے نواب سر عبدالقیوم کو بحیثیت صدر یونائیٹڈ پارٹی کو دعوت دی کہ وہ وزارت قائم کریں۔ ان دنوں صوبہ سرحد میں مختلف پارٹیوں کی

پوزیشن یہ تھی۔

یونائیٹڈ پارٹی۔ ۲۱ ارکان، کانگریس۔ ۱۹، ہندو سکھ نیشنلسٹ۔ ۸، مسلم انڈیپنڈنٹس۔ ۱۰

اس طرح سرحد میں پہلے وزیر اعظم سر عبدالقیوم مقرر ہوئے۔

سبھاش بابو کی رہائی | کلکتہ، ۱۶ مارچ سٹر سبھاش چندر بوس جنہیں گذشتہ سال دفعہ ستر کے تحت نظر بند کیا گیا تھا۔ آج شام رہا کر دیا گیا۔

کانگریس کی قرارداد | جب سے ملک میں انتخابات ختم ہونے ہیں۔ حکومت ایک نئی ایلین میں پھنسی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس ایکشن میں کانگریس پانچ صوبوں

میں کامیاب ہو چکی ہے اور وہ کسی دوسری پارٹی سے کونیشن پر آمادہ نہیں۔ اس کے علاوہ کانگریس میں مختلف عناصر اپنے اپنے ذہن اور خیال کے مطابق سوچ رہے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے ہے کہ ہمیں وزارتیں قبول کرنی چاہئیں۔ دوسرا طبقہ مشروط وزارتیں قبول کرنے کے حق میں ہے۔ ایک پارٹی کا کہنا ہے کہ ہمیں گورنروں سے اختیارات کے استعمال کی ضمانت حاصل کرنی چاہیے۔

انہی حالات میں ۱۶ مارچ کو دہلی میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب آٹھ سو نمبر ان کی موجودگی میں دو روزہ سبھاش کے بعد حسب ذیل ریزولوشن پاس کیا۔

”جس صورت میں حکومت برطانیہ دست ہند کی واضح اور بینہ رائے کے اعلان

کرنے کے باوجود جدید دستور اس میں پرکھ رہا ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی جس

آئین ساز کے ارکان کو تاکید کرتی ہے کہ اس صورت میں مجالس آئین ساز کے

اندر اور اس کے باہران کے اقدامات کانگریس کی بنیادی پالیسی پر مبنی ہونے چاہئیں۔ تاکہ وہ جدید دستور سازی کا مقابلہ کر سکیں اور اسے ختم کر دینے کے قابل بن سکیں۔

یروہی پالیسی ہے جس کے تحت کانگریس نے لوگوں سے ووٹ حاصل کیے ہیں اور انتخابات میں اسے فتح نصیب ہوئی ہے۔ یہ پالیسی اس مرحلے تک پہنچنی چاہیے جس راستے سے برطانیہ حکومت کی راہ میں رکاوٹیں حاصل کی جا سکیں اور برطانوی استعماریت اور ہندوستانی نیشنلزم کے درمیان ایک دائمی تنازعہ پیدا کیا جاسکے۔ اور جدید دستور کے خلاف جمہوریت کی دفعات کو طشت از بام کیا جاسکے۔

آل انڈیا کانگریس اپنے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ان ریزولیشنوں کی تصدیق کرتی ہے جو ۲۰ اور ۲۸ فروری کو دارعہ میں منظور ہوئے تھے۔ ان قراردادوں میں مجلس آئین ساز کے کانگریسی ارکان۔ اقدامات مجلس آئین ساز کے اندر اور باہران کی کوششیں، عوام الناس سے ان کا میل جول اور مجلس آئین ساز میں کانگریس پالیسی کی وضاحت کی گئی تھی۔

آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس مجلس آئین ساز کے کانگریسی ارکان سے ملتی ہے کہ وہ انہی ریزولیشنوں کو اپنا دستور العمل بنائیں۔ وزارتوں کی قبولیت یا عدم قبولیت کے تصفیہ شدہ موضوع کے بارے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی۔ مجلس آئین ساز کے کانگریسی ارکان کو مجاز قرار دیتی ہے کہ وہ کانگریس کی اکثریت والے صوبوں میں وزارتیں قبول کر لیں۔ بشرطیکہ کوئی وزارت اس وقت تک قبول نہ کی جائے جب تک مجلس آئین ساز کی کانگریس پارٹی کا ایڈر مطمئن نہ ہو جائے اور عوام الناس کے سامنے اعلان کرنے کے قابل نہ ہو جائے کہ جس وقت تک وہ یا اس کی کابینہ دستور اساسی کی حدود میں کام کریں گے گوڈرنر اپنے اختیارات خصوصی کو استعمال نہیں کریں گے۔ اور نہ ہی وزیر ارکان کی رائے کو

نظر انداز کریں گے۔“

(روزنامہ ”انقلاب“ لاہور۔ ۱۸ مارچ ۱۹۳۶ء)

مندرجہ بالا قرارداد کانگریس کے سالانہ اجلاس ۱۹۔ مارچ کو زیرِ صدارت جواہر لعل نہرو زیرِ سرپرستی آئی اور چند لفظی ترمیمات کے ساتھ اسے منظور کر لیا گیا۔

علامہ اقبال کا خط مسٹر جناح کے نام | کانگریس کی قرارداد کے بعد ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ۲۰۔ مارچ کو مسٹر جناح کے نام حسب ذیل خط لکھا۔

”میرا خیال ہے، آپ نے پنڈت جواہر لعل نہرو کا خطیہ صدارت ملاحظہ فرمایا ہوگا، جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں دیا ہے۔ اس خطیہ میں مسلمانانِ ہند کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے، اس کو سچی آپ نے بخوبی محسوس کیا ہوگا۔ آپ یقیناً اس بات سے بھی آگاہ ہوں گے کہ نئے آئین نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کا اور موقعہ ضرور دیا ہے کہ وہ ہندوستان اور اسلامی ایشیا میں رہنا ہونے والے سیاسی حالات کے پیش نظر اپنی تنظیم کر سکیں۔ بلاشبہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے پر تیار ہیں۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل قومی تنظیم پر ہے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک مؤثر جواب دینا بے حد ضروری ہے۔ آپ کو چاہیے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں۔ جس میں شرکت کے لیے نئی نموبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ دیگر بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں کو بھی مدعو کریں۔ اس کنونشن میں آپ پوری صفائی اور تندہی کے ساتھ حقیقت بیان کیجئے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ سیاسی بستی کے مالک ہیں اور اس حیثیت سے ان کا سیاسی مطمحہ نظر کیا ہے۔

یہ امر بے حد ضروری ہے کہ اندرون و بیرون ہند کی تمام دنیا لوٹا دیا جائے۔

کہ ملک میں محض اقتصادی مسئلہ ہی تھا ایک مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مسلمان ہند کے لیے ثقافت اور کلچر کا مسئلہ اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے۔ بہر حال کلچر کا مسئلہ کسی طرح بھی اقتصادی مسئلہ سے کم اہم نہیں ہے۔

اگر آپ نے اس قسم کی کنونشن منعقد کی تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح ان مسلمان ممبروں کی نیتوں کا بھی امتحان ہو جائے گا، جنہوں نے مسلمان ہند کے اغراض و مقاصد کے خلاف اپنی الگ جماعتیں قائم کر رکھی ہیں۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہندوؤں پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جائے گی کہ باریک سے باریک ریاستی چال بھی مسلمانوں کو فریب نہیں دے سکتی۔ اور اپنی جداگانہ تمدنی حیثیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔

میں چند روز میں دہلی آ رہا ہوں۔ پھر اس موضوع پر آپ سے زبانی گفتگو

ہوگی۔ (اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ پبلشر شیخ محمد اشرف)

یوپی میں لیڈرشپ کا جھگڑا | یوپی کے چودھری خلیق الزمان عجیب و غریب طبیعت کے آدمی تھے۔ ریاستی سوجھ بوجھ کے علاوہ عملی دد و دھوپ میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ چار۔ پیسے بھی پاس تھے۔ اس بل بوتے پر اقتدار کے محاذ کی کمان کرنے کو بھی جی چاہتا تھا۔ اگرچہ آل انڈیا شہرت کے آدمی نہیں تھے۔ تاہم اپنے صوبے میں انہیں کافی وقار حاصل تھا۔

نئے انتخاب میں کامیابی کے بعد انہیں ایک ادھ وزارت ملنے کا امکان تھا۔ اس بنا پر انہوں نے باغبان اور صیاد دونوں کو راضی رکھنے کی کوشش کی۔ ان کا ارادہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں کسی طرح مفاہمت ہو جائے۔ اس ملاپ میں وہ پیش پیش تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ چودھری خلیق الزمان کو کانگریس، مسلمانوں کی طرف سے وزارت میں لے لیتی۔ لیکن راجندر بابو نے یہ کہہ کر کہ کانگریس وزارت بنانے میں کسی دوسری پارٹی سے تعاون نہیں کرے گی، چودھری خلیق الزمان کی تمام خیالی عمارت دھڑام سے نیچے گرا دی اور چودھری صاحب



کو انسوس کے لمحے میں کہنا پڑا کہ راجندر پرشاد کو ایسا بیان دینے میں اتنی جلدی کیا تھی۔ ان کا یہ بیان بہت خطرناک مستقبل کو دعوت دے گا۔

اگر کانگریس کے سابق صدر راجندر بابو غلطی نہ کرتے اور کانگریس اپنے طور پر ہی مسمیٰ، خلیق الزمان کو وزارت میں شامل کر لیتی تو آگے چل کر تحریک پاکستان کو یوپی میں یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو کانگریس کی اس غلطی سے ہوئی۔

کانگریس سے ایوس ہونے کے بعد چودھری خلیق الزمان نے مسلم لیگ کی طرف رجوع کیا۔ پھر کیا ہوا یہ کہانی سر محمد یامین خاں کی زبانی سنئے۔

یوپی میں مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس میں پارٹی کا لیڈر چنا جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ مسوائے دو تین مسلم لیگ کے بھروں کے سب نواب اسماعیل کے طرفدار تھے۔ اور چودھری خلیق الزمان کے طرفدار صرف دو تین تھے۔ نواب اسماعیل خاں کی وجہ سے بہت مسلم لیگی کامیاب ہوئے۔ لیکن خلیق الزمان اس کو کیسے گزروا کرتے کہ وہ کچھ نہ ہوں۔ چونکہ انہوں نے ہی نواب اسماعیل خاں کی مدد سے مسٹر جناح کو لیگ ٹکٹ پر الیکشن لڑانے پر تیار کیا تھا اور کانگریس سے سارا درون خانہ سمجھوتہ کر رکھا تھا کہ ڈیکانٹے ڈاک (DECOY DUCK) بن کر لیگ کو کانگریس سے ملا دیں گے اور وزارت حاصل کریں گے۔ اب اگر یہ لیڈر منتخب نہ ہوتے تو وزارت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہ ترکیب کھیلی گئی کہ سچانے ممبران اسمبلی کے پارلیمنٹری بورڈ میں انتخاب کرے اور چونکہ پارلیمنٹری بورڈ کو پورا اختیار نہ تھا۔ لہذا مسٹر جناح کو مدعو کیا گیا۔ اور ان کو خفیہ طور پر سمجھایا گیا کہ نواب اسماعیل خاں فوری طور پر پکھڑے ہو کر تقریر نہیں کر سکتے اور پہلے جب مرکزی اسمبلی میں تھے، تو کوئی تقریر چھ سال کے عرصے میں نہیں کی تھی۔ اس لیے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر خلیق الزمان کو کر دیا جائے جو وہاں لڑائی لڑتے رہے اور وہاں لیگ کے صدر نواب اسماعیل خاں ہوں۔ چونکہ صوبہ میں ان کی عزت و وقعت ہے اور خلیق الزمان کو اودھ کے باہر کوئی نہیں جانتا۔

مسٹر جناح اس پر تیار ہو گئے۔ تب پارلیمنٹری بورڈ میں یہ تجویز کی گئی کہ مسٹر جناح پر چھوڑ دیا جائے۔ جس کو چاہیں منتخب کریں۔ نواب اسماعیل خاں اس انداز میں سازش سے قطعاً ناواقف

تھے۔ وہ رضامند ہو گئے۔ مسٹر جناح نے بھی فیصلہ دیا کہ نواب اسماعیل خاں صوبائی لیگ کے صدر ہوں اور چودھری خلیق الزمان صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ کے لیڈر ہوں۔ اس طرح چودھری خلیق الزمان منسٹری کے مستحق بنے۔ چونکہ اب وہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر ہو گئے۔ اگرچہ مسلم لیگی ممبران کی اکثریت نواب اسماعیل خاں کے ساتھ تھی۔

یوپی کے گورنر سر ہنری ہیک نے عارضی وزارت بنانے کے لیے نواب چھتاری کو مدعو کیا۔ چونکہ کانگریس کے بعد ایگریکلچرل پارٹی سب سے بڑی تھی۔ نواب چھتاری نے مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنا چاہا کہ ایک منسٹر لیگ کا بھی لے لیں۔ چودھری خلیق الزمان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ لیکن نواب چھتاری کو معلوم تھا کہ نواب اسماعیل خاں کے طرفدار زیادہ ممبر تھے۔ اس لیے بخیران کی مدد کے کام نہ چلے گا۔ اور نواب اسماعیل خاں کی ریاست جہانگیر آباد ضلع بلند شہر میں ہے۔ جس ضلع سے نواب چھتاری ممبر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو نظر انداز کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لیے انہوں نے دونوں کو چھوڑ کر راجہ سلیم پور کو وزارت میں لے لیا۔ راجہ سلیم پور کو بھی نیشنلسٹ مسلمانوں نے ۱۹۳۴ء میں یونٹی بورڈ کا لیڈر بنایا تھا اور ان کے روپے اور نام سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اب یہ گروہ لیگ میں آ گیا۔ راجہ سلیم پور کو زد نہیں کر سکتے۔ لیکن ان لوگوں کا اصل مقصد تو کانگریس سے مل کر مستقبل کی وزارت میں شامل ہونے کا ہے۔ اس لیے کانگریس سے ساز باز جاری ہے۔ لیکن مشکل ہے کہ خلیق الزمان اکیلے کانگریس وزارت میں جائیں تو مسلم لیگ کے سب ممبر منحرف ہو جائیں گے۔ اور نواب اسماعیل خاں کو لیڈر اسمبلی مسلم لیگ پارٹی کا منتخب کر لیں گے۔ اور خلیق الزمان کا سارا پول کھل جائے گا۔ اور اگر تنہا اسماعیل خاں کو وزارت میں لے لیا جائے۔ جس کے لیے جواہر لال وغیرہ تیار ہو جائیں گے تو خلیق الزمان کانگریس کے خلاف سازش شروع کر دیں گے۔ اس لیے اگر وزارت میں جائیں تو دونوں ورنہ کوئی نہ جائے گا۔

(نامہ اعمال مصنفہ یا مین خان ص ۶۶۲-۶۶۳)

اس کے برعکس چودھری خلیق الزمان اپنی کتاب "شاہراہ پاکستان" کے ص ۶۲۲-۶۲۳ میں

لکھتے ہیں۔

۱۹- مارچ کو شاہ محمد حسین عثمانی کے ذریعے نواب چھتاری نے مجھے اپنے مکان پر بلایا۔

اور کہا کہ گورنر ہنری بیگ نے ان سے کانپور اسٹیشن پر کہا کہ میں یوپی میں ایک انڈسٹریل گورنمنٹ بنا لوں اور میرا ارادہ ہے کہ میں آپ کو اپنی کیبنٹ میں شامل کر لوں۔ آپ میرے ساتھ شریک ہو کر میرا ہاتھ بٹائیں۔ میں نے جواب میں کہا، میں اس عزت کو جو آپ مجھے دینے والے ہیں، قبول نہیں کر سکتا (اس عبارت کے آخر میں چودھری صاحب کہتے ہیں)۔

راجہ سلیم پور کی چھٹاری وزارت میں شرکت کے متعلق دن میں مجھے خبریں ملتی رہیں کہ نواب چھٹاری کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ دوسرے روز اعلان ہوا کہ راجہ سلیم پور انڈسٹریل گورنمنٹ میں وزیر تعلیم ہو گئے۔ اس واقعہ کا میرے دل پر بہت اثر ہوا اور سال دو برس میں راجہ سلیم پور سے نہیں ملا۔ اور ان کو پارٹی سے خارج کر دیا۔

(نوٹ)۔ چودھری خلیق الزمان کو اگر وزارت کی خواہش نہیں تھی۔ نیز ان کے انکار پر نواب چھٹاری نے راجہ سلیم پور کو عارضی وزارت میں شامل کر لیا تو اس پر چودھری صاحب کو فسوس کیوں ہوا؟  
(مصنف)

وزارتیں قائم ہو گئیں | نئے آئین میں گورنروں کے ناجائز اختیارات کے باعث کانگریس نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ بلوچ حجت گورنروں نے کانگریس کے رہنماؤں کو وزارت ترقیب دینے کی دعوت دی۔ جیسے کہ یوپی میں پنڈت پنتھ کو، بہار میں شری کرشن سنہا، اڑیسہ میں مہاراجہ مکھیڈی، مدراس میں شری نواز شاستری کو۔ لیکن ان سب نے کانگریس ریزولوشن کے تحت وزارت بنانے سے انکار کر دیا۔ سدا اکثریت والے صوبوں میں کسی خاص پارٹی کو اکثریت حاصل نہیں تھی۔ لہذا گورنروں نے اقلیتی پارٹیوں کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ چنانچہ سرحد میں نواب سر عبدالقیوم، سندھ میں غلام حسین ہدایت اللہ، آسام میں سر سدا اور یوپی میں نواب چھٹاری نے انڈسٹریل گورنمنٹ بنالی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو اکثریت حاصل تھی لہذا اس کے سوا جس قدر صوبوں میں حکومتیں بنیں، ان کی پائیداری مشکوک رہی۔

کانگریس کے رویے پر صدر مجلس احرار کا اظہارِ افسوس | مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کانگریس کے

ذمہ دار رہنا عارضی فتح کے نشہ میں اس قسم کے تلخ بیانات دے رہے ہیں، جس سے ملک میں بجائے اس کے کہ کانگریس کا وقار بڑھے ایسے بیانات سے اس کے وقار کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہر کانگریسی کی زبان سے یہی صدا بلند ہو رہی ہے کہ ہم مسلم لیگ یا کسی دوسری جماعت سے تعاون کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کانگریس سے بدظن ہو کر بدیشی حکومت کی پناہ ڈھونڈنے لگے گا۔ ہر ہندوستانی کانگریس سے محبت رکھتا ہے۔ لیکن کانگریس کے طرز عمل نے قریب آنے والوں کو بھی دور کر دیا ہے۔

**کانگریسی ارکان کیلئے حلف نامہ** | ہم موتمر ہند کے ارکان انفرادی اور اجتماعی طور پر حلف اٹھاتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہندوستان

کی خدمت کرتے رہیں گے۔ مجالس آئین ساز اور اس کے باہر ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشاں رہیں گے۔ اس کے لیے جو حکم کیا جائے گا۔ ہم پوری جدوجہد کریں گے۔ نیز عوام اقباس کے افلاس کو دور کرنے کے لیے پوری کوشش کریں گے۔

ہم عہد کرتے ہیں کہ کانگریس کے تحت رہتے ہوئے کانگریس کے نظریے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ہندوستان کی آزادی کا حصول، کروڑوں انسانوں کو خلاعی کی مصیبت سے نجات دلانا ہمارا منتہائے مقصود ہوگا۔

**مسٹر محمد علی جناح کا اعلان** | نئی دہلی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کونسل میں انتخابات کے دوران مسلم لیگ کی کارگزاریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے

مسٹر جناح نے کہا کہ

”ہندوستان میں اس وقت ایک بھی ذمی شعور آدمی ایسا نہیں جس کے دل میں آزادی کی تڑپ نہ ہو۔ اس موضوع پر رائے کا اختلاف ہو سکتا ہے مگر اس کا سبب یہ نہیں کہ مسلمانوں میں قوم پرستی کا جذبہ مغفود ہے۔ اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے لیے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا ممکن نہیں۔ کیونکہ ان دونوں قوموں کی

تہذیب اور معاشرت اصولی طور پر علیحدہ علیحدہ ہیں۔ لیکن دونوں قوموں کے لیے لازم ہے کہ وہ شانہ نشانہ ہو کر آزادی کی منزل مقصود کی طرف پیش قدمی کریں۔ یہ نصب العین سیف گورنمنٹ کا ہے۔ اگر مسلمانوں نے آزادی کی منزل کی طرف پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا تو میری دلی تائید اور حمایت انہیں حاصل ہوگی۔ مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان یہ اقدام کسی خاص شخص یا جماعت کو خوش کرنے کے لیے اختیار کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ مسلمان مؤخر الجہش ہو کر رہ جائیں ہیں انہیں ہراول دستہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان گاؤں گاؤں میں مسلمانوں کی تنظیم کا پیغام لے کر جائیں۔ میرا منشا یہی ہے، خواہ ڈوبو یا تڑو جتو یا مرو۔ مگر متحد قوم کی طرح رہو۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء)

**ایک نظم کی ضبطی** | یونیسٹ پارٹی نے اپنی وزارت قائم کرتے ہی سب سے پہلے راج کو مجلس احرار کے شاعر ابراہیم خادم کی پنجابی نظم "سرسے دی بول گئی لگڑوں کڑوں" جو مزارِ غلام احمد کے خلاف تھی، ضبط کر لی۔

ابراہیم خادم تانڈلیا نوالہ ضلع لاہور کے رہنے والے تھے اور ان کی زندگی کا اکثر حصہ مجلس احرار کے ساتھ وطن کی جدوجہد میں گزرا۔ مرہوم کی موت دریا میں ڈوب جانے کے باعث ہوئی۔ وہ کہیں دوسرے گاؤں میں نماز پڑھانے جا رہے تھے۔

**پٹنٹ منرو کا اعتراف شکست** | کانگریس کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے کانگریس کے صدر پٹنٹ منرو نے کہا کہ

» ہم مسلم شہستوں کے متعلق بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اور اس ناکامی نے ہمیں بتا دیا کہ یہ ہماری دسترس میں تھا۔ کیونکہ مسلم عوام کانگریس کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ اور ہم ناکام اس لیے ہوئے ہیں کہ ہم نے مسلم عوام میں کام کرنے کی طرف سے بے توجہی برتی اور ہم ان کے پاس نہ پہنچ سکے۔ جہاں ہم پہنچ سکے وہاں کے عوام بالخصوص دیہاتی حلقوں میں ہمیں ویسی ہی آزادی کی لہر لفظانی

ہم نے ہندو، سکھ اور مسلمان دیہاتیوں سے باتیں کیں تو وہاں فرقہ وارانہ مسائل بالکل بے وجود معلوم ہوئے، جن کی نسبت ہم بہت کچھ سنتے رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم مسلم عوام پر زیادہ توجہ کرتے تو ان مشکلات کے باوجود ہمیں اچھی خاصی کامیابی ہوتی۔

یکم اپریل کو ہڑتال | برطانوی آئین ۱۹۳۵ء کے نفاذ پر کوئی ہندوستانی مطمئن نہیں تھا۔

من حیث القوم مسلمانوں کے تمام گروہوں، جماعتوں اور فرقوں نے اسے بہ طور قبول کر لیا تھا اور نہیں تو اس سے حکمرانی کی ٹریننگ ہوگی۔ یہاں تک کال انڈیا کانگریس نے بھی اسے بادلِ خواستہ قبول کر لیا۔ ورنہ وہ انتخاب میں شامل نہ ہوتی۔ اس کے باوجود یکم اپریل کو جس روز سے اس آئین کا نفاذ ہونے والا تھا۔ کانگریس نے تمام ہندوستان میں اس آئین کے خلاف بطور احتجاج ہڑتال کا اعلان کیا۔ لیکن جب مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے ۲۶-۱۷ مارچ کو ممبئی سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے نام ایک پیغام ارسال کیا، جس میں انہوں نے مسلمانان ہند سے التماس کی کہ وہ یکم اپریل کو ہڑتال نہ کریں۔ اس بیان کی وضاحت کرتے ہوئے مسٹر خراج نے کہا کہ

”مجھے ہندوستان کے مختلف حصوں سے مسلمانوں کے پیغامات وصول ہو

رہے ہیں کہ یکم اپریل کو ہڑتال کی جائے یا نہ۔

میں نے اس سلسلہ میں ٹھنڈے دل سے غور کر کے فیصلہ کیا ہے، کہ

مسلمانوں کو اس ہڑتال میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ کال انڈیا مسلم لیگ

فیصلہ کر چکی ہے کہ جدید دستور اساسی سے جس قدر امکان ہو استفادہ کیا

جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہڑتال کی وجہ سے تاجروں، مزدوروں اور دیگر

کاروباری لوگوں کو نقصان ہوگا۔ لہذا ہڑتال میں شامل ہونا مسلمانوں کیلئے مضر ہے۔“

مدح صحابہ کیٹیجی | ۲۱-۱۷ مارچ کو ایک سرکاری اعلان کیا گیا کہ سنیوں اور شیعوں کے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے جو غیر سرکاری کمیٹی قائم کی گئی تھی وہ مسلسل کوششوں کے

باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہی ہے لہذا اب گورنر نے تمام معاملات کو حکومت کے سپرد کر دیا ہے اور جس آئین اس کمیٹی کے صدر ہوں گے۔ اور وہ تمام واقعات کی از سر نو تحقیق

کریں گے۔

**مسلم ماس کنٹیکٹ** کانگریس میں بندوہما سبھائی ذہنیت کے آتے ہی ہندوستان کی یہ منظم، غیر مذہبی اور آزادی ہند کی دھویدار پولیٹیکل جماعت اپنے متعین راستے سے ایسی بھٹکی یا اسے غیر ملکی حکومت کی حکمت عملی کیسے کہ اس نے کانگریس میں ایسے عناصر کو داخل کیا کہ کانگریس صرف ایک قوم کی نمائندہ ہو کر رہ گئی۔ اس پر مجلس اجراء نے ۱۹۳۱ء میں اور مسلم لیگ نے ۱۹۳۰ء میں سنجالایا اور مسلمانوں کو اپنی علیحدہ تنظیم کا احساس دلایا۔ کانگریس کو اس کا پتہ حالیا انتخاب میں چلا، جب کانگریس کے ٹکٹ پر کوئی مسلمان امیدوار کامیاب نہ ہو سکا۔

آخر کانگریس نے ۳۱ مارچ کو الہ آباد میں فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ کانگریس میں شامل ہوں۔ اس کے لیے کانگریس نے مسلم ماس کنٹیکٹ مسلم عوام سے رابطہ کی جماعت کے نام سے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا جس کے صدر علیگڑھ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اشرف اور جنرل سیکرٹری منشی احمد دین مقرر ہوئے۔ پنجاب میں اس کے انچارج میاں افتخار الدین تھے۔ اس سلسلے میں اشتہارات، پمفلٹ وغیرہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ نیز اخبارات میں مضامین لکھنے کی تجویز بھی کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس کے صدر پنڈت نہرو نے تمام کانگریس کمیٹیوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی دلچسپی پر مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کیلئے کام کریں۔

**ایکٹ ۱۹۳۵ کا نفاذ** یکم اپریل ۱۹۳۵ء کو ایکٹ ۱۹۳۵ء کا عملی طور پر نفاذ کر دیا گیا۔ اس کے تحت تمام صوبوں میں وزارتیں قائم کر دی گئیں۔ اس موقع پر ملک معظم نے گورنر جنرل کے نام حسب ذیل پیغام ارسال کیا۔

» آج دستور اساسی کا پہلا حصہ نافذ ہو گیا ہے۔ جس کی تیاری کے لیے برطانیہ اور ہندوستان کے بہترین دماغوں نے متحدہ طور پر کام کیا تھا۔ اس موقع پر میں اپنی ہندوستانی رعایا کو یقین دلاتا ہوں کہ میری دعائیں ان کے ساتھ ہوں گی۔ آج ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ مجھے کامل امید ہے اور میری دعا ہے کہ جدید دستور اساسی کے پیدا کردہ مواقع سے فائدہ

اٹھانے میں بصیرت سے کام لیں کیونکہ اس سے میری ہندوستانی رعایا کو پورا فائدہ پہنچے گا۔

زنگون یکم اپریل ۱۹۳۷ء نصف رات سے نئے آئین کے تحت صور پورا برما علیحدہ کر دیا گیا۔ برما ہندوستان سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس اعتبار سے برما اب برطانیہ کے زیر سایہ ایک الگ ملک قرار دیا گیا ہے۔ ایک تقریب میں غیر سرکاری افراد اور ملک کے اہم مندوبین کے روبرو برما کی علیحدگی کا اعلان کیا گیا اور تاج برطانیہ سے وفادار رہنے کا حلف لیا گیا۔

وزیر اعظم بنگال کا اعلان اگلے یکم اپریل کو وزیر اعظم بنگال مسٹر فضل الحق نے اعلان کیا کہ میں اخباروں میں دیکھتا ہوں کہ کہیں ہندو راج اور کہیں مسلم راج کے متعلق خوف و ہراس کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ میں اس موقع پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بنگال میں مسلم راج اسی طرح نہیں ہو گا جس طرح بہار میں اور یوپی میں ہندو راج کا امکان نہیں۔ ہر جگہ برطانوی راج ہو گا۔ مختلف صوبوں میں یہ نمایاں خصوصیت ہوگی کہ کسی صوبے میں نظم و نسق چلانے والے زیادہ تر ہندو ہوں گے اور کسے صوبے میں یہ کام زیادہ تر مسلمانوں کے ذمہ ہوگا۔ لیکن حکومت کا تخیل اور نصب العین ہر جگہ برطانوی ہوگا۔

(روزنامہ انقلاب لاہور ۳۰ اپریل ۱۹۳۷ء)

جدید دستور تقریباً ایک سو اٹھ غلامی کے بعد غیر ملکی آقاؤں کا ۱۹۰۹ء میں اپنے غلاموں پر پہلی دفعہ دست کرم دراز ہوا اور اسے آزادی کی پہلی قسط کہا گیا، جس کی رو سے قانون ساز کونسلوں کے ارکان کی تعداد میں قدرے اضافہ کر دیا گیا۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ارکان کی تعداد بڑھادی گئی۔ لیکن کونسلوں میں سرکاری اکثریت برقرار رکھی گئی۔ مرکزی قانون ساز کونسل میں سرکاری ارکان کی تعداد سینتیس<sup>۳۵</sup> اور غیر سرکاری ارکان کی تعداد تیس<sup>۲۳</sup> مقرر کی گئی۔ سینتیس<sup>۳۵</sup> سرکاری ارکان میں سے اٹھائیس<sup>۲۸</sup> کو گورنر نے نامزد کرنا تھا اور باقی بلحاظ عمدہ مقرر کیے جانے تھے۔ تیس غیر سرکاری ارکان میں سے پانچ کو گورنر جنرل نے منتخب کرنا تھا اور باقی ارکان کا انتخاب ہونا قرار پایا۔ یہ تھا حکومت ہند کا قانون مجریہ ۱۹۰۹ء۔



۱۹۰۹ء کی اصلاحات سے ہندوستان کے عوام مطمئن نہیں تھے۔ لہذا پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے ہندوستان پر ایک اور احسان کیا۔ یعنی ہندوستان کو آزادی کی دوسری قسط دی۔ اب مرکزی اسمبلی میں امپریل لیجسلیٹو کونسل کی جگہ دو ایوانی مقننہ قائم کی گئی۔ ایوان بالا کا نام کونسل آف سٹیٹ اور ایوان زیریں کا نام سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی رکھا گیا۔

کونسل آف سٹیٹ ایک سو پینتالیس<sup>(۴۵)</sup> ارکان پر مشتمل تھی۔ اس میں ایک سو تین ارکان منتخب کیے جاتے تھے۔ باقی بیالیس ارکان کو گورنر جنرل نامزد کرتا تھا۔ ایک سو تین ارکان کی تقسیم اس طرح تھی۔ عمومی حلقہ ہائے انتخاب سے اکیس<sup>(۴۱)</sup>۔ مسلمان ہائے انتخاب سے دو۔

خاص حلقہ ہائے انتخاب سے بیس ارکان۔ ان کی تقسیم اس طرح تھی۔

زمیندار۔ سات، یورپین۔ نو، ایوان تجارت۔ چار۔ نامزد ارکان میں پچیس<sup>(۲۵)</sup> سرکاری

اور باقی غیر سرکاری۔

ظاہر ہے کہ انگریز کا یہ قانون بھی ہندوستان کے لیے مفید نہیں تھا۔ چنانچہ ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کا حادثہ جمیڈیا نوالہ باغ بھی اسی بے چینی کا نتیجہ تھا۔ تحریک خلافت بھی ہمیں سے آگے بڑھی اور ترک موالات کے ہنگامے بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

آخر برطانیہ نے مرجان سامن کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کیا جو ۱۹۲۸ء میں ہندوستان آیا۔ اس کمیشن میں ہندوستان کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا۔ جس میں بطور ناراضگی کانگریس اور مسلم لیگ نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ اس کے باوجود کمیشن نے ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنی رپورٹ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دی۔ ۲۔ مارچ ۱۹۳۲ء میں حکومت نے ایک قوط اس اجلاس شائع کیا۔ جس پر ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے تنقید کی۔ برطانوی حکومت نے اسے تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ۵۔ نومبر ۱۹۳۵ء کو ایک مسودہ بل تیار کر کے پارلیمنٹ میں پیش کیا جسے ۲۔ اگست ۱۹۳۵ء کو منظور کیا گیا۔ یہی وہ قانون ہے جو ایکٹ ۱۹۳۵ء کو لایا اور یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو اس کا نفاذ ہندوستان میں ہو گیا۔

ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں — (جباری)

(جاننا زمرنا)

# تاریخ آزادی بزرگ نصیر پر تقسیم کے بعد پہلی مستند کتاب چند عنوانات

- ◆ کانگریس نے وزارتیں قبول کر لیں
- ◆ یوپی مسلم لیگ اور کانگریس وزارت
- ◆ جمعیتہ علمائے ہند اور مسلم لیگ کے مابین معاہدے کا خاتمہ
- ◆ شیعوں کی طرف سے لکھنؤ میں تبرہ ایچی ٹیشن
- ◆ قائد اعظم کا خطاب
- ◆ حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت امیر شریعت کے مابین تبلیغی کا خاتمہ
- ◆ خاکسار تحریک - بیلچہ اور کلہاڑی
- ◆ قائد اعظم اور ماتما گاندھی کے مابین خط و کتابت
- ◆ دوسری جنگ عظیم اور مجلس اہل حق کی قرارداد
- ◆ کانگریس مسلم لیگ اور خاکساروں کی دوسری جنگ عظیم کے متعلق قراردادیں
- ◆ قرارداد لاہور
- ◆ پاکستان کا بانی کون تمام پس منظر کے ساتھ
- ◆ کانگریس وزارت اور تحریک مدح صحابہ
- ◆ چودھری افضل حق کا پشاور میں خطبہ صدارت
- ◆ پاکستان کے متعلق مجلس اہل حق کی پالیسی
- ◆ لکھنؤ مسلم لیگ کی قرارداد اور تحریک شہید گنج
- ◆ شہید گنج اور مجلس اہل حق کی سول نافرمانی اور
- ◆ دیگر عنوانات

(جلد سوم)

# کاروائی حرام





